READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

اکتوبر 2016

READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM

Monthly JASOOSI DIGEST

مدیر اعلیٰ

عذرا رسول

پبلشر و پرپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

عزیزانِ من...... السلامُ علیکم!

اکتوبر کا شمارہ آپ کی نذر ہے...... آگ، پانی اور ہوا...... یہ تین عناصر قبضۂ قدرت میں ہیں۔ نہایت فراوانی اور فیاضی کے ساتھ ربّ العالمین کائنات کے ہر ذی روح کو مسلسل فراہم کررہا ہے لیکن ہمارے پڑوس میں جب سے ایک بار والا، چائے فروش اپنی اوقات سے بہت زیادہ بڑھ کر مسندِ اقتدار پر چڑھا ہے، آئے دن کوئی نہ کوئی گھٹیا ہرزہ سرائی کرتا رہتا ہے۔ کشمیر میں فوجی تشدد کرکے جس میں چنگاری خود ڈالی...... جب یہ آگ بنی اور اڑی کی تنصیبات تک پہنچی تو اس نے ہمارے خلاف زہر اگلنا شروع کردیا۔ فوجی ہم جوئی کے ہولناک نقصانات کا احساس دلانے پر جیکل اسٹرائیک سے منہ موڑا تو آبی دہشت گردی کا راگ الاپنا شروع کردیا۔ بھول گیا کہ اس طاس سندھ معاہدے کو عالمی بینک کی ضمانت حاصل ہے۔ لگتا ہے کہ اس کے نام میں ایک ٹکے کی کمی رہ گئی ہے۔ جب سرکاری سرپرستی میں بھارتی میڈیا پر پاکستان کے وزیراعظم کے سر کی قیمت لگانے کی باتیں ہو رہی ہوں تو ہمیں بھی حق ہے کہ اصولی طور پر نریندر کے نام کی تصحیح کرکے اسے اب نریندر موذی کردیا جائے۔ کیسا حکمراں ہے کہ قدرت کی فراہم کی ہوئی سہولتوں اور قدرتوں پر اپنی دریائی گزرگاہوں پر نعوذ باللہ اپنی خدائی مسلط کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ بھول گیا کہ برہم پترا کا پانی کہاں سے آتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ دوسروں کے آب و دانہ پر ڈاکا ڈالنے کے چکر میں یہ اپنی پوری قوم کو گئو ماتا کے پوتر جل پر گزارا کرنے پر مجبور کر دے۔ بھارت کے ہوش مند لوگوں کو چاہیے کہ اپنے اس موذی کو لگام دیں اور اچھے ہمسایوں کی طرح پُرامن بقائے باہمی کے تحت اپنی زندگی گزارتے رہیں۔ اب چلتے ہیں اپنی محفل میں جہاں کھٹے میٹھے الفاظ کا ایک جلترنگ منتظر ہے۔

کراچی سے محمد اقبال لکھتے ہیں ”حسبِ معمول وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا اور جاسوسی کی آمد کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہونے میں نہیں آرہی تھیں اور طویل سے طویل تر ہوتی جارہی ہیں۔ دو دو اڑھائی بک اسٹال کے لگا چکے تھے اور ہر بار یہی جواب ملتا تھا کہ بس ایک گھنٹے بعد لے جائیے گا۔ الا خر تیسرے چکر میں امید بر آئی اور ہمارا پیارا جاسوسی ہمارے محفوظ ہاتھوں میں تھا جسے دیکھ کر ہماری ساری کوفت دور ہوگئی کیونکہ ٹائٹل پر عید مبارک دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ ٹائٹل حسینہ ڈاکٹر انکل کی جسارت کا منہ بولتا ثبوت تھی، چھوٹی پیشانی، چھوٹی آنکھیں چشمے کے نیچے اور چشمے کی کیا بات ہے، ستواں ناک کے نیچے خوب صورت ہونٹ شاید حیرت سے کھلے ہوئے تھے کیونکہ دو باڈی گارڈ اپنے ایک ان کی ٹھوڑی کے نیچے نجانے کسے پکار رہا تھا، اور دوسرا شاید اس حسینہ کے حسن کی تاب نہ لاتے ہوئے آنکھیں بند کرکے چیخ رہا تھا یا ہنس رہا تھا سمجھ نہیں آیا۔ اس کے بعد فہرست پر نظر ڈالی جہاں بارہ کہانیوں کے ناموں کو سادگی سے ڈبوں میں ڈال کر فہرست ترتیب دی گئی تھی۔ دیگر قلم کاروں کے ناموں کے ساتھ کاشف زبیر مختار آزاد کے نام دیکھ کر دل اداس ہوگیا۔ دوستوں سے ایک بات شیئر کرتا چلوں کہ مختار آزاد (مرحوم) کے ساتھ میں نے کچھ عرصہ ایک اخبار میں کام کیا، اور میں انہیں ذاتی طور پر جانتا تھا، وہ بہت نفیس انسان، دلکش شخصیت اور انتہائی حساس دل کے مالک تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور لواحقین کو صبرِ جمیل عطا کرے، آمین۔ فہرست سے نکل کر اداریہ پڑھا جہاں انہوں نے خوب صورت الفاظ میں دنیا کی تلخ حقیقت بیان کی جس سے اتفاق کرتے ہوئے دوستوں کی محفل میں پہنچے، ناظم آباد کراچی سے رانا بشیر احمد ایاز براجمان تھے اور اپنی غیر حاضری پر یاد نہ کرنے پر شکوہ کررہے تھے۔ امید ہے اب بہت خوش ہوں گے، بہت مبارک باد۔ فیصل آباد سے شعیب الرؤف اور سیف الرؤف کی جلے بازی ذرا ہلکی تھی۔ سید شکیل حسین کاظمی کی غیر حاضری کے بعد آمد اچھی لگی، ہلکی پھلکی نوک جھوک کے ساتھ مناسب تبصرہ تھا۔ راجن پور سے ماہتاب گل راٹھ کی طویل عرصے بعد حاضری بھی اچھی لگی۔ واہ کینٹ سے بلقیس خان، لاہور سے عبدالجبار رومی انصاری، گوجر خان سے عرفان راجہ، اٹک جیل سے اسرار ساقی نے ہمیں سراہا جس کے لیے دل سے شکر گزار ہیں۔ دیگر ساتھیوں کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ کاشف زبیر کی فتنہ میں فتنہ سازی پڑھ کر ان کی یاد میں آنکھیں نمناک ہوگئیں، اچھی تحریر تھی۔ اس کے بعد مختار آزاد کی خونی ناتک سے نبرد آزما ہوئے، مناسب کہانی تھی۔ اس کے بعد طاہر جاوید مغل کی انگارے ایک ہی نشست میں پڑھی، شاہ زیب اور آقا جان جلد ہی آمنے سامنے نظر آئیں گے۔ شاہ زیب ذہنی طور پر اس سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار نظر آتا ہے۔ انیق کا کردار بھی مزہ دیتا ہے، خاص کر ڈاکو سجاول سے اس کی نوک جھوک مزہ دیتی ہے۔ آگے دیکھتے ہیں مغل صاحب کیا گل کھلاتے ہیں، انتظار رہے گا۔ آوارہ گردی میں ڈاکٹر صاحب شہزی کو پرانی مصیبتوں سے نکال کر نئی مصیبتوں میں پھنسا دیتے ہیں۔ شہزی نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا ہے۔ دشمن کے گھر میں ناکوں چنے چبوا رہا ہے، زبردست بھٹی صاحب۔ باقی کہانیوں میں بڑا آدمی منظر امام، دو خواب سرور اکرام کی پڑھی ہیں، مناسب تھیں۔ باقی زیرِ مطالعہ ہیں۔ وقت ملنے پر پڑھوں گا، اس لیے تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں۔“

احسان پور، رحیم یار خان سے رانا بشیر احمد ایاز کی فرمائش ”ستمبر کا شمارہ اپنی تمام تر جسرسامانیوں اور دلفریبیوں کے ساتھ 3 تاریخ کو جلوہ گر

ہوا۔ سرورق پر حسینہ جاسوسی چہرے پر سن گلاسز لگائے بے نیازی کا مظاہرہ کررہی تھی۔ ساتھ میں جڑواں چہرے والا قوی ہیکل لگتا ہوا عجیب وضع آدمی اور دائیں طرف والا آدمی شاید پیٹ کے درد کی وجہ سے چلاتے ہوئے آدمی آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ارے واہ جی واہ اس دفعہ تو ادارے نے عید مبارک بھی دے ہی دی۔ اس بار ڈاکٹر انکل نے ٹائٹل کے حوالے سے ہماری شکایات کا ازالہ کر دیا۔ فہرست پر نظر دوڑا کر اپنی محفل کو رونق بخشی جہاں پر آغاز میں ہم ہی چار چاند لگا رہے تھے۔ خود کو مبارک باد دے کر نئے تبصرہ نگار کا تبصرہ دیکھا۔ اے زیڈ وصلی اچھا لکھا آپ نے۔ شعیب الرؤف، سید شکیل کاظمی اور ماہ تاب گل رانا کافی طویل غیر حاضری کے بعد جلوہ افروز ہوئیں۔ خوش آمدید۔ اب غیر حاضری نہیں چلے گی جی۔ ورنہ وارنٹ جاری کر دیے جائیں گے۔ باقی بلقیس خان اور محمد صفدر معاویہ بہترین تبصرے کے ساتھ چمک رہے تھے۔ باجی طاہرہ گلزار کی اس دفعہ پھر غیر حاضری۔ جلدی حاضر ہوں جی، آپ کی کمی محسوس ہو رہی ہے محفل میں۔ کہانیوں میں آغاز اس دفعہ مغل اعظم صاحب کے انگاروں کو ہوا دے کر کیا۔ انیق اور شاہ زیب آخر کار سبزی پلاؤ کا سیمپل حاصل کر کے اور اس کے زہریلا ہونے کا ثبوت لینے میں کامیاب رہے۔ سجاول کی تیز نگاہوں نے انیق کا سرسری سا اشارہ بھی بھانپ لیا۔ شاہ زیب، ابراہیم کو سمجھانے میں تھوڑا بہت کامیاب رہا۔ ڈاکٹر ارم آندھی کی طرح آئی اور طوفان کی طرح چلی گئی۔ منظر امام اس دفعہ بڑا آدمی لے کر آئے۔ اچھی کہانی تھی لیکن یہ کہانی پہلے بھی شائع ہو چکی ہے۔ لگتا ہے منظر امام صاحب کے پاس اب کوئی ٹاپک نہیں رہا۔ مہربانی کر کے استاد زائے عالم کو واپس لائیں۔ وہ خواب، سرور اکرام کی اچھی کاوش رہی لیکن اینڈ الجھا گیا کہ آخر عدیل کی موت کیسے ہو گئی اور وہ بھی اچانک؟ سرور اکرام، منظر امام کو کاپی کرتے ہیں۔ (جی ہاں ہم بھی یہی کہتے ہیں آن سے) آوارہ گرد میں حسب معمول شہزی کی تگ و دو جاری ہے۔ شہزی نے اپنی طویل جذباتی تقریر سے رینا اور سوشیلا کو قائل کر ہی لیا۔ رینا کے ساتھ محفوظ ٹھکانے پر پہنچ کر بالآخر شہزی سی جی بھوانی پر قابو پانے میں کامیاب ہو ہی گیا مگر آخر میں بلراج سنگھ کی انٹری نے معاملہ آگے تک ٹال دیا ہے۔ سرورق کہانیوں میں ڈاکٹر آزاد پہلے نمبر پر موجود تھے اپنے خونی جال کے ساتھ، مگر کہانی کا پلاٹ بے جان تھا۔ نئی قلم کار شبنم شفیق دوسرے سرورق رنگ کے ساتھ تشریف لائیں مگر ابھی ان کے قلم میں وہ جادو نہیں ہے جو پڑھنے والے کو اپنے سحر میں جکڑ سکے۔ کردار میں کوئی خاص اٹھان نہیں تھی اور نہ ہی جاسوسی کے معیار کے مطابق انداز تحریر تھا۔ چلو خیر کوئی بات نہیں۔ کوشش کرنے سے نکھار آجائے گا۔ سب سے پہلے کہانی فتنہ بہت خوب اور بہترین رہی۔ کاشف زبیر صاحب کا انداز تحریر اور ان کا دل کش انداز بے اختیار آنکھیں نم کر گیا۔ اتنی شاندار کہانی پر تبصرہ کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ ہی نہیں۔ باقی چھوٹی کہانیوں میں جال مرگ، آخری لمحہ، مداری، نامعلوم محرک اچھی رہیں۔ اس دفعہ کتر نیں کم رہیں۔ ایک فرمائش ہے ادارے سے کہ جس طرح کاشف زبیر کی کہانی شامل کی ہے اسی طرح محی الدین نواب کی بھی کوئی تحریر شامل کر کے شکریہ کا موقع دیں، باقی اس دفعہ رسالہ کافی دلکش رہا۔"

دراہن کلاں سے مرجان گل کی داستان امیر حمزہ "جس طرح خوش قسمتی در پر دستک دیتی ہے اسی طرح جاسوسی ڈائجسٹ کی کال بیل ہم بجاتے رہتے ہیں۔ کیونکہ سائنسی دور ہے اور وہ وقت گیا جب دروازے پر دستک دی جاتی تھی۔ جاسوسی ڈائجسٹ نے جب ہماری ہتھیلیوں کے دن دے پر لینڈ کیا تو سرورق بہت زیادہ پسند آیا۔ جاسوسی ڈائجسٹ میں جو چیز ہمیں سب سے زیادہ پسند ہے، وہ ہے اس کا ٹائٹل۔ ارے بھی ناراض نہ ہوں باقی سب بھی دل و جان ہیں۔ پاکستان میں بلاشبہ سیکڑوں ڈائجسٹ نکلتے ہیں۔ جن میں کم و بیش سب کے ایک طرح کے سرورق ہوتے ہیں۔ لیکن جاسوسی اپنی ایک الگ انفرادیت رکھتا ہے۔ جاسوسی کے ٹائٹل پر نگاہ پڑتے ہی بندے کو سب سے پہلے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ کسی کہانی یا ناول کی کوئی خاص سچویشن ہے جو کہ ٹائٹل پر خاص اور خوب صورت انداز میں اجاگر کی گئی ہے اور یہی چیز سسپنس میں مبتلا کر دیتی ہے۔ پھر کہانیوں کی ترتیب کا صفحہ ہر مرتبہ انفرادیت کا حامل ہوتا ہے۔ یوں لگتا جیسے ہر کہانی کی آنکھ لگی ہو اور یہ آنکھیں مل کر دعوت دے رہی ہوں کہ آؤ دیکھو، پڑھو اور کھو جاؤ۔ چٹکی میری کمزوری ہے بشرطیکہ ساتھ نمکین نہ لگا ہو لیکن ...... چٹکی کی نکتہ چینی میں نوک جھونک پڑھ کر جو لطف آتا ہے اس کا کوئی بدل نہیں ...... باقی ڈائجسٹوں کے برعکس ہماری محفل کی سب سے زبردست بات یہ ہے کہ دوستوں کے لیٹرز پر بھی سب تبصرہ کرتے ہیں اور گپ شپ بھی چلتی رہتی ہے۔ لطیف سے طنز کرتے ہیں ایک دوسرے پر اور کہانیوں پر تو لازمی تبصرہ ہوتا ہے۔ خوب صورت انداز میں۔ حالانکہ باقی رسالوں میں صرف سرد و سپاٹ انداز میں کہانیوں پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔ اشتہاروں کو روکرتے ہوئے اپنی محفل میں پہنچے تو اپنا لیٹر نہ دیکھ کر اتنا غصہ آیا جتنا کہ بش کو اسامہ کو سامنے دیکھنے پر آتا ہوگا۔ اس مرتبہ پائے دان پر رانا بشیر احمد تھے۔ احمد صاحب نے جاسوسی پر آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی ڈالی۔ بلقیس خان کا تبصرہ ہوا کی طرح لگا۔ ٹھنڈی میٹھی... یاد آوری کا شکریہ کیا کریں اب ادارے والے ہی ہم کو جگہ نہیں دے رہے ورنہ ہم ہر ماہ لکھتے ہیں۔ اسرار ساقی تھینکس آپ کا تبصرہ بھی بہت تھا خوشبو لگا کے۔ کاشف عزیز واقعی ہم سے ہی کائنات میں اور محفل میں رنگ ہیں خوشبو لگا کے۔ باقی شکیل کاظمی آپ ذرا ہاتھ پاؤں سنبھال کر لکھا کریں۔ پیاری طاہرہ آنٹی کے بارے میں تڑکے لگا کے۔ باقی سب صنف وجاہت کے تبصرے خوب تڑکے لگا رہے تھے، تڑکے اچھے بھی تھے۔ کاشف زبیر صاحب کا نام خوشی کا باعث بنا اس لیے کاشف زبیر صاحب کو پا کر فوراً سے پیشتر پہلے صفحات کی طرف دوڑ لگائی۔ چھکا لگا کے۔ اور یہ دوڑ بے مقصد نہیں لگائی وہاں سے خوب سیر ہو کر نکلے تو کھو گئے۔ انہوں نے مناسب اور موزوں الفاظ کے انتخاب سے ایسا سماں باندھا کہ قاری کے اعصاب ہر لمحے تنے ...... اور ڈھیلے پڑتے رہے، قاری خود قدم قدم پر سسپنس کی وادی میں گھومتا محسوس کرتا ہے۔ اس کے بعد آگ اگلتے انگاروں میں کود پڑے۔ مغل انکل کے قلم کا سحر انگارے میں اپنے پورے جوبن پر ہے۔ ان کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ ایک ایسا طلسم خانہ قائم کر دیتے ہیں جس کی بھول بھلیوں میں پڑنے والا اس شدت سے گم ہو جاتا ہے کہ وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوتا اور اس وقت بندہ چونکتا ہے جب باقی آئندہ کا بورڈ اس کا منہ چڑا رہا ہوتا ہے۔ ادھر سے فارغ ہوئے تو آوارہ گرد نے اپنی طرف کھینچ لیا جہاں قدم قدم پر موت کی وادی تھی جہاں سے شہزی نکلتا اور پھنستا رہتا ہے۔ اب اگلی گولی پر اس کی موت تھی یا زندگی، یہ تو اگلے ماہ پتا چلے گا چھکا لگا کے۔ اس کے بعد منظر امام کے آنگن میں اترے جہاں امام صاحب نے واقعی جادو سا کر دیا تھا۔ ان کے بعد سب سے پہلے مرحوم ڈاکٹر آزاد کے رنگ خونی ناٹک کو شکار کیا۔ ابھی اس شکار

سے فارغ ہوئے تھے کہ دوسرے بڑے شکاری نے اپنی طرف متوجہ کرلیا لہٰذا اسے شکار کرنے چل پڑے۔ یوں دل نے بے اختیار داد دی۔ پڑھنے والا ان کے ساتھ ساتھ خود بھی ان مناظر میں کھو جاتا ہے، اس قدر جاندار رنگ تھا۔ شبنم شفیق نے کہانی کے موضوع کو کافی مضبوطی سے اپنی گرفت میں رکھا اور کامیاب رہیں چھکا لگا کے۔ وہ خواب، سرورِ اکرام کی ایک خوب صورت وزبردست تحریر تھی، ناقابلِ یقین زبردست۔ آخری لمحہ، آئیوان بے چارہ کافی بدقسمت تھا اور دنیا سے لوگ خالی ہاتھ ہی جاتے ہیں۔ چال مرگ، بیسر بنارامش نے وہ لطف اور سنسنی برقرار رکھی کہ جو اکثر ترجمے کے دوران کھو جاتی ہے۔ نامعلوم محرک پڑھ کر ہم بھی متحرک ہوگئے، واقعی سپرہٹ تحریر تھی۔ اس بار جاسوسی کے پروانوں میں ایک اور پروانے کا اضافہ ہوگیا ہے یعنی ہماری دوست جو انگارے پڑھنے کے بعد بہت معصومیت سے پوچھنے لگیں کہ اگلی قسط کیا آخری ہوگی۔ بے چاری کو ہم نے بھی کس انتظارِ شوق میں ڈال دیا ہے۔ اس مرتبہ کارٹون جاسوسی کی وادی سے غائب تھے۔ امید ہے کہ آئندہ کارٹون کی وافر مقدار دستیاب ہوگی۔ طاہرہ گلزار صاحبہ آپ تھوڑی سی خوشبو ان حضرات کے پاس بھیج دیں تاکہ وہ تبصرہ کرنے پہنچ جائیں چھکا لگا کے اور خود بھی تڑکے لگا کے آجائیں۔ چوہدری سرفراز، معراج محبوب عباسی، عبادت کاظمی، فلک شیر، نادر سیال، انور یوسف، شیخ وقار، انجم، مشال اینڈ نوال، افتخار حسین، رمضان پاشا، محمد عمران جونانی صاحب اور خاص کر قدرت نیازی آپ سب کدھر گم ہیں جلدی آئیں اور محفل کی رونق بڑھائیں چھکا لگا کے۔ اور آخر میں سید شکیل کاظمی، طاہرہ آنٹی سے پیغام لیں نسوار لگا کے۔ جی بالکل بہت محبت ہے ، کے بھلے کی سمجھ آپ کو آج کل کہاں آئے گی۔ آپ کی سمجھ تو شگفتہ آنٹی لے اڑیں۔ اس مرتبہ سارا شمارہ ہی بیسٹ رہا۔"

لاہور سے عبدالجبار رومی انصاری کی تبصرہ نگاری "خوب صورت چشمہ نینوں پر سجائے، کہیں دور نظریں جمائے لڑکی، بلقیس خان کی طرح کافی ذہین لگ رہی تھی جو اپنے تبصرے میں کھٹے میٹھے برجستہ جملے بولنے میں جواب نہیں رکھتی، باقی ٹائٹل پُراسرار سا تھا۔ عبدالستار ایدھی کی خدمتِ خلق ان کا کام ان کا نام ہمیشہ ہمارے دلوں میں گونجتا رہے گا لیکن ان جیسی حکمتِ عملی، مثبت سوچ شاید ہی حکمرانوں کے پلّے پڑے۔ ہاں وہ بڑے بڑے رئیس غریب عوام کا لوٹا پیسا باہر کے ملکوں میں رکھنے والے تکلیف ہونے پر بھی باہر کو دوڑنے والے بھلا ایک غریب منش درویش صفت شخص عبدالستار ایدھی کی پیروی کہاں کریں گے جو غریب عوام کی ترقی چاہتے تھے اور پھلتا پھولتا پاکستان چاہتے تھے۔ رانا بشیر احمد ایاز کا تبصرہ خوب رہا، پر ٹائٹل کے حوالے سے اپنا انداز ایک ماہ پہلے بتا دیتے تو شاید انکل غور فرما لیتے، باقی ادارے کی پالیسی۔ اے رئیس وصلی، شعیب الرؤف اور سیف الرؤف آپ نے بجا فرمایا واقعی تبدیلی آگئی ہے دیکھو تو ماہتاب گل رانا نے بھی ساحر لدھیانوی کو گنگنانے کا نام اقبال ہی لیا ہے اور بلقیس خان اپنی میٹھی باتوں کے ساتھ بھرپور انداز سے جلوہ گر تھیں۔ بہت اچھا لگا اور شکیل حسین کاظمی ایک ماہ تبصرہ نہ لکھے تو واقعی فرق نہیں پڑتا پر کوئی غیر حاضری نوٹ کرے ایسا بھی کم ہی ہوتا ہے۔ (جی نہیں اس کے برعکس ہوتا ہے۔ ہر قاری، دوسرے قاری کی غیر حاضری کو ضرور محسوس کرتا ہے) محمد صفدر معاویہ، عرفان راجہ، اسرار ساقی، محمد اقبال اور کاشف عزیز کے تبصرے بہت پسند آئے۔ اس کے علاوہ روبینہ حنیف، عمران ملک، محمد افتخار، حماد انصار اور شاکر لطیف کا تعاون بھی ٹھیک رہا۔ آزمائے ہوئے کو پھر سے آزمانا حماقت ہے اور وہ بھی ایک عورت کو۔ فتنہ انگیز ایلزبتھ تو کمال کی شعبدہ باز تھی جس نے جیک کے ساتھ ساتھ سب کو چکرا کے رکھ دیا۔ آخر جیک کی محبت دیکھ کر اسی کے شانے سے آلگی۔ آخری لمحے کی گڑبڑ نے سب کچھ ختم کر دیا اور آئیوان خالی ہاتھ ہی اس دنیا سے چلا گیا۔ آقا جان کو زیر کرنا آسان تو نہیں پر اسے شاہ زیب کو زیر کرنا ہی پڑے گا کیونکہ پارا ہاؤس میں برائی کا محور وہی نظر آتا ہے، باقی ابراہیم کو کسی حد تک شاہ زیب نے مٹھی میں کر ہی لیا ہے بہت اچھی رہی انگارے۔ آوارہ گرد میں شہزی تو بھارت میں لڑائی بھڑائی میں معروف تھا ہی اب کمیل داور، شکیلہ اور اول خیر کو بچانے کی مہم بھی شروع ہوگئی ہے۔ ہر دفعہ کہانی میں کوئی نہ کوئی خونی موڑ وحشت کا سین بھر دیتا ہے جیسے اس دفعہ پاروتی پربت گرنے سے موت ہوئی۔ یہ ہلندا کون ہے؟ مقابلے میں شریک لڑکی، اور یہ کون؟ شوکا میزبان۔ یہ ڈیرک کون ہے؟ شوکا تیسرا جج، اور پھر ندراری نے کچھ بھیجوں کو بچانے کے لیے ان کی ڈوریاں ہلا دیں اور شکیل کے قتل میں رینڈی پکڑا گیا، واقعی گریسٹر کھلاڑی تھا یا سراغ رساں کہانی دلچسپ رہی۔ جنگل میں کنکر پھینکنے سے چھوٹے سے بڑے بڑے دائرے بنتے جاتے ہیں ایسے ہی شک کا دائرہ بڑھتا ہے۔ سرورق کی پہلی کہانی شک وشبہ کے زیرِ اثر رہی اور سونی سنگھ کو پکڑ لیا گیا۔ وہ بھی جولی اور راجندر پر حملے کے جرم میں، لیکن یادو لیے کے قاتل کا کچھ پتا نہیں شاید جو ثابت ہو سکے۔ وہ سچ چاہے جھوٹ ہی ہو مگر جو ثابت نہ ہو سکے وہ جھوٹ چاہے سچ ہی ہو بس خونی ناٹک پورا ہو گیا۔ مختار آزاد کی کہانی بہترین رہی۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ ایک دوسرے کے گرد جھوٹ اور سچ کا تانا بانا بنتے جال بنا دیا اور پھر جرم کے زیرِ اثر کمال۔ عفیفہ اور شجاع؟ اسی جال میں پھنس کر اپنے انجام سے دوچار ہوئے اور سچائی کے علمبردار حنا اور سالار اس مکافاتِ عمل سے محفوظ رہے۔ شبنم شفیق کا دوسرا سرورق زبردست رہا۔ انکل آپ نے تو تاش کی تاش ہی فٹ باندھی ہے اور پھر سب کو اپنی حرکتوں سے محظوظ کرنے والا بڑا آدمی مسٹر تو تیر پکڑا گیا جو وہ مجبور لوگوں کو ہزار چہرے کا روپ دے کر لوٹ لیا کرتا اور بیمار معصوم بچوں کو اسپتال جا کر الٹی پلٹی حرکتیں کر کے ان کے چہروں پر مسکراہٹ بکھیر دیتا ہے۔ بڑا آدمی بھی زبردست رہی۔"

کھاریاں سے بابر عباس+حسنین عباس+کمیل عباس کا مشترکہ اظہارِ خیال "ستمبر کا جاسوسی پوری آب وتاب اپنی بھرپور رعنائی کے ساتھ رنگوں کی برسات کرتا ہوا 5 ستمبر کو جلوہ افروز ہوا پھر اپنی جلوہ نمائی کرواتے ہوئے میرے بوڑھے اور لرزتے ہوئے ہاتھوں میں ایسے آیا جیسے سرفراز احمد کے ہاتھوں میں کپ۔ سرجی دو سال سے اپنے پیارے جاسوسی سے دور رہا دور رہنے کی کئی وجوہات تھیں جن میں ایک آنکھوں کی بینائی بھی تھی جس کے لیے مجھے دائیں آنکھ کا آپریشن کروانا پڑا اسی لیے مجھے اپنے پیارے جاسوسی سے دور رہنا پڑا۔ جاسوسی کا نیا شمارہ ہاتھ میں ہے میں بڑے غور سے جاسوسی کے سرورق کو دیکھ رہا ہوں کہ ذاکر صاحب نے اس دفعہ کیا بنایا ہے۔ سرورق کی حسینہ کسی بدصورت چڑیل سے کم نہ تھی جس نے عینک لگا کر خود کو خوب صورت بنایا ہے رہی سہی کسر لپ اسٹک نے پوری کردی اور آنکھوں میں جیسے موتیا اتر آیا ہے جبکہ حسینہ دل نواز کی بیک سائیڈ پر

خوبرو مرد شاید مسکرانے کی کوشش کر رہا ہے مگر اذیت کی وجہ سے نہ رو سکتا ہے اور نہ ہنس سکتا ہے جبکہ دوسرا شخص شاید کوئی جن ہے۔ وہی جن، جن کے ہونٹوں پہ ہنسی پاؤں میں چھالے ہوں گے۔ ذاکر صاحب کا سرورق دیکھنے والے پاگل ہوں گے۔ سرجی اشتہارات کو بالکل اسی طرح پار کیا جس طرح کوئی پاکستانی انڈین بارڈر پار کرتا ہے اور سیدھا پہنچا اپنی پیاری محفل چٹکی نکتہ چینی میں حالانکہ اس وقت میری تازہ ترین شوگر 286 ہے۔ (محترم کیا غضب کرتے ہیں فوراً کنٹرول کریں) اپنی پیاری سی محفل میں آپ ہم سب کو عید قرباں کی پیشگی مبارک باد دے رہے تھے۔ سر آپ کو بھی میری طرف سے بہت بہت عید مبارک قبول ہو۔ سرجی ایک بات ہے جاسوسی کا طرۂ امتیاز رہا ہے کہ اس کے تبصرے جاندار اور شاندار ہوا کرتے تھے۔ (مگر اب ایسا کچھ نہیں) سرجی افسوس صد افسوس پہلے عبدالقیوم شاہ صاحب، علیم الحق حقی، ابوضیاء اقبال، اقبال کاظمی، محی الدین نواب صاحب، کاشف زبیر اور بہت سوں کے ساتھ اب اپنے مختار آزاد صاحب! آہ مختار آزاد کو جتنا بھی پڑھا، خوب پڑھا، کیا زبردست لکھا کرتے تھے میں آزاد صاحب کے اہلِ خانہ کے غم میں برابر کا شریک ہوں، خدا مختار آزاد صاحب کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور اہلِ خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔ فیصل آباد سے شعیب الرؤف اور سیف الرؤف کی بلے بازی زیادہ اچھی نہ تھی۔ دونوں بھائی ون ڈاؤن پر آئے تھے مگر زیادہ ترنیچ ہونے سے بچتے رہے ان دونوں کی بلے بازی کوئی خاص نہ تھی، بیٹنگ پر توجہ دیں۔ سید شکیل حسین کاظمی صاحب اپنی آنکھوں کا علاج کروائیں شاید کچھ افاقہ ہو، باقی ہومیو پیتھک کا علاج کروانے سے انسان...... پھر آپ عقل مند ہیں اور عقل مند کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ ماہتاب گل رانا آپ شاید کسی غلط فہمی کا شکار ہیں آپ محفل کا چاند نہیں اور نہ ہی چاندنی ہیں ذرا آئینہ تو دیکھیں بعد میں آپ بھی کہیں گی آئینے کے سو ٹکڑے کر کے ہم نے دیکھے ہیں ایک میں بھی تنہا تھے سو میں بھی اکیلے ہیں۔ (دو سال بعد حاضر خدمت ہیں اور نازک دلوں کو تار تار کر رہے ہیں) بلقیس خان جی خواب ہر کوئی دیکھتا ہے بے روزگاری ایک ایسا عفریت ہے جو ہر کسی کو کھا رہا ہے اگر اس بے روزگار نوجوان نے اچھے دنوں کی تلاش میں ایرانی بارڈر پار کرنے کی کوشش کی تھی تو اس میں اچھے دنوں کی کچھ یادیں بھی ہوں کچھ خوب صورت سپنے بھی ہوں گے۔ سسرالی شہر لاہور سے عبدالجبار رومی انصاری، محفل میں شریک ہوئے جن کا نام لیتے لیتے بندہ لاہور پہنچ جاتا ہے رومی صاحب نام کچھ چھوٹا کریں صحت کے لیے یہی مفید ہے۔ عرفان راجہ صاحب، صرف آپ ہی عقل مند نہیں ہیں اور بھی عقل مند دنیا میں موجود ہیں سوچا کریں یار۔ اسرار ساقی صاحب آپ بھلا کس جرم میں جیل گئے تھے۔ بیاجی جیل کوئی اچھی چیز نہیں شاید میں غلط کہہ گیا جیل کوئی اچھی جگہ نہیں بہرکیف خدا آپ کو جلد از جلد اس جگہ سے رہائی دلائے، آمین۔ محمد اقبال صاحب زیادہ خوشی کا اظہار بھی مت کریں خوشی میں بندہ پاگل بھی ہو جاتا ہے اور یقیناً آپ پاگل نہیں ہونا چاہیں گے پھر لوگ کہیں گے کہ پاگل ای او ئے۔ سرجی یہ تو تھا حسبِ معمول محفل میں موجود ساتھیوں کے خطوط پر کچھ تحریفانہ سا تبصرہ۔ (تحریفانہ نہیں ہمیں تو قیامانہ لگا)۔ اب کچھ شریفانہ سا تبصرہ کہانیوں پر۔ حسبِ معمول اور حسبِ حال اور حسبِ ضرورت سب سے پہلے جو کہانی پڑھی اپنے آل ٹائم گریٹ رائٹر جناب طاہر جاوید مغل صاحب کی زبردست تحریر اور دلوں کو گرماتی ہوئی انگارے پڑھی۔ سرجی اس میں کوئی شک نہیں کہ طاہر صاحب ایک زبردست رائٹر ہیں جو لفظوں سے کھیلنا جانتے ہیں۔ دوسرے نمبر پر جناب عزت مآب ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی خوب صورت تخلیق آوارہ گرد پڑھی۔ وہ ڈاکٹر صاحب، اس میں کوئی شک نہیں آپ اپنے خوب صورت انداز میں آوارہ گرد کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ ایک گزارش تھی اپنے مریضوں پر بھی توجہ دیں۔ پہلا رنگ مختار آزاد مرحوم کا خونی ناٹک کوئی خاص تاثر نہ چھوڑ سکی۔ بہرکیف پسند اپنی اپنی شاید یار دوست میری رائے سے اتفاق نہ کریں۔ دوسرا رنگ شبنم شفیق کا جال تحریر سے بہتر تھا اس کے لیے شبنم شفیق صاحب مبارک باد کی مستحق ہیں۔ ایک وہ بھی ٹائم تھا سرورق کے تین رنگ ہوا کرتے تھے اور رنگوں کے لیے محی الدین نواب، عبدالقیوم شاہ، کاشف زبیر، پروین زبیر، ابوضیا اقبال، سرور اکرام، غلام قادر، محمود احمد مودی، نجمہ مودی صاحبہ زبردست کہانیاں لکھا کرتے تھے مگر افسوس ان میں کچھ مرحوم ہو چکے ہیں خدا ان مرحومین کو اپنی جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔ جاسوسی کے شروع کے صفحات پر ہمیشہ زبردست کہانی دی جاتی ہے۔ اس بار بھی کاشف سبا کی قسمت نے اس روایت کو قائم رکھا۔ قسمت دل سے پسند آئی۔ عکس فاطمہ کی آخری لمحہ، میر بنارس کی چال مرگ، منظر امام کی بڑا آدمی، سرور اکرام کی دو خواب، جمال دستی کی مداری بھی اچھی اور معیاری تحریریں تھیں۔ آخر میں اپنے پرانے ساتھیوں تقسیر عباس بابر، طاہرہ گلزار، اعجاز احمد راحیل، قیصر اقبال گجر، سدرہ بخاری اور دوسروں کو بہت بہت سلام کہتا ہوں۔"

کمالیہ سے شفقت محمود کا تبصرہ "اس دفعہ جاسوسی کا دیدار 3 تاریخ کو ہوا۔ عید سے پہلے جاسوسی کا ملنا عید سے کم نہیں تھا۔ ٹائٹل اس دفعہ کچھ عمدہ قسم کا تھا لیکن ہم یہ نہیں سمجھ سکے۔ سرورق پہ بنے بھائی صاحب چلا رہے ہیں یا ہنس رہے ہیں۔ لیکن ہم بھی بات کی تہ تک آخر پہنچ ہی گئے۔ چیخی نکتہ چینی میں اس دفعہ کافی دھماکو قسم کے خط شامل تھے لیکن مصروفیت کی وجہ سے چند ایک ہی پڑھے گئے جن میں زیڈ اے وصلی کا پہلا شاندار خط بہت اعلیٰ تھا۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ بھائی صاحب کا پہلا نامہ ہے خوش آمدید وصلی صاحب۔ فیصل آباد سے الرؤف برادران بھی حاضر تھے کافی جاندار اننگ کھیل کر گئے ہیں۔ شعیب الرؤف کا ڈیبیو کافی جاندار تھا۔ شکیل کاظمی صاحب بھی خصوصی مبارک باد کے ساتھ حاضر تھے۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس دفعہ ڈاکٹر لگ رہے تھے۔ ماہتاب گل رانا کی حاضری طویل عرصے کے بعد ہوئی جس کا کریڈٹ زویا اعجاز کو جاتا ہے جن کی لاجواب تحریر سے پرانے تبصرہ نگار اپنے مسکن چھوڑ کر بھاگے بھاگے آئے۔ مختار آزاد صاحب کی وفات کا پڑھ کر دکھ ہو رہا ہے۔ اللہ ان کے درجات بلند کرے، آمین۔ کہانیوں میں ہمارے دلوں میں ہمیشہ بسنے والے کاشف زبیر صاحب کی قسمت بہت زبردست کہانی تھی۔ ایلزبتھ واقعی ایک بہت بڑا فتنہ تھی اس نے تو آخری وقت میں بے چارے پادری کو بھی نہیں چھوڑا آخر تک غیر متوقع انجام کی کہانی محترم کاشف زبیر کی کہانی ہمارے لیے یادگار تحفہ ہے۔ انگارے مغل صاحب کی لاجواب تحریر ہے اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑ چکی ہے رضوان تی کا کردار ایک بار پھر زندہ ہو گیا ہے شاہ زیب اب کامیابی کے قریب پہنچ چکا ہے۔ جاوید دونوں بھائیوں کو زہر کیوں دیا جا رہا ہے اس راز کے فاش ہونے کے لیے شدت سے انتظار کر رہے

ہیں۔ عبدالرب بھٹی صاحب کی آوارہ گرد اس دفعہ بہت دھواں دھار رہی۔ بلیو تلسی کو اس دفعہ شہزی نے خاک میں ملا کر رکھ دیا ہے لیکن کہانی کا اختتام بہت غیر متوقع تھا۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔''

کراچی سے سجاد احمد ساحر کی سحر انگیزی ''میں گزشتہ 17 سال سے جاسوسی کا خاموش قاری ہوں۔ پہلی بار جسارت کر رہا ہوں آپ محفل میں جگہ دیں گے۔ جاسوسی اس بار 3 ستمبر کو ملا اور یہ دیکھ کر حیرت و خوشی کا احساس ہوا کہ ہمارے نالائق شاگرد اور چھوٹے بھائی رانا جنید احمد ایاز کو محفل کی زینت بننے کا موقع ملا...... سرورق پر نظر دوڑائی تو پتا چلا کہ حسینہ انکل اور زخمی بندے کی قربانی کے جانور کے پیسے لے کر فرار ہو گئی ہے۔ مختار آزاد صاحب کو اللہ پاک غریقِ رحمت کرے۔ کاشف زبیر مرحوم کی فتنہ پڑھی، لاجواب کہانی تھی۔ الزبتھ تو پادری کو بھی چونا لگا گئی۔ تنویر ریاض کی نامعلوم محرک نے مغرب کی بے راہ روی کو ظاہر کیا۔ پیٹر نے لارا کو چھوڑ کر اس کی ماں پر ڈورے ڈالنا شروع کر دیے۔ عکس فاطمہ کی تحریر آخری لمحہ نے چونکا دیا۔ آئیوان کامیاب تو ہو گیا لیکن موت سے نہ بچ سکا۔ سیریتا راض کی چال مرگ اچھی رہی۔ مارٹن منرو کی چالاکی نے مارٹن کرسٹائز کو دشمنوں کے ہاتھوں مروا دیا۔ طاہر جاوید مغل انکل تو ہمیشہ کی طرح چھائے رہے۔ انکل کا تو میں دس سال کی عمر سے فین ہوں جب 5th کا اسٹوڈنٹ تھا اور سرگزشت 1993ء میں تاوان پڑھنی شروع کی۔ منظر امام صاحب کی تعریف تو سورج کو سویائل کی تاریخ دکھانے والی بات ہو گی۔ بڑا آدمی میں تو قیر واقعی بہت بڑا آدمی نکلا۔ سرور اکرام کے دو خواب نے کچھ ڈرا دیا کہ آخر میں اس کی گردن ہی اڑا دی گئی خواب نہ دیکھنے کے جرم میں۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب نے دل خوش کر دیا۔ یوم دفاع کے موقع پر شہزی نے اکیلے ہی بلیو تلسی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور سی جی بھوانی کو اغوا کر کے لے آیا۔ ویل ڈن شہزی۔ حال دل کی مداری متاثر نہ کر سکی۔ خونی ناتک میں مختار آزاد صاحب نے اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ قاتل کا تو اندازہ تھا کہ کرشن ہی ہوگا۔ ساجد بے چارہ مفت میں رگڑا گیا۔ شیام کے ہاتھ سے اہم کردار بھی نکل گیا۔ شبنم شفیق کی چال بس گزارے لائق تھی۔ جن کو باپ کے ساتھ دولت بھی ملی اور شرمندگی بھی جو باپ کے کالے دھندے کی وجہ سے تھی۔ اپنی محفل چٹپٹی کے تمام دوستوں کے تبصرے اچھے تھے۔ محمد صفدر معاویہ، بلقیس خان، اے زیڈ وصلی، عبدالجبار رومی، ماہتاب گل رانا کے تبصرے بہت زیادہ اچھے رہے۔''

وزیر آباد سے محمد احسن زمان کی دعائے ورخواست ''ستمبر کا شمارہ اس بار 4 تاریخ کو ہی رونق افروز ہو گیا۔ جلدی جلدی گھر کے ایک کونے میں لے کر بیٹھا ہی تھا کہ جائزہ لے سکوں لیکن خاتون خانہ کی آواز آئی کہ آپ تو رسالے میں غرق ہو جائیں گے۔ بازار سے سودا سلف کون لائے گا۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق رسالہ تکیے کے نیچے رکھا اور انتظار کیا کہ اس کی باری شام کو آئی۔ سرورق پر موجود حسینہ دھوپ کا چشمہ لگائے نہ جانے کیا گھور رہی تھی کہ پیچھے موجود شخص ہنس رہا تھا۔ شاید وقت سے پہلے عید کی مبارک پر۔ پیچھے بالوں والا شخص غالباً شیطان کے بہروپ کو دیکھ کر ہنس رہا ہوگا۔ سرورق مجموعی طور پر ٹھیک ہی تھا گو کہ جاسوسی کے معیار کا نہیں تھا۔ چٹپٹی محفل کی طرف نظر کرتے ہوئے گزر رہا تھا کہ مختار آزاد صاحب کی رحلت کا دکھ ہوا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ ان کے بعد نظر پڑی بلقیس خان کے خط کے آخری حصے پر۔ کسی سیاسی کارکن کی طرح خوب دل جلی ہوئی باتیں تھیں۔ محترمہ آپ کا فرمان درست کہ ہمارے ہاں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ دنیا میں کہیں بھی نہیں ہو رہا۔ لیکن کاش آپ دوربین اٹھا کر دیکھتیں پاکستان کے مقابلے میں کشمیر، شام، افغانستان اور فلسطین کے حالات ہم سے بہتر ہیں کیا؟ دوسرا اس ساری صورت حال کا ذمے دار کون ہے؟ ''ہم عوام'' اس کی زندہ مثال ترکی کا ناکام فوجی انقلاب ہے۔ عوام باہر نکلی تو فوج کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اگر یہی صورت حال ہمارے ہاں ہو جاتی تو کیا ہوتا سب کو معلوم ہے اگر غلط کہا تو صحیح فرما دیجیے۔ کاشف زبیر صاحب کی الزبتھ واقعی فتنہ ثابت ہوئی۔ اس کی فتنہ انگیزی پچاس سے زائد صفحات پر پھیلی ہوئی تھی۔ لمحہ بہ لمحہ بدلتی صورت حال نے مجھے جیسے جکڑ لیا تھا۔ ہر موڑ پر لگا کہ الزبتھ اب گئی کہ تب گئی لیکن وہ قسمت کی دھنی نکلی۔ گلبرٹ تو چالو اس سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ پادری بے چارہ مفت میں مارا گیا اور آخر میں الزبتھ اپنی فتنہ انگیزیوں سمیت جب دوبارہ جیک کو ملی تو میں حیرت کے سمندر میں ڈوب گیا کہ جیک تو زہر خورانی کا شکار ہو گیا تھا۔ آغاز کی طرح انجام بھی فتنہ انگیز تھا۔ نامعلوم محرک تنویر ریاض کی کاوش تھی مجھے تو کچھ خاص سمجھ نہیں آئی۔ اس میں میری سمجھ دانی کا قصور ہو سکتا ہے۔ جاسوسی میں... ایسی الجھی ہوئی کہانی نہیں چھپ سکتی۔ عکس فاطمہ آخری لمحہ لے کر آئی تھیں۔ میرا دل کہانی کے ساتھ ساتھ دھک دھک کر رہا تھا کہ آئیوان کی قسمت کا وہ کون سا لمحہ ہوگا کہ جب قسمت اسے دھوکا دے گی اور دولت کہاں گئی..... آخری لمحے میں قسمت گڑبڑا گئی اور آئیوان بے چارہ۔ چال مرگ سیریتا راض کی کاوش تھی۔ آغاز کچھ ایسا تھا کہ میں سمجھا کہ مارٹن حالات سے دلبرداشتہ ہو کر خودکشی کا سوچے گا اور وہی چال مرگ بن جائے گی لیکن یہاں تو سارا کھیل ہی الٹ رہا۔ مارٹن کے خواب ایسے چکنا چور ہو جائیں گے کہ انہیں حقیقت نے بغیر ہی ختم کر دیا گیا۔ بے چارہ مارٹن۔ انگارے میں وہی مار دھاڑ، دھکم پیل، اغوا، پٹاخ اور آخر میں تجسس بھرا انتظار۔ کم و بیش چالیس صفحات پر مشتمل انگارے کا لمحہ بہ لمحہ بدلتا ہوا رنگ ہمیں اپنے رنگ میں رنگتا ہوا اپنی منزلیں طے کر رہا ہے اور ہم سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح، اس کے دھارے میں بہہ رہے ہیں۔ چاولوں کے نمونے آزمانے کے لیے قدرت نے کیا شاندار انتظام کیا۔ ابراہیم کی شادی کا اونٹ اب کس کروٹ بیٹھتا ہے، اس کے لیے اگلے ماہ کے شمارے کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ ڈاکٹر ارم ملک ڈیرے کے بعد یہاں ملے گی میرے سان و گمان میں نہ تھا اور اس کے معشوق نامراد رضوان کا تو بالکل بھی نہیں کہ وہ بھی فروکش ہوگا۔ لیکن ہونی ہو کر رہتی ہے اور ڈاکٹر ارم اپنے کالے کرتوتوں سمیت اپنے انجام کو پہنچی اور رضوان، چراغ تلے اندھیرے کے مصداق یا یوں کہہ لیں جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے والی مثال بنا ہوا ہے اور آخر میں آغا جان سے ملنے لگ گیا جس کے بارے میں شاہ زیب کا دل گواہی دے رہا ہے کہ اس بندے کو زیر کرنا آسان نہ ہوگا۔ چلو اب باری آ گئی بڑا آدمی کی جسے منظر امام نے لکھا تھا اور واقعی بڑا آدمی ہی ثابت ہوا یہ توقیر۔ ویسے توقیر

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L.5/78 تحصیل وضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

نے دونوں طرف سے خوب گھمایا۔ جو کر بھی کھلا راز بنا رہا اور رہزار چہرہ تو ویسے ہی پوشیدہ تھا۔ بے حد متاثر ہوا۔ سر درا کرام وہ خواب جیسی ہوتی کہانی لے کر آئے تھے۔ آوارہ گرد میں ریتا اور سوشیلا نے آغاز تو دھما کا خیز کیا لیکن شہزی کی جذباتی تقریر نے عورت ذات کا دل موم کر دیا اور پھر ریتا کے توسط سے دشمن ملک میں پناہ کا ملنا بھی غنیمت سے کم نہ تھا۔ شہزی کی کرنل بھوانی کی کچھار میں گھس کر مار دھاڑ نے تو مجھے سلطان راہی کی یاد دلا دی۔ تن تنہا دلن کی پوری پلٹن کا صفایا کر دیا اور آخری سو نمبر بھی جیت گئے۔ لیکن یہاں شہزی تو پھنس گیا ہے۔ دیکھتے ہیں فلیٹ کا فرش پھٹتا ہے یا چھت سے مدد آتی ہے۔ اس کا حال اب اکتوبر میں ہی معلوم ہو سکے گا۔ ویسے مجھے کسی طرح بھی توقع نہ تھی کہ شہزی یوں کرنل سی جی کے گھر پر دھاوا بولے گا اور پھر وہ اس کے ہتھے بھی چڑھ جائے گا۔ مداری جو شکیل باؤل کی لاش سے شروع ہوئی، قدرت کھلنے پر کچھ اور ہی نکلا۔ کریکٹر کی روحانیت والے کام نے مجھے پہلے تو حیران کر دیا لیکن بعد از اں حقیقت کھلی تو سوچنے لگا کہ کاش میں بھی اتنی ہی آنکھیں اور ذہن کھلا رکھوں بشرطیکہ پولیس میں ہوتے اور جب ریمنڈی کے ہاتھ میں ہتھکڑی پڑی تو حیرت سے انگلیاں دانتوں میں داب لیں۔ مختار آزاد نے خونی ناٹک لکھ مارا تھا۔ شیام بے چارہ ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر بڑے کردار کا انتظار کرتا رہے گا۔ خیر اسے تو اب عادت سی ہو گئی ہے۔ بہر حال ہر لمحے پلٹتے حالات اور کرداروں نے مجھے الجھا کر رکھ دیا اور اختتام پر مجرم سامنے آئے بھی اور سزا نہ پاسکے۔ اب باری آئی جال کی۔ آغاز میں جیسے ہوا اور پھر فوراً ہی ماں بیٹی کو منظر سے ہٹا دیا گیا۔ اس سے میں کھٹک گیا لیکن جوں جوں کہانی آگے بڑھتی گئی ماں بیٹی میرے ذہن سے اتر گئے۔ سالار، عفیفہ اور کمال کی تکون نے شجاع کے گرد جال خوب بُنا جس میں وہ پھنس بھی گیا۔ لیکن ترپ کا پتا حنا کی آمد سے میں سمجھ گیا تھا کہ اب اس تکون کا کھیل ختم سمجھو۔ اور وہی ہوا لیکن گیم ایسی الٹے گی کہ عفیفہ اور کمال وغیرہ منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔ سونے پہ سہاگا حنا اور بریگیڈیئر طاہر کا گٹھ جوڑ ہوا اور یوں رہی سہی کسر پوری ہو گئی۔ مجھے مطلق بھی توقع تھی اور نہ امید کہ سالار بچ جائے گا۔ آخری بات 19 اگست کو میرے اباجی 92 سال کی عمر میں اس دنیائے فانی سے رخصت فرما گئے۔ تمام احباب سے دعا کی درخواست ہے۔"

کراچی سے ادریس احمد خان کی پسند "ستمبر کا جاسوسی ڈاکر صاحب کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ اندازِ ادبیہ بھی حسبِ حال تھا نامون کی فہرست میں رانا ایاز کا نام نظر آیا۔ باقی ...... سے پرانے دوست جلوہ گر نظر آرہے تھے۔ سب ہی دوستوں کو ہماری طرف سے عیدی پر خلوص مبارک باد اور شکریہ۔ مختار آزاد صاحب کے سانحہ ارتحال پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں اور اللہ رب العزت سے دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت ان کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔ کہانیوں کا آغاز سب سے پہلے کاشف زبیر مرحوم جن کو مرحوم لکھتے ہوئے ایک ٹھنڈی سانس آہ بن کر نکلتی ہے۔ ان کی تحریر کو پڑھی جس کا ایک ایک حرف دلچسپی کا عنصر لیے ہوئے تھا۔ ان کو اللہ اعلیٰ درجات سے نوازے، آمین۔ نامعلوم محرک اور آخری لہر اثر پذیر کہانیاں تھیں جنھوں نے متاثر کیا۔ جال مرگ میں اپنے دیکھے ہوئے خواب حقیقت میں بدلتے محسوس ہوئے مگر اس کی تعبیر اس کی موت کی صورت میں ملے گی ایسا شاید اس نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا کہ تعبیر ایسی خوفناک ہوگی جو اس سے اس کی زندگی جیسی انمول شے چھین کر لے جائے گی۔ اس کے بعد انگارے جس کی بلاشبہ جتنی بھی تعریف کی جائے، وہ کم ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ اس کے لکھنے والے کہنہ مشق لکھاری طاہر جاوید مغل ہوں۔ منظر امام صاحب کی بڑا آدمی کا بھی جواب نہیں۔ وہ اپنی تحریر میں ہی پیغام دے جاتے ہیں۔ وہ خواب بھی اچھی تحریر تھی۔ آوارہ گرد بھی اپنا سفر کامیابی سے جاری رکھے ہوئے ہے۔ واقعی وہ بھی بہت اچھی تحریر ہے جو قاری کو آخری سطر تک سحر میں جکڑے رکھتی ہے۔ عبدالرب بھٹی صاحب کی بے مثال تحریر ہے۔ مداری نے بھی اچھے ہونے کا احساس جگایا۔ آخری صفحات کی دونوں کہانیاں خونی ناٹک اور جال بھی اچھی لیکن مگر آخری صفحات کا حق ادا نہ کر سکیں پھر بھی پسند آئیں۔ کترنوں نے بھی مزہ دیا۔"

پشاور سے طاہرہ گلزار کے شکوے "5 ستمبر کو اپنا سویٹ سویٹ شیب جاسوسی ملا۔ سرورق پر بلقیس خان تو پریشان تھی کہ طاہرہ باجی دو مہینے سے غیر حاضر، بیچے وڈے باجی پاگل ہو رہے تھے تو دوسری طرف سیف الرؤف پاگلوں کی طرح ہنس رہے تھے۔ اللہ ان کی حالت پر رحم کرے۔ کہانیوں کی فہرست میں کاشف زبیر کا نام دیکھا تو دل خوشی سے جھوم اٹھا اور دل سے ادارے کے لیے دعا نکلی کہ یہ قیامت جگمگاتا رہے۔ دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کریں، آمین۔ دوسری طرف جب مختار آزاد کی پہلا رنگ کے لیے تحریر خونی ناٹک دیکھی تو دل سے ایک دکھی آہ نکلی کہ یہ زندگی اور موت کیا ہیں۔ آج ہے کل نہیں۔ اب مختار آزاد جیسے نامور ادیب بھی ہمیں چھوڑ گئے۔ یہ 2016 تو بہت ہی غم کا سال ٹھہرا، ہم سے ادب کے کتنے ستارے چھین لیے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کی مغفرت کرے، آمین۔ اللہ باقی کے رائٹرز جو ہم سب کے پسندیدہ ہیں، ان کو زندگی خوشیوں کے ساتھ عطا کرے۔ اب چلتی ہوں چٹکی نکتہ چینی کی محفل میں کہ کون چٹکی اٹھا رہا ہے اور کون خود کو بے وقوفوں کا افلاطون سمجھ کے بے جا نکتہ اٹھا رہا ہے۔ پتا نہیں کچھ لوگوں کو نفرت اور حسد جیسے بے ہودہ جذبے سے اتنی محبت کیوں ہوتی ہے۔ لو جی پہلے نمبر پر تو بھائی رانا بشیر احمد ایاز اپنے خوب صورت اور لاجواب تبصرہ لے کر حاضر، شکریہ بھائی کہ آپ نے میری کمی محسوس کی۔ دوسرے نمبر پر اے زیڈ وصلی کچھ لوگوں کو کھٹکن لگاتے نظر آئے۔ مسٹر رضوان تنولی کی باتوں کے لیے خالص دماغ کی ضرورت ہوتی ہے جو ہائے رے قسمت آپ کے پاس نہیں۔ شعیب اور سیف الرؤف حسینہ آپ کے ڈھیٹ پن کو دیکھ کے شرما رہی تھی۔ بالکل وڈے باجی نے ادارے کو صحیح مشورہ دیا ہے کہ میرے سسپنس، جاسوسی اور سرگزشت کے خطوط کتابی شکل میں شائع کریں۔ میری ادارے سے التجا ہے کہ شائع کر کے ایک کاپی وڈے باجی اور دوسری حریم صاحب کو تحفہ دے دیں۔ سیف آپ اپنے دماغ کا ضرور علاج کرائیں۔ کبیر کی چمچہ گیری میں اتنے نہ آگے جاؤ کہ لوگ پاگل کہیں، ویسے کبیر میرے بھی بھائی ہیں۔ واہ واہ وڈے باجی کا بھی کیا معیار ہے کبھی پڑوسن اور اب شگفتہ جی کی انگلیوں پر گھوم رہے ہیں۔ شکیل صاحب اپنی آنکھوں سے رضوان کے لیے یہ حسد اور رشک کی پٹی ہٹا دیں۔ محمد صفدر اس بار کچھ سست نظر آئے، بھائی اللہ صحت عطا کرے، آمین۔ اپنے سویٹ اور نمکین سے دوست عبدالجبار بھی بہت مزیدار اور خوب صورت تبصرہ لے کر حاضر تھے۔ خود کو لوگ شوہر ثابت کرنے

میں لگے ہیں، اللہ ہمیشہ خوش رکھے، آمین۔ عرفان تبصرہ بہت اچھا کرتے ہو بس ذرا کچھ لوگوں کو بلاوجہ مکھن نہ لگایا کرو جیسے مکھن لگانے کا کام بہت نفاست سے کرتے ہو اور کچھ لوگ جوش میں بانس پر چڑھ جاتے ہیں ہاہاہا۔ محمد اقبال آپ نے بھی میری کمی محسوس کی، آپ کا تبصرہ بہت ہی جامع اور مکمل رہا۔ شروع کے صفحات کا ایک بہترین تحفہ قتلہ۔ الیزبتھ واقعی ایک حسین فتنہ تھی۔ آخر تک دولت کے لیے مردوں کو لبھاتی رہی اور حسب عادت ہر مرد اس کے آگے بے وقوف بنا گیا۔ ایک ایک لفظ کاشف بھائی کی یاد دلاتا رہا۔ پوری کہانی میں برطانیہ اور امریکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کاشف بھائی کی مغفرت کرے، آمین۔ انگارے واہ اس بار تو کہانی کا ٹیمپو 5G تک پہنچا تھا، کیا ایکشن، کیا منظر نگاری۔ کہانی میں دوبارہ ڈاکٹر ارم خان اور میرے فیورٹ کردار رضوان ٹی ؟ اچھا ہوا ارم ماری گئی، رضوان کی عزت نفس سے کھیل رہی تھی۔ منظر امام انکل کی ایک اور لازوال تحریر بڑا آدمی توقیر کام تو بہت اچھا اور نیک کر رہا تھا لیکن اس کی کمائی کا طریقہ غلط تھا۔ بحیثیت انسان توقیر جیسے لوگ تو آٹے میں نمک کے برابر ہیں لیکن اینڈ اچھا لگا۔ سرور اکرام صاحب کے خواب پر مشتمل تحریر... وہ خواب، بہت اچھی تحریر لیکن عدیل کیسے قتل ہوا، یہ ایک نکتہ تشنگی دے گیا۔ اس بار تو لگتا ہے ڈاکٹر عبدالرب بھٹی نے خاصے کی چیز آوارہ گرد خوب فرصت میں لکھی ہے۔ ایک ایک لفظ سے ڈاکٹر صاحب کے حساس محب وطن دل کا پتا چل رہا تھا۔ خوب خوب ایکشن اول خیر، شکیلہ اور کپیل دادا کا ذکر اور ان کا ان رذیل بی جی بھوانی کی قید میں رہنا دل دکھی ہو گیا لیکن امید قائم ہے کہ ان بہادر شیروں کو اللہ اپنے حفظ و امان میں رکھے گا۔ سرورق کی پہلی کہانی خونی ناسک مختار آزاد صاحب کی تحریر۔ ایک اسٹیج اداکار کی سچ بیانی پر مشتمل۔ شیام اداکار سے زیادہ جاسوسی کرنے والا سراغ رساں بنا رہا۔ مجھے شروع سے کرشن پر شک تھا۔ خیر بہت عرصے بعد ایک منفرد تحریر پڑھی، ویلڈن مختار آزاد۔ اللہ ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے، آمین۔ دوسری کہانی جال، شبنم شفیق کی زبردست تحریر دولت کے پجاریوں کی مکار سازشوں سے بھرا سرورق تھا۔"

کراچی سے حرا اختیار کی تعریف و تنقید "4 ستمبر کو بالآخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں جیسے ہی ہم کو بک اسٹال پر خوب صورت چشمے سے کہیں دور نظریں جمائے لڑکی، اور اس کے ساتھ دو ہونق سے صنفِ کرخت کی شکلیں نظر آ گئیں تو میں تیزی سے اپنے پیارے جاسوسی کی طرف لپکی، میری تیزی کو دیکھ کر بک اسٹال والے صاحب بھی مسکرا دیے اور میں خجل سی ہو گئی۔ عبدالستار عابدی کی خدمت خلق ان کا کام ان کا نام ہمیشہ ہمارے دلوں میں گونجتا رہے گا۔ رانا بشیر احمد ایاز کا تبصرہ خوب رہا، اے زیڈ وصلی، شعیب الرؤف اور سیف الرؤف کا تبصرہ مناسب تھا۔ ماہتاب گل رانا نے بھی ساحر لدھیانوی کو گنگنانے کا ٹائم نکال ہی لیا ہے، بلقیس خان بھرپور انداز سے جلوہ گر تھیں۔ بہت اچھا لگا، شکیل حسین کاظمی، محمد صفدر معاویہ، عرفان راجہ، اسرار ساقی، محمد اقبال اور کاشف عزیز کے تبصرے بہت پسند آئے۔ کاشف زبیر کی فتنہ اپنی سحر سامانیوں کے ساتھ اچھی لگی۔ مختار آزاد کی جدائی ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے دکھ کا باعث بنی۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔ انگارے میں شاہ زیب اینڈ کمپنی یعنی ڈاکٹر جاوید اور اشتیاق کو بڑے صاحب کو آقا جان سے نجات دلانے کے لیے واقعی پسینے آ جائیں گے مگر میر واجا بھی کچھ کم نہیں، سیر نہیں سوا سیر ہے آقا جان کو بھی لگ پتا جائے گا کہ اب آیا ہے اونٹ پہاڑ کے نیچے۔ مغل صاحب کی کردار نگاری اور منظر کشی ایسی ہوتی ہے کہ ایک ہی نشست میں کہانی ختم کر کے باقی آئندہ پڑھ کر دل جز بز ہو جاتا ہے بہرحال انتظار تو کرنا ہی پڑے گا۔ دوسری طرف عبدالرب بھٹی صاحب نے بھی شہزی کے ذریعے بھارت میں اودھم مچا دیا ہے۔ شہزی نے دشمنوں کے بیچ رہتے ہوئے انھیں اپنی انگلیوں پر نچانا شروع کر دیا ہے اور دشمن پریشان ہے کہ یہ کیا بلا ہمارے گلے پڑ گئی ہے۔ بہت اچھے جا رہے ہیں بھٹی صاحب۔ مختار آزاد (مرحوم) کی کہانی بہترین رہی۔ شبنم شفیق کا دوسرا سرورق زبردست رہا۔ انکل آپ نے تو ٹائی کی ناٹ ہی غلط باندھی ہے اور مجرم سب کو اپنی حرکتوں سے محظوظ کرنے والا بڑا آدمی مسٹر توقیر پکڑا گیا جو دو نمبر لوگوں کو ہزار چہرے کا روپ دے کر لوٹتا ہے اور بیمار معصوم بچوں کو اسپتال جا کر اوٹ پٹانگ حرکتیں کر کے ان کے چہروں پر مسکراہٹ بکھیر دیتا ہے۔ بڑا آدمی بھی زبردست رہی۔

عمران خان، حیدر آباد سے "اس دفعہ جاسوسی کا دیدار 4 تاریخ کو ہوا۔ عید سے پہلے جاسوسی کا ملنا عید سے کم نہیں تھا۔ ٹائٹل اس دفعہ کچھ اچھا تھا لیکن ہم یہ نہیں سمجھ سکے سرورق پہ بیٹھے بھائی صاحب چلّا رہے ہیں یا ہنس رہے ہیں۔ چٹکی نکتہ چینی میں اس دفعہ کافی عمدہ خط شامل تھے لیکن مصروفیت کی وجہ سے چند ایک ہی پڑھے گئے جن میں زیڈ اے وصلی کا شاندار خط بہت اعلیٰ تھا۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ بھائی صاحب کا پہلا نامہ ہے خوش آمدید وصلی صاحب۔ فیصل آباد سے الرؤف برادران بھی حاضر تھے کافی جاندار انٹری کر گئے ہیں، شعیب الرؤف کا خط بھی جاندار تھا۔ شکیل کاظمی بھی حاضر تھے۔ مہتاب گل رانا کی حاضری طویل عرصے کے بعد ہوئی۔ مختار آزاد صاحب کی وفات کا پڑھ کر دکھ ہوا، اللہ ان کے درجات بلند کرے، آمین۔ کہانیوں میں ہمارے دلوں میں ہمیشہ بسنے والے کاشف زبیر صاحب کی فتنہ بہت زبردست کہانی تھی۔ الیزبتھ واقعی ایک بہت بڑا فتنہ تھی۔ اس نے تو آخری وقت میں بے چارے پادری کو بھی نہیں چھوڑا۔ کاشف زبیر کی کہانی ہمارے لیے یادگار تحفہ ہے۔ انگارے مغل صاحب کی لاجواب تحریر ہے۔ اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑ چکی ہے۔ رضوان ٹی کا کردار ایک بار پھر زندہ ہو گیا ہے شاہ زیب اب کامیابی کے قریب پہنچ چکا ہے۔ سادہ لوح دونوں بھائیوں کو زہر کیوں دیا جا رہا ہے۔ اس راز کے فاش ہونے کے لیے شدت سے انتظار کر رہے ہیں۔ عبدالرب بھٹی صاحب کی آوارہ گرد اس دفعہ بہت دھواں دھار ہے۔ بلیو ٹسی کو اس دفعہ شہزی نے خاک میں ملا کر رکھ دیا ہے لیکن کہانی کا اختتام بہت غیر متوقع تھا، اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔"

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

جنید ملک، کراچی۔ شہناز اقبال، لاہور۔ ثاقب عزیز، کوٹری۔ تہمینہ فرید، میرپور خاص۔ عمران ملک، منڈی آدم۔ حنا کاشف، کراچی۔ طارق محمود، راولپنڈی۔ اعجاز احمد، ڈیرہ غازی خان۔

زیرِ نشتر

امجد رئیس

اولین صفحات کی زینت...... مشہور مصنف ٹیس گریتسن کے بہترین ناول کا انتخاب

انسان کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے... ایک بے فکر آرام دہ زندگی اور چاہتوں سے لبریز خوب صورت دل... وہ دیوانہ تھا دل کش زندگی اور چاہت کا دیوانہ... چاہت ملی اور کھو گئی... مگر اس کے دل و دماغ سے نہ نکل سکی... دیوانگی بڑھتی چلی گئی... خون ریزی کا ہولناک آغاز ہوا تو پھر چاہت... محبت اور جنون کے رنگوں میں خون کی آمیزش ہوتی گئی اور پھیلتی چلی گئی... ایک کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا... سلسلہ تھا کہ دراز ہوتا چلا گیا... پھر وہ خود بھی اپنی محبت سے جا ملا... زیرِ زمیں جا سویا... لیکن خون ریزی کے آثار یونہی چھائے رہے... ایک اسرار تھا معما تھا... ایک دلربا... نازبرو... نازو آفریں لیکن سرکش ڈاکٹر کی مشکلات کی ہولناکی جو ہفت رنگ اسرار میں الجھ کر سب کچھ ہارنے چلی تھی۔

ایک ہی نشست میں پڑھے جانے والے یادگار ناول کے سنسنی خیز موڑ......

اوہ گاڈ، ماضی کس طرح مراجعت کرتا ہے؟ ماضی کی غلطی اچانک بھوت بن کے سامنے آجاتی ہے، نیند حرام ہوجاتی ہے۔ ماضی حال میں تبدیل ہوکر پل پل ہر سانس کو زہر آلود کرتا ہے۔ ماضی کی غلطی کو بھولنا ہی فاش غلطی ہے۔ وہ پلٹ کر سامنے آتی ہے اور قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔

آفس کی کھڑکی سے ڈاکٹر ہنری ٹیتا کا باہر پارکنگ لاٹ میں برستی رم جھم کو تک رہا تھا...... کیوں؟ آخر کیوں، کیسے...... اتنے برسوں بعد...... اسے تباہ کرنے کے لیے ماضی کی غلطی بدروح بن کے لوٹ آئی تھی۔

ہانالولو کے علاقے کولوکی وہ صبح توقع کے مطابق روشن اور مطلع صاف ہونا چاہیے تھا لیکن صبح چار بجے تک سیاہ بادل کلینک سمیت علاقے پر چھا چکے تھے۔ بعدازاں جو مینہ برسا تو جل تھل کر کے رکھ دیا۔ کلینک کا عملہ ایک ایک کر کے گھر جا چکا تھا۔ ٹیتا کا نے نظر کا زاویہ تبدیل کیا اور ڈیسک پر پڑے خط کو گھورا جو ایک ہفتہ قبل اسے موصول ہوا تھا لیکن ہمیشہ کی طرح وہ خط بھی میڈیکل جرنلز، کیٹلاگز اور مختلف کاغذات کے ڈھیر میں غوطہ زن رہا...... خط استقبالیہ کلرک کی نظر میں ایک دن قبل آیا تھا۔

خط پر بھیجنے والے کا نام اور پتا دیکھ کر 'ٹیتا کا' کے دماغ میں دور کہیں خطرے کی گھنٹی بجی...... خط جوزف کیافو، اٹارنی ایٹ لاء کی جانب سے تھا۔ 'ٹیتا کا' کئی مرتبہ خط پڑھ چکا تھا۔ کرسی میں پیچھے کی جانب گر کے اس نے ایک بار پھر خط کھولا۔

ڈیئر ڈاکٹر ٹیتا کا!

مسٹر چارلس ڈیکر کے اٹارنی کی حیثیت میں، آپ سے درخواست ہے کہ مس جینیفر بروک کا تمام میڈیکل ریکارڈ ذیل کے پتے پر ارسال کیا جائے۔ مس بروک، آپ کی زیرِ نگرانی میڈیکل کیئر میں تھی۔ موت کے وقت وہ آپ کے زیرِ علاج تھی۔

ٹینا کا، آگے کی سطور کئی بار پڑھ چکا تھا۔ اس نے خط واپس ڈیسک پر پھینک دیا۔

جینیفر بروک...... جینیفر بروک...... وہ تو یہ نام بھول چکا تھا۔ ایک گہری بے نام سی تھکن نے اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا، نیم جان کر دیا۔ ایسے آدمی کی تھکن جس پر گویا نیا انکشاف ہوا ہو کہ وہ کبھی اپنے سائے سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ گھر جانے کے لیے اس نے ہمت مجتمع کرنی شروع کی پھر رک کر آفس کے در و دیوار کا جائزہ لیا۔ اس کا آفس...... جیسے اس کے لیے پناہ گاہ تھا۔

آفس کے بیرونی کمرے سے آواز آئی۔ جس نے ڈاکٹر کو کرسی چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ غالباً دروازہ بند ہونے کی مخصوص کلک تھی۔ اس نے ریسیپشن ایریا میں جھانکا۔

”پیگی؟ کیا تم ابھی تک کلینک میں ہو؟“

”پیگی؟“ مگر جواب میں خاموشی رہی۔

ٹینا کا کی متلاشی نظریں گھومتی ہوئی بیرونی دروازے پر جم گئیں۔ دروازے کا لاک کھلا ہوا تھا۔

معاً، چیکنگ روم کی جانب سے مدھم آواز آئی...... جیسے دھات سے دھات ٹکرائی ہے۔

”پیگی؟“ ٹینا کا نے ایک بار پھر سوالیہ پکار بلند کی...... مگر خاموشی رہی۔

وہ ہال سے ہوتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے سوئچ آن کر کے کمرا روشن کر دیا۔ اسٹین لیس اسٹیل کا سنک چمک اٹھا۔ گائناکالوجیکل ٹیبل...... سپلائی کیبنٹ...... اس نے سوئچ آف کیا اور دوسرے کمرے کا رخ کیا۔ وہاں بھی ہر شے اپنی جگہ پر تھی۔ وہ تیسرے اور آخری کمرے کی جانب بڑھا۔ کمرے میں داخل ہو کر اس نے سوئچ کی جانب ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس کا وجود سنگی مجسمے میں تبدیل ہو گیا۔ وہ ایک ہی انداز میں وہیں جم کے رہ گیا۔ کسی نادیدہ وجود کے احساس نے اسے منجمد کر دیا تھا...... تاریکی میں کوئی اس کا منتظر تھا۔ وحشت اس کے رگ و پے میں اترتی چلی گئی۔ اس نے گھوم کر فرار ہونا چاہا تو احساس ہوا کہ وہ جو بھی تھا، اس کے عقب میں کھڑا تھا۔ ایک تیز دھار چمک چکا۔ جیسے بجلی بادلوں میں جھلک دکھلا کر روپوش ہو جاتی ہے۔ تیز دھار آلہ بلیڈ کے مانند اس کے گلے کو تراش گیا تھا۔

وہ ڈگمگاتا ہوا چیک اپ روم کے انسٹرومنٹ پینل سے ٹکرایا اور زمین بوس ہو گیا۔ گرتے ہی اسے احساس ہوا کہ رگوں میں دوڑتا سرخ آبِ حیات تیزی سے جسم و جان سے پھسل رہا ہے۔ جریانِ خون میں شدت تھی۔ شہ رگ کٹ چکی تھی۔ لاشعوری طور پر اس نے ہاتھ سے کاری زخم کو جانچا۔ منٹوں کا کھیل تھا۔ جریانِ خون کو روکنا پہلی ترجیح تھی۔ ٹانگوں میں سنسناہٹ کا آغاز ہو چکا تھا......

ہاتھ پیروں کے بل اس نے کیبنٹ کی جانب حرکت شروع کی جہاں روئی کے بنڈل رکھے تھے۔ ٹائلز نما کارپٹ پر خون ہی خون تھا۔ دماغ کی اہلیت کم ہوتی جا رہی تھی۔ شیشے کے دروازے سے کمزور سی روشنی اندر آ رہی تھی۔ یہ مدھم روشنی اس کی آخری امید تھی۔

دروازے میں کھڑا سایہ ہال کی جانب سے آنے والی روشنی کو مزید کم کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اجنبی حملہ آور دروازے میں کھڑا اسے دیکھ رہا ہے۔ تاہم وہ ہاتھ پیروں کے بل کیبنٹ کی جانب حرکت کرتا رہا۔ اس کے ہوش و حواس رخصت ہونے لگے تھے۔ ٹینا کا نے آخری لمحات میں کسی طرح سہارا لے کر خود کو گھسیٹا اور کیبنٹ کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اس کا پٹ کھول کر اس نے اندھوں کے مانند ہاتھ چلائے۔ ادھ کھلے بنڈل میں سے مٹھی میں روئی بھر کر اس نے زخم کے اندر بھر دی۔

اس جاں گسل تگ و دو میں وہ حملہ آور کو نہ دیکھ سکا...... جس کے تیز دھار ہتھیار نے دوسری اور آخری مرتبہ قوتِ بینائی اور برق رفتاری سے مجروح ڈاکٹر کی پشت میں ڈوب گیا۔ ٹینا کا نے چیخنے کی کوشش کی تاہم اس کے حلق سے جو آواز برآمد ہوئی...... وہ محض ایک آہ تھی۔ دراصل یہ اس کی آخری اخراج شدہ سانس تھی۔ اس کے بعد وہ دوبارہ زمین بوس ہو گیا۔

☆☆☆

چارلس ڈیکر نیم برہنہ حالت میں بستر پر پڑا تھا۔ وہ خوف زدہ تھا۔ کھڑکی میں سے لہو رنگ نیون سائن دکھائی دے رہا تھا...... دی وکٹری ہوٹل ہوٹل کا 't' غائب تھا۔ لہٰذا نیون سائن یوں پڑھنے میں آ رہا تھا۔ 'دی وکٹر ہول'۔ وہ جگہ تھی بھی کسی 'ہول' کے مانند جہاں ہر مسرت، فتح، آسائشیں واپس نہ آنے کے لیے، اندھے غار میں گر جاتی تھیں۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں لیکن نیون سائن پھر بھی نظر آ رہا تھا۔ اس نے کروٹ بدل ڈالی اور سر تکیے میں

چھپا لیا۔ تکیے کے غلاف میں بھی بو تھی۔ تکیہ ایک طرف اچھال کر وہ کھڑکی کی طرف لپکا اور نیچے سڑک کو گھورنے لگا۔ سائڈ واک پر چند لوگ قہقہے لگا رہے تھے۔ کہیں سے مغنیہ کی صدا لہروں کے دوش پر سفر کر رہی تھی...... اب کیا فرق پڑتا ہے، زندگی تو گزارنی ہے...... اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے پھر کھڑکی کی بند کرنے لگا۔ گرمی بہت تھی۔ وہ کھڑکی بند کیے بغیر واپس آ گیا۔ ٹیبل پر آ کر اس نے لیمپ روشن کیا۔ کسی اخبار کی سرخی اس کا منہ چڑا رہی تھی:

''ہانا لولو میں ایک فزیشن کو اس کے کلینک میں ذبح کر دیا گیا۔''

اس کے چہرے پر پسینہ آ گیا۔ اس نے اخبار بھی ایک طرف پھینک دیا اور بستر پر بیٹھ کر سر دونوں ہاتھوں میں دبا لیا۔ دور سے آنے والے نغمے کی آواز معدوم ہو گئی۔ ذرا دیر کے وقفے کے بعد دوسرا گیت بلند ہوا۔

کہاں ہے میری چاہت...... میں مر جاؤں گا۔

دھیرے دھیرے اس نے سر اٹھایا، گردن گھمائی اور ایک جانب فریم کو گھورنے لگا۔ جس میں جینی کی مسکراتی ہوئی تصویر آویزاں تھی۔ وہ اٹھا، فریم ہاتھ میں لے کر فوٹو کو چھوا۔ اس کے خیالات ماضی کی بھول بھلیوں میں الجھ گئے۔

☆☆☆

''تم سونے والی ہو، اپنی آنکھیں بند کر لو۔'' کیٹ نے ایلن سے سرگوشی نما آواز میں کہا۔

''مجھے کچھ محسوس نہیں ہو رہا۔''

''ایک آدھ منٹ لگے گا۔'' کیٹ نے اس کے شانے پر تسلی آمیز تھپکی دی۔ ''خود کو ڈھیلا چھوڑ دو...... خیال کرو، تم آسمان پر اڑ رہی ہو...... بادلوں کے درمیان۔''

ایلن مسکرائی۔ آپریٹنگ ٹیبل پر تیز روشنیوں نے ایلن اور برائن کی جلد پر ہر ایک جھائیں، لکیر...... حتیٰ کہ تل کو بھی نمایاں کر دیا تھا۔

''میں خوف زدہ نہیں ہوں۔'' ایلن نے خمار آلود آواز میں کہا۔

''تمہیں ضرورت بھی نہیں ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ ہر بات کا خیال رکھوں گی۔''

''میں جانتی ہوں۔'' ایلن نے اس کا ہاتھ چھونے کی کوشش کی۔ کیٹ نے اپنی دوست کا ہاتھ تھام لیا۔

دروازہ کھلا اور سرجن اندر داخل ہوا۔ ڈاکٹر گائے سائیٹی اپنے غیر معمولی جثے کی وجہ سے نمایاں اور عجیب دکھائی دیتا تھا۔ کسی وزنی بجاؤ کے مانند۔ تاہم اپنے پیشے میں وہ مہارت رکھتا تھا۔ اس نے اندر آتے ہی مریضہ کا ہاتھ دبایا اور کہا۔ ''ایلن! سونے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟''

وہ مسکرائی۔ ''سچ تو یہ ہے کہ اچھا ہوتا یا برا...... مجھے فلاڈیلفیا میں ہونا چاہیے تھا۔''

ڈاکٹر گائے ہنسا۔ ''تم وہاں چلی جاؤ گی لیکن تمہارے جسم کا ایک عضو یہیں رہ جائے گا۔''

''پتا نہیں...... مجھے تو ہر...... قسم کے...... کھانوں کا شوق ہے...... معلوم نہیں...... کیا پرہیز کرنا...... ہوگا؟'' ایلن کے پپوٹے بھاری ہونے لگے۔

''کوئی خاص پرہیز نہیں ہوگا۔ تم میٹھی نیند سو جاؤ۔''

کیٹ شیزنی، ایلن کو دیکھ رہی تھی۔ جو تقریباً سو چکی تھی۔

''ایلن۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا اور انگلیوں کی پوروں سے اس کی پلکوں کو چھیڑا۔ کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا۔ کیٹ نے ڈاکٹر گائے کی جانب دیکھ کر سر ہلایا۔ ''اب یہ تمہاری ہے۔''

''اوہ، کیٹ ڈارلنگ...... تم کتنی خوب صورتی اور نفاست سے کام کرتی ہو۔''

''بس...... بس کرو...... مجھے پتا ہے۔'' کیٹ نے کہا۔

''او کے، شو شروع ہونے والا ہے۔'' ڈاکٹر گائے نے دونوں ہاتھوں کو رگڑا۔ ''سب کچھ ٹھیک ہے...... لیب ورک؟''

''ٹھیک ہے۔''

''ایکسرے، EKG؟''

''نارمل۔'' جواب ملا۔

آپریشن سے قبل اگلے دس منٹ تک تمام کام میکانیکی انداز میں ہوئے۔ شاندار گھڑی کی سوئیوں کے مانند۔ بنا کسی خلل اور جھول کے...... رواں اور مہارت کے ساتھ۔

کیٹ اپنی ذمے داری، ہمیشہ کی طرح نہایت روانی اور ارتکاز کے ساتھ انجام دے رہی تھی۔ ایلن مریضہ ہی نہیں، کیٹ کی دوست بھی تھی۔ کیٹ کا ارتکاز غیر معمولی تھا۔ اگرچہ وہ اپنی پیشہ ورانہ اخلاقیات کے تحت تمام مریضوں کو یکساں اہمیت دیتی تھی۔

اینستھیسالوجسٹ کے پیشے میں ایک محاورہ عام ہے۔ ''یہ پیشہ 99 فیصد بوریت اور 1 فیصد 'وحشت' ہے۔ اور کیٹ اسی ایک فیصد کو ہمیشہ ذہن میں رکھتے ہوئے کام کرتی تھی، بجائے اس کے کہ محض ایک فیصد تناسب کی بنا

پر ''فیئر پوزیشن'' پر کم توجہ دی جائے یا اس کا لحاظ ہی نہ کیا جائے۔

وہ خوب جانتی تھی کہ شاذ و نادر ہی سہی، لیکن پیچیدگی پلک جھپکنے میں ہی سر اٹھا لیتی ہے۔ ایلن او برائن کی عمر ابھی اکتالیس برس تھی۔ وہ صحت مند تھی، سوائے پتے کی تکلیف کے......

ڈاکٹر گائے نے مخصوص لوشن میں ایک بار پھر ہاتھوں کو مسلا۔ دیگر نرسز بھی الرٹ تھیں، وہ سب ایک ٹیم کی شکل میں ٹیبل کے اردگرد کھڑے تھے۔

کیٹ کی نگاہ ماسک میں چھپے چہروں سے ہوتی ہوئی ڈاکٹر گائے پر رکی۔ آپریشن تھیٹر میں اس کا بے ڈھنگا وجود قطعی غیر موزوں نظر آتا تھا۔ تاہم آلاتِ جراحی اس کے چوڑے بھدے ہاتھوں میں پہنچتے تو کرشمے رونما ہونے لگتے تھے۔

سرجن نے اپنا ہاتھ نرس سینڈی کی جانب دراز کیا۔ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ سینڈی نے (scalpal) اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ سرجن نے مریضہ کے پیٹ پر پہلا کٹ لگایا۔ سرخ لکیر نمودار ہوئی۔ ڈاکٹر گائے کے ہاتھ ماہر پیانسٹ کے مانند حرکت پذیر تھے۔ ٹیم ہم آہنگی کے ساتھ کام کر رہی تھی۔ کیٹ کی سماعت ایلن کے دھڑکنوں پر تھی۔ سب کچھ ٹھیک تھا۔ کوئی بحران افق پر نہیں تھا۔ کیٹ ایسی صورتِ حال کو انجوائے کرتی تھی۔ سب کچھ انڈر کنٹرول تھا۔ اچھی اور کامیاب صورتِ حال میں کارڈیاک مونیٹر کی بیپ بھی موسیقی کا احساس دلا رہی تھی۔

ڈاکٹر گائے گہرائی میں کٹ لگا رہا تھا جہاں چربی کی تہ تھی......

''عضلات میں کھنچاؤ ہے، کیٹ۔'' اس نے کہا۔

''میں دیکھتی ہوں۔'' کیٹ نے جواب دیا۔ وہ ادویات کی طرف مڑی۔ ایک چھوٹی دراز پر لیبل لگا تھا...... سکسی نل کولن، یہ دوا عضلات کو نرم کرنے کے لیے تھی۔ کیٹ کی پیشانی پر لکیر نمودار ہوئی۔ ''اینی؟ یہاں ایک وائل اور ہونی چاہیے تھی۔ پلیز دیکھو۔''

''حیرت ہے۔'' سینڈی نے کہا۔ ''کل شام میں نے پورا اسٹاک چیک کیا تھا۔''

''اس وقت یہاں ایک ہی وائل ہے۔'' کیٹ نے وائل اٹھائی اور کرسٹل کے مانند شفاف محلول پانچ سی سی کی مقدار میں لے کر ایلن کی آئی وی لائن میں شامل کر دی۔ وہ واپس بیٹھ گئی۔ دوا کو اپنا اثر دکھانے کے لیے ایک منٹ درکار تھا۔

ڈاکٹر گائے، چربی سے نمٹ کر عضلات تک پہنچا تھا۔

''کیٹ، کھنچاؤ اب تک ہے۔'' وہ بولا۔

کیٹ نے گھڑی کی جانب دیکھا۔ دو منٹ سے زیادہ گزر چکے تھے۔

''کچھ اثر ہونا چاہیے؟''

''نہیں، کچھ بھی نہیں۔''

''او کے۔ میں تین سی سی اور دیتی ہوں۔'' ساتھ ہی کیٹ نے نرس اینی کو تنبیہ کی کہ دوسری وائل کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ معاً کارڈیک مونیٹر کا بزر بول اٹھا۔ کیٹ کی گردن یوں گھومی جیسے کرنٹ لگا ہو۔ اسکرین پر نظر پڑتے ہی وہ دہشت کے عالم میں اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

ایلن او برائن کی حرکتِ قلب بند تھی۔

اگلے ہی لمحے کمرے میں افراتفری پھیل گئی۔ بلند آواز میں احکامات دیے جا رہے تھے۔ انسٹرومنٹ ٹرے کو ایک طرف ہٹایا گیا۔ چہروں پر ماسک کے باوجود سنسنی اور ہراس، آنکھوں سے عیاں تھا۔

محاوراتی ایک فیصد دہشت ظہور پذیر ہو چکی تھی۔ وہ دہشت، جو ہر اینستھیسیا لوجسٹ کے لیے ایک بھیانک خواب کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کیٹ کی پیشہ ورانہ زندگی کا بدترین لمحہ تھا۔ وہ بکھرتے اعصاب کو سنبھالنے کے لیے خود سے لڑ رہی تھی۔ ایڈرینلین کی کئی وائلز، کیٹ نے اوپر تلے انجیکٹ کر دیے...... پہلے آئی وی لائن میں پھر براہِ راست ایلن کے دل میں۔

''میں اسے کھو رہی ہوں...... ڈیئر گاڈ، میں اسے کھو رہی ہوں۔'' اس نے تصور میں سسکی لی۔ پھر اس نے دیکھا کہ اوسلواسکوپ پر دل کی سیدھی لکیر پھڑپھڑائی۔ زندگی کی واحد علامت جھٹکے کا سہارا......

''کارڈیوورٹ!'' اس نے بلند آواز میں کہا اور نرس اینی کی جانب دیکھا۔ جو ''ڈیفبریلٹر'' (DEFIBRILLATOR) کے قریب کھڑی تھی۔ ''دو سو واٹ۔''

اینی منجمد کھڑی رہی۔ اس کا چہرہ برف کے مانند سفید پڑ گیا تھا۔

''اینی؟'' کیٹ چلا اٹھی۔ ''دو سو واٹ کا جھٹکا۔''

حرکت میں آنے والی اینی کے بجائے سینڈی تھی، جس نے مشین کے چارجنگ بٹن پر ہاتھ مارا۔ سینڈی کے ہاتھ مارتے ہی سوئی اچھل کر دو سو کے ہندسے پر پہنچ گئی۔ ڈاکٹر گائے نے برقی جھٹکے دینے والے دونوں پیڈ دبوچے اور ایلن کے سینے پر رکھ کر چارج ریلیز کیا۔

ایلن کا جسم معمولی گڑیا کے مانند اچھلا اور اسکرین پر پھڑپھڑانے والی لکیر لرزش میں تبدیل ہوگئی۔ یہ علامت تھی کہ دل ساتھ چھوڑ رہا ہے۔

کیٹ کا اپنا دل بیٹھنے لگا۔ اس نے دوسری دوا انجیکٹ کی پھر مایوسی کے عالم میں تیسری دوا۔ لاحاصل، ڈبڈبائی آنکھوں سے اس نے اسکرین پر قلب کی حرکات دکھانے والی لکیر کو دم توڑتے دیکھا۔

''اٹ از اوور۔'' ڈاکٹر گائے نرمی سے دکھ بھرے لہجے میں بولا۔

''نہیں۔'' کیٹ کی ڈبڈباتی آنکھوں سے موتی گرے۔ اس نے دونوں ہاتھ ایلن کے سینے پر رکھے اور پوری قوت سے جھٹکے دینے لگے۔

''اٹ از ناٹ اوور۔'' وہ چلائی۔ اس نے خود کو ایلن کے بالائی دھڑ پر گرادیا۔ اسے ایلن کو زندہ رکھنا ہے۔ سب خاموش تھے۔ کیٹ دیوانہ وار جدوجہد کررہی تھی۔

''ایلن، اٹھو...... تمہیں زندہ رہنا ہے۔'' اس کی آواز شدتِ کرب سے ٹوٹ گئی۔

''کیٹ۔'' ڈاکٹر گائے نے اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھ دیا۔

''نہیں۔''

''کیٹ۔'' اس نے نرمی سے کیٹ کو ہٹایا۔ کسی نے ہارٹ مانیٹر کو بند کردیا۔ متواتر بھنبھناہٹ یک لخت معدوم ہوگئی اور وہاں پُراسرار سناٹا چھا گیا۔ کیٹ دھیرے سے مڑی۔ سب اسے تک رہے تھے۔ کیٹ نے مشین پر نگاہ ڈالی۔ خطِ قلب بالکل سیدھا افقی حالت میں تھا۔

☆☆☆

ایلن کی باڈی بیگ میں رکھ کر زپ کھینچ دی گئی۔ بیگ کو اسٹریچر پر رکھا گیا۔ اسٹریچر، سردخانے کی جانب روانہ ہوگیا۔ ایک...بےرحم حقیقت...... باڈی کے بیگ میں جانے سے پہلے ہی خود کو تسلیم کراچکی تھی۔ اسٹریچر کے پہیوں کی گاہے بگاہے چوں چاں...... ساکت کھڑی کیٹ کی سماعت پر چھریاں چلا رہی تھی۔

یکے بعد دیگرے سب خاموشی سے سوگوار حالت میں رخصت ہوگئے۔ آپریشن تھیٹر میں کیٹ تنہا کھڑی تھی۔ اس سے الجھن... میں خالی وائلز اور خون آلود ردی پڑی تھی۔ جسے جلد ہی سمیٹ کر تلف کردیے جانا تھا پھر المیہ کا کوئی سراغ وہاں نہ ملتا۔

سوئٹ...... یہاں تو وہاں سے...... ایلن کے

والدین کی جانب سے بھی۔ وہ ان کا سامنا کیسے کرے گی؟

پژمردہ کیٹ نے سرجیکل کیپ اتاری۔ اس کی براؤن زلفیں شانوں پر بکھر گئیں۔ اسے تنہائی کی ضرورت تھی...... سوچنے کے لیے۔ یہ کیونکر ہوا؟ وہ پلٹی تو دروازے میں ڈاکٹر گائے کو کھڑا پایا۔ دونوں کی نظریں چار ہوتے ہی کیٹ نے محسوس کیا، کوئی گڑبڑ ہے۔

ڈاکٹر گائے نے خاموشی سے ایلن اوبرائن کا چارٹ کیٹ کو پکڑا دیا۔ کیٹ چارٹ کو نہیں اسے دیکھ رہی تھی۔

''الیکٹروکارڈیوگرام (EKG)۔'' اس نے کہا۔ ''تم نے بتایا تھا کہ وہ نارمل تھا۔''

''ایسا ہی تھا۔''

''ایک نظر دیکھ لو۔''

کیٹ کی آنکھوں میں الجھن تھی۔ اس نے چارٹ میں EKG ریکارڈ تلاش کیا۔ سب سے پہلے اس کی نگاہ اپنے دستخط پر گئی۔ جو صفحے کے بالائی کونے پر موجود تھے۔ دستخط اس بات کی علامت تھے کہ اس نے EKG والا صفحہ دیکھا تھا۔ پھر اس نے ٹریسنگ پر نظر ڈالی۔ یہ دو بارہ سیاہ لہریں تھیں، جو قلب کی تقیہ کیفیت یا سرگرمی کو ظاہر کرتی تھیں۔ پورے ایک منٹ تک وہ پلک جھپکائے بغیر الیکٹروکارڈیوگرام کو گھورتی رہی۔ اسے اپنی بینائی پر شک ہورہا تھا۔ EKG کا پیٹرن بہت واضح تھا۔ اس پیٹرن کو ایک تھرڈ ایئر کا طالب علم بھی بہ آسانی سمجھ سکتا تھا۔

''یہ وجہ تھی جس نے ایلن کو آناً فاناً ہم سے چھین لیا۔'' ڈاکٹر گائے نے کیٹ سے کہا۔

''لیکن...... یہ ناممکن ہے۔'' کیٹ نے یقین سے ساتھ کہا۔ تاہم اس کی الجھن برقرار تھی۔ ''میں ایسی معمولی غلطی نہیں کرسکتی۔''

ڈاکٹر گائے جواب دینے کے بجائے دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اسے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ کیا کہتا۔

''گائے، تم مجھے خوب جانتے ہو۔'' کیٹ نے احتجاج کیا۔ ''اس قسم کی سہو، اور مجھ سے؟؟...... ایلن کے معاملے میں تو میں نے ہر چیز دو بار نہیں سہ بار چیک کی تھی...... نہ بھی کرتی تو کسی بھی کیس میں ایسی بھول...... نہیں، یہ ناممکن ہے۔''

''خدا کے لیے کیٹ، یہ ریکارڈ کا حصہ ہے۔ تمہارے دستخط موجود ہیں۔ کیا کیا جاسکتا ہے؟؟''

دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ دونوں صدمے کی کیفیت سے دوچار تھے۔

"میں معذرت خواہ ہوں۔" بالآخر وہ بولا اور پریشانی سے بالوں میں کنگھی کی۔ "اوہ خدایا...... حملہ قلب...... ایلن کو ایک بار ہارٹ اٹیک ہو چکا تھا اور...... اور ہم اسے سرجری کے لیے لے گئے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے اسے ہلاک کیا ہے۔"

☆☆☆

"یہ ایک بہت سادہ اور واضح نااہلیت کا کیس ہے؟" اٹارنی ڈیوڈ رین سم نے فائل بند کرتے ہوئے کہا۔ فائل پر ایلن اوبرائن کا نام لکھا تھا۔ اٹارنی نے ساگوان سے بنی ڈیسک کے دوسری جانب اپنے مؤکلان کی جانب دیکھا۔ پیٹرک اوبرائن اور میری اوبرائن...... دونوں کے بالوں میں سفیدی کا رنگ غالب تھا۔ چہرے اترے ہوئے تھے۔ لباس اوسط درجے کا تھا۔ ایلن، ان کی واحد اولاد تھی۔ پیٹرک اوبرائن کبھی اپنی پیاری بیٹی کی اچانک موت کے صدمۂ جانکاہ سے غمناک ہو جاتا اور کبھی غصے میں آجاتا۔

"مسٹر اوبرائن۔" اٹارنی رین سم نے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ میں آپ کے غم کا حقیقی مداوا کسی طرح نہیں کر سکتا، تاہم جہاں تک ہو سکا میں اپنی بہترین کاوش کروں گا۔"

پیٹرک اوبرائن نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہمیں پیسا نہیں چاہیے۔ اگرچہ میں اپنی کمر کی تکلیف کے باعث تقریباً معذور ہو چکا ہوں لیکن ایلن نے انشورنس کرا رکھی تھی...... اور......"

"پالیسی کتنی مالیت کی ہوگی؟" رین سم نے سوال کیا۔

"پچاس ہزار ڈالر۔" میری نے پہلی مرتبہ لب کشا کیے۔ "وہ اتنی پیاری بچی تھی۔ ہمیشہ ہمارے بارے میں سوچتی تھی۔" میری پہلے ہی آہ وزاری کر چکی تھی۔ لگتا تھا کہ اسے اپنے شوہر کی نسبت کچھ قرار مل گیا ہے۔ تاہم غم واندوہ اس کی پوری شخصیت پر چھایا ہوا تھا...... وہ ایک دم مزید بوڑھے ہو گئے تھے۔

رین سم، ان دونوں کی اذیت اور اشتعال کو خوب سمجھ رہا تھا۔ اس کے نزدیک یہ ایک اوپن اینڈ شٹ کیس تھا۔ جسے وہ بہت آسانی سے جیت سکتا تھا۔ دونوں میاں بیوی نے صاف کہہ دیا تھا کہ چاہے انہیں ایک پیسا نہ ملے لیکن وہ ذمے داران کی ناک رگڑنا چاہتے ہیں۔ جنہوں نے ان کی اکلوتی بیٹی کو مار دیا تھا۔

اپنے پیشے کے تقاضے کے تحت اٹارنی ڈیوڈ رین سم نے بہرحال ان کے لیے ہرجانے کا دعویٰ کرنا تھا۔ اس نے دونوں کی اجازت سے چند ضروری سوالات کیے۔ مثلاً ایلن کی جاب، عمر، تنخواہ...... کیا وہ شادی شدہ تھی وغیرہ وغیرہ۔ پھر وہ ایلن کی میڈیکل ہسٹری کی جانب آیا۔ اس نے میڈیکل چارٹ کی نقول کو سامنے رکھا جس کے مطابق ایلن کی عمر اکتالیس برس تھی اور وہ صحت مند حالت میں تھی۔ بس اسے ایک عام سی سرجری کی ضرورت تھی۔ جس کا تعلق پتے سے تھا۔

"کیا آپ کی بیٹی کو کبھی دل کی تکلیف رہی تھی؟"

"کبھی نہیں۔"

"اس نے کبھی سینے میں تکلیف یا سانس کی روانی میں شکایت محسوس کی ہو؟"

"یہ ممکن نہیں۔ ایلی (ایلن) طویل فاصلے کی تیراک تھی۔ اسے ایسی کوئی شکایت نہیں تھی۔ یہ ممکن ہی نہیں۔" دونوں نے ہارٹ اٹیک کی کہانی پر یقین کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

"لیکن EKG کے مطابق یہ تشخیص ہوا ہے، مسز اوبرائن۔ ہمیں اس کی اثابت جانچنے کے لیے آٹوپسی کی ضرورت پڑے گی لیکن میرے خیال میں آٹوپسی کے لیے دیر ہو گئی۔ ہمارا مقصد پورا نہیں ہو سکے گا۔"

"دل کا مریض کیونکر تیراکی کر سکتا ہے؟ جہاں تک ریکارڈ کی بات ہے، وہ آپ جانیے۔ آٹوپسی کی ضرورت کیوں ہوگی...... وہ پہلے ہی میری بچی کو کاٹ چکے تھے......"

کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔

"بس انہیں ایسا سبق ملے کہ وہ زندگی بھر نہ بھولیں کہ کسی کی اولاد کی کیا قیمت ہوتی ہے۔" پیٹرک اوبرائن نے غصے سے کہا۔

رین سم نے ایک بار پھر انہیں دلاسا دیا اور یقین دلایا کہ وہ اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کرے گا۔

دونوں کے رخصت ہونے کے بعد اس نے گہری سانس خارج کی۔ وہ جذباتی کیفیت سے باہر آنا چاہ رہا تھا جو اس کی سوچ پر اثر انداز ہو رہی تھی، اس کی شہرت بے داغ تھی۔ یہ کیس اس کے لیے آسان تھا لیکن وہ اپنے مزاج کے تحت کسی سقم کو نظر انداز کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ بحیثیت ایک انسان وہ بہرکیف دونوں میاں بیوی کی کیفیات سے متاثر ہوا تھا۔

چھ دن قبل ایک ڈاکٹر سے مہلک غلطی کا ارتکاب ہوتا ہے اور ایک اکتالیس سالہ صحت مند مریضہ اس چوک کے

باعث اس دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے جو اپنے بوڑھے والدین کا واحد سہارا ابھی تھی۔ اکتالیس برس کا مطلب وہ اب بھی خود اٹارنی رین سم سے تین سال چھوٹی تھی۔

رین سم اپنی نشست پر سیدھا ہو گیا اور وہ فزیشنز کا بائیوڈیٹا دیکھنے لگا۔ ایک ڈاکٹر گائے سائیمنی اور دوسری ڈاکٹر کیتھرائن (کیٹ) شیزنی۔

اڑتالیس سالہ سرجن، ڈاکٹر گائے سائیمنی کا ریکارڈ غیر معمولی تھا۔ ہارورڈ سے سند یافتہ سرجن اپنے کیریئر کی چوٹی پر تھا۔ اس کے مضامین جن رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں، صرف ان ہی کی تعداد اتنی تھی کہ فہرست کو سمونے کے لیے پانچ صفحات بھرے گئے تھے۔ اس کی تحقیق کا دائرہ کار ہیماٹنک فزیالوجی تھا۔ آٹھ برس میں ایک مرتبہ اسے عدالت کا سامنا کرنا پڑا تھا اور وہ مقدمہ بہ آسانی جیت گیا تھا۔ سرجن کو نشانہ بنانا فضول تھا۔ ویسے بھی رین سم کا ہدف، اینستھیسیالوجسٹ کیٹ شیزنی تھی...... ڈاکٹر کیٹ کا ریکارڈ بھی متاثر کن تھا۔ عمر تیس سال۔ شائع شدہ مضامین کی فہرست، متاثر کن۔ کیٹ نے مڈ پیک اسپتال کو گیارہ ماہ قبل جوائن کیا تھا۔

ڈیوڈ رین سم نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔ اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی تھی۔ یہ کسی عطائی کا پروفائل نہیں تھا۔ شاندار ریکارڈ کسی طرح معمولی سی غلطی سے لگا نہیں کھا رہا تھا۔ ریکارڈ چیخ رہا تھا کہ کیٹ سے اتنی بنیادی غلطی سرزد نہیں ہو سکتی۔

رین سم نے فائل بند کر دی۔ وہ کیا کر سکتا تھا۔ حقیقت غیر متنازع تھی اور کیٹ کے لیے دفاع میں کچھ نہیں تھا۔ مریضہ، سرجن کے آلات جراحی کے نیچے، کیٹ کی غلطی کی وجہ سے ہلاک ہوئی تھی۔ کیٹ کو خمیازہ بھگتنا ہی پڑے گا۔ کیس بوڑھے میاں بیوی کے حق میں تھا۔

☆☆☆

جارج بیٹن کورٹ، ڈاکٹرز کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتا تھا۔ یہ اس کے ذاتی خیالات تھے۔ مخصوص مزاج و خیالات کے باعث، بحیثیت CEO، اسپتال میں اس کا کام مزید دشوار ہو گیا تھا۔ مڈ پیک اسپتال میں، چیف ایگزیکٹو کی حیثیت میں اسے دس برس بیت گئے تھے۔ اس نے ایم بی اے کے علاوہ پبلک ہیلتھ میں ماسٹرز کیا ہوا تھا۔ پرانی انتظامی ٹیم کے برعکس اس نے تن تنہا، مڈ پیک کے جامد وجود میں نئی روح پھونک دی تھی۔ مڈ پیک (غیر اہم اسپتال) سے قابل قدر منافع بخش ادارے میں تبدیل ہو چکا تھا۔

اس کے باوجود سینئرز ڈاکٹرز کی ٹیم، نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھی۔ بیٹن کورٹ کے نزدیک سفید کوٹ والے ڈاکٹرز احمق تھے...... وہ اس بات کو نہیں سمجھ پائے تھے کہ زندگیاں بچانا بھی کاروبار کا حصہ ہوتا ہے۔ بیٹن کورٹ کے لیے سفید کوٹ والے بھوت، لگا ہے لگا ہے، دردِ سر کا باعث بنتے رہتے تھے۔ اس وقت جو ڈاکٹر، بیٹن کورٹ کے سامنے میز کی دوسری جانب بیٹھا تھا، اس کا نام ڈاکٹر ایوری تھا اور بیٹن کورٹ کو دردِ سر کے بجائے دردِ شقیقہ محسوس ہو رہا تھا۔ عمر رسیدہ ڈاکٹر ایوری خاصا ڈرپوک تھا۔ اپنے سائے سے بھی بدکنے والا...... ایسا آدمی کسی متنازعہ مسئلے میں کیا ساتھ دیتا...... وہ چیف اینستھیسیا تھا۔ سفید بالوں والا ڈاکٹر ایوری، بیوی کے عارضہ قلب کے باعث مزید گم صم رہنے لگا تھا اور اپنی ڈیوٹی مشینی انداز میں پوری کرتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے کوئی روبوٹ کام کر رہا ہے۔

باوجود اس کے، بیٹن کورٹ کے لیے وہ موجودہ صورت حال میں اہم آدمی تھا اور بیٹن کورٹ کو اس کی ضرورت تھی۔ کیونکہ اسپتال کی ساکھ داؤ پر لگ چکی تھی۔ لیکن بیٹن کورٹ کے خدشے کے تحت، بڑا مسئلہ نئی ڈاکٹر تھی، جسے وہ پوری طرح جانتا بھی نہیں تھا۔

کیٹ نے جیسے ہی اس کے آفس میں قدم رکھا، بیٹن کورٹ نے خطرے کی بو سونگھ لی۔ تجربہ اور چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اس کا خدشہ درست ثابت ہونے والا ہے۔ اسے توقع نہیں تھی کہ ڈاکٹر کیٹ کی شکل میں اسے کسی حسینہ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اگرچہ کیٹ کی براؤن زلفیں بکھری ہوئی تھیں اور ہونٹ بھی لپ اسٹک سے بے نیاز تھے۔ تاہم بیٹن کورٹ کے لیے کیٹ کی مقناطیسی آنکھیں ہی اسے پرکشش ثابت کرنے کے لیے کافی تھیں۔ کیٹ کی آنکھوں کی فطری چمک بتا رہی تھی کہ وہ شکاری نہیں تو شکار بھی نہیں ہے۔

”ڈاکٹر کیٹ، وکیل کی جانب سے یہ خط آج صبح موصول ہوا ہے۔“ اس نے چند کاغذات ڈیسک پر کیٹ کے سامنے رکھے۔ ”یہ ذاتی پیغامبر کے ذریعے دستی ترسیل ہے۔“

کیٹ نے خط کی پیشانی پر نظر ڈالی تو اعصابی ہیجان میں مبتلا ہو گئی۔ ”اوہارا اینڈ رین سم، اٹارنی ایٹ لاء۔“ اوہارا اینڈ رین سم کا شمار چوٹی کی لاء فرم میں ہوتا تھا۔

بیٹن کورٹ بغور کیٹ کے تاثرات پڑھ رہا تھا۔ ”تم

اور اسپتال دونوں پر "نااہلیت" کا مقدمہ دائر ہونے والا ہے۔ ڈیوڈ رین سم بذاتِ خود کیس ہینڈل کرے گا۔" ہینٹن نے کیٹ پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ درحقیقت کیٹ کا گلا خشک ہو گیا تھا۔ اس نے گھنیری پلکیں اٹھائیں۔

"لیکن...... لیکن وہ یہ کیسے کر سکتے......"

"انہیں محض ایک وکیل اور ایک لاش کی ضرورت ہے۔" ہینٹن کورٹ نے کہا۔

"میں وضاحت کر چکی ہوں۔" کیٹ نے سر گھما کر ڈاکٹر ایوری کو دیکھا۔ "آپ کو یاد ہے......؟"

"ڈاکٹر ایوری سے میں ڈسکس کر چکا ہوں۔" ہینٹن کورٹ نے قطع کلامی کی۔ "اس وقت مسئلہ یہ نہیں ہے۔"

"پھر کیا مسئلہ ہے؟"

برجستہ سوالیہ فقرے نے ایک لمحے کے لیے ہینٹن کورٹ کو گڑبڑا دیا۔ اس نے سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی۔

"مسئلہ یہ ہے کہ ملین ڈالر کا "لا سوٹ" فائل ہونے جا رہا ہے۔ بحیثیت آجر کے دھر جانے کی ذمے داری ہم پر عائد ہوگی۔ لیکن صرف رقم ہی کا معاملہ باعثِ تشویش نہیں ہے...... اس سے بڑھ کر، مسئلہ ساکھ کا ہے۔" ہینٹن کورٹ نے خشک لہجے میں کہا۔

کیٹ خاموش رہی۔ وہ جانتی تھی کہ کیا ہونے والا ہے۔ اس نے ہاتھ مٹھیوں کی شکل میں بھینچ کر گود میں رکھ لیے۔

"یہ لا سوٹ، اسپتال کے لیے برا شگون ثابت ہو گا۔" وہ پھر بولا۔ "ٹرائل شروع ہو گیا تو بات پریس/میڈیا تک جائے گی اور پھر پبلک میں...... لوگ باتیں بنائیں گے اور اسپتال سے دور بھاگیں گے۔" ہینٹن کورٹ نے نیچے ڈیسک پر کاغذات کو دیکھا۔ "مجھے احساس ہے کہ تمہاری اب تک کی کارکردگی قابلِ قبول ہے۔"

کیٹ کی گردن تن گئی۔ "قابلِ قبول؟" وہ چیخ پڑی۔ اور ڈاکٹر ایوری کو گھورا۔

ایوری اپنی نشست میں کسمسایا اور نظریں چرائیں۔ "ویل...... دراصل، ڈاکٹر شیزنی کی کارکردگی...... گڈ، ویری گڈ۔" وہ گویا کراہ اٹھا۔ "میرا مطلب ہے...... قابلِ قبول سے زیادہ......"

"خدا کے لیے مرد بنو۔" وہ تصور میں چلا اٹھی۔ "تم جانتے ہو کہ میری کارکردگی بے مثال رہی ہے۔"

"کبھی کوئی شکایت نہیں آئی۔" ایوری نے جھکی ہوئی آواز میں بات ختم کی۔ وہ دونوں سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔

"بہرحال جیسے بھی کہہ لو۔" ہینٹن کورٹ نے بات آگے بڑھائی۔ "تمہاری وجہ سے ہمیں ایک حساس صورتِ حال کا سامنا ہے۔ ڈاکٹر کیٹ اسپتال کے بہترین مفاد میں ہے کہ تمہارا نام اسپتال کے نام کے ساتھ جڑا نہ رہے۔"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں کہیں کہیں ایوری کی دبی دبی کھانسی کی آواز شامل تھی۔ وہ ڈیسک کو تک رہا تھا۔

"ہمیں تمہارے استعفے کا انتظار ہے۔" بالآخر ہینٹن کورٹ نے بلی کو تھیلے سے باہر نکالا۔

کیٹ کو جھٹکا لگا...... جیسے کوئی طوفانی لہر ٹکرائی ہو۔ تاہم اس نے مستحکم آواز میں کہا۔ "اور میں انکار کر دوں پھر؟"

"ڈاکٹر، یقین کرو، تمہارے لیے بھی یہ ایک بہتر آپشن ہے...... بجائے اس کے کہ ہم......"

"برطرف...... مطلب ڈس مس کر دیں؟" کیٹ نے جملہ مکمل کیا۔

ہینٹن کورٹ نے سر ہلایا۔ "ہم ایک دوسرے کو سمجھ رہے ہیں نا؟"

"نہیں۔" کیٹ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

کیٹ کی آنکھوں میں یقین اور سرکشی دیکھ کر وہ اندر ہی اندر تلملایا۔ "نہیں، تم مجھے سمجھنے میں قطعی ناکام رہے ہو۔"

کیٹ کے ذہن میں ہینٹن کورٹ کے لیے ناپسندیدگی کا عنصر بڑھ چکا تھا۔

"تم ایک قابل ڈاکٹر ہو۔" ہینٹن کورٹ نے پینترا بدلا۔ "تم اپنے بہتر آپشن کو ذہن میں رکھو۔ ہم کسی صورت میں تمہیں آپریشن تھیٹر میں واپس نہیں لے سکتے۔"

"یہ ٹھیک نہیں ہے۔" ایوری نے اعتراض کیا۔

"کیا مطلب؟"

"اس طرح نکالنا درست نہیں...... چینلز کو استعمال......"

"مجھے اچھی طرح پتا ہے پراپر چینلز کا۔ مجھے امید تھی کہ ڈاکٹر کیٹ صورتِ حال کو سمجھتے ہوئے بہتر فیصلہ کرے گی۔" اس نے کیٹ کی جانب دیکھا۔ "ڈاکٹر کیٹ کو سمجھنا چاہیے کہ اس طرح اس کے ریکارڈ پر کوئی داغ نہیں آئے گا۔ صرف یہ معلوم ہوگا کہ اس نے یہاں سے استعفیٰ دیا تھا۔ میں ایک گھنٹے میں لیٹر ٹائپ کروا دوں گا۔ ڈاکٹر کیٹ نے صرف دستخط......" کیٹ کی آنکھوں کا تاثر دیکھ کر ہینٹن کورٹ جملہ مکمل نہ کر سکا۔

کیٹ شاذونادر ہی مشتعل ہوتی تھی۔ عموماً وہ اپنے
جذبات کو سختی سے قابو میں رکھتی تھی لیکن اس وقت جو طوفان
تہ سے اٹھ کر سطح آب پر آیا، وہ خود اس کے لیے اجنبی اور
خوفناک تھا۔ اس کی آواز میں ہلاکت خیز سکون کروٹ لے
رہا تھا۔ ”مسٹر بیٹن کورٹ، اپنے کاغذات اور اپنے
مشورے اپنے پاس محفوظ رکھو۔“
بیٹن کا جبڑا، جملہ مکمل کیے بغیر کھٹ سے بند ہو گیا۔
”تمہارا فیصلہ ہے۔“ وقفے سے وہ بولا۔ ”اوری،
میٹنگ کب ہے؟“ بیٹن کورٹ خاصا چپ گیا تھا۔
”منگل...... لیکن......“
”اوبرائن کیس، ایجنڈے پر رکھو۔“
کیٹ نے بدقت تمام مزید کچھ کہنے سے خود کو باز
رکھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی پوزیشن نازک ہے۔ ضابطے کی
کارروائی کے دوران بیٹن کورٹ نے اگر کوئی بدنما لیبل اس
پر چسپاں کر دیا تو مستقبل اندھیروں کی نذر ہو جائے گا۔
تاہم اس نے نگاہ نیچی نہیں کی، خود کو سمیٹ کر رکھا اور پُروقار
انداز میں ہاتھ ملا کر رخصت ہوئی۔ کیٹ نے نکلتے وقت اپنی
چال بھی ہموار رکھی۔ لفٹ تک پہنچی۔ اندر قدم رکھا پھر نیچے
جاتے ہوئے کوئی نازک شے اس کے وجود میں چھن سے
ٹوٹ کر بکھر گئی۔ وہ لفٹ سے نکلی تو جسم لرز رہا تھا۔
لابی میں وہ باہر آ کر آگے چل پڑی۔ وہاں کی
آوازیں اسے سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ نہ افراد دکھائی
دے رہے تھے۔ حقیقت کا ادراک سونامی کی لہر بن کے
پوری قوت کے ساتھ اس کے وجود سے ٹکرایا تھا۔ ابھی
پریکٹس شروع کیے، اسے بمشکل سال ہوا تھا اور اس پر
”نااہلیت“ کا مقدمہ ہونے جا رہا تھا۔ وہ دوسروں کے
مقدمے جان کر حیران ہوتی تھی کہ ان کی زندگی کس خوفناک
طریقے سے تباہ ہوتی ہو گی...... کبھی نہیں سوچا تھا خواب اور
گمان میں نہیں تھا کہ کیریئر کے آغاز میں ہی خود اس پر یہ
مصیبت آنے والی ہے۔
معاً وہ لابی میں موجود فونز کی قطار کے قریب تھم گئی۔
وہ خود کو سمیٹتے ہوئے فون ڈائریکٹری کو دیکھ رہی تھی۔ کچھ سوچ
کر اس نے ڈائریکٹری کی ورق گردانی شروع کی...... اوبارا
اینڈ رین سم، اٹارنی ایٹ لا کا آفس، شپ اسٹریٹ پر تھا۔
کیا انہیں حقائق کا پتا ہے؟ کیا وہ ان کو قائل کر سکتی
ہے؟ اس نے خود سے سوال کیا اور ڈائریکٹری کا وہ صفحہ ہی
پھاڑ کر سفید کوٹ کی جیب میں اڑس لیا۔

☆☆☆

”مسٹر رین سم مصروف ہیں۔“ استقبالیہ ڈیسک پر
موجود خاتون نے ٹکا سا جواب دیا۔
”لیکن مجھے ان سے ملنا ہے۔“ کیٹ نے اصرار
کیا۔
”ڈاکٹر، میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ وہ میٹنگ میں
ہیں۔ ملاقات ممکن نہیں ہے۔“
صبر کی دیوار میں ارتعاش نمودار ہونے لگا۔ کیٹ نے
ڈیسک پر دونوں ہاتھ رکھ دیے۔ ”میٹنگ قیامت تک جاری
نہیں رہے گی۔“
”یہ میٹنگ رہے گی۔“ خاتون نے خشک لہجے میں
کہا۔
کیٹ مسکرائی۔ ”تو میں بھی قیامت تک بیٹھی
ہوں۔“
”ڈاکٹر، وقت ضائع مت کرو۔ تعارف کے مطابق
تمہارا تعلق مقدمے کے دفاع سے ہے اور مسٹر رین سم وکالتی
پارٹی سے ملاقات نہیں کرتے...... مجھے ناخوشگوار قدم
اٹھانے پر مجبور مت کرو۔“ فون کی گھنٹی نے اس کی توجہ کھینچ
لی۔ فون ریسیو کرتے ہوئے اس نے کیٹ کی جانب پشت کر
لی تھی۔
”اوبارا اینڈ رین سم؟...... اوہ یس، مسٹر میتھیو......
مس فائلز دیکھ کر بتاتی ہوں......“
کیٹ نے بے قراری سے اطراف میں دیکھا۔ قیمتی
فرنیچر، پینٹنگز......
کاروبار خوب چل رہا ہے۔ کیٹ نے خود سے سرگوشی
کی۔ دفعتاً ملی جلی آوازوں نے اسے چونکا دیا۔ کیٹ نے
رخ بدلا۔ کانفرنس روم سے ایک گروپ برآمد ہوا۔ عورتیں
اور مرد دونوں شامل تھے۔
رین سم کون ہو سکتا ہے؟ کیٹ نے چہروں کی چھان
بین کی۔ کوئی چہرہ فرم کے سینئر پارٹنر کی نمائندگی نہیں کر رہا
تھا۔ کیٹ نے گردن موڑ کر بحث کرنے والی اڑیل خاتون
پر نگاہ ڈالی، وہ اسی طرح پیٹھ پھیرے مشغول تھی۔ پلک جھپکتے
اسے ایک خیال آیا اور کیٹ نے عمل بھی کر ڈالا۔ وہ تیزی
سے قدم بڑھاتی ہوئی کانفرنس روم تک پہنچ گئی۔ دروازے
میں وہ رکی۔ کچھ فاصلے پر کمرے کے اندر ساگوان کی وزنی
میز کے ایک جانب چرمی نشستوں کی قطار تھی۔ دوسری جانب
ایک تنہا آدمی میز کے عقب میں بیٹھا تھا۔ اس کی توجہ
کاغذات کی جانب تھی۔ اس نے کیٹ کی موجودگی کو محسوس
نہیں کیا۔

کیٹ نے خود کو سنبھالا۔ ”مسٹر رین سم؟“

اس آدمی نے سر اٹھا کر کیٹ پر نگاہ ڈالی۔ اس کے تاثرات متوازن تھے۔ ”ییس؟ تم کون ہو؟“

”میں......“

”معذرت خواہ ہوں، مسٹر رین سم۔“ اچانک استقبالیہ کلرک ڈیسک والی خاتون نے عقب سے مداخلت کی اور آواز نیچے رکھتے ہوئے غصے سے بڑبڑائی۔ ”میں نے تم سے کیا کہا تھا۔ تمہاری سمجھ میں نہیں آرہا۔ چلو میرے ساتھ۔“ اس نے کیٹ کا بازو پکڑ لیا۔

”مجھے صرف چند منٹ باتیں کرنی ہیں۔“

”کیا میں گارڈز کو طلب کروں؟“ اس نے دانت پیسے۔

کیٹ نے بازو چھڑا لیا۔ ”ہاں، شوق سے طلب کرو۔“

”یہ کیا تماشا ہے؟“ رین سم کی بلند آواز کانفرنس روم میں گونج اٹھی۔ دونوں چونک کر خاموش ہوگئیں۔

رین سم براہ راست کھوجنے والی نظر سے کیٹ کو دیکھ رہا تھا۔ ”تمہارا نام؟“

”ڈاکٹر کیٹ شیرنی۔“ کیٹ نے بحالی اعتماد کے ساتھ کہا۔

رین سم کی پیشانی پر لکیر نمودار ہوئی۔ ”اوہ سمجھا۔“ وہ دوبارہ کاغذات کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ”مسز براؤن، ڈاکٹر کو باہر کا راستہ دکھائیے۔“ اس نے سامنے دیکھے بغیر سپاٹ آواز میں کہا۔

”میں صرف چند حقائق بتانا چاہتی ہوں۔“ کیٹ اڑی ہوئی تھی۔ دوسری طرف مسز براؤن کو گویا وارنٹ ہاتھ آگیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے کیٹ کو باہر کی جانب دھکیل رہی تھی۔

”تم حقائق جاننا ہی نہیں چاہتے؟ کیا تمام وکلا کا یہی انداز ہے...... پیسا کمانے کے لیے تم لوگ سچائی سے منہ پھیر لیتے ہو...... تم بھی ان میں سے ایک ہو...... تم یہ جاننا ہی نہیں چاہتے کہ ایلن ادبراؤن کے ساتھ درحقیقت کیا ہوا تھا؟“ کیٹ تقریباً چلا اٹھی۔

رین سم نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ وہ سرد نگاہوں سے کیٹ کو گھور رہا تھا۔ ”مسز براؤن، آپ جائیے۔“

مسز براؤن پیچ و تاب کھاتی ہوئی واپس چلی گئی۔ دروازہ بند ہوگیا۔ کمرے میں خاموشی کا طویل وقفہ در آیا۔

”ڈاکٹر، مسز براؤن کو حیران کر کے تم ایک کارنامہ انجام دے چکی ہو اور اب وہیں کھڑی رہو گی؟“ بالآخر ڈیوڈ رین سم نے کرسی کی جانب اشارہ کیا۔ رین سم کے انداز نے کیٹ کے تناؤ کو کم کرنے کے لیے کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ وہ قدم بہ قدم کرسی کی طرف بڑھی۔ وہ اس کے ہر قدم پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔

کیٹ اس کی پوزیشن اور ساکھ سے آگاہ تھی۔ اسے توقع تھی کہ رین سم کوئی عمر رسیدہ شخص ہوگا۔ اس کی عمر واضح طور پر پچاس سے بھی کم نظر آرہی تھی۔ ٹائی سے لے کر لباس تک ہر چیز ذوق اور قیمت کی نشاندہی کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ، تاثرات، چوڑے شانے...... پوری شخصیت متاثر کن تھی۔ خاص طور پر اس کی نیلگوں آنکھیں۔ وہ آنکھیں جیسے کیٹ کا ایکسرے کرنے میں مصروف تھیں۔

دوسری جانب رین سم کے تصور میں ڈاکٹر کیٹ کے بایو ڈیٹا کے مطابق ایک شبیہ تھی۔ وہ غلط نکلی تھی۔ سامنے موجود کیٹ شیرنی، تصوراتی کیٹ سے قطعی مختلف تھی۔

”میں یہاں چند حقائق بیان کرنے آئی ہوں، مسٹر رین سم۔“

”حقائق...... جو تمہاری نظر میں ہیں۔“

”حقائق...... جیسے وہ ہیں۔“ کیٹ نے برجستگی کا مظاہرہ کیا۔

اگر وہ دفاعی پارٹی نہیں ہوتی تو ”بہت خوب“ کے الفاظ رین سم کی زبان سے ادا ہو جاتے۔ بجائے اس کے، اس نے بریف کیس میں سے ادبراؤن کیس کی فائل نکال کر میز پر رکھی۔

”جن کی مجھے ضرورت ہے، وہ تمام حقائق یہاں موجود ہیں۔“ اس نے فائل کی جانب یوں اشارہ کیا جیسے کہہ رہا ہو کہ تمہاری بربادی کا تمام انتظام مکمل ہے۔

”ہر چیز یہاں ہے، اس فائل میں۔“

”ہر چیز نہیں ہے۔“

”اگر نہیں ہے تو تم کیا نئی بات مجھے بتاؤ گی؟“

”جو بتاؤں گی، وہی سچ ہے۔“

”اوہ، بتاؤ لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارے اٹارنی کو علم ہے کہ تم یہاں موجود ہو؟“

”اٹارنی؟ میں نے کسی اٹارنی سے بات نہیں کی۔“

”تو پھر جلدی کرو، اٹارنی کا بندوبست کر لو۔ تمہیں ضرورت پڑنے والی ہے۔“

”ضروری نہیں ہے...... یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے، مسٹر رین سم...... اگر تم سن لو تو مجھے یقین ہے۔“

"ایک منٹ۔" رین سم نے اسے اشارہ کیا اور بریف کیس میں سے کیسٹ ریکارڈر برآمد کیا۔ ریکارڈر آن کر کے اس نے میز پر کیٹ کے سامنے رکھ دیا۔ "میں نہیں چاہوں گا کہ کوئی معمولی سی بات بھی ادھر ادھر ہو جائے۔ اب اپنی کہانی سناؤ، سمجھو کہ میرا پورا وجود ایک کان ہے۔"

کیٹ کے کان گرم ہو گئے۔ اس نے ریکارڈر آف کر دیا۔ "یہ کوئی عدالتی بیان نہیں ہے۔ ہٹاؤ اسے ایک طرف۔"

چند لمحوں کے لیے فضا میں تناؤ کی کیفیت طاری رہی۔ نیلگوں تیز آنکھیں، سبز آنکھوں کے راستے دماغ میں اتر رہی تھیں۔ مجبوراً رین سم نے ریکارڈر واپس رکھ دیا۔ کیٹ نے پہلی مرتبہ فتح مندی کا مبہم ذائقہ چکھا۔

"ہم کہاں تھے؟" اس نے شائستگی سے کہا۔ "ہاں، شاید تم بتا رہی تھیں کہ در حقیقت ہوا کیا تھا۔"

کیٹ نے ناپ تول کر بولنا شروع کیا۔ "ہو سکتا ہے کہ میں بہت شاندار نہ ہوں لیکن میں اناڑی بھی نہیں ہوں۔ میں اپنے کام میں بہت احتیاط سے کام لیتی ہوں اور میرا اب تک کا ریکارڈ بے مثال ہے...... اس کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ ایسی احمقانہ غلطی کی توقع کوئی بھی مجھ سے نہیں کر سکتا۔ اور ایلین تو ہماری اسٹاف ممبر تھی...... میری دوست بھی تھی۔ میں نے اپنی ذمے داریاں ہمیشہ سے زیادہ احتیاط سے پوری کی تھیں۔ EKG کا مطالعہ ایک سے زیادہ مرتبہ کیا۔ ایلین میری وجہ سے پُرسکون تھی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ ہر چیز نارمل ہے یا نہیں۔"

"اور تم نے بتایا کہ ہر چیز نارمل ہے؟"

"ہاں میں نے ایسا ہی کہا۔ کیونکہ یہ حقیقت تھی۔ یہی سچ تھا۔"

"لیکن EKG؟" رین سم نے فائل کی جانب اشارہ کیا۔

"وہ غلط کہہ رہا ہے۔"

"لیکن یہ دستاویزی ثبوت ہے جس پر تمہارے دستخط ثبت ہیں۔" رین سم نے پختہ آواز میں کہا۔

کیٹ نے دونوں ہاتھ میز پر دائیں بائیں رکھے اور آگے جھکی۔ "یہ وہ رپورٹ نہیں ہے۔"

رین سم نے یوں دیکھا جیسے اسے سننے میں مغالطہ ہوا ہو۔

"میں نے جو EKG رپورٹ دیکھی تھی، وہ نارمل تھی۔" کیٹ نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"پھر یہ چارٹ میں کیسے آ گئی؟ تمہارا مطلب ہے کہ یہ جعلی ہے؟"

"ہاں کسی نے اصل کی جگہ اسے وہاں رکھا تھا۔"

"کس نے؟"

"یہ میں نہیں جانتی۔"

"ہونہہ...... میں نہیں کہہ سکتا کہ تم کورٹ میں کیا حاصل کر سکو گی؟"

"مسٹر رین سم، اگر میں غلطی کرتی تو سب سے پہلے جو ہستی اسے تسلیم کرتی...... وہ بھی میں ہی ہوتی۔"

"یعنی تم غیر معمولی حد تک ایماندار ہو۔" اس کی آواز میں ہلکا طنز سا تھا۔

"کیا تم واقعی یہ سمجھ رہے ہو کہ میں ایک احمقانہ کہانی لے کر آئی ہوں؟"

وہ ہنس پڑا۔ "مجھے یقین ہے کہ تم کوئی اور قابلِ یقین بات بتاؤ گی۔ یہ جاننے کے لیے میں شدت سے منتظر ہوں کہ چارٹ میں EKG کا صفحہ کیسے اول بدل ہو گیا؟" رین نے طنزیہ انداز میں کہا۔

کیٹ کے رخسار جل اٹھے۔ "میں کیا کہہ سکتی ہوں؟"

"کم آن ڈاکٹر، مایوس مت کرو۔"

"میں نے کہا، کچھ نہیں ہے۔ میں کسی کا نام نہیں لے سکتی۔ نہ جانتی ہوں ایسا کیونکر ہوا؟"

"کوئی اندازہ؟"

"شاید کسی اجنبی سیارے سے کوئی ایلین وہاں آیا ہو۔" کیٹ ترخ اٹھی۔

"گڈ تھیوری۔" اس کی آواز میں کوئی تاثر نہیں تھا۔ اس نے EKG کا صفحہ نکال کر سامنے رکھ دیا۔ "وضاحت کرو، اس پر تمہارے دستخط ہیں۔"

"میرے نہیں ہیں۔"

"کیا مطلب...... یہ جعلی دستخط ہیں؟"

کچھ دیر دونوں میں تکرار جاری رہی......

"ٹھیک ہے۔ فرض کر لیتے ہیں کہ تم درست کہہ رہی ہو...... تو پھر EKG تبدیل کرنے کی دو ہی ممکنہ وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی تمہارا کیریئر اور مستقبل تباہ کرنا چاہتا ہے۔"

"مضحکہ خیز بات ہے۔ میرا کوئی دشمن نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ اور دوسری وجہ...... ممکنہ وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ......" وہ رک گیا۔ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے

کو دیکھ رہے تھے۔ کوئی ایسا ہے جو کسی قتل کی نشانیاں مٹانا چاہتا ہے۔''

دوسرا امکان سن کر وہ دنگ رہ گئی۔ رین سم نے اس کے تاثرات دیکھے تو مسکرایا۔ ''ظاہر ہے کہ دوسرا امکان بھی ہم دونوں کے لیے مضحکہ خیز ہے...... پھر میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ تم غلط بیانی سے کام لے رہی ہو...... اب تم مجھے بتاؤ کہ وہاں کیا ہوا تھا؟''

کیٹ اسے گھورتی رہی۔ اس کی نیلی آنکھوں سے جگنو سے نکلتے ہوئے محسوس ہوئے...... نیلے رنگ کے روشن جگنوؤں نے کیٹ کے گرد ہالہ بنا لیا۔ دفعتاً کیٹ پر تحیر خیز انکشاف ہوا کہ وہ محض ایک کھردرا وکیل نہیں بلکہ وجیہہ مرد بھی ہے۔ کیٹ کی سوچ کا زاویہ بے قابو ہونے لگا...... وہ بے اختیار ہونے لگی...... نیلی آنکھوں میں تو بلا کی کشش تھی۔ وہ ایک غیر اختیاری کیفیت کا شکار ہو رہی تھی۔

''تم کیا بتاؤ گی۔ تمہارے پاس کوئی جواب نہیں۔'' رین سم اس کی کیفیت سے بے خبر اسے خاموش دیکھ کر بولا۔ نیلے جگنو یک لخت غائب ہو گئے۔ تاہم وہ خاموش رہی۔

''میں بتاتا ہوں۔'' رین سم نے فائل کھولی اور آواز کی دستاویزی فلم چلا دی۔ ہر بات میں کاغذی ثبوت کا ناقابلِ تردید سہارا موجود تھا......

رین سم نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی، وہ اکتایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ''یہ آسان تر نہیں ہوگا کہ تم اپنی غلطی تسلیم کر لو۔'' اس نے کہا۔

''آسان تر؟ کس کے لیے؟''

''سب کے لیے...... کورٹ سے باہر سمجھوتا...... تیز، آسان اور نسبتاً کم تکلیف دہ۔''

''آؤٹ آف کورٹ...... لیکن مجھے وہ غلطی تسلیم کرنی پڑے گی، جو مجھ سے کبھی سرزد نہیں ہوئی۔''

رین سم کی کھوپڑی چیخ گئی۔ پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ ''ٹرائل میں جانا ہے۔ اوکے، ڈاکٹر...... فائن۔ جب میں کیس لیتا ہوں تو اسے درمیان میں نہیں چھوڑتا۔ تم اسپتال میں نہیں کورٹ میں کھڑی ہو گی۔ جہاں تمہارا سامنا ڈیوڈ رین سم سے ہوگا، وہاں پھر میری حکومت ہو گی۔ تمہارے پاس ایک فیصد چانس بھی نہیں ہے، تمہارے چاروں طرف...... ہر طرف آگ ہی آگ ہو گی اور کوئی تمہیں ایک قطرۂ آب تسلیاں دینے والا نہ ہوگا۔''

کیٹ کا دل چاہا کہ اٹھ کر اسے گردن سے دبوچ لے۔ وہ بیٹھی رہی۔ اس بات کا کسی کو احساس نہیں ہے کہ ایلن کے جانے کا غم ہی میرے لیے بہت تھا۔ سونے پر سہاگا یہ مقدمے بازی...... معاً اس کا غصہ اس کی توانائی بہ سرعت تحلیل ہوتی چلی گئی۔ احساسِ بے بسی...... آشفتگیِ دل و جان نے دفعتاً اسے نڈھال کر دیا۔ یکایک کائنات درہم برہم ہو گئی۔

وہ اپنی نشست گاہ میں گر سی گئی۔ ''کاش واقعی میں نے...... غلطی کی ہوتی اور اسے تسلیم کر لیتی۔'' اس کی آواز بکھر گئی۔

''کاش میں مجرم ہوتی اور کہہ سکتی کہ میں سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں...... گزشتہ سات دن تک میں بھٹکی ہوئی روح کے مانند سرگرداں و پریشاں خدا کو پکارتی رہی کہ یہ کیسے ہوا...... ایلن مجھ پر بھروسا کرتی تھی اور اس نے میری نگرانی میں دم توڑ دیا...... اسی وقت میں بھی ٹوٹ گئی تھی۔ پھر میں نے خواہش کی...... کاش میں ڈاکٹر ہی نہ بنی ہوتی...... کچھ اور بن جاتی...... ویٹرس بن جاتی۔ کلرک بن جاتی...... کچھ بھی۔ مجھے اپنے کام سے محبت ہے۔ تم نہیں سمجھ سکتے، یہ کتنا دشوار ہے کہ میں گھٹنے ٹیک دوں یا...... شعبۂ طب سے دستبردار ہو جاؤں۔'' اس کی آواز ٹوٹ گئی۔ چہرہ دھواں دھواں تھا۔ سبز آنکھوں کی چمک دھندلا گئی...... حاصل سے کم نہیں غم حاصل بھی......

کیٹ نے کلام کرنے کی کوشش کی اور سر جھکا لیا۔ یہ اعترافِ شکست تھا۔ وہ بے بسی، بے چارگی، غم و اندوہ، سوز و گداز کی سوگوار بے جان تصویر میں ڈھل گئی۔

رین سم دل میں اٹھنے والے جذباتی طوفان کو دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے اپنے اندازوں پر بڑا ناز تھا۔ چہرے اور آنکھیں اسے فریب نہیں دے سکتی تھیں۔ وہ جتنی دیر بولتی رہی۔ رین سم اس کی سبز آنکھوں میں جھوٹ کا سراغ لگانے کی سعیِ لاحاصل میں مصروف رہا اور جھوٹ اداکاری کا ذرہ بھر عنصر پانے میں بھی ناکام رہا۔ سبز آنکھیں ترشے ہوئے زمرد کی جوڑی تھی۔

وہ وکیل تھا۔ ایک پیشہ ور وکیل پہلی مرتبہ اسے لگا کہ وہ جذباتی کیفیت سے باہر آنے کے بجائے بھنور میں گھرتا جا رہا ہے۔ اس کے چاروں طرف شوریدہ سر لہریں تھیں...... سبز رنگ کی لہریں۔ وہ سبز بھنور سے باہر آنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اور ڈوبتا جا رہا تھا۔ کیٹ کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ کیوں چاہ رہا ہے کہ وہ سر اٹھائے...... کیا سبز رنگ کے لیے؟ دفعتاً انکشاف ہوا کہ وہ وکیل نہیں ہے بلکہ ابھی کچا ہے......

نہیں تو پتہ ہے۔ اس نے کبھی جینا چاہا تھا۔ مسکتا حسن سوگوار نہیں دیکھا تھا۔

کوئی تصور میں چلایا...... تو لٹ گیا۔ نظارۂ حسن ذات نے لوٹ لیا...... جلوہ گری نے لوٹ لیا۔ چاند، کہکشاں، یہ گل، یہ بوٹے...... نیرنگی صفات نے لوٹ لیا۔ اس کے دل نے کہا کہ اٹھ کر کیٹ کا سر بلند کر دے، اس کا پرانا، تیکھا بانکپن اسے لوٹا دے۔

وہ اٹھتا کیسے؟ وہ تو سبز بھنور سے لڑ رہا تھا۔ بیشتر اس کے، وہ کبھی نہ ابھرنے کے لیے ڈوب جاتا۔ اس نے اندازے سے پانی کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ہاتھ کے تصادم سے گلاس میز پر لڑھک گیا۔ گلاس خالی تھا لیکن معمولی آواز بھی دھماکا ثابت ہوئی۔ سناٹے کی چادر چاک ہوئی۔ سبز لہریں غائب ہو گئیں۔ دونوں ایک ساتھ چونکے اور رین سم نے خجالت کے ساتھ رومال نکالا۔ اس کی پیشانی بھیگی ہوئی تھی۔ سبز آنکھوں میں الجھن تھی لیکن وہ دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔

چند ساعت بعد اس نے بریف کیس سنبھالا اور کھڑا ہو گیا۔ ”مجھے تاخیر ہو گئی...... کورٹ پہنچنا تھا۔“

کیٹ بھی کھڑی ہو گئی۔ اس نے قدم بڑھائے۔

”مسٹر رین سم۔“ مدھم نرم آواز نے اس کے قدم پکڑ لیے۔

”وہاٹ؟“ اس نے پلٹ کر دیکھنے کی غلطی نہیں کی۔

”میں جانتی ہوں کہ میری کہانی پر کوئی یقین نہیں کرے گا۔ لیکن میں قسم کھاتی ہوں...... کہ میں نے سچ کہا ہے۔“

وہ پلٹا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ کیٹ مایوسی کے عالم میں دو بول سننا چاہتی ہے کہ رین سم نے اس کی بات سمجھ لی ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ اس نے کیٹ کی باتوں پر یقین کیا ہے یا نہیں۔ اس کے لیے یہ بڑی عجیب اور پریشان کن بات تھی...... یہ پریشانی کیٹ کی شخصیت اور اندازے سے بڑھ کر ان دو زمرد نما آنکھوں نے پیدا کی تھی۔ وہ براہِ راست سبز آنکھوں میں دیکھنے سے کترا رہا تھا۔ ”ڈاکٹر، میرے یقین کرنے یا نہ کرنے سے کیا فرق پڑے گا۔“ وہ رخ پھیر کر دروازے سے نکل گیا۔

☆☆☆

ڈیوڈ رین سم گھر کے قریب موجود قبرستان میں تھا۔ وہ ایک قبر کے پاس کھڑا تھا۔

لوحِ مزار: رین سم

عمر۔ سات سال

اس نے بیٹھ کر قبر پر سے پتے ہٹائے۔ وہ تصور میں بیٹے سے باتیں کر رہا تھا پھر وہ کھڑا ہو گیا...... رخ پھیر کے واپسی کا ارادہ کیا۔ ”میں قسم کھاتی ہوں۔“ ایک نسوانی آواز تصور میں در آئی۔ اس نے سر جھٹکا اور کار کی جانب بڑھ گیا۔

کچھ دیر بعد قبرستان کے قریب موجود ماں کے گھر میں تھا۔

”قبرستان سے آ رہے ہو؟“ اس کی اڑسٹھ سالہ ماں نے استفسار کیا۔

”آپ کو تو پتا ہے۔“

”بیٹا، تم ایک بات بھول جاتے ہو۔“

”کیا؟“

”نوحا کی خواہش تھی کہ اس کا کوئی بھائی ہوتا۔“

”اوہ، مام اب آپ شادی کے لیے کہیں گی۔“

”بالکل ٹھیک۔ ایک شاندار لڑکی پکڑو اور......“

”مام آپ جانتی ہو میرا جواب...... مجھے دوبارہ شادی نہیں کرنی۔“

”جانتی ہوں لیکن آج تم مجھے اپنا مسئلہ بتا دو۔“

معاً دو سبز آنکھیں اس کے تصور میں ابھرنے لگیں۔

وہ کورٹ سے نکلنے کے بعد بھی ادبرائن کیس کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔

”کہاں کھو گئے؟“ اس کی ماں نے سوال کیا۔

”شادی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔“ رین سم نے جھوٹ بولا۔

”کوئی پسند آئی؟“ ماں نے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ ”جلدی کرو...... کب تک سوچتے رہو گے؟“

”ٹھیک ہے ماں، ابھی تو چلتا ہوں۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔

”کہاں؟“

”اپنے گھر۔“

☆☆☆

ایلن کی باڈی آخری رسومات کے لیے سرد خانے سے نکال لی گئی تھی۔

اجتماع میں گاہے گاہے سسکیوں کی آواز شامل ہو جاتی۔ اسپتال کے اکثر لوگ وہاں موجود تھے...... ڈیوڈ رین سم بھی شریک ہوا تھا۔ کیٹ، سوگوار لباس میں قدرے ہٹ کر کھڑی تھی۔ ڈیوڈ اور کیٹ نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا تھا...... واپسی میں کسی نے بھی کیٹ کے قریب رکنے کی کوشش نہیں کی۔ ایلن کے والدین نے تو اس پر نگاہ تک

نہیں ڈالی۔ ڈاکٹر اپوری جھٹکا تھا پھر آگر بڑھا کے آگے بڑھ گیا۔ ڈیوڈ رین سم کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک ابھر کر ڈوب گئی۔ وہ بھی گزرتا چلا گیا۔ تاہم دل ہی دل میں اس نے کیٹ کی ہمت کی داد دی کہ ناموافق حالات میں اس نے وہاں آنے کی جرأت کی تھی۔

سب سے آخر میں کیٹ نے حرکت کی اور گاڑی کی طرف بڑھی۔ ڈیوڈ اپنی کار کی طرف جارہا تھا۔ دفعتاً اسے کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ کیٹ کا پرس گر گیا تھا۔ وہ نڈھال انداز میں جھک کر اپنی چیزیں سمیٹنے لگی۔

ارادے کے برخلاف رین سم کے قدم اس کی جانب اٹھنے لگے۔ کیٹ اس کی موجودگی سے بے خبر تھی۔ وہ اس کے قریب بیٹھ گیا اور چند سکے اٹھا کر اس کی طرف بڑھائے۔

کیٹ نے اسے دیکھا اور بے حرکت ہوگئی۔

''تمہیں مدد کی ضرورت ہے؟'' وہ بولا۔

''اوہ۔''

دونوں ایک ساتھ کھڑے ہوگئے۔

''شکریہ۔'' کیٹ نے کہا۔

چند لمحے دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔ پھر کیٹ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ انجن اسٹارٹ ہوا۔ رین سم اسے جاتا دیکھتا رہا۔ وہ جانے کے لیے پلٹا ہی تھا کہ اس کی نگاہ زمین پر پڑی۔ کسی چیز پر روشنی منعکس ہورہی تھی۔ وہ سلور پین تھا۔ رین سم نے پین اٹھا کر دیکھا۔ اس پر بڑی نفاست سے نام کھدا ہوا تھا:

کیتھرائن شیزلی، ایم ڈی۔ وہ کچھ دیر پین کو گھورتا رہا۔ ساتھ کیٹ کا سراپا تصور میں لہراتا رہا۔ معاً اس نے پین ہوا میں اچھال کر مہارت سے واپس پکڑ لیا۔ پین اس کی جیب میں منتقل ہوچکا تھا۔

☆☆☆

این، بس اسٹاپ کی طرف جارہی تھی۔ پچاس ڈالر اس کی مٹھی میں دبے تھے۔ پچاس ڈالر؟ سو، ہزار، ملین ڈالرز بھی ناکافی تھے۔ اس کے ذہن میں خیالات کا جنگل اگنے لگا۔

وہ داے کی کی جانے والی بس میں سوار ہوئی اور کلاکوا پر بس چھوڑ دی۔ وہ تیزی سے اپنی رہائش گاہ کی جانب بڑھ رہی تھی۔ جوں جوں وہ بلڈنگ سے قریب تر ہورہی تھی، اس کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ ہجوم اور ٹریفک کم ہوگیا تھا۔ بلڈنگ کے قریب موڑ کاٹ کر وہ رک گئی۔ ذہن کے اندر یہ خیال جڑ پکڑ چکا تھا کہ کوئی اس کے تعاقب میں ہے۔ وہ کچھ فاصلہ طے کرکے پھر رک گئی اور پلٹ کر دیکھا، چند افراد تھے۔ اسے کوئی غیر معمولی چیز دکھائی نہیں دی۔ این کئی روز سے پریشان تھی۔

دس منٹ بعد وہ اپنے اپارٹمنٹ میں تھی۔ ضروری اشیا اس نے سوٹ کیس میں منتقل کرنا شروع کردیں۔ تاہم اس کی غیر یقینی کیفیت برقرار تھی۔ اگرچہ وہ فیصلہ کرچکی تھی کہ سان فرانسسکو، بھائی کے گھر چلی جائے۔

''ٹھیک نہیں ہورہا ہے تمہیں پولیس کے پاس جانا چاہیے۔'' خیالات کے جنگل سے سرگوشی کی شکل میں ایک شگوفہ پھوٹا۔ وہ رک گئی۔

پولیس سے کیا کہوں گی؟ اس نے خود سے سوال کیا۔ کیا اس طرح ایک معصوم زندگی برباد نہیں ہوجائے گی، وہ کمرے کے اندر چکرانے لگی۔

صرف ایک کال کی ضرورت ہے۔ تسلیم کرلو اور راز افشا کردو..... خطرات، اندیشے..... تحلیل ہوجائیں گے۔ وہ سوچ میں پڑگئی۔ معاً اس کی نگاہ آئینے پر گئی۔ ابتر حالت کے باعث خود اپنی شکل اسے اجنبی لگی۔ دفعتاً اس نے فیصلہ کرلیا۔

سوٹ کیس سے توجہ ہٹا کر اس نے فون اٹھالیا۔ اس نے کیٹ کے گھر کا نمبر ملایا۔ گھنٹی بجتی رہی۔ اس کا دل ڈوب گیا۔ مجبوراً اس نے پیغام ریکارڈ کرایا۔

''میں این رشٹر ہوں۔'' وہ بولی۔ ''پلیز، مجھے تم سے بات کرنی ہے..... ایلن کے بارے میں۔ میں جانتی ہوں کہ اس کی موت کیوں واقع ہوئی۔''

اس نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا اور انتظار کرنے لگی۔

☆☆☆

ایلن کی آخری رسومات کی ادائگی کے بعد کیٹ وہاں سے روانہ ہوئی اور بے مقصد سڑکوں پر کار دوڑاتی رہی۔ جمعے کی شب قریب تھی۔ بعدازاں وہ ایک ریسٹورنٹ میں داخل ہوئی۔ کھانا بھی بے ذائقہ محسوس ہورہا تھا۔ اس نے زبردستی کچھ نہ کچھ حلق سے اتارا۔ ادائگی کے ساتھ ٹپ چھوڑ کر وہ اٹھ گئی۔

تنہائی تھی اور کار..... وہ ایک مووی تھیٹر میں جا دھمکی۔ مووی ختم ہونے سے قبل ہی وہ وہاں سے بھی نکل کھڑی ہوئی۔ کامیڈی مووی تھی۔ تاہم ہنسنا تو دور سہی،

مسکراہٹ تک اس کے چہرے پر نمودار ہونے میں ناکام رہی۔

بالآخر اسے گھر کا رخ کرنا ہی پڑا۔ گھر پہنچی تو دس بج رہے تھے۔ وہ نصف لباس تبدیل کر کے بستر پر بیٹھ گئی۔ دفعتاً اس کی نگاہ فون پر گئی۔ ٹیلی فون میسج کا اشارہ جل بجھ رہا تھا۔ کیٹ نے اٹھ کر منسلک انسٹرومنٹ پر پلے بیک کا بٹن دبایا اور بقیہ لباس کی تبدیلی کے لیے وارڈ روب کے قریب آگئی۔

”ہیلو ڈاکٹر شیزفی، فور ایسٹ کالنگ۔ مسٹر برجر کا بلڈ شوگر 98 ہے...... ہیلو، وس از جون، ڈاکٹر ایوری کے آفس سے...... منگل کی میٹنگ چار بجے ہوگی۔ ہائے وس از ونڈ وارڈ ریلٹی...... ہمیں کال بیک کیجیے۔ ہماری فہرست یقیناً آپ کو پسند آئے گی۔“

کیٹ نے بقیہ لباس بھی تبدیل کیا۔

”...... وس از این رشٹر۔ پلیز مجھے تم سے بات کرنی ہے۔ ایلن کے بارے میں۔ میں جانتی ہوں کہ اس کی موت کیوں واقع ہوئی۔“

کلک کی آواز آئی۔ پیغام ختم ہو چکے تھے۔ ”ٹیپ آٹو میٹک ریوائنڈ موڈ پر چلی گئی۔

ادھر کیٹ پر جیسے سکتہ طاری تھا۔ گردن پر چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ اس نے رخ بدل کر فون کو دیکھا۔ دفعتاً اسے ہوش آیا۔ وہ فون کی طرف لپکی۔ ریکارڈر کا ری پلے بٹن دبایا۔ پیغامات پھر سنائی دینے لگے۔ کیٹ کی رفتارِ قلب بڑھتی جا رہی تھی۔ بدن سنسنا رہا تھا۔

”میں جانتی ہوں کہ اس کی موت کیوں واقع ہوئی۔“

”میں جانتی ہوں کہ......“

کیٹ نے جھپٹ کر فون بک اٹھائی۔ این کا نمبر اور پتا دیکھا...... وہ بار بار این کا نمبر ڈائل کر رہی تھی۔ دوسری جانب نمبر مصروف تھا۔ کیٹ نے فون پٹخا اور تیزی سے دوبارہ لباس تبدیل کرنا شروع کیا۔ دماغ میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ پل بھر میں، مختصر سے پیغام نے ایک انقلابی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ کیٹ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اڑ کر این تک پہنچ جائے۔

☆☆☆

”وائے کی کی“ کی سمت ٹریفک بمپر ٹو بمپر جا رہا تھا۔ ایسے علاقوں میں زندگی کی لہر غروبِ آفتاب کے بعد اٹھتی ہے اور بلند ہوتی جاتی ہے۔ سیاح، آف ڈیوٹی سپاہی، مقامی لوگ، نائٹ کلبس، ترنگ سنگ، رنگ برنگ، مستی

کیٹ خلافِ معمول غصے میں تھی۔ اسے یہ سب کچھ ایک وبال لگ رہا تھا۔ ہر ممکن تیزی سے وہ راستہ بنا رہی تھی۔ کئی مقام پر حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔

بالآخر وہ اپنی مطلوبہ عمارت تک پہنچ گئی۔ کار سے نکل کر وہ تقریباً بھاگتی ہوئی ایلیویٹر تک گئی۔ ایلیویٹر کا انتظار بھی گراں گزر رہا تھا۔ ایلیویٹر نیچے اور اسے لے کر پھر اوپر جانے لگا۔ وہاں وہ تنہا تھی۔ دھڑکنیں بڑھتے بڑھتے اب ہتھوڑے کے مانند چل رہی تھیں۔ وہ ساتویں منزل پر ایلیویٹر سے باہر آئی۔ کوریڈور ویران تھا۔

وہاں نیلے رنگ کا کارپٹ بچھا ہوا تھا۔ نیلی رنگت ”اڑی اڑی سی تھی۔ کیٹ نمبر 710 کی طرف جا رہی تھی۔ اس کی کیفیت اور حالِ دل عجیب تر تھا، یوں محسوس ہو رہا تھا، گویا خواب میں چل رہی ہو۔

اپارٹمنٹ نمبر 710 کا دروازہ نیم وا تھا۔ کیٹ نے رک کر آواز دی۔

”این؟“

کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے دوسری بار آواز دی پھر بے قراری سے دروازے پر ہاتھ کا دباؤ ڈالا۔ دباؤ بڑھتا گیا۔ دروازہ کھلتا گیا۔ وہ اندر قدم رکھنے سے پیشتر ہی منجمد ہوگئی۔ لیونگ روم کا منظر ایسا ہی ہولناک تھا۔ فون کا ریسیور نیچے لٹک رہا تھا۔ کرسیاں الٹ گئی تھیں۔ میگزین بکھرے پڑے تھے۔ لہو کی سرخ لکیر زگ زیگ کرتی ہوئی این کے جسم تک چلی گئی تھی۔ وہ منہ کے بل پڑی تھی۔ بلاشبہ روح کا پنچھی جسدِ خاکی سے پرواز کر چکا تھا۔ وہ ایک لاش تھی، اپنے ہی خون میں ڈوبی ہوئی۔

کیٹ پر جیسے فالج کا حملہ ہوا۔ چکر سا آیا اور اس نے سہارے کے لیے چوکھٹ پر ہاتھ رکھ دیا۔ آپریشن روم اور میڈیکل ٹریننگ کے دوران اسے ہنگامی حالات کا سامنا رہتا تھا۔ خون، لاشیں، زندگی اور موت کی کشمکش اس کے لیے انجانی نہیں تھیں لیکن موجودہ صورتِ حال نے اسے خوفناک ذہنی جھٹکا پہنچایا تھا۔

دھڑکنیں بے قابو ہوتے ہوئے ڈھول کی ڈھاڈم...... ڈم، میں ڈھل گئیں۔ ڈم...... ڈھاڈم...... ڈھاڈم...... ڈم...... اور پھولی ہوئی سانسیں۔ ہانپنے کی آواز...... نہیں، یہ اس کی سانس نہیں تھی۔ وہاں کوئی اور بھی تھا۔ جیسے کوئی جنگلی درندہ ہانپتا ہے۔ اچانک کیٹ کی نگاہ اندر آئینے پر پڑی۔ وہ ایک جھلک تھی۔ وحشی اندر تھا۔ آئینے میں

اس کا عکس تھا۔ آئینہ بلیونگ روم میں بائیں جانب تھا۔ وہ دائیں جانب ہانپ رہا تھا۔ کیٹ نے دائیں طرف چوکھٹ کا سہارا لیا تھا۔ وہ ساکت نہیں تھا۔ دائیں جانب سے جھپٹ رہا تھا۔ اس لیے عکس جھلک دکھلا کر غائب ہو گیا۔ آئینے میں لمحہ بھر کے لیے دونوں کی نظریں چار ہوئی تھیں۔ اس لمحہ اس نے منہ کھول کر کچھ کہا۔ لیکن کیٹ کی سماعت تک محض پھنکار نما آواز پہنچی تھی۔ جیسے زہریلا ناگ حملہ آور ہونے سے قبل پھنکارتا ہے۔

کیٹ کا سکتہ ٹوٹ گیا۔ اس کے پاس سیکنڈ سے بھی کم وقت تھا۔ اس نے تیزی سے چوکھٹ سے ہاتھ ہٹایا اور پھرکی کے مانند گھومی۔ یوں لگا جیسے کوریڈور دراز ہوتا ہوا میلوں تک چلا گیا ہے۔ وحشت زدہ سانسوں کی آواز بہت قریب تھی۔ اپنی ہی چیخ کیٹ کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ بے تحاشا بھاگی تھی۔ فرار کا ایک ہی راستہ تھا ایلیویٹر کا انتظار ناقابلِ تصور تھا۔ سیڑھیوں کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ بے محابا سیڑھیوں پر کودی اور دروازہ عقب میں دے مارا۔ ساتسے چھٹے فلور کی لینڈنگ پر پہنچنے سے قبل، اس کا بند کیا ہوا دروازہ عقب میں پھر کھلا۔ سماعت سے پھنکار نما آواز ٹکرائی۔ کیٹ نے دو قدم اوپر سے لینڈنگ پر جست لگائی...... ریلنگ تھام کر گھومی اور اندھا دھند دو دو سیڑھیاں طے کرنا شروع کیں۔ وہ جانتی تھی کہ قاتل کی نظر بھی آئینے پر پڑی تھی۔ وہ آگاہ تھا کہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ چکے ہیں۔ اس کی بچت اسی میں تھی کہ کیٹ کو نہ نکلنے دے۔ کیٹ بھی اس کے ارادوں سے بے خبر نہیں تھی۔ وہ دیوانہ وار پانچ سے چوتھی فلائٹ پر آئی۔ اس نے چلانا شروع کر دیا تھا۔ شاید کوئی اس کی آواز سن لے۔

قاتل آندھی کے جھکڑ کے مانند لپک رہا تھا۔ شکار اور شکاری کی جان لیوا کشمکش جاری تھی۔ تیسری منزل...... دوسری منزل...... کیٹ نے محسوس کیا کہ پھنکاریں اس کی گردن سے ٹکرا رہی ہیں۔ دہشت اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ سانس دھونکنی کے مانند چل رہی تھی۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اس نے فیصلہ کیا اور دوسری سے پہلی لینڈنگ پر براہِ راست کود گئی۔ ٹخنے میں اذیت ناک ٹیس اٹھی۔ وہ لڑھک گئی۔ زندگی داؤ پر لگی ہو تو درد کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ آٹھ سیڑھیوں بعد وہ گراؤنڈ فلور پر ہوتی۔ وہیں پر پارکنگ لاٹ تھی۔ وہ سنبھلی، دانت پر دانت جما کر جست لگائی اور گراؤنڈ فلور پر لڑھکتی چلی گئی...... اس مرتبہ شدتِ درد کے باعث اس کی چیخ بلند ہوئی تھی۔ کیٹ نے چیخوں کا گلا گھونٹا اور لنگڑاتی ہوئی ایک وین کے عقب میں بیٹھ گئی۔ چہرہ پسینے میں تر تھا۔

کیٹ نے سماعت پر زور دیا۔ وہاں سناٹا تھا اور کچھ نہیں۔ اسے اپنی طوفانی دھڑکنوں کے سوا کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ سیکنڈ گزرے...... منٹ گزرے...... سانس اور دھڑکنیں قدرے معتدل ہوئیں۔ ٹخنے کا درد اپنی جگہ پر تھا۔ کیا وہ فرار ہو گیا ہے؟ کیٹ نے سوچا، اچانک کوئی شے کنکریٹ کے فرش پر گری اور اس کا دل جنگلی گھوڑی کے مانند اچھلا۔ کیسی آواز تھی؟ کس طرف سے آئی؟ وہ تعین نہ کر سکی اور وین سے چپک گئی۔ تمام حسیات جان بچانے پر مرکوز تھیں۔ اس نے ہمت کی...... انچ بہ انچ جھکی اور وین کے نیچے سے جھانکا۔ دفعتاً وہ سانس لینا بھول گئی۔ قاتل کے پیر وین کی دوسری جانب تھے۔ وہ دبے قدموں وین کی عقبی سمت میں آ رہا تھا۔ کیٹ، ہرنی کے مانند اچھل کر گاڑیوں اور ستونوں کے درمیان چکراتی ہوئی گیٹ کی جانب بھاگی۔ پھنکار کے ساتھ قدموں کی آہٹ ابھری۔ درد کی پروا کیے بغیر وہ جان توڑ کر بھاگ رہی تھی۔ ایک منٹ سے پہلے وہ گیٹ سے نکل جانے کی...... پھیپھڑوں میں گویا چنگاریاں بھر گئیں۔

آخری ستون سے گھوم کر اس نے گیٹ کا رخ کیا۔ معاً ریمپ پر دو ہیڈ لائٹس نمودار ہوئیں۔ کیٹ کی نظر چندھیا گئی۔ کار اندر آ رہی تھی۔ لہٰذا رفتار زیادہ نہیں تھی۔ تاہم تصادم یقینی تھا۔ کیٹ نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا۔ ونڈ اسکرین کے پیچھے ایک مرد اور عورت موجود تھے۔ دونوں کے منہ کھل گئے تھے...... تصادم ہوا۔ آنکھوں میں ستارے ناچ گئے۔ اسے علم نہیں تھا کہ ٹکرا کر وہ بونٹ پر گری تھی یا ریمپ پر۔ کچھ سجھائی نہیں دیا۔ حتیٰ کہ وہ اندھیرا بھی حسِ بصارت سے پرے تھا...... جس میں وہ ڈوب چکی تھی۔

☆☆☆

اوبرائن کیس پکے ہوئے پھل کی طرح رین سم کی گود میں پڑا تھا۔ ہفتے کا دن آفس میں بہت مصروف گزرتا تھا لیکن جمعے کی شب وہ معمول کے مطابق پُرسکون نیند لینے میں ناکام رہا تھا۔ اس نے جماہی لی اور چرمی نشست پر نیم دراز ہو گیا۔ کئی برس بیت گئے تھے، رین سم نے ایسے خواب نہیں دیکھے تھے۔ وہ کھڑکی کے پاس ساکت کھڑی تھی۔ کسی ہیولے کے مانند۔ پہلے وہ سمجھا کہ وہ اس کی سابقہ بیوی لنڈا ہے...... وہ اس کے قریب چلا گیا۔ قریب...... اور قریب...... اسے احساس ہوا کہ وہ لنڈا نہیں تھی۔ اس نے

نسوانی ہیولے کوشاخوں نے پکڑ کر کھایا۔ پتا نہیں مدھم روشنی کہاں سے آگئی۔ سبز روشنی نے زمرد نما سبز آنکھوں کو نمایاں کر دیا۔ پھر وہی سبز لہریں...... اٹھلاتی...... مچلتی...... اس کے گرد چکرانے لگیں۔ بھنور بنتا گیا، وہ ڈوبتا گیا...... اس مرتبہ وہ باہر نہیں آنا چاہتا تھا۔ اک نشہ تھا...... خمار تھا...... مدہوشی تھی...... کیف تھا...... سرور تھا...... بے خودی تھی...... سرمستی تھی۔ یک لخت، بھنور نابود ہو گیا۔

اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔ ڈوب سکا نہ ڈوب سکا۔ وہ کیٹ شیزنی تھی...... وہ کئی بار جو خواب ہوا اور ہر مرتبہ اک ہی خواب؟

اب وہ نشست میں پڑا خود کو ڈانٹ رہا تھا...... بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا، لاشعور پر کس کی گرفت ہے؟ لیکن اس وقت تو وہ حالتِ شعور میں تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ نوعمر لڑکوں کے مانند افیئر چلانے کی ٹھنی ہے۔ اس نے خود کو سمجھایا۔ وہ بھی اپوزیشن کے ساتھ؟

کیٹ نے تو ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا تھا۔ وہ وکلاء سے متنفر تھی اور رین سم ڈاکٹرز کے خلاف۔ وہ جارحانہ آئی تھی اور شکست کھا گئی تھی۔ کتنی ہی خواتین اس کے آفس میں آتی جاتی رہی تھیں...... پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ اک کھردرا وکیل تھا۔ اگرچہ یہ کھردرا پن بھی آب سے دور رہتا تھا۔

رین سم نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کیٹ کا پین نکالا۔ اسے یہ پین واپس کرنا چاہیے اور اس کے لیے اسے ٹریک اسپتال جانا پڑے گا۔ جو بہت زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اس نے ڈیسک پر بکھرے کاغذات کی جانب دیکھا...... سوچتا رہا۔ پھر فون پر اسسٹنٹ کو طلب کر لیا۔ اسسٹنٹ کو ضروری ہدایات دے کر وہ نکل گیا۔

بیس منٹ بعد وہ اسپتال کی لابی میں تھا۔

''میں ڈاکٹر کیٹ سے ملنا چاہتا ہوں۔ کیا وہ اسپتال میں ہیں؟''

''ڈاکٹر کیٹ شیزنی؟'' آپریٹر نے وقفے سے کہا۔

''ہاں، وہ اسپتال میں ہیں۔ آپ کون؟''

وہ نام بتاتے ہوئے رک گیا۔ کہیں نام جان کر کیٹ انکار ہی نہ کر دے۔ ''میں دوست ہوں۔'' اس نے الجھن کے ساتھ مبہم جواب دیا۔

''پلیز، ہولڈ آن۔'' انتظار کے دوران ایئر پیس میں موسیقی سنائی دیتی رہی۔ رین سم نے بے صبری محسوس کی۔ اچانک اسے خود پر غصہ آیا۔ وہ نوعمر لڑکوں کے مانند بے قرار تھا۔ وہ جانے کے لیے پلٹا تو متحیر رہ گیا۔

پولیس کے دو آدمیوں نے اس کا راستہ روک لیا تھا۔

''مائنڈ نہ کریں تو ہمارے ساتھ آئیے۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔

''میں ضرور آتا۔'' رین سم نے منہ بنایا۔

''ہمیں دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔''

''وہاٹ؟'' رین سم چیخنے لگا۔ ''کیا ظلم کر دیا میں نے...... ڈبل پارکنگ؟ یا تمہارے والدین کی شان میں گستاخی کی ہے؟''

جواب میں انہوں نے دائیں بائیں سے رین سم کے بازو تھام لیے اور لابی سے ایڈمن ونگ کی جانب بڑھے۔

''یہ گرفتاری ہے یا کچھ اور؟'' رین سم سنجیدہ ہو گیا۔

جواب نہ ملنے پر وہ پھر بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم دونوں میرے قانونی حقوق سے مجھے آگاہ کر دو...... او کے۔ میں خود بتاتا ہوں۔'' وہ حیران تھا۔ بالآخر اس نے اپنا ترپ کا پتا نکالا۔ ''میں ایک وکیل ہوں۔''

''ایسا ہے تو شاید تم کلی ہو۔'' ایک نے کہا۔

''چارجز بتاؤ، ورنہ تم دونوں پھنس جاؤ گے۔'' رین سم کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔

''ہم صرف حکم کی تعمیل کر رہے ہیں۔'' انہوں نے کانفرنس روم کا دروازہ کھولا۔

''کس کا حکم؟''

''میرا حکم؟'' کسی نے جواب دیا۔

رین سم نے جواب دینے والے کو دیکھا۔ آواز شناسا تھی۔ وہ ڈیٹیکٹیو پوکی تھا...... ہومی سائیڈ ڈیٹیکٹیو۔ رین سم اسے کافی عرصے بعد دیکھ رہا تھا۔

''اوہ، ڈیوی...... تم یہاں؟'' پوکی نے بھی اسے پہچان لیا۔

''ہاں، منع ہے یہاں آنا؟'' رین سم نے جھٹکا دے کر بازو چھڑائے۔

پوکی نے سر ہلا کر اشارہ کیا۔ ''سب ٹھیک ہے، اپنی جگہ پر جاؤ۔'' وہ دونوں چلے گئے۔ دروازہ بند ہو گیا۔

''کیا تماشا ہو رہا ہے؟'' رین سم نے آنکھیں دکھائیں۔

جواب میں پوکی نے قریب تر ہو کے رین سم کے سراپا کا جائزہ لیا۔

''بہت خوب، پرائیویٹ پریکٹس میں لوٹ مچی ہوئی ہے کیا؟ کیا سوٹ ہے، اور یہ قیمتی جوتے...... اٹالین ہیں؟ واہ واہ......''

’’تمہاری ترقی کیوں نہیں ہوئی کیا؟ پچیس برس ہو گئے ہوں گے؟‘‘

’’26 سال۔‘‘ پوکی نے کہا۔’’17 سال ہوئی سائڈ میں...... آخری ترقی چند برس پہلے تمہارے سامنے ہوئی تھی...... گفوریا کیس یاد ہے؟‘‘ پوکی نے استفسار کیا۔

’’ہاں۔‘‘

’’لیکن حالات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ وہی پرانی کار، وہی جوتے۔‘‘ اس نے ٹانگیں آگے کیں۔ ’’تائیوان کے ہیں۔‘‘

’’یہاں کیا ہو رہا ہے؟ کچھ بتاؤ گے یا نہیں؟‘‘

’’تم ڈاکٹر کیٹ شیزنی کے دوست ہو؟‘‘

رین سم اس اچانک سوال کے لیے تیار نہیں تھا۔

’’ہاں، جانتا ہوں اس کو۔‘‘

’’کتنی اچھی طرح؟‘‘

’’کئی بار اس کے ساتھ گفتگو رہی۔ میں اس کا چین واپس کرنے کی نیت سے یہاں آیا تھا۔‘‘ رین سم نے احتیاط سے کہا۔

’’یعنی تم نہیں جانتے کہ رات اسے ایمرجنسی روم میں لایا گیا تھا۔ ٹراما سروس۔‘‘

’’وہاٹ؟‘‘ رین سم کی آواز بے اختیار بلند ہو گئی۔

’’سنجیدہ بات نہیں ہے۔ آج اسے ڈسچارج کر دیا جائے گا۔‘‘ پوکی نے سگریٹ سلگائی۔

رین سم کے اعصاب تن گئے۔

’’خاصی مصیبت کھڑی ہوتی نظر آ رہی ہے۔ نہ کوئی کلیو ہے۔ نہ فائل بند کی جا سکتی ہے۔‘‘

’’کیٹ کے ساتھ کیا ہوا؟‘‘ رین سم نے آواز کو معتدل رکھنے کی کوشش کی۔

’’وہ غلط وقت پر غلط جگہ پہنچ گئی تھی۔‘‘ پوکی نے دھوئیں کا بادل فضا میں چھوڑا۔ ’’وہ جائے واردات پر تھی۔ خطرناک جگہ پر......‘‘

’’تمہارا مطلب وہ شاہد یعنی شاہد...... وٹنس؟ لیکن کس واردات کی؟‘‘

پوکی نے وقفے کے ساتھ طویل کش لیا، پھر بولا۔ ’’مرڈر۔‘‘

☆☆☆

رات وہ بمشکل تھوڑی بہت نیند لے سکی تھی۔ صبح ہو چکی تھی۔ رات کا واقعہ اسے بھیانک خواب لگ رہا تھا جس نے کیٹ کو نچوڑ کے رکھ دیا تھا۔ نقاہت کا عالم تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ اب وہ سو جائے گی۔ صدمے کے اثرات بہت حد تک ختم ہو گئے تھے لیکن کمزوری......

معاً اسے لگا کہ دروازے پر دستک ہوئی ہے۔ دستک کے بعد وقفہ ہوا...... پھر دروازہ کھل گیا۔ کیٹ نے زور دے کر بوجھل پلکوں کو اٹھایا۔ اس نے رین سم کو اندر آتے دیکھا۔ کیٹ نے غصے کی لہر محسوس کی لیکن کمزوری کے باعث غصے کے آثار ظاہر نہیں ہوئے۔ وہ نڈھال تھی جو کہنا چاہتی تھی کہہ نہ سکی۔ رین سم بھی لب بستہ تھا۔ گویا دونوں گنگ تھے۔

’’یہ اچھی بات نہیں ہے مسٹر رین سم۔‘‘ کیٹ نے سرگوشی کی۔ ’’تم ایک لڑکی کو اس وقت دق کرنے آئے ہو جبکہ وہ ابتر حالت میں ہے...... ویری بیڈ۔‘‘ کیٹ نے منہ پھیر لیا۔

’’پلیز کیٹ، خاموش رہو۔‘‘

وہ چونک اٹھی۔ رین سم نے صرف اس کے نام کا پہلا حصہ استعمال کیا تھا۔ یہ غیر رسمی انداز تھا۔ ان کے درمیان ایک ان دیکھی رکاوٹ حائل تھی جو دفعتاً گر گئی۔ وہ نہیں جان سکی، ایسا کیونکر ہوا۔ صرف اتنی آگہی تھی کہ وہ اس کے بہت نزدیک ہے۔ آفٹر شیو کی بھینی بھینی خوشبو اور نیلگوں تیکھی ہوئی آنکھوں...... نگاہوں کی حدت اسے محسوس ہو رہی تھی۔

’’تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میں تمہیں تنگ کرنے نہیں آیا۔ مجھے نہیں آنا چاہیے تھا لیکن مجھے پتا چلا کہ رات کیا ہوا تھا...... تب میں نے سوچا...... سوچا......‘‘

کیٹ نے گردن موڑی۔ رین سم گونگوں کے مانند اسے تک رہا تھا۔ یہ تو کوئی اور ہے۔ یہ وہ نہیں تھا جسے کیٹ نے آفس میں دیکھا تھا۔ کوئی چیز بدل گئی تھی...... کچھ بدل گیا تھا۔ اور برائن کیس کے حوالے سے دونوں حریف تھے۔ لیکن کیٹ پہلی مرتبہ، اس کی موجودگی میں تحفظ محسوس کر رہی تھی۔ دیدہ ہوں کہ دید؟ نظارہ ہوں یا محو نظارہ ہوں؟ آخر یہ تماشا کیا ہے؟ کیٹ کی خودسری نے کروٹ لی۔ کیوں آنکھ اٹھاؤں، کس کا جلوہ دیکھوں...... سوچ کا انداز پھر بدلا...... رین سم کے گرد ہمیشہ کی طرح توانائی اور اعتماد کا ایک ہالہ تھا۔ اگر وہ اس کے ساتھ کھڑا ہوتا، بجائے مخالف سمت کے تو کیٹ پر یقین تھی کہ وہ کوئی کیس نہیں ہارتی۔ کسی بھی لڑائی میں کوئی اسے شکست نہیں دے سکتا تھا لیکن رین سم کیوں اس کے ساتھ کھڑا ہوتا۔

’’تم کچھ کہہ رہے تھے؟‘‘ کیٹ نے نرمی سے کہا۔

’’میں معذرت خواہ ہوں۔‘‘ اس نے بالوں میں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

انگلیاں چلا گئیں۔ ”میں تمہارے آرام میں مخل ہوا ہوں نا؟“

اس نے دروازے کی جانب دیکھا۔

”کیوں آئے تھے؟“

وہ خوامخواہ ہنس دیا۔ ”میں بھول گیا تھا۔ یہ واپس کرنا بھول گیا تھا۔“ اس نے پین نکال کر کیٹ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ کیٹ سحر زدہ سی ہاتھ کو دیکھ رہی تھی...... اپنے نہیں، اس کے ہاتھ کو۔ معاً کیٹ کی قوتِ متخیلہ بیدار ہوئی۔ تصور میں رین سم کے مضبوط ہاتھ کی انگلیاں کیٹ کی براؤن زلفوں میں رینگنے لگیں۔

”تھینک یو۔“ کیٹ نے سرگوشی کی اور سر تکیے پر گرا دیا۔

اس کے ایک رخسار پر نیلگوں خراش تھی۔ جسے دیکھ کر رین سم نے دھچکا محسوس کیا۔ غیر متوقع طور پر وہ جذباتی ہو گیا۔ نامعلوم آدمی پر اسے شدید غصہ آیا، جس نے کیٹ کی یہ حالت کردی تھی۔ وہ اسپتال میں نیم جان پڑی تھی۔

اس نے کرسی اٹھا کر بیڈ کے قریب رکھی اور بیٹھ گیا۔

”کیسا محسوس کر رہی ہو؟“ کچھ نہیں سوجھا تو اس نے سادہ سوال کیا۔ رکنے کا بہانہ تلاش کیا۔

کیٹ کے لبوں پر نہایت دھیمی مسکراہٹ ابھری۔ ”خوش قسمت ہوں کہ زندہ ہوں...... بہت بدشکل لگ رہی ہوں۔“ اس نے چھت کو گھورتے ہوئے لاشعوری طور پر چہرے کی خراش چھپانے کی کوشش کی۔ رین سم نے افسردگی کو ظاہر ہونے سے روکا۔

”کیٹ تم ٹھیک ہو...... اچھی لگ رہی ہو۔ یہ خراش چند روز میں غائب ہو جائے گی۔ میری بات کا یقین کرو۔ اہم بات یہ ہے کہ تم صحیح سلامت ہو۔“

”واقعی؟“ کیٹ نے دروازے کو دیکھا۔ ”رات سے وہاں گارڈز موجود ہیں۔ وہ نرسوں کے ساتھ ہنستے بولتے رہے ہیں۔ وہ یہاں کیا کر رہے ہیں؟“

”محض احتیاطی تدابیر ہیں۔ کوئی تمہیں پریشان نہ کرے۔ وہ کسی کو نہیں آنے دیں گے۔“ رین سم نے اسے اطمینان دلایا۔

”لیکن تم کیسے آ گئے؟“ وہ الجھ گئی۔

”کیس لیفٹیننٹ پوکی کے پاس ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔“

”پھر تو اس نے بہت کچھ بتایا ہوگا؟ کیا کہتا ہے وہ؟“

”وہ کہتا ہے کہ تم عینی شاہد ہو۔ کیس میں تمہاری اہمیت بہت زیادہ ہے......“

”اور؟“

”اور...... تم فٹ ہو جاؤ تو بتاؤں گا۔“

”کیا اس نے تمہیں این رشٹر کے بارے میں بتایا۔ این نے مجھے کال کی تھی۔ رابطہ نہ ہونے پر اس نے میرے لیے پیغام چھوڑا تھا۔“

”کیسا پیغام؟ تمہارا مطلب ہے کہ قاتل کے پہنچنے سے پہلے اس نے تم سے رابطہ کیا تھا؟“ رین سم نے سنسنی محسوس کی۔

”ہاں، پیغام ایلن اور برائن سے متعلق تھا۔ آدھ میں گھر دیر سے پہنچی، میری بات نہیں ہو سکی۔ پھر میں اس کے گھر گئی تو......“ کیٹ چپ ہو گئی۔ اس کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔

رین سم کا ضبط جواب دے گیا۔ اس نے اپنا مضبوط ہاتھ کیٹ کے ریشم جیسے ہاتھ پر رکھ دیا۔ کیٹ کے ہاتھ کی خفیف سی لرزش ختم ہو گئی۔ اس نے حیرانگی سے ہاتھ کی جانب، پھر رین سم کی آنکھوں میں دیکھا۔ دونوں ایک دوسرے کی کیفیت سے بے خبر اپنی اپنی جگہ بے اختیار رہ گئے۔

”سوری۔“ رین سم نے ہاتھ کھینچنا چاہا، کیٹ کی مخروطی انگلیاں اس کی انگلیوں میں ریشمی دھاگوں کے مانند الجھ گئیں۔

رین سم نے بے یقینی سے ہاتھ کی طرف دیکھا، پھر سبز آنکھوں میں جھانکا۔ خاموشی کا طویل وقفہ در آیا۔ ہاتھوں کا لمس بول رہا تھا یا پھر چار آنکھیں تھیں...... دو ادھر اور دو ادھر...... گردوپیش سے بیگانہ ہوتے چلے گئے...... آنکھوں ہی آنکھوں میں کھو گئے۔ دونوں ڈوبتے ڈوبتے سوچ رہے تھے کہ نظر کا دھوکا ہے یا کوئی اسرار ہے جو محتاجِ شرح ہے۔ یک لحظہ بے خودی ہی سہی۔ دھوکا ہی سہی...... خوشی گوارا کر لو۔

”کیا پیغام تھا؟ میں لاعلم ہوں۔“ رین سم کو اپنی ہی آواز اجنبی لگی۔ اسے لگا کہ اس کا ایک ہاتھ مفلوج ہو گیا ہے۔ ویسا ہی لمس اس نے خواب میں بھی محسوس کیا تھا۔

کیٹ نے منفعل ہو کر نرمی سے ہاتھ کھینچا۔ ”وہ کچھ جانتی تھی۔“ کیٹ نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ ”ایلن کی موت کے بارے میں۔ قضا نے مہلت ہی نہ دی...... اف...... اسے موقع ہی نہیں ملا...... وہ مجھے بتانا چاہتی تھی۔“ کیٹ نے رک کر گہرے گہرے سانس لیے۔

”ریکارڈر میں پیغام تھا...... میں جانتی ہوں کہ اس کی

موت کیوں واقع ہوئی..... وہ مجھ سے ایلن کے بارے میں بات کرنا چاہتی تھی۔ آخری فقرہ ایسا ہی تھا۔ جیسا میں نے بتایا۔"

رین سم سناٹے میں آگیا۔

"شاید..... شاید وہ سرجری کے متعلق کچھ....." رین سم نے خیال آرائی میں وقت محسوس کی۔

"نہیں۔ پیغام بہت واضح تھا۔ اس نے "WHY" کا لفظ استعمال کیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ایلن "کیوں" مری..... "کیسے" نہیں بلکہ "کیوں"..... مطلب، اس کی موت کے پیچھے کوئی مقصد تھا۔" کیٹ نے دھیمی مگر مستحکم آواز میں کہا۔

"مرڈر؟ آپریشن ٹیبل پر؟" رین سم نے نفی میں سر ہلایا۔

کیٹ نے چہرہ دوسری طرف پھیرلیا۔ "میں بھول گئی تھی کہ تم ایک وکیل ہو اور تمہارا بیش قیمت اور برائٹ کیس خراب ہوسکتا ہے۔"

پھر خاموشی کا وقفہ۔ رین سم نے نچلا ہونٹ چبایا۔

"پولیس کا کیا موقف ہے؟" رین سم نے استفسار کیا۔

"میں کیونکر جان سکتی ہوں؟ تمہارا دوست..... کیا نام بتایا اس کا؟"

"لیفٹیننٹ بوکی۔"

"ہاں..... بوکی۔ وہ رات میری بات ہی نہیں سمجھ رہا تھا۔ اسے اپنی مشکلات کی پڑی تھی۔ کارڈز کو دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ مجھ سے کچھ چھپایا جارہا ہے..... کیا تم بھی چھپاؤ گے؟"

"میرے جو علم میں ہے' بتادوں گا۔" رین سم نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "میرے لیے کیس سے زیادہ تم اہم ہو۔" اس کی زبان پھسل ہی گئی.....

"وہاٹ؟" کیٹ کی آنکھیں پھیل گئیں پھر وہ بے ساختہ ہنسنے لگی۔ رین سم یک ٹک، حشر ساماں..... اس آفتِ جاں کو دیکھ رہا تھا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میرا مطلب تھا کہ زندگی انمول ہوتی ہے۔ میری معلومات کے مطابق قاتل نے تمہیں بھی ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔" رین سم نے کان کھجایا۔ "یہاں سے نکل کر کہاں جاؤ گی؟"

"تمہارے گھر۔"

"وہاٹ؟"

"میرا مطلب ہے کہ تمہارے گھر تو جانے سے رہی۔ میرے دوستوں کا کاٹیج ہے..... دور ساحل سمندر پر، وہ خالی پڑا ہے۔ فی الحال وہیں جاؤں گی۔"

"وہاں تنہا رہو گی؟ کیا وہ محفوظ جگہ ہے؟"

کیٹ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

رین سم نے کھوکھلے انداز میں خود کو باور کرایا کہ یہ پولیس کا مسئلہ ہے..... وہ کھڑا ہوگیا۔ گومگو کیفیت سے نکل کر دروازے کی طرف پیش قدمی کی، عقب سے ایک دھیمی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"میں نہیں سمجھتی کہ اب میں کہیں پر بھی محفوظ رہ سکوں گی۔"

☆☆☆

وہ نارتھ شور ہائی وے پر سفر کررہے تھے۔

"کاٹیج زیادہ بڑا نہیں ہے۔" ڈاکٹر سوزن ساٹھکی نے کہا۔ "چند کمرے، باتھ اور کچن لیکن تم آرام محسوس کرو گی۔"

کیٹ نے بے دلی کے انداز میں سر ہلایا۔

"ہم لوگ زیادہ استعمال نہیں کرتے۔ اسی لیے گائے کی خواہش تھی کہ کاٹیج فروخت کردیا جائے۔ تاہم میں نے ہمیشہ فروخت کی مخالفت کی تھی۔" سوزن نے گاڑی ہائی وے سے اتار کر پگڈنڈی نما کچی سڑک پر ڈال دی۔

بلند درختوں کے پیچھے پرانی طرز کا کاٹیج موجود تھا۔

کیٹ، گاڑی سے نکل کر درختوں کے پیچھے کھڑی ہوگئی۔ نیلے رنگ کے سمندر کا چمکدار پانی اور ساحلی ریت کو چومتی ہوئی لہریں..... ایک منظر خوش رنگ تھا۔ قدرتی ماحول، قدرتی فضا۔

"وہ رہے۔" سوزن نے ایک جانب انگلی سے اشارہ کیا۔ جہاں اس کا بیٹا ولیم ریت میں اچھل کود رہا تھا۔ بچے نے صرف نیکر پہنی ہوئی تھی۔ اس کے قریب تولیے پر بیٹھی ایک عورت کسی میگزین کی ورق گردانی کررہی تھی۔

"وہ ایملی ہے۔" سوزن نے بتایا۔ "اسے حاصل کرنے کے لیے ہمیں چھ اشتہارات دینے اور اکیس انٹرویوز کرنے پڑے تھے۔ تاہم میرا نہیں خیال کہ وہ ہماری توقعات پر پورا اتر سکے گی..... مسئلہ یہ ہے کہ ولیم اس کے ساتھ انسیت محسوس کرنے لگا ہے۔"

معاً ولیم کی نظر ان پر پڑی۔ "ہائے، مام۔" اس نے

چیخ کر کہا اور ہاتھ ہلایا۔

''اس کھڑکی پر آؤ۔ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ یہ منظر نہیں بھلا سکو گی۔'' سوزن نے کھڑکی سے پردہ سرکایا۔

کیٹ نے کھڑکی سے سمندر کی مچلتی لہروں کو دیکھا۔ سورج کی کرنیں ریت اور سمندر کے نیلے رنگ پر ناچ رہی تھیں۔ نیلے رنگ کے ساتھ اسے رین سم کی نیلی آنکھیں یاد آئیں۔ اس نے لاشعوری طور پر وہ ہاتھ پکڑ لیا جسے رین سم نے چھوا تھا اور باہر دیکھنے لگی۔ لہروں کی آوازوں کے ساتھ پرندوں کی آوازیں بھی تھیں۔

''میرا خیال ہے کہ تم بھی یہاں سے جانا پسند نہیں کرو گی؟'' سوزن مسکرائی۔

''نہیں کبھی نہیں۔''

''ماما...... ماما؟'' ولیم بھاگتا ہوا آیا اور سوزن کی بانہوں میں سما گیا۔ سوزن گھٹنوں کے بل بیٹھی تھی۔ اس نے ولیم کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر پیشانی پر بوسہ دیا۔

''مائی بے بی۔''

☆☆☆

''تم نے مجھے پوری بات نہیں بتائی تھی۔ میں تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔'' رین سم، پوکی کے دفتر میں تھا۔

''تمہارے سوالات سے لگتا ہے کہ تم وکالت کا پیشہ چھوڑنے والے ہو...... یہ صرف تجسس نہیں ہے۔''

''وہ میری دوست بھی ہے۔'' رین سم نے کہا۔

''بناؤ مت یار...... تم بخوبی جانتے ہو کہ میں ایک سراغ رساں ہوں۔ او برائن کیس میں وہ تمہارے مدمقابل ہے۔ تم نے مخالف پارٹیوں سے دوستیاں کرنا شروع کر دی ہیں؟''

رین سم نے اسے بتایا کہ دو دن قبل وہ کیوں اس کے آفس آئی تھی...... ''اگر یہ مرڈر ہے تو کیس پر بری طرح اثر انداز ہوگا۔ میں الجھن کا شکار ہوں۔ کیٹ کی کہانی ٹھیک معلوم ہوتی ہے اور او برائن کی فائل بھی مضبوط ہے۔ میں جیوری کے سامنے ادھوری تیاری کے ساتھ کھڑا نہیں ہو سکتا۔ مجھے تفصیلات درکار ہیں۔''

تھوڑی دیر کی ردوقدح کے بعد پوکی رضامند ہو گیا۔ تاہم وہ رین سم سے رازداری کا وعدہ لینا نہیں بھولا تھا۔

پوکی نے سگریٹ نکالی۔ ''اجازت ہے؟''

''بولتے رہو تو اجازت ہے۔'' رین سم نے جواب دیا۔

پوکی نے بتانا شروع کیا۔ درمیان میں رین سم سوال کرتا رہا...... وہ کوئی بات قلمبند کرنا نہیں چاہتا تھا، خصوصاً پوکی کے سامنے، لہٰذا وہ تمام نکات ذہن نشین کر رہا تھا۔

ایک گھنٹے بعد وہ شکریہ ادا کر کے وہاں سے نکلا اور سیدھا اپنے دفتر پہنچا۔ تیزی سے ضروری کام نمٹائے، کچھ اسسٹنٹ کے سپرد کیے پھر استقبالیہ سے کہا کہ اگلی ہدایت تک کسی کو بتایا نہ جائے کہ وہ آفس میں ہے...... دروازہ اندر سے بند کیا۔ کوٹ اتار کر ٹائی ڈھیلی کی اور کاغذ قلم لے کر ڈیسک پر جم گیا۔ کاغذ کی پیشانی پر اس نے تین نام لکھے۔

کیٹ شیزنی، پوکی اور او برائن۔

دوسری سطر میں لکھا۔ ایلن۔ این۔ ڈاکٹر ہنری ٹیمنا کا۔

تین قتل ہو چکے تھے۔ تینوں کا تعلق طب کے پیشے سے تھا۔ چوتھی کیٹ تھی جو بال بال بچی تھی۔ اگرچہ ایلن کا قتل مزید تفتیش و تصدیق کا طلب گار تھا۔

ہنری ٹیمنا کا، کا قتل دو ہفتے قبل ہوا تھا۔ قاتل ہوشیار تھا۔ دونوں جگہ اس نے کوئی کلیو نہیں چھوڑا۔ پوکی کے مطابق ٹیمنا کا اور این رشتر کا قاتل ایک ہی تھا۔ وجہ...... انداز قتل تھا۔ پوکی کی تفتیش و تجزیے کے مطابق۔ رین سم نے موٹے موٹے نکات ایک کالم میں لکھ لیے تھے۔ دوسرے کالم میں جزوی نکات لکھے تھے اور تیسرے کالم میں اپنی خیال آرائی نوٹ کر رہا تھا......

چند ہفتے قبل ڈاکٹر ہنری ٹیمنا کا کا قتل اسی کے کلینک میں ہوا تھا۔ مقام تھا ہانالولو۔ ٹیمنا کا اور این کا قتل ایک ہی انداز میں کیا گیا تھا۔ تیز دھار آلے سے دونوں کی شہ رگ کاٹی گئی تھی۔ حملہ اتنی مہارت اور تیزی سے کیا گیا تھا کہ دونوں کو مدافعت کا موقع نہیں ملا تھا۔ دونوں کا تعلق طبی شعبے سے تھا۔ این کے برعکس ٹیمنا کا کی پشت میں ایک اور زخم تھا۔

این رشتر کی خواب گاہ سے اسی رات کے لیے سان فرانسسکو کی مڈنائٹ فلائٹ کا ٹکٹ ملا تھا، وہ اچانک کیوں سان فرانسسکو روانہ ہو رہی تھی؟

جان بچانے کے لیے کیٹ نے جسم و جان سے بڑھ کر جدوجہد کی تھی۔ اسے بہت دیر بعد اسپتال میں پتا چلا کہ بھاگ دوڑ میں وہ ہینڈ بیگ وہیں گرا آئی تھی۔ پوکی کے بیان کے مطابق وہ لوگ ہینڈ بیگ تلاش کرنے میں ناکام رہے تھے۔ بیگ میں پرس، لائسنس اور گھر کی چابیاں وغیرہ تھیں۔

پوکی کے خیال میں چشم دید گواہ کو اسپتال آنا تھا۔ قاتل ہنرکار تھا۔ اس نے جائے واردات پر کوئی کلیو نہیں چھوڑا

تھا...... واحد آپشن، ڈاکٹر کیسٹ شیزنی تھی۔ پوکی کو امید تھی کہ وہ قاتل کو اسپتال میں گھیر لے گا۔

رین سم کو اس بات پر حیرت تھی کہ پوکی نے این رشٹر کے اس پیغام کا ذکر نہیں کیا تھا، جو اس نے کیسٹ کے لیے ریکارڈ کرایا تھا۔ رین سم کو یقین تھا کہ کیسٹ کذب بیانی سے کام نہیں لے رہی تھی۔ کیسٹ پر حملے اور این کے قتل کو عام انداز میں نہیں لیا جاسکتا تھا۔ ممکن ہے کہ کیسٹ کو موقع ہی نہ ملا ہو کہ وہ پوکی کو پیغام کے بارے میں بتاتی۔

رین سم پر یقین تھا کہ اگر ایلین کی موت دوران آپریشن، قتل ثابت ہوجاتی ہے تو دو باتیں ظہور پذیر ہوں گی...... اول یہ کہ "اوبرائن کیس" مشکل ہو جائے گا۔ دوسرے طبی شعبے سے متعلق یہ تیسرا قتل ہوگا...... کیا "ٹیمنا کا" بھی ماضی میں یہاں کام کرتا رہا ہے؟ نیز خونی وارداتوں کا یہ سلسلہ رکے گا یا آگے چلے گا؟ اسے یقین تھا کہ اگلا ٹارگٹ کیسٹ شیزنی ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی وہ مضطرب ہو گیا۔

☆☆☆

"تم نے مجھے پوری کہانی نہیں سنائی۔" رین سم نے شکوہ کیا۔ وہ ایک بار پھر پوکی کے دفتر میں موجود تھا۔

"آپریشن ٹھیل پر مرڈر؟" پوکی بڑبڑایا اور سگریٹ سلگا کر گہرے گہرے کش لینے لگا پھر اس نے اٹھ کر دروازہ بند کیا اور واپس اپنی کرسی پر آ گیا۔

"میرے تمہارے درمیان تمام گفتگو آف دی ریکارڈ ہے۔"

"بھروسا رکھو۔" رین سم نے یقین دہانی کرائی۔

"کیا جاننا چاہتے ہو؟"

"تفصیل۔"

"مثلاً؟"

"این رشٹر کی موت کا ایگزیکٹ ٹائم؟"

پوکی نے آٹوپسی رپورٹ کے مطابق وقت بتایا۔

رین سم سوچ میں پڑ گیا۔ "اگر یہ وقت صحیح ہے تو وہ تین گھنٹے تک وہاں کیا کرتا رہا۔"

"نشانات مٹا رہا ہوگا۔"

"یا پھر کیسٹ کا انتظار کر رہا ہو گا۔" رین سم نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟" پوکی چونک اٹھا۔

رین سم نے این رشٹر کے پیغام کے بارے میں بتایا جو موت سے قبل اس نے کیسٹ کو بھیجا تھا۔ "نشانات اور پیغام کی صفائی میں اتنی دیر نہیں لگتی...... وہ کیسٹ کا انتظار کر رہا تھا۔"

"ہاں، کیسٹ اس رات اسپتال میں پیغام کے بارے میں کچھ کہہ رہی تھی...... میں یہی سمجھا کہ وہ شاک کی حالت میں ہے......"

"کیا قاتل نے رہائش گاہ سے کوئی چیز غائب کی ہے؟"

"نہیں، کچھ نہیں۔ رقم، زیورات...... ہر شے اپنی جگہ پر تھی۔"

"جنسی حملہ؟"

"نہیں۔"

"یعنی وحشیانہ قتل بغیر کسی محرک کے۔"

"ٹیمنا کا کا شعبہ گائنی تھا۔" پوکی نے کہا۔

"اور این رشٹر نرس تھی۔" رین سم بولا۔

"ٹھیک، دلچسپ بات یہ ہے کہ OR جوائن کرنے سے پہلے این بھی گائنی میں تھی...... مطلب یہ کہ بہت امکان ہے کہ وہ نرس ٹیمنا کا سے واقف ہو۔" پوکی نے بات ختم کی۔

رین سم ساکت بیٹھا تھا بے حس و حرکت۔ وہ گائنی کی دوسری مقتول نرس کے بارے میں سوچ رہا تھا جو این رشٹر سے قریب تھی۔

"دو ہفتے قبل ٹیمنا کا بہت دیر تک اپنے کلینک میں موجود تھا۔" پوکی نے کہا۔ "تمام اسٹاف جا چکا تھا۔ اس کی بیوی کے بیان کے مطابق ٹیمنا کا اکثر تاخیر سے گھر آتا تھا۔ وہ مصروفیت کا عذر پیش کرتا تھا...... اس کی بیوی نے بھی اس عذر کو قبول نہیں کیا۔"

"یعنی کوئی گرل فرینڈ؟"

"ظاہر ہے اور کیا وجہ ہوسکتی ہے۔" پوکی نے کہا۔

"اس کی بیوی نے کوئی نام بتایا؟"

"نہیں، اس کا کہنا تھا کہ وہاں موجود نرسوں میں سے کوئی بھی ہوسکتی ہے۔ بہرحال صبح کا ذب ایک خاکروب نے ٹیمنا کا کی لاش دریافت کی۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ کوئی لٹیرا تھا...... کیبنٹ سے کچھ ڈرگز بھی غائب تھیں۔"

"منشیات؟" رین سم نے فوراً استفسار کیا۔

"نہیں۔" جواب ملا۔ "قاتل نے سستی اور غیر اہم ادویات غائب کی تھیں جن کی مارکیٹ میں خاص ویلیو نہیں تھی۔ لگتا تھا۔ یہ ایک احمقانہ حرکت معلوم ہوتی ہے۔ تاہم جس صفائی سے نشان چھوڑے بغیر اس نے واردات کی

تھی، وہ اسے احمق ثابت نہیں کرتی۔ ہمیں صرف ایک ہی
سرا ہاتھ آیا تھا...... سڑک پر کام کرنے والے خاکروب نے
ایک عورت کو بھاگتے دیکھا تھا۔ وہ پارکنگ لاٹ میں تھی۔
موسم خراب تھا۔ بارش کے ساتھ اندھیرا بھی تھا۔ تاہم اس
نے اتنا دیکھ لیا کہ اس کی زلفیں سرخ تھیں۔"
"اس اشارے سے تم نے کیا حاصل کیا؟"
"کچھ بھی نہیں۔" پوکی نے اعتراف کیا۔ "ہم نے
آس پاس چھان بین اور پوچھ گچھ کی...... کلینک نما اسپتال کو
بھی چھانا...... لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ پھر این رشٹر کا قتل ہو
گیا۔ اس کے بال بھی سرخ تھے۔ اس وقت کیٹ شیزنی
ہمارے پاس واحد "بریک" ہے۔ وہ قاتل کو دیکھ بھی چکی
ہے۔ آرٹسٹ، کیٹ کے بیان کے مطابق اسکیچ بنا رہے
ہیں۔ پھر یہ اسکیچ پیر کی صبح اخبارات میں شائع کرا دیا جائے
گا۔"
"کیٹ کے تحفظ کے لیے تم نے کیا اقدام اٹھائے
ہیں؟" رین سم نے سوال کیا۔
"وہ "نارتھ شور" پر ہے۔ ایک پٹرول کار ہر چند
گھنٹے بعد وہاں سے گزرتی رہے گی۔"
"یہ ناکافی نہیں ہے؟" رین سم نے اعتراض کیا۔
"کوئی نہیں جانتا کہ وہ وہاں پر ہے۔"
"عام آدمی نہیں جانتا ہوگا۔ پروفیشنل کے لیے کوئی
دشواری نہیں...... مزید یہ کہ کیٹ کا بیگ بھی غالباً اس کے
ہاتھ لگ گیا ہے۔ مطلب اس کی معلومات میں مزید اضافہ ہو
چکا ہے...... اس کی باخبری اس بات سے عیاں ہے کہ این
رشٹر نے جس دن سان فرانسسکو کی فلائٹ بک کی، اسی رات
این کو روانہ ہو جانا تھا۔ قاتل کی پھرتی اور معلومات مکمل
تھیں۔ اس نے بے رحمی سے اسی رات این کا کام تمام کر
دیا...... دوسری بات این کو خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔
سوال یہ ہے کہ خطرے کی نوعیت کیا تھی؟ این بہت کچھ جانتی
تھی...... ہمیں اس پیغام کو ہلکا نہیں لینا چاہیے جو اس نے
کیٹ شیزنی کے لیے چھوڑا تھا۔"
"پیغام اس نے غائب کر دیا ہے۔"
"کوئی مسئلہ نہیں ہے، کیٹ، پیغام سن چکی تھی اور اس
نے لفظ بہ لفظ مجھے پیغام سنایا ہے۔"
"تم وکالت چھوڑ کر سراغ رسانی میں کیوں نہیں
آجاتے؟"
"میں جہاں ہوں ٹھیک ہوں...... ویسے اچھا وکیل
جاسوس کے مانند ہی ہوتا ہے۔" رین سم نے جواب دیا۔
"تم اپنا منافع بخش کیس کیوں خراب کر رہے ہو؟
کیٹ کی وجہ سے؟"
"میرے اپنے کچھ اصول ہیں جن کے بارے میں
صرف میں جانتا ہوں۔ میں میرٹ پر پیسے کو ترجیح نہیں دیتا۔
مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ کیٹ نے مجھے آفس میں کنفیوز
کر دیا تھا۔ تاہم میں فیصلہ کرنے میں جلدی نہیں کرتا۔ کیٹ
سے اسپتال میں ملنے کے بعد، شک کی گنجائش نہیں رہ
جاتی......"
"کیسا شک؟"
"یہی کہ وہ بے قصور ہے۔"
"کیا تم اوبرائن کیس چھوڑ دو گے؟" پوکی نے سوال
کیا۔
"یقیناً...... اور یہ فیصلہ کرنے میں مجھے کوئی خلش نہیں
ہے۔ میرے پاس کافی شواہد اکٹھے ہو چکے ہیں۔ مجھے سو
فیصد یقین ہے کہ قاتل کا اگلا نشانہ ڈاکٹر کیٹ ہے۔ تمہارے
تعاون کا شکریہ...... بدلے میں چند باتیں اور تمہیں بتا رہا
ہوں لیکن آف دی ریکارڈ۔"
"بالکل۔" پوکی چوکس ہو گیا۔
"کیٹ نے مجھے بتایا تھا کہ EKG کا ریکارڈ کسی
نے تبدیل کر دیا تھا پھر اس نے بتایا کہ چارٹ میں جو
EKG موجود تھا، اس پر کیٹ کے دستخط نہیں تھے......
مطلب کسی نے کیٹ کے جعلی دستخط کیے تھے۔ تیسری بات
EKG کے مطابق...... مطلب جعلی EKG کے مطابق
ایلن کو دل کی تکلیف تھی اور اسے دل کا دورہ پڑا تھا...... یہ
بات غلط ہے جس کی تصدیق ایلن کے والدین اور کیٹ کے
بیان سے ہو جاتی ہے۔ تمہیں کوئی سرا ہاتھ آیا تو ذرا پیک
اسپتال کے اندر سے ہی ہاتھ آئے گا۔" رین سم کھڑا ہو گیا۔
"شکریہ، دوست۔" پوکی نے ہاتھ بڑھایا۔
"مزید یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ قاتل نے
کیونکر پتا چلایا کہ این رشٹر اچانک سان فرانسسکو جا رہی
ہے...... یا تو وہ متواتر تعاقب میں تھا...... یا اسے ائرپورٹ
سے خبر ملی...... یا پھر اسپتال سے کسی نے اسے لائن دی
ہے...... یا محض اتفاق تھا کہ وہ روانہ ہونے سے پہلے ہی
ماری گئی...... گڈ لک۔"

☆☆☆

کیٹ، ساحل پر اوندھی لیٹی سن باتھ لے رہی تھی۔
ناریل کے درختوں کی خوشبو، پرندوں اور لہروں کا شور......
اس نے ناشتے کے بعد کچھ نہیں لیا تھا اور اشتہا محسوس کر رہی

تھی۔ دفعتاً ایک اور ہی احساس نے جنم لیا۔ احساس تھا کہ وہ وہاں پر تنہا نہیں ہے۔ کوئی اور بھی اسے دیکھ رہا ہے۔ یہ احساس اتنا قوی تھا کہ وہ پلٹنے پر مجبور ہوگئی۔ کیٹ نے حیرت سے رین سم کو دیکھا۔ اس نے جینز اور کاٹن شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ شرٹ کی آستینیں اوپر چڑھی ہوئی تھیں۔ بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔

رین سم خاموش کھڑا تھا۔ دونوں ہاتھ جیبوں میں تھے۔

"تم تک پہنچنا کافی مشکل ثابت ہوا۔" بالآخر وہ بولا۔

"روپوش ہونے کا مرکزی خیال یہی ہوتا ہے کہ کوئی خفیہ مقام تک پہنچ نہ سکے۔" کیٹ نے کہا۔

رین سم نے اطراف کا بنظر غائب جائزہ لیا۔ "اچھا خیال نہیں ہے۔ یہاں سناٹے میں ساحل پر لطف اندوز ہوا جائے۔"

"ہاں شاید......" کیٹ نے بکس پر تولیا لپیٹا اور کتاب لے کر کھڑی ہوگئی۔ "کوئی بھی یہاں اچانک وارد ہوسکتا ہے...... کوئی چور، ڈاکو یا قاتل...... یا پھر کوئی وکیل۔" وہ مڑ کر چل دی۔

"کیٹ، مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"

"میرے وکیل سے کرلو۔"

"تو تم نے کسی وکیل کا بندوبست کرلیا ہے؟"

"پھر کیا کرتی کورٹ روم میں تمہارا سامنا جو کرنا ہے۔"

"کورٹ روم میں ہمارا سامنا نہیں ہوگا۔"

"افسوس ہوا سن کر۔" وہ قدم بڑھاتی رہی۔ رین سم بھی اس کے عقب میں تھا۔ کیٹ کاٹیج تک پہنچ گئی اور سیڑھیاں طے کر کے دروازہ کھولا۔

"تم نے سنا نہیں، میں نے کیا کہا؟" رین سم کی آواز بلند ہوگئی۔ "میں کورٹ نہیں جاؤں گا۔"

"کیا مطلب ہے؟"

"میں کیس چھوڑ رہا ہوں۔"

"کیوں؟"

"اندر آنے دو تو بتاؤں۔"

کیٹ، ساکت کھڑی، اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی...... قبل اس کے سبز دھیلے رنگ کا انوکھا کھیل ازخود دونوں کو بے خودی سے دوچار کرتا، کیٹ نے اسکرین ڈور وا کر دیا۔ وہ بولی کچھ نہیں...... رین سم نے قدم اندر رکھ دیا۔

کیٹ کے پیچھے پیچھے وہ کچن میں آگیا اور ڈائننگ ٹیبل کے قریب ایستادہ ہو کر کیٹ کا جائزہ لینے لگا۔ معاً کیٹ کو اپنے ناکافی لباس کا احساس ہوا۔ وہ اب تک اس بات سے آگاہ ہو چکی تھی کہ دونوں کے درمیان ایک غیر محسوس رشتہ پروان چڑھ رہا ہے۔ آفس میں وہ اسے کوئی نام نہ دے سکی تھی۔ تاہم اسپتال میں وہ واضح طور پر بے خود ہوگئی تھی اور رین سم کی سرشاری بھی دیکھ لی تھی۔ اگرچہ رین سم نے اپنے جذبات کو چھپانے کی ناکام کوششیں کی تھی لیکن کیا کیا جائے، سازِ رگِ جاں آشنائے مضراب نہیں...... اور اب یہاں اتنی دور اسے کیا چیز کھینچ لائی تھی...... یہاں پہنچنا اتنا سہل تو نہ تھا۔

"میں کپڑے تبدیل کر کے آتی ہوں۔" کیٹ نے دل کی دھڑکن کے کیف و سرور کو عیاں نہ ہونے دیا۔ اس نے پہلی مرتبہ رین سم کو جینز اور شرٹ میں دیکھا تھا۔ وہ سوٹ کی نسبت زیادہ جوان اور پُرکشش لگ رہا تھا۔

خواب گاہ میں کپڑے بدلتے ہوئے اس کے ہاتھ متوازن نہیں تھے۔ وہ کچن میں واپس آئی تو رین سم کو وہیں کھڑے پایا۔

"بیٹھ جاؤ، میں کافی بناتی ہوں۔"

وہ پریشان تھی کہ سادہ سا کام سرانجام دینے میں اسے معمول سے زیادہ توجہ صرف کرنی پڑ رہی تھی...... کیتلی میں پانی ڈال کر اسٹوو پر رکھنا بھی کوئی کام تھا...... رین سم، دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کیٹ نے پتی ڈالتے وقت جب فرش پر چھلکائی تو رین سم کو اٹھنا ہی پڑا۔

"چائے بنانا سیکھ رہی ہو؟"

"جی نہیں......"

"لاؤ، میں مدد کرتا ہوں۔" رین سم کو قریب ہونا پڑا۔ شانے سے شانہ مس ہوا۔ یوں لگا جیسے کرنٹ لگا ہو...... بقیہ پتی بھی بکھر گئی۔ کیٹ گنگ تھی۔ رین سم بھی خود سے برسرِ پیکار تھا کہ لمحے غنیمت تھے دل بیٹھنے کے...... کچھ نہ سہی تو اظہار ہی کر دے...... رین سم کو احساس ہوا کہ یہ اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ کیٹ نے نظر ملائی اور رین سم کی چرب زبانی، الفاظ کی روانی مفلوج ہوگئی۔

"کیا بات ہے؟" وہ سحر زدہ سی بولی۔

"کچھ نہیں...... چھوڑو چائے کو، یہاں ٹیبل پر بیٹھو۔" رین سم نے سنبھل کر کہا۔ حالات نازک تھے...... رومانس کی رنگینیاں، خون کی سرخی میں نہ ڈوب جائیں۔

وہ گلا صاف کر کے بولا۔ "تم مجھے ڈیوڈ کہہ سکتی ہو۔"

کیا شروع سے مسٹر رین، مسٹر رین سم کی گردان ہے۔''

''ہاں، میں جانتی ہوں۔'' کیٹ کی سانس ایک ساعت کے لیے رک گئی۔

دونوں کچھ دیر خاموش رہے۔

''کل تک تم کورٹ میں میرا تیا پانچہ کرنے کے لیے تیار تھے، اب اچانک یہ تبدیلی کیسی؟''

''پہلے مجھے شک تھا کہ تم جھوٹ بول رہی ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس بات پر بھی شک تھا کہ واقعی تم جھوٹ بول رہی ہو...... میں الجھن میں پڑ گیا...... پھر اوپر تلے ایسے واقعات/حادثات ہوئے کہ مجھے یقین کرنا پڑا کہ تم معصوم ہو۔''

''مطلب شک پر بھی شک تھا؟''

''ہاں۔'' رین سم نے جواب دیا۔

''شکریہ ڈیوڈ۔''

رین سم جھوم اٹھا اور بولا۔ ''شکریہ۔''

''کیا......'' کیٹ نے حیرت سے کہا۔ ''کیسا شکریہ؟''

''ڈیوڈ کہنے کا شکریہ۔''

''اوہ۔'' کیٹ دلفریب انداز میں مسکرائی۔

ڈیوڈ نے ایک فوٹو جیب سے نکال کر کیٹ کو دی۔

''پہچانو؟''

کیٹ فوٹو دیکھتے ہوئے سنجیدہ ہوگئی۔ ''یہ ڈاکٹر ہنری ٹیٹا کا ہے...... ہمارے گائنی ڈپارٹمنٹ میں کام کر چکا ہے...... میں ہنری کے قتل کی تفصیل کئی ہفتے قبل اسٹار بلیٹن میں پڑھ چکی ہوں...... تاہم ان کے ساتھ کام کرنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا...... لیکن......''

''لیکن یہ کہ ہنری اور این کو ایک ہی انداز میں قتل کیا گیا ہے۔''

''ہنری کے بارے میں، میں نے پڑھ لیا تھا...... کیا این......''

''ہاں، این کو بھی اسی انداز میں مارا گیا۔''

''تمہیں کیسے پتا...... میڈیا میں غالباً اتنی تفصیل نہیں ہے۔''

''میں نے ڈیٹیکٹیو پوکی سے بہت کچھ معلوم کیا ہے...... اس نے فوراً دونوں وارداتوں میں مشابہت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسپتال میں تمہاری نگرانی کی جا رہی تھی...... کیونکہ تم نے قاتل کی جھلک دیکھ لی تھی۔''

''یعنی قاتل گواہ کو ختم کرنے کے لیے اسپتال پہنچ سکتا تھا؟ لیکن کیسے؟''

''ہاں، اس کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔ جہاں تک ''کیسے'' کی بات ہے تو تم بھول رہی ہو کہ تم فرار ہوتے وقت اپنا بیگ وہیں گرا آئی تھیں۔ جو قاتل کی تحویل میں ہے...... ویسے تم ہو بہت بہادر۔''

''کب معلوم ہوا؟'' کیٹ نے سوال کیا۔

''آفس میں ہی علم ہو گیا تھا۔'' جواب ملا۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ گھوم کر کیٹ کی نشست کی پشت پر آیا اور دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیے۔ کیٹ کو رد عمل دینے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اسے لگا کہ اس کا بدن موم کی طرح پگھل رہا ہے۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔

''کیٹ!'' ڈیوڈ نے جھک کر اس کے کان کے قریب سرگوشی کی۔

''ہونہہ......'' وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

عین اسی وقت فون کی گھنٹی چیخی۔ کیٹ کسمسا کر رہ گئی۔

''ڈیوڈ......''

''کچھ نہیں ہے۔'' وہ بولا۔

''ڈیوڈ فون......'' وہ بمشکل کھڑی ہوئی۔

فون کی گھنٹی نے پھر سمع خراشی کی۔ کیٹ نے عالم ناگواری میں خود کو فون کی جانب دھکیلا اور کھنکھارتے ہوئے ریسیور اٹھایا۔

''ہیلو۔'' کیٹ نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ ابھی تک نیم مدہوش تھی۔ کیٹ کو یہ ادراک چند ثانیے کے بعد ہوا کہ دوسری جانب خاموشی تھی۔

''ہیلو۔'' اس نے پھر قدرے نارمل آواز میں کہا۔

''ڈاکٹر کیٹ؟'' کسی نے سرگوشی نما سوال کیا۔ وہ بمشکل اپنا نام سن سکی۔

''YES۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا تم تنہا ہو؟''

''نہیں۔ تم کون ہو؟'' سوال کرتے ہی اس کا گلا بند ہو گیا۔ دہشت اس کے رگ و پے میں سرایت کرنے لگی۔ دل کانوں میں دھڑک رہا تھا۔

''ہیلو؟'' وہ چلا اٹھی۔ ''تم کون ہو؟''

''ڈاکٹر کیٹ، تم خطاوار ہو...... موت ہر وقت، ہم سب کے آگے پیچھے چکراتی ہے......''

☆☆☆

ریسیور کیٹ کے ہاتھ سے پھسل چکا تھا۔ خود وہ

کاؤنٹر کے سہارے کھڑی تھی۔

"وہی تھا...... ہاں...... وہی تھا۔" وہ چلائی۔

رین سم نے ریسیور اٹھا کر ہیلو، ہیلو کہا پھر اسے کریڈل پر پٹخ دیا۔

"کون تھا؟ کیا کہہ رہا تھا؟" اس نے خوف زدہ کیٹ کو شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔

کیٹ نے اسے بتایا......

"سوٹ کیس کہاں ہے تمہارا؟"

"بیڈروم کلوزٹ۔"

رین سم بیڈروم کی طرف بڑھ گیا۔ اضطراری طور پر کیٹ بھی اس کے پیچھے گئی...... رین سم نے شیلف سے سوٹ کیس اٹھایا۔

"اپنی دیگر اشیا بھی اٹھا لو۔ تم یہاں نہیں رک سکتیں۔" رین سم نے کہا۔

کیٹ نے کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ جان گئی تھی کہ یہاں گزارا ہوا ہر ایک منٹ خطرات میں اضافہ کرتا جائے گا۔

وہ دونوں BMW میں سوار ہو کر نکلے تو کیٹ نے پہلا سوال کیا۔

"یہ کیسے ہو گیا؟ اسے کیونکر علم ہوا؟"

"وہی سوچ رہا ہوں۔" رین سم نے رفتار بڑھائی۔

"صرف پولیس جانتی ہے...... آخر یہ راز کس نے افشا کیا؟"

"تم یہاں کس کے ساتھ پہنچی تھیں؟"

کیٹ نے وضاحت کی......

"کسی نے تم لوگوں کا پیچھا کیا تھا؟"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

"یہاں آتے وقت، تم اپنے کاٹیج پر گئی تھیں...... میرا مطلب ہے کہ سوزن کے ساتھ؟"

"نہیں۔"

"پھر کپڑے کہاں سے لیے؟"

"میری لینڈ لیڈی نے سوٹ کیس میں پیک کر کے اسپتال پہنچا دیے تھے۔"

"وہ اسپتال کی لابی کی نگرانی کر رہا ہوگا...... جب تم ڈسچارج ہوئیں تو اس نے تعاقب شروع کر دیا...... کیا خیال ہے؟"

"ممکن ہے ایسا ہوا ہو۔" کیٹ نے کہا اور نشست گاہ سے پشت لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ "ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"میری رہائش گاہ پر۔"

☆☆☆

"یہاں محفوظ ہو۔" رین سم نے کہا۔

رین سم نے وہسکی کے دو جام تیار کیے۔ ایک کیٹ کے حوالے کیا اور خود فون کی جانب بڑھ گیا...... پولیس کو مطلع کرنا ضروری تھا۔

"وہ کیا کہتے ہیں؟" کیٹ نے استفسار کیا۔

"پوکی کی ہدایت کے مطابق فی الحال ہمیں یہاں سے ہلنا نہیں چاہیے۔" رین سم اپنا گلاس لے کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔

کیٹ کسمسائی...... "میرے دوست پریشان ہو جائیں گے...... مجھے ان کو کال کرنا چاہیے۔"

"فکر نہ کرو وہ پوکی انہیں بتا دے گا۔"

کیٹ کا اعصابی تناؤ تقریباً ختم ہو گیا تھا لیکن رین سم کی قربت اسے بے چین کر رہی تھی۔ کیٹ نے اپنا سر اِن کے شانے سے لگا دیا۔ "رین......"

"نہیں، ڈیوڈ......" اس نے ٹوکا۔

"سوری ڈیوڈ...... یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

"ٹھیک ہو جائے گا...... سب ٹھیک ہو جائے گا...... تم کچھ کھاؤ گی؟"

"ہاں، مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

"گڈ۔"

☆☆☆

وہ باتوں سے کیٹ کا دل بہلا رہا تھا۔ کیٹ کے چہرے کے عضلات نرم پڑتے جا رہے تھے...... گاہے گاہے وہ مسکرا دیتی۔ معاً کھڑکی بجی تو وہ چونک اٹھی۔

"کچھ نہیں...... محض ہوا کا جھونکا ہے۔" رین سم نے تسلی دی۔ بعض اوقات یہاں ہوا اتنی تیز ہوتی ہے کہ لگتا ہے چھت اڑ جائے گی۔ رین سم نے سر اٹھا کے چھت کے بیم دیکھے۔ یہ مکان تیس سال پرانا ہے۔ تاہم جب ہم نے خریدا تھا، اس وقت خوب تسلی کر لی تھی۔"

"ہم؟" کیٹ ایک بار پھر چونک اٹھی۔

"اس وقت میں شادی شدہ تھا۔" رین سم نے آہستہ سے کہا۔ "ہماری شادی پانچ برس برقرار رہی۔"

"اوہ۔" کیٹ نے پہلو بدلا۔ "طلاق ہو گئی تھی؟"

رین سم نے اثبات میں سر ہلایا۔ "لنڈا اور ہمارا تعلق اب بھی دوستانہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ طلاق شدہ جوڑوں کی اکثریت ایسا نہیں کر سکتی۔ لنڈا کا شوہر بھی اچھا آدمی

ہے...... کم از کم مجھ سے بہتر ہی ہے۔ وہ مجھ سے زیادہ لنڈا کا خیال رکھ سکتا ہے......'' رین ہم خاموش ہو گیا۔

''اور بچے؟''

رین ہم نے سوچا کہ کاش وہ یہ سوال نہ کرتی۔

''ایک بیٹا۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''کتنی عمر ہے تمہارے بیٹے کی؟''

''وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔'' اس نے رک کر سپاٹ آواز میں جواب دیا۔ ''نوحا'' کی موت کا خیال ہی اسے اداس کر دیتا تھا۔ اس سے پہلے کہ کیٹ اظہارِ ہمدردی کرتی، اس نے جلدی سے موضوع تبدیل کیا...... کیٹ بھی رسمی الفاظ استعمال نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔

''خیر، چھوڑو...... میں پھر کنوارے کی طرح ہوں...... میرا خیال ہے کہ مجھ جیسوں کے لیے یہ اچھا ہے۔ میرے پیشے کا تقاضا ہے کہ میں اپنی توجہ وہیں مرکوز رکھوں۔''

''لیکن ڈیوڈ، کیا تمہارا ارتکاز ٹوٹ نہیں گیا ہے؟''

''ہاں......'' رین ہم نے ٹھنڈی سانس بھری اور سبز آنکھوں میں جھانکا۔ ''میرا منصوبہ تھا نہ کوئی ارادہ...... جینا، میں پہلی ملاقات کے دوران میں ہی بے بس ہو گیا تھا۔ تم بتاؤ، تم نے شادی نہیں کی؟''

''نہیں۔'' کیٹ نے دوسری طرف دیکھا۔ ''ایک ملا تھا...... شاید شادی ہو جاتی لیکن پھر ہم ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے۔ اچھا ہوا...... عادات اور مزاج کا قبل از وقت علم ہو گیا تھا۔'' کیٹ نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''گویا تم نے کیریئر کو محبت پر ترجیح دی؟''

''میں سمجھتی ہوں کہ یہ معاملہ سو فیصد ہی کیریئر سے متعلق نہیں تھا۔'' وہ پُرخیال انداز میں بولی۔ ''لیکن تم اپنے بارے میں کیا کہتے ہو؟ میرا اشارہ لنڈا کی طرف نہیں ہے۔'' وہ تھم گئی۔ ''میرا مطلب موجودہ صورتِ حال سے متعلق ہے۔''

''کیٹ، میں صرف ایک کیس سے دستبردار ہو رہا ہوں...... وہ بھی حقائق کی بنیاد پر۔'' رین ہم نے جواب دیا۔

''تمہارا مطلب ہے...... سچ کی بنیاد پر۔ کیا صرف سچ؟'' کیٹ نے نیلی آنکھوں میں جھانکا۔

''بہت مشکل سوال ہے...... اس کے ساتھ ایک سچ اور جڑا ہوا ہے۔ کیا تم سننا چاہتی ہو؟''

''نہیں...... میں سمجھ گئی ہوں، سننے سے حقیقی لطف غارت ہو جائے گا۔'' کیٹ مسکرائی۔

''تم میڈیکل کے شعبے میں کیسے آ گئیں؟'' وہ جواب سن کر مسکرایا۔

''اور تم وکالت کے......''

''بس......'' اس نے بے محابا کیٹ کے تراشیدہ لبوں پر انگلی رکھ دی۔ وہ بے خود ہو گئی۔ دونوں جانب، خلوتِ جاں میں شور سا اٹھا...... رین ہم نے بمشکل ہاتھ ہٹایا۔ کیٹ نے بہ عجلت ایک ہی گھونٹ میں جام اٹھا کے خالی کیا۔

''اور پیو۔'' اس نے بوتل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ خوش تھا کہ کیٹ ساحلِ سمندر کے کاٹیج والی اجنبی کال کے شاک سے باہر آ چکی تھی۔

''یعنی؟'' کیٹ نے حیرت سے سوال کیا۔ تو رین ہم کو احساس ہوا کہ ''اور پیو'' کے الفاظ میں بھدا پن تھا...... وہ کیا کہتا؟ بات ہی الٹ گئی تھی...... وہ خود ہی ساقی تھا، بادہ بھی اور پیمانہ بھی...... گرمیِ میخانہ بھی......

اس نے جلدی سے تصحیح کی۔ ''میرا مطلب تھا کہ اور لوگی؟''

''نشے میں ڈبونا چاہ رہے ہو؟'' اس نے مشکوک انداز میں استفسار کیا۔

''تم بھی تو وہی کر رہی ہو۔'' وہ برجستہ بولا۔

''میں؟''

''ہاں، تمہاری آنکھوں میں دیکھتا ہوں تو......''

کیٹ کی ہنسی میں اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ کیٹ نے بوتل تھام لی۔ بے خودی وحشی سی تھی...... رین ہم، جرعہ چشمِ مست کن سے اور کیٹ جامِ مئے ناب سے بیگانۂ ہوش و حواس ہوئے جا رہے تھے...... تاہم دونوں نے خود کو تھامے رکھا۔

کیٹ نے اس کے والدین کے بارے میں استفسار کیا۔ رین ہم نے بتایا کہ ان کی رہائش گاہ قریب ہے۔ تاہم وہ خود یہیں رہتا ہے۔ طعام اور دیگر کاموں کے لیے اس نے ایک ملازمہ رکھی ہوئی تھی۔ رین ہم نے کیٹ کی فیملی کے بارے میں سوال کیا تو معاً کیٹ کا رنگ بدل گیا۔ اس نے پہلو بدلا۔ رین ہم نے دیکھا کہ اس کا نچلا ہونٹ لرز اٹھا تھا۔

''اوہ تو، وہ رونے والی ہے۔'' اسے ادراک ہوا کہ لاعلمی کے باعث غلط سوال کر بیٹھا ہے۔ یقیناً اس سوال سے کوئی المیہ پیوست تھا۔ اس نے بوکھلا کر دائیں بائیں دیکھا۔ اس کے لیے یہ ایک دشوار مرحلہ تھا۔ تاہم اسے اطمینان ہوا کہ کیٹ نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ رین ہم نے گلاس اس کے

ہاتھ سے لے کر ٹیبل پر رکھ دیا۔

''کافی ہے۔ آؤ تمہارا کمرا دکھادوں۔''

دونوں کھڑے ہو گئے۔ کیٹ کی آنکھوں میں دہسکی کا خمار تھا۔ دل وحشی پھر مچلنے لگا تھا۔

کھڑکی بند تھی لیکن ہوا کے جھونکے اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھے۔

''میرا خیال ہے کہ بستر پر چلنا چاہیے۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں گویا ہوا۔

''وہاٹ؟''

اس نے کھنکھار کے گلا صاف کیا۔ ''میرا مطلب ہے...... تم اپنے اور میں اپنے بستر پر۔''

''اوہ......''

''لیکن تم چاہو تو......''

''میں چاہوں......؟ کیا؟''

''کچھ نہیں۔''

دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ شب تنہائی، قربت، نشہ، الفت...... تمام لوازمات موجود تھے۔ پھر بھی کوئی پکار تھی، گریز تھا، کشمکش تھی۔ پینے کے بعد بھی دونوں تشنہ لب تھے...... اک آگ سی سینے میں لگی ہوئی...... طوفان تھا دھڑکنوں میں۔ کچھ وقفہ عذاب جاں پہ گزرا پھر اس نے رخ بدلا۔ نگاہ کا تار ٹوٹا۔

''ہاں، بستر پر جانے کا وقت ہے۔'' کیٹ نے سرگوشی کی۔

دونوں نے بیک وقت مخالف سمت میں حرکت کی۔ پندار خودی گویا حد سے بڑھ گیا۔ دونوں موہوم امید کے ساتھ قدم بڑھا رہے تھے۔

''کیٹ؟''

کیٹ کی سانس رک گئی۔ ''ہاں؟''

''تمہارا کمرا دوسری منزل پر دائیں جانب ہے۔'' رین سم نے کہا۔

''شکریہ۔'' قلابازیاں کھاتا ہوا دل، بہت بلندی سے گہرائی میں جا گرا۔ وہ چلا گیا۔ کیٹ اتنا ہی جان پائی کہ وہ چاک گریباں گیا ہے...... مگر تیر نگی غم پہ مسکرا کے گیا ہے۔ اتنا جان جانا بہت زیادہ تھا۔

☆☆☆

کیٹ کو اپنے کمرے میں گئے کافی دیر ہو گئی تھی۔ رین سم اپنے کمرے میں بیٹھا، سوچوں کے گرداب میں ڈوب رہا تھا...... ڈوب کے ابھر رہا تھا...... وہ جو کہ گیا تھا کر اٹھ

مزاحمت لاحاصل تھی۔ کیٹ اس کے دل و دماغ پر چھا چکی تھی۔ وہ یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ یہ غلط ہے۔ کم از کم اس وقت تک، جب تک وہ ''اوپن کیس'' کی فائل دوسری فرم کے حوالے نہیں کر دیتا۔ قانونی، اخلاقیات کے تحت ایلن کے والدین اب تک اس کے کلائنٹ تھے۔ اس نے پہلے کبھی اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں نجی معاملات کو حائل نہیں ہونے دیا تھا لیکن کیٹ کے معاملے میں وہ پہلے دن سے ہی بے بس تھا۔ جتنا سنبھلتا، اتنا ہی گرتا۔ جتنا ابھرتا، اتنا ہی ڈوب جاتا۔ اس کی ہر کوشش ناکام ہو گئی تھی۔

وہ اٹھ کر کمرے کے چکر کاٹنے لگا۔ دوسری جانب کیٹ اپنے کمرے میں بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ ڈیوڈ کے بارے میں سوچتے سوچتے، معلوم نہیں کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

ڈیوڈ پھر بستر پر بیٹھ گیا۔ مجبور، بے کیف و بے جام، انگلیوں سے بالوں میں کنگھی کی اور واش روم میں گھس گیا۔ وہ ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔

☆☆☆

آنکھ اچانک کھل گئی تھی۔ وہ کہاں تھی۔ کوئی دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ وہ ڈیوڈ کے ساتھ ہے۔ کھڑکی سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ وہ اٹھ کے بیٹھ گئی۔

''کیٹ؟'' ڈیوڈ کی آواز آئی۔

''ہاں؟''

''پوکی کا فون آیا ہے۔ جلدی تیار ہو جاؤ۔''

''ایک منٹ رکو۔'' کیٹ نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

''کیا ہوا؟''

''قاتل کی شناخت ہو گئی ہے۔'' ڈیوڈ نے جواب دیا۔

☆☆☆

ڈیٹیکٹو پوکی نے مگ بک آگے بڑھائی۔ ''ڈاکٹر شیزنی، دیکھو...... ان میں سے کسی کو پہچانتی ہو؟''

کیٹ نے فوٹو دیکھنے شروع کیے۔ جلد ہی اس کی تیز نگاہ ایک فوٹو پر جم گئی۔ یہ ایک بگڑا ہوا، مسخ چہرہ تھا۔ سب سے اہم اس کی آنکھیں تھیں۔ بے روح، سیاہ، گھورتی ہوئی آنکھیں......

''یہی ہے۔'' کیٹ نے اعتماد سے کہا۔

''کوئی شک، ابہام؟''

''نہیں، اس کی آنکھیں، میرے حافظے پر نقش ہیں۔'' کیٹ نے چہرہ دوسری جانب پھیر لیا...... رین سم اور

پوکی نے شک محسوس کیا کہ وہ ہسٹریا کا شکار ہو جائے گی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔

''یہ ہمارا ٹارگٹ ہے۔'' پوکی نے فوٹو الگ کرلیا۔ وہ مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔

''یہ آدمی کون ہے؟'' کیٹ نے اچانک سوال کیا۔

''اس کا نام چارلس ڈیکر ہے۔ ایک مضبوط الحواس آدمی ہے۔ یہ فوٹو پانچ سال قبل لیا گیا تھا۔ اس کی گرفتاری کے وقت۔''

''گرفتاری؟''

''تشدد اور اقدام قتل...... اس پاگل نے اسٹاف کے سامنے ڈاکٹر کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی تھی۔''

''ڈاکٹر؟'' ڈیوڈ رین ہم چونک اٹھا۔ ''کون؟''

''کون ہوسکتا تھا؟'' پوکی نے الٹا سوال کیا۔

ڈیوڈ نے چند سیکنڈ بعد جواب دیا۔ ''ہنری ٹیٹا کا۔''

پوکی نے جواب دینے کے بجائے دانت نکالے اور ڈیوڈ نے خفگی محسوس کی۔ کیٹ بھی حیران تھی۔

''ہم نے مسز ٹیٹا کا سے رابطہ کیا تھا۔ ڈاکٹر ٹیٹا کا، کا دشمن یا مخالف کون ہوسکتا تھا۔ مسز ٹیٹا کا نے چند نام لیے تھے...... تاہم وہ تمام کلیئر تھے...... ہم نے پھر رابطہ کیا۔ تب اسے یاد آیا وہ تمام کلیئر تھے...... ہم نے پھر رابطہ کیا۔ تب اسے یاد آیا کہ پانچ برس قبل، اس کے شوہر کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا تھا۔'' پوکی نے چارلس ڈیکر کی اریسٹ رپورٹ نکالی۔ ''ڈیکر کو اسٹیٹ اسپتال میں رکھا گیا تھا۔ چند ہفتے قبل اسے صحت یاب تصور کرتے ہوئے اسپتال سے رخصت کردیا گیا تھا۔''

''لیکن وہ یہ سب کچھ کیوں کررہا ہے؟''

''میں نے بتایا...... اس کا دماغ چل گیا تھا۔ یقیناً اس کی کھوپڑی ابھی تک ٹھکانے پر نہیں ہے۔''

''ہزاروں افراد سنکی ہیں، لیکن اس وجہ کے تحت وہ قاتل نہیں بن جاتے۔'' کیٹ نے کہا۔

''میں کوئی ماہر نفسیات نہیں ہوں۔ مجھے اپنے دائرے میں رہتے ہوئے کام کرنا ہے جو تقریباً ختم ہونے والا ہے۔''

''مسٹر، وہ آدمی، میری زندگی کے لیے خطرہ تھا اور ہے۔ صرف نام ہی کافی نہیں ہے۔ مجھے اور معلومات درکار ہیں۔'' کیٹ نے مطالبہ کیا۔

ڈیوڈ نے کیٹ کے موقف کی حمایت کی۔ پوکی نے ڈیوڈ کو دیکھا اور گہری سانس لے کر ایک نوٹ بک برآمد کی۔

''او کے۔'' اس نے ورق گردانی شروع کی......

''چارلس ڈیکر، کلیو لینڈ میں اڑتالیس سال قبل پیدا ہوا تھا۔ والدین میں طلاق ہوگئی تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں اس کا بھائی گینگ فائٹ میں مارا گیا تھا۔ اس کی ایک شادی شدہ بہن فلوریڈا میں ہے...... اس نے ہمیں زیادہ تر اطلاعات فراہم کی ہیں۔ ڈیکر نے بائیس سال کی عمر میں نیوی میں ملازمت اختیار کی...... مختلف جگہوں سے ہوتا ہوا یہاں پرل پر اس کی پوسٹنگ ہوگئی۔ وہ جہاز کے سرجن کے اسسٹنٹ کے طور پر کام کررہا تھا۔ چارلس ڈیکر بنیادی طور پر تنہائی پسند تھا...... جذباتی معاملات میں وہ نارمل تھا...... دفعتاً پانچ سال قبل کچھ غلط ہوگیا۔''

''کیا، نروس بریک ڈاؤن؟''

''شاید، اس سے زیادہ۔''

''اسے ایک لڑکی سے پیار ہوگیا۔ اس نے شادی کی درخواست کی جو لڑکی کے والدین نے منظور کرلی...... بدبختی یہ ڈیکر کو اپنی محبت کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کا موقع نہیں ملا۔ جہاز کو روانہ ہونا تھا۔ جب وہ چھ ماہ بعد واپس آیا تو بغیر اجازت شپ سے اتر گیا۔ وہ اپنی محبت کی تلاش میں دیوانہ ہوا جارہا تھا۔''

''اور اس دوران، وہ لڑکی کسی اور مرد کے ساتھ جا چکی تھی۔'' ڈیوڈ نے قیاس آرائی کی۔

''نہیں۔ وہ مرچکی تھی۔''

کمرے میں طویل وقفے کے لیے سکوت طاری ہو گیا۔

''لڑکی کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا تھا؟'' کیٹ نے دھیمے لہجے میں سکوت کا پردہ چاک کیا۔

''وہ حاملہ تھی۔ کیس پیچیدہ ہوگیا تھا۔ بچی کی پیدائش تو ہوگئی، لیکن دونوں جانبر نہ ہوسکے...... ڈیکر کو پتا ہی نہیں چلا کہ اس کی محبوبہ بیوی حاملہ تھی۔'' پوکی نے بتایا۔

کیٹ سوچ رہی تھی کہ چارلس ڈیکر پر کیا گزری ہو گی۔ جب وہ بیوی سے دور تھا...... اور جب وہ واپس آیا......

''بس اس کے بعد، ڈیکر حواس کھو بیٹھا۔'' پوکی نے بات جاری رکھی۔ ''کسی طرح اسے علم ہوگیا کہ کیس کس ڈاکٹر کے پاس تھا۔''

''کس کے پاس؟'' ڈیوڈ نے سرسراتی آواز میں سوال کیا۔

''ہنری ٹیٹا کا۔''

ڈیوڈ اور کیٹ نے بیک وقت ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

''وہ ڈاکٹر تک پہنچا اور اسے مارنے کی کوشش کی۔''

''اس کی ضمانت ہو گئی تھی...... ضمانت کے ایک روز بعد اس نے پستول خریدا...... لیکن ڈاکٹر کے لیے نہیں...... اپنے ہی منہ میں رکھ کر اس نے فائر کر دیا۔'' پوکی نے نوٹ بک بند کر دی۔

''تو وہ مر گیا؟'' کیٹ نے حیرانگی سے کہا۔

''نہیں، وہ زندہ تھا اور زخمی تھا۔ پستول عام سا ایک ارزاں ہتھیار تھا...... اسے اسٹیٹ اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ طویل عرصے اس کا علاج ہوتا رہا۔ تاہم وہ ٹھیک طرح سے بولنے کے قابل نہ رہا...... بعد ازاں اس کا نفسیاتی علاج ہوا۔''

''کیا وہ گونگا ہے؟'' ڈیوڈ نے سوال کیا۔

''نہیں، پوری طرح نہیں۔'' پوکی نے جواب دیا۔ ''ایک ماہ قبل اسے ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ نیم چیک کے ساتھ اس کا اپائنٹمنٹ تھا لیکن وہ نہیں آیا۔ تب سے غائب ہے۔''

''اور قتل و غارت گری کرتا پھر رہا ہے۔'' ڈیوڈ نے تبصرہ کیا..... پوکی نے کندھے اچکائے۔

''تاہم اب وہ زیادہ دیر تک روپوش نہیں رہ سکتا۔''

''یعنی وجہ قتل، انتقام ہے؟''

''اور کیا کہہ سکتے ہیں۔''

''لیکن این رشٹر کا اس سے کیا تعلق بنتا ہے؟'' کیٹ نے استفسار کیا۔

''یاد کرو۔'' پوکی نے کہا۔ ''جس خاکروب نے ہنری کی لاش دریافت کی تھی، اس نے پارکنگ میں سرخ بالوں والی کسی عورت کو دیکھا تھا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ وہ این رشٹر تھی؟''

''اور کوئی منطق نہیں بنتی...... ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں میں کوئی تعلق تھا...... اسی لیے ڈیکر نے این رشٹر کو ٹھکانے لگا دیا۔'' پوکی نے وضاحت کی۔ اس رات بھی وہ ہنری کے پاس گئی ہوگی...... اسے وہاں سے فرار ہونا پڑا۔ قاتل نے اسے دیکھ لیا ہوگا۔''

''لیکن وہ پولیس کے پاس جا سکتی تھی۔'' کیٹ نے اعتراض کیا۔

''ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے تعلقات کو پوشیدہ رکھنا چاہتی ہے۔

ہو...... یا وہ بہت زیادہ ڈر گئی ہو، یا اسے وہم ہو گیا کہ کہیں الزام اس کے سر نہ آجائے...... کون جانتا ہے؟ وہ کیا سوچ رہی تھی؟''

''یعنی وہ محض ایک گواہ تھی۔ بالکل میری طرح۔'' کیٹ نے اظہار کیا۔ ''یہ تصدیق بھی ہونی چاہیے کہ ہنری سے اس کے مراسم تھے۔''

''تم دونوں میں بڑا فرق ہے۔'' پوکی نے کیٹ کو دیکھا۔ ''چارلس ڈیکر نہیں جانتا کہ تم اس وقت کہاں ہو۔ وہ تم تک نہیں پہنچ سکتا...... اس دفتر کے باہر کوئی نہیں جانتا کہ تم کہاں ٹھہری ہو۔'' پوکی نے ڈیوڈ کو دیکھا۔ ''کوئی مسئلہ تو نہیں، تمہارے گھر پر؟''

''ڈاکٹر وہاں رہ سکتی ہے۔'' ڈیوڈ نے چہرے کے تاثرات سپاٹ رکھے۔ ''لیکن کیٹ کی بات میں وزن ہے کہ یہ ابھی تک ایک قیاس ہے کہ این اور ہنری ٹیٹا کا ایک دوسرے سے ملتے تھے۔''

''اور یہ بہتر ہوگا کہ ڈاکٹر اپنی کار سے دور رہے۔''

''کیوں؟''

''ڈیکر کے پاس تمہارا بیگ ہے...... ظاہر ہے کہ کار کی چابیاں بھی ہوں گی، وہ تمہاری تاک میں ہوگا۔''

''میری تلاش میں ہوگا۔'' کیٹ لرز اٹھی۔ ''میں کب تک چھپتی پھروں گی؟''

''زیادہ عرصہ نہیں۔ چارلس ڈیکر ہمیشہ کے لیے چھپ نہیں سکتا۔ ہم جلد ہی اسے قابو کر لیں گے...... این اور ہنری کے تعلق کی تصدیق بھی ہو جائے گی۔''

کمرے میں پھر خاموشی چھا گئی۔ بالآخر کیٹ گہری سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

معاً اس کے دماغ میں بجلی سی چمکی۔ وہ جاتے جاتے رک گئی۔ ''ڈیٹیکٹیو۔'' وہ بولی۔ ''ایلن اوبرائن کا کیا ہوا؟'' پوکی کاغذات سمیٹ رہا تھا۔ ''کیا مطلب؟''

''تمام معاملے سے، ایلن کا کیا تعلق تھا؟''

پوکی ایک ساعت کے لیے رکا۔ ''کوئی تعلق نہیں...... کچھ بھی نہیں۔''

کیٹ نے پُرشکن پیشانی کے ساتھ ڈیوڈ کو دیکھا۔ تاہم خاموش رہی...... دونوں نے باہر کا رخ کیا۔

☆☆☆

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' کیٹ تڑخی۔ ''ایلن کا کوئی نہ کوئی تعلق بنتا ہے...... مسٹر پوکی پیچیدگیوں سے جان چھڑا رہا

”یا پھر وہ کچھ چھپا رہا ہے۔“ ڈیوڈ نے کہا۔

”کیوں؟ کیا وہ تمہارا دوست نہیں ہے؟“

”وہ میرا کوئی جگری یار نہیں ہے۔ جتنا اس نے بتا دیا، یہ بھی بہت ہے۔ ویسے بھی ہم بہت عرصے بعد ملے تھے۔ میں نہیں جانتا، اس دوران اس کے خیالات میں کیا تبدیلیاں آچکی ہیں۔ ان لوگوں کا اپنا طریقۂ کار ہوتا ہے۔ اسے اپنے مفادات کا خیال بھی رکھنا ہوتا ہوگا۔ اس کے بیوی بچے ہیں۔ ایک طویل عرصہ ہو گیا ہے اسے...... اب اس عمر میں خوامخواہ کے خطرات مول لینے کی اسے کیا ضرورت ہے۔“

”کیا وہ ایک اچھا کوپ (COP) نہیں ہے؟“

”اچھا کہہ سکتے ہیں۔ لیکن میں اسے بریلینٹ نہیں کہہ سکتا۔“ ڈیوڈ نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

”کیا وہ ایلن کے معاملے میں غلطی نہیں کر سکتا؟“

”کر سکتا ہے۔“ ڈیوڈ نے جواب دیا۔ ”لیکن سچ یہ ہے کہ میں خود بھی، ابھی تک ایلن کو اس کیس میں ملوث کرنے میں ناکام رہا ہوں۔“

”یہ عجیب بات ہے کہ ڈیکر ایک سرجن کا اسسٹنٹ تھا؟“ کیٹ نے نکتہ اٹھایا۔

”لیکن ہم اس سے کیا ثابت کر سکتے ہیں؟“

”لیکن مجھے ثابت کرنا ہے۔ تاہم میں نہیں جانتی کہ میں یہ کیسے کروں گی؟“ کیٹ نے بددلی سے کہا۔

”اوکے۔“ ڈیوڈ نے گہری سانس لی۔ ”ہم کچھ ثابت نہیں کر سکتے...... مطلب فی الحال...... لیکن ہم یہ سوچ سکتے ہیں کہ یہ حادثہ نہیں تھا۔“

”یعنی مرڈر تھا؟“

ڈیوڈ نے سر ہلایا۔ ”ڈیکر کو تصور میں رکھو۔ وہ باہر کا آدمی تھا۔ میڈیسن اور سرجری کے بارے میں جانتا تھا۔ وہ کسی کو اسپتال میں ہلاک کرنا چاہتا ہے۔ اب تم مجھے بتاؤ...... قدم بہ قدم...... وہ کیسے وہاں آئے گا اور کیا کیا کرے گا یا کیا کر سکتا تھا؟“

کیٹ کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ”میرا خیال ہے کہ...... کہ......“ وہ رک کر غور سے اخبار فروش لڑکے کو دیکھنے لگی۔ وہ گاڑیوں کے درمیان صبح کا اخبار لہراتا پھر رہا تھا۔ وہ اچانک بولی۔

”ایلن! اتوار کے روز اسپتال میں ایڈمٹ ہوئی تھی۔“ کیٹ، گویا خود سے باتیں کر رہی تھی۔ ”مجھے یاد ہے۔ رات کے آٹھ بجے تھے اور دس گھنٹے میں، یہاں دس گھنٹے ہیں......

”رک جاؤ۔ کیا کہہ رہی ہو؟ دس گھنٹے میں کیا ہونے والا تھا؟“

کیٹ نے ڈیوڈ سے آنکھیں چار کیں اور بولی۔

”مرڈر۔“

☆☆☆

وزیٹر پارکنگ لاٹ تقریباً خالی تھی۔ اتوار کی رات تھی۔ آٹھ نہیں، دس بج رہے تھے، جب ڈیوڈ کی بی، ایم، ڈبلیو اسپتال کے ڈرائیو وے میں داخل ہوئی۔ لابی کے قریب گاڑی روک کر اس نے کیٹ کی جانب دیکھا۔

”ایک بار پھر سوچ لو۔ مجھے نہیں لگتا کہ ہم کچھ حاصل کر پائیں گے۔“ اس نے کہا۔

”مجھے کوشش کرنے دو۔“ کیٹ نے سرخ ایمرجنسی نشان کی طرف دیکھا۔

”اوکے، شروع کرتے ہیں۔“ ڈیوڈ نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ لابی کے دروازے لاک تھے...... دونوں ایمرجنسی روم کے داخلی دروازے سے گزر کر انتظار گاہ میں آگئے۔ وہاں ایک بوڑھا مریض کھانس رہا تھا اور ایک بچی ماں کی گود میں چلا رہی تھی۔ وہاں ایک ہی نرس تھی جو فون پر بات کر رہی تھی۔

دونوں نارمل انداز میں ایلیویٹر کی طرف بڑھ گئے۔ ڈیوڈ نے سوالیہ نظروں سے کیٹ کو دیکھا۔

”نرس مجھے پہچانتی ہے۔“ کیٹ نے آہستہ سے کہا۔

”لیکن میں؟“

”وہ مصروف ہے اور تم میرے ساتھ ہو۔“

”سیکیورٹی؟“

”راؤنڈ پر ہوگی...... اسپتال ہے، آخر کتنے گارڈ ہوں گے۔“ کیٹ پُرسکون تھی۔ ڈیوڈ نے شانے اچکائے۔

دونوں چوتھی منزل پر اترے۔ وہ جراثیم کش کوریڈور میں آپریشن روم کے ڈبل ڈور کی جانب رواں تھے۔ جس پر ”نو ایڈمیشن“ کا نشان موجود تھا۔

”کیا ہم اندر جا سکیں گے؟“ ڈیوڈ نے استفسار کیا۔

کیٹ نے بطور تجربہ چند قدم بڑھائے۔ ڈورز میکانیکی انداز میں پھسل کر کھل گئے۔ ”نو پرابلم۔“ کیٹ مسکرائی۔

اندر مدھم روشنی تھی۔ کیٹ نے ایک دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں اگلے روز ہونے والی سرجریز کا شیڈول آویزاں تھا۔

"کل کے تمام کیسز" کیٹ نے سمجھایا۔ "ایک نظر میں ڈالنے پر پتا چل جاتا ہے کہ کون سے روم میں کون سا مریض ہو گا؟ سرجن کون ہو گا؟ طریقۂ کار اور اینستھیسیالوجسٹ کون ہوگا؟"

"ایلن کون سے آپریشن روم میں تھی؟"

"دائیں جانب، کونے والے کمرے میں۔" کیٹ، ڈیوڈ کو لے کر روم نمبر 5 میں آ گئی۔ اندر آ کر اس نے مرکزی بتی روشن کر دی۔ لمحہ بھر کے لیے نگاہ چندھیا گئی۔

"اینستھیسیا کارٹ، اس طرف ہے۔" کیٹ نے اشارہ کیا۔

ڈیوڈ بغور آپریشن روم کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر چند ایک درازیں کھول کر دیکھیں۔ یہ اسٹیل کی بنی ہوئی تھیں۔ ایک میں کانچ کی وائلز موجود تھیں۔

"کیا ان دواؤں کو لاک نہیں کیا جاتا؟"

"یا پھر ان کی زیادہ قیمت نہیں ہے۔ البتہ جو نارکوٹکس میں شمار ہوتی ہیں، ان کو لاک رکھا جاتا ہے۔" کیٹ نے دوسرے وال کیبنٹ کی طرف اشارہ کیا۔

ڈیوڈ ایک بار پھر وائلز کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے ایک وائل اٹھائی۔ "اگر کسی میں ملاوٹ کرنی ہو تو کتنا وقت لگنا چاہیے؟"

"اس روز مجھے سکسی نل کولن کی ضرورت پڑی تھی۔ کارٹ میں مذکورہ وائلز معمول کی تعداد میں نہیں تھیں۔ اگر وائل کو خالی کر کے کارٹ سے ہٹایا گیا تھا تو ڈیکر یہ کام ایک منٹ سے بھی کم وقت میں کر سکتا تھا۔"

"یہ اتنا آسان ہے۔"

"ہاں۔" کیٹ کی نظر آپریشن ٹیبل پر گئی۔

"مریض مکمل طور پر ہمارے رحم و کرم پر ہوتے ہیں...... میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ آپریٹنگ ٹیبل پر بھی قتل کیا جا سکتا ہے۔"

"اگر EKG ٹھیک تھا تو ہمیں فرض کرنا پڑے گا کہ ایلن صرف اس لیے ماری گئی کہ مذکورہ دوا میں ملاوٹ کی گئی تھی دوا نے کام نہیں کیا۔ تم نے جب دوسری وائل کی ضرورت کا احساس دلایا تو وہ کارٹ میں نہیں تھی اور اس کے استعمال کی نوبت بھی نہیں آئی، کیا ایسا ہی تھا؟" ڈیوڈ نے سوال کیا۔

"ہاں، اس کے سوا کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔" کیٹ نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

"لیکن پھر EKG کیوں تبدیل کیا گیا؟"

"دوا کی طرف سے توجہ ہٹانے کے لیے۔ جعلی EKG ثابت کرتا ہے کہ ایلن کو ہارٹ اٹیک ہو چکا تھا...... میرا مطلب ہے کہ ماضی میں...... اور ہم اس کے باوجود اسے سرجری کے لیے لے گئے۔ کورٹ کے نزدیک یہ قتل جیسا ہے۔"

"لیکن کیٹ، اس طرح تو براہ راست تم زد میں آتی ہو۔"

"یہی بات میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ یہاں، وہاں میرا کوئی دشمن نہیں۔" کیٹ نے پیشانی مسلی۔ "ایک منٹ، ڈیوڈ۔" کیٹ نے تیزی سے کہا۔

"وہاٹ؟"

"ہاں، اس طرح میں پھنس جاتی ہوں اور ایلن کا قتل پردۂ اخفا میں رہ جاتا ہے۔ قاتل بھی یہی چاہتا تھا۔ لیکن این رشنر بہت کچھ جانتی تھی۔ شومیٔ قسمت قاتل نے اسے بروقت ہلاک کر دیا۔ میری جان کم از کم خطرے سے باہر تھی لیکن این کا پیغام سن کر میں وہاں پہنچ گئی......"

"ویری گڈ پوائنٹ۔" ڈیوڈ نے تحسین آمیز انداز میں کہا۔ "یہ بتاؤ کہ قاتل نے EKG کیسے تبدیل کیا ہو گا؟"

"بہت آسان۔ مریض کا چارٹ، بشمول EKG سرجری سے قبل وارڈ میں ہوتا ہے۔ وارڈز میں نرسوں کی چہل پہل ہوتی ہے۔ سفید کوٹ سے وہ غیر شعوری طور پر مرعوب رہتی ہیں۔ میں شرط لگاتی ہوں کہ تم سفید کوٹ اور اسٹیتھیس اسکوپ کے ساتھ کسی بھی ایسی جگہ پر آرام سے ٹہل سکتے ہو۔"

"چلو دیکھتے ہیں۔"

"ابھی؟"

"ہاں، کیا حرج ہے؟" بچپن میں ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔

"اور اب ڈاکٹرز کے پیچھے پڑے ہو۔" کیٹ، شرارت سے مسکرائی۔

جواباً ڈیوڈ بھی مسکرا دیا۔

"بس...... بس...... اپنی جگہ پر رہو۔ میں تمہارے لیے کوٹ اور اسٹیتھیس اسکوپ کا بندوبست کرتی ہوں۔"

کیٹ نے دونوں مطلوبہ اشیا ڈیوڈ کے حوالے کیں اور ایلیویٹر تک اس کے ساتھ آئی۔ "گھوم پھر آؤ، میں یہیں ملوں گی...... اور ہاں، ڈاکٹری ایکٹنگ مت کرنا۔ کیونکہ تم ڈاکٹر ہی ہو۔ ڈاکٹر اسٹھ......" کیٹ نے بے ساختہ باتیں

پلک جھپکائی۔

''یہ کیا حرکت ہے؟'' ڈیوڈ نے سبز آنکھوں میں جھانکا۔

''آنکھ میں کچھ گر گیا..... شاید۔''

''واپس آ کے آنکھ چیک کروں گا۔'' ڈیوڈ ایلیویٹر میں داخل ہو گیا۔

''سنو۔'' کیٹ نے آواز دی۔ ''یاد رکھنا تم کو کیا کرنا ہے۔''

''ہاں، یاد ہے۔''

کیٹ واپس روم نمبر 5 میں آ گئی۔ وہ آپریشن ٹیبل کے نزدیک اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ گئی۔ خیالات کی یلغار اسے دوسری دنیا میں لے گئی۔

معاً دروازہ بند ہونے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ ڈیوڈ اتنی جلدی آ گیا؟ کوئی مسئلہ تو نہیں ہو گیا؟ اس نے اچھل کر اسٹول چھوڑ دیا۔ وہ تیزی سے کوریڈور میں نکل آئی۔ آپریشن روم نمبر 7 روشن دکھائی دے رہا تھا۔ کیٹ نے سماعت پر زور دیا۔ درازوں اور کیبنٹ کھولے بند کیے جا رہے تھے۔

کون ہو سکتا ہے۔ نرس یا کوئی اجنبی؟ اسے نکل جانا چاہیے۔ سیکورٹی کو کال کرنا چاہیے۔ ابھی اس کے پاس موقع تھا۔ یہ فیصلہ کن لمحے تھے۔ جن کو وہ کسی خوش فہمی کی نذر نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے تصور میں وہ ہولناک منظر نمایاں ہو گیا، جب وہ ریٹن کے فلیٹ سے فرار ہو رہی تھی۔

روم نمبر 7 میں جو کوئی بھی تھا، وہ دوسرے کمروں کا رخ بھی کر سکتا تھا۔ اگر وہ یونہی کھڑی رہی تو ٹریپ ہو جائے گی۔ دبے قدموں اس نے حرکت شروع کی۔ اچانک روم نمبر 7 سے بلند ہونے والی آوازیں بند ہو گئیں۔ کیٹ نے سراسیمگی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ قیمتی لمحات ضائع ہو گئے تھے۔ وقفتاً روم نمبر 7 کا دروازہ کھلا۔ کیٹ کی سانس رک گئی۔

وہ ڈاکٹر ایوری تھا۔ مخبوط الحواس ڈاکٹر ایوری۔ کیٹ نے سکون کی سانس لی۔ تاہم اس کی حیرت برقرار تھی۔ ایوری، کیٹ کو دیکھ کر منجمد ہو گیا۔ کوئی چیز اس کے ہاتھ سے پھسلی اور شیشہ ٹوٹنے کی آواز بلند ہوئی۔ ایوری کا چہرہ اس کے بالوں کے مانند سفید ہو رہا تھا۔ لمحہ بھر کے لیے کیٹ نے دہشت محسوس کی۔ اسے یوں لگا جیسے ایوری کو ہارٹ اٹیک ہونے والا ہے۔

''ڈاکٹر..... ڈاکٹر شیری؟'' اس کی آواز میں لرزش تھی۔ ''مجھے توقع نہیں تھی..... ہم..... میرا..... مطلب.....''

''او کے، او کے، ڈاکٹر.....'' کیٹ نے اس کی گھبراہٹ کم کرنے کی سعی کی۔ ایوری نے نیچے اپنے قدموں میں دیکھا۔

''یہ میں نے کیا کر دیا۔'' ایوری نے بے بسی سے نفی میں سر ہلایا۔

''کچھ نہیں ہوا۔ میں صفائی میں مدد کروں گی۔'' کیٹ نے کوریڈور کی مزید بتیاں روشن کر دیں۔ ایوری سابقہ حالت میں کھڑا رہا۔ کیٹ نے ایوری کی ایسی حالت پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ حتیٰ کہ اس کے موزوں کے رنگ بھی بدلے ہوئے تھے۔ ایک نیلے رنگ اور دوسرا سفید رنگ کا تھا۔

کیٹ ٹشو پیپرز اور روئی کے بنڈل لے آئی۔ کچھ ٹشو پیپرز اس نے ایوری کے ہاتھ میں دے دیے۔ تاہم وہ کھڑا ہی رہا۔ کیٹ نیچے بیٹھ گئی۔ شیشے کے ٹکڑے پر لیبل قابلِ مطالعہ تھا۔ ایوری کو احساس تھا۔ وہ خود ہی بول پڑا۔

''یہ میرے کتے کے لیے تھا۔'' وہ کمزور آواز میں بولا۔

''ایکسکیوزی؟'' کیٹ نے سر اٹھایا۔

''پوٹاشیم کلورائیڈ..... میرے کتے کے لیے۔ وہ بہت بیمار ہے۔ وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ میں مجبور ہو گیا۔ اب اسے سو جانا چاہیے..... ہمیشہ کے لیے۔ یہ کام میں خود کروں گا۔''

''ٹھیک ہے، میں ابھی آتی ہوں۔'' کیٹ فرش صاف کر کے واپس کمرے میں آ گئی۔ ٹشو پیپرز اور روئی کو ضائع کر کے اچھی طرح ہاتھ دھوئے۔ پوٹاشیم کلورائیڈ کی دوسری شیشی برآمد کر کے وہ باہر آئی اور شیشی ایوری کے حوالے کر دی۔

''یہ کافی ہے؟''

''شکریہ۔'' ایوری نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر وہ جاتے جاتے پلٹا۔ ''ایک بار پھر شکریہ۔ کیٹ تم یہاں واحد ہستی ہو جس نے کبھی پیٹھ پیچھے میرا مذاق نہیں اڑایا۔ کبھی طعنے بازی نہیں کی نہ ریٹائرمنٹ کے مشورے دیے۔'' اس نے رک کر ٹھنڈی سانس بھری۔ ''وہ بھی ٹھیک ہی ہیں۔ مجھے ریٹائر ہو جانا چاہیے۔'' وہ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

کیٹ روم نمبر 5 میں واپس آ گئی۔ اس کے ذہن میں پوٹاشیم کلورائیڈ کا لیبل پھڑپھڑا رہا تھا۔ یہ ایک خطرناک زہر تھا۔ اسے نس کے ذریعے خون میں شامل کرنے سے دل بند

ہو جاتا ہے۔ اتنے زہر سے کتا تو کیا کسی انسان کو بھی مارا جا سکتا تھا۔

☆☆☆

وارڈ 3B کا کلرک ڈیسک پر جھکا ہوا تھا۔ وہ کسی کتاب میں زیادہ ہی مگن تھا۔ اس نے ڈیوڈ کی موجودگی محسوس کرنے میں تاخیر کر دی۔ اس اثنا میں ڈیوڈ اس کے انہماک کی وجہ جان گیا۔ وہ کتاب نہیں ایک نیم عریاں میگزین تھا۔

کلرک نے بوکھلا کر میگزین نیچے کھسکایا۔

''اوہ! ڈاکٹر...... کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''ڈاکٹر اسمتھ۔''

''یس سر؟''

''مجھے ایک چارٹ دیکھنا ہے۔''

''جی، کون سا؟''

ڈیوڈ نے چارٹ ریک کی جانب دیکھا۔ ''روم نمبر 8۔''

''A یا B؟''

''B۔''

''مسز لوہیز؟''

''یس۔''

کلرک کھڑا ہو گیا۔ ایک منٹ میں وہ چارٹ لے آیا اور دست بستہ پیش کیا۔ وہ اب تک خجل دکھائی دے رہا تھا۔ اوپر سے ''ڈاکٹر اسمتھ'' کی شخصیت......

''تھینک یو۔'' ڈیوڈ نے کہا۔

فون کی گھنٹی بجی۔ کلرک جیسے انتظار میں تھا۔ فوراً وہاں سے کھسک لیا۔ فون پر ہدایت وصول کی اور بلڈ ٹیوبز ٹرے میں رکھ کر روانہ ہو گیا۔

ڈیوڈ اطمینان سے چارٹ کی ورق گردانی کرتا رہا۔ ڈیوڈ کے آس پاس سے چند نرسیں گزریں۔ تاہم انہوں نے ڈیوڈ پر کوئی توجہ نہیں دی۔ ڈیوڈ EKG والے صفحے تک پہنچ گیا...... پندرہ بیس سیکنڈ میں اسے بہ آسانی تبدیل کیا جا سکتا تھا۔

ڈیوڈ نے چارٹ واپس رکھ دیا۔ مرڈر کا شمار عام جرائم میں نہیں ہوتا۔ لیکن اسپتال میں یہ گھناؤنا کام کرنے کے لیے محض ایک سفید کوٹ کافی تھا۔

☆☆☆

''میرا خیال ہے کہ مرڈر سے متعلق تم نے آپریشن روم میں کچھ نہ کچھ ثابت کر دیا ہے۔'' ڈیوڈ نے مکن مچھلی پر

دودھ کے گلاس سجائے۔

''نہیں، ہم کچھ نہیں کر سکے۔'' کیٹ نے ڈھیلی آواز میں تردید کی۔

''ایوری کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''وہ مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔''

''پھر وہ اتنا گھبرا کیوں گیا تھا؟ کیا واقعی اس نے کتا پالا ہوا ہے؟''

''میں نے اس کی ڈیسک پر کتے کی تصویر دیکھی تھی۔''

''تمہاری ہیئرنگ منگل کو ہے۔ اسے آگے بڑھا دو۔'' ڈیوڈ نے مشورہ دیا۔

''میں پہلے ہی ناکام کوشش کر چکی ہوں اور اب تک ایلن کے معاملے میں ہمیں کوئی معمولی سرا بھی ہاتھ نہیں آیا ہے۔ ہیئرنگ میں کہنے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔'' کیٹ نے افسردگی سے کہا۔

ڈیوڈ میز کی سطح کو گھور رہا تھا۔ ''ایسا تو نہیں، کہیں کتا غلط شکار پر بھونک رہا ہو۔''

''کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''میرا مطلب پولیس لائن سے ہے...... ممکن ہے چارلس ڈیکر محض ایک وائلڈ کارڈ ہو۔''

''ڈیوڈ جب وہ میرے پیچھے آیا تو دروازے پر انگلیوں کے نشانات چھوڑ گیا تھا۔ دوسرے یہ کہ میری نظر پڑ گئی تھی اور میں پولیس کے سامنے تصدیق کر چکی ہوں۔''

''تم سمجھی نہیں۔'' ڈیوڈ نے انگلیوں سے میز کی سطح کھٹکھٹائی۔

''کیا نہیں سمجھی؟''

''تم نے قتل ہوتے نہیں دیکھا تھا۔''

کیٹ خاموش تھی۔ اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

''ہاں، میں نے اسے ایلن کو بلاک کرتے واقعی نہیں دیکھا۔ لیکن وجۂ قتل اس کے علاوہ کس کے پاس ہو سکتی ہے؟''

''ایک منٹ کے لیے دوسرے زاویے سے سوچتے ہیں۔'' ڈیوڈ نے تکون سالٹ ہولڈر میز پر گھمایا۔ ''ہم جانتے ہیں کہ ہنری ٹیمنا کا ایک معروف آدمی تھا۔ اور ہم اس کی پریکٹس کے بجائے افیئر کی بات کریں گے۔ غالباً ایلن رشتر کے ساتھ، میرا مطلب ہے غالباً......''

''او کے لیکن ایلن کو کہاں فٹ کرو گے؟''

''یہی ملین ڈالر کا سوال ہے؟'' ڈیوڈ نمک کے

بجائے شوہر چارج کو دیکھنے لگا۔ ”ایلن اوبرائن کو کہاں فٹ کیا جائے؟“

کیٹ نے تیوری چڑھائی۔ ”محبت کی تکون؟“

”ممکن ہے۔ لیکن ایک شادی شدہ معروف ڈاکٹر کتنی محبوبائیں پالے گا...... ڈاکٹر نہیں ہوا، پلے بوائے ہو گیا...... تکون اندر تکون...... بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے لیکن ایسا ہوتا بھی ہے۔ انسان بھی عجیب چیز ہے۔ ہم دونوں بھی تو انسان ہی نکلے......“

”کیا؟“

”کچھ نہیں۔ دیکھو یہ اگر تکون در تکون جیسی چیز ہے تو عورتوں کے اور بھی چاہنے والے ہو سکتے ہیں...... چنانچہ حسد کا عنصر داخل ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے، ڈیکر نہیں بلکہ کوئی اور حاسد ہو۔“

”تم میرا دماغ خراب کر رہے ہو۔“ کیٹ نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

کچھ دیر خاموشی چھائی۔

اچانک ڈیوڈ نے پھر خیال آرائی کی۔ ”مجھے یقین نہیں آرہا کہ ہم اب تک چوتھا کونا نظر انداز کرتے رہے۔“

”وہاٹ؟“

”ہاں...... چوتھا اہم ترین کونا ہم بھول گئے۔“ ڈیوڈ کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔

کیٹ غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ”مائی گاڈ“ اس نے سرگوشی کی۔ ”مسز ٹیماکا۔“

”جی، مسز ٹیماکا۔“

”اس جانب تو میرا خیال ہی نہیں گیا۔“

”اب خیال بھی جائے گا اور ہم بھی جائیں گے۔“

☆☆☆

کلینک کا دروازہ جاپانی عورت نے کھولا تھا۔

”تو تم لوگوں کا تعلق پولیس سے نہیں ہے؟“

”نہیں، لیکن چند سوالات......“

”میں صحافیوں سے بات نہیں کرتی۔“ وہ دروازہ بند کرنے لگی۔

”ہم رپورٹرز نہیں ہیں۔ میں وکیل ہوں اور یہ ڈاکٹر کیٹ شیزنی ہیں۔“

”کیا چاہتے ہو تم لوگ؟“

”ایک مرڈر ہوا ہے، جس کی کڑیاں تمہارے شوہر کے مرڈر سے ملتی ہیں...... ہمیں کچھ معلومات درکار ہیں۔“

جاپانی عورت کی آنکھوں میں دلچسپی کا عنصر ابھر کر غائب ہو گیا۔ ”تم اس نرس کی بات کر رہے ہو...... رشٹر......“

”یس۔“

”کیا جانتے ہو، اس کے بارے میں؟“

”ہم بخوشی سب بتا دیں گے اگر تم ہمیں اندر آنے دو۔“ جاپانی عورت کی آنکھوں میں احتیاط، تجسس اور دلچسپی کے عناصر گھل مل گئے تھے۔ تجسس جیت گیا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ اس کا نام ماری ٹیماکا تھا۔ وہ خاصی پُرکشش تھی۔ کیٹ نے حیرت محسوس کی کہ ایسی پُرکشش بیوی کی موجودگی میں ٹیماکا کے افیئر کیونکر چل رہے تھے۔ کیا مسز ٹیماکا شکی مزاج تھی یا پھر چڑچڑی......

وہ جہاں بیٹھے تھے، وہاں قریب ہی شیشے کا پارٹیشن تھا جس کے دوسری جانب دو خواتین ڈیسک پر مصروف کار تھیں۔ مسز ٹیماکا، کیٹ کے ذریعے این رشٹر کے بارے میں جاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ کیٹ محتاط انداز میں جواب دے رہی تھی۔

موقع ملتے ہی کیٹ نے سوال کیا۔ ”کیا کوئی اور خاتون بھی ملوث تھی؟“

”میرے علم میں نہیں ہے۔“

”کیا تم نے ایلن اوبرائن کا نام سنا ہے؟“

”نہیں، کیا میرے شوہر کے ساتھ اس کا تعلق تھا؟“

”ہمیں امید تھی کہ اس بارے میں تم کچھ بتا سکو گی۔“

مسز ٹیماکا نے نفی میں سر ہلایا۔

”کیا پولیس نے کسی ملزم کا ذکر کیا تھا؟“ ڈیوڈ نے سوال کیا۔

”تمہارا مطلب ہے، چارلس ڈیکر؟“

”ہاں۔“

ڈیٹکٹیو کا ساتھی ایک فوٹو لایا تھا۔ میں نے وہ فوٹو بھی نہیں دیکھا تھا۔ نہ ہی مجھے نام کا علم تھا۔ میں صرف اتنا جانتی تھی کہ پانچ سال قبل کسی ذہنی مریض نے میرے شوہر پر حملہ کیا تھا اور پولیس نے اسے دوسرے روز ہی چھوڑ دیا تھا۔“

”کیا وجہ تھی؟“

”شاید میرا شوہر اس معاملے کو ختم کرنا چاہتا تھا۔“

”کیسا معاملہ؟“

”اس نے مجھے نہیں بتایا تھا...... لیکن شاید پیگی کچھ مدد کر سکے۔“ مسز ٹیماکا نے بتایا۔

”پیگی؟“

مسز ٹینا کالے نے سر ہلا کر شیشے کی دوسری جانب اشارہ کیا۔

تینوں نے جگہ تبدیل کرلی۔

پیگی کی یادداشت اچھی تھی۔ اس کی پیشانی ذہانت کی عکاسی کر رہی تھی...... اسے نہ صرف چارلس ڈیکر یاد تھا بلکہ خاصی تفصیل یاد تھی۔ اسی نے بتایا کہ ڈیکر، ہنری کا گلا دباتے ہوئے چلا رہا تھا۔

"لعنت ملامت؟"

"نہیں۔ وہ کچھ اور کہہ رہا تھا۔" پیگی نے بتایا۔ "وہ جاننا چاہ رہا تھا کہ ڈاکٹر ہنری نے اس لڑکی کے ساتھ کیا کیا؟"

"کون سی لڑکی؟"

"اس کی بیٹی۔"

"وہ تو ایک گھنٹے بعد مرگئی تھی؟"

"ہاں۔"

ڈیوڈ اور کیٹ نے الجھن سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"وہ مریضہ تھی، نوجوان اور خوب صورت تھی۔ ہنری نے بہت کوشش کی تھی لیکن وہ لڑکی اور نومولود دونوں کو نہ بچا سکا۔" پیگی نے مزید کہا۔

"عورت کا نام کیا تھا؟"

"جے...... جینی...... ایک منٹ۔" پیگی سوچنے لگی۔

"ہاں بروک...... جینیفر بروک۔ میں نے اسٹاف کے ساتھ مل کر پاگل آدمی کو ہنری سے الگ کیا تھا۔ اس کے بعد وہ ڈھیر ہوگیا۔"

"کون، ڈاکٹر؟"

"نہیں، ڈیکر...... وہ فرش پر گٹھری کی صورت میں پڑا رو رہا تھا۔ پولیس کے آنے تک وہ اسی حال میں تھا۔ چند روز بعد ہم نے سنا کہ اس نے خود کو گولی ماری تھی لیکن خاصا زخمی ہونے کے باوجود بچ گیا...... بہت عجیب تھا۔ وہ بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ میں خود جذباتی ہوگئی تھی۔ حتیٰ کہ ہنری بھی رنجیدہ تھا۔"

کیٹ اور ڈیوڈ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں روانگی کا ارادہ باندھ رہے تھے۔ اچانک کیٹ کھڑے ہوتے ہوتے بیٹھ گئی۔

"ایک آخری سوال، پیگی۔ اگر تم برا نہ مانو؟ اگر تمہارا کوئی مریض جانبر نہ ہوسکے تو تم کتنے عرصے تک میڈیکل ریکارڈ محفوظ رکھتے ہو؟"

"پانچ سال۔ بعض صورتوں میں اس سے بھی زیادہ۔"

"جینیفر بروک کا چارٹ تمہارے پاس ہونا چاہیے؟"

"یقیناً، کیا تم دیکھوگی؟"

کیٹ نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔

پیگی، آفس میں فائل کیبنٹ کی طرف گئی اور حروفِ تہجی کے حساب سے B والی دراز دو مرتبہ دیکھی۔ پھر J والی دراز کا جائزہ لیا۔ اس کے چہرے پر واضح الجھن تھی۔

"یہ کیونکر ہوسکتا ہے۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے مڑی۔

"کیا وہ جگہ پر نہیں ہے؟" کیٹ اور ڈیوڈ دونوں ایک ساتھ گویا ہوئے۔

"میں بہت احتیاط کرتی ہوں۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ چارٹ کو اپنی جگہ پر ہونا چاہیے۔" پیگی نے پریشانی سے کہا۔

"یعنی کسی نے چارٹ غائب کر دیا ہے؟" ڈیوڈ بولا۔

"ہاں، اسی کا کام ہے۔ لیکن کیوں، آخر پانچ سال بعد اس نے یہ حرکت کیوں کی؟"

"میں سمجھا نہیں، تم کس کی بات کر رہی ہو؟"

پیگی نے ڈیوڈ کی طرف یوں دیکھا، جیسے وہ احمق ہے۔ "ڈاکٹر ہنری [illegible] کا اور کون؟"

☆☆☆

"جینیفر بروک۔" اسپتال کے ریکارڈ کلرک نے سپاٹ آواز میں نام لیا۔ اور کی بورڈ کے ذریعے نام کمپیوٹر میں داخل کیا...... جینیفر کے ساتھ دو نام سامنے آئے BROOK اور BROOKE۔ کیٹ نے دونوں کی تاریخ پیدائش دیکھی۔ ایک کی عمر ستاون برس بنتی تھی اور دوسری کی عمر پندرہ سال۔

کلرک نے سوالیہ نظر کیٹ پر ڈالی۔ کیٹ نے نفی میں سر ہلایا اور مایوسی سے ڈیوڈ کو دیکھا۔ ڈیوڈ نے پینٹ شرٹ پر سفید کوٹ پہنا ہوا تھا۔

"جن مریضوں کی اموات ہوجاتی ہے، ان کا ریکارڈ بھی کمپیوٹر میں ہوتا ہے؟" ڈیوڈ نے سوال اٹھایا۔ کیٹ نے پرامید نظروں سے کلرک کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔ ایسے مریضوں کا ریکارڈ الگ رکھا جاتا ہے۔" کلرک نے ایک بند دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

دونوں نے شکریہ ادا کیا اور بند دروازے کی طرف

بڑھ گئے۔

"آپ لوگ بیٹھیں، میں لاتا ہوں۔ آپ کو دشواری پیش آئے گی......" وہ بند دروازے کے عقب میں غائب ہو گیا۔ کلرک نے واپس آنے میں زیادہ وقت نہیں لیا۔ اس کے تاثرات دیکھ کر دونوں سنسنا اٹھے۔

"چارٹ وہاں نہیں ہے۔" کلرک نے اعلان کیا۔

"اسپتال سے کیسے گم ہو گیا؟" ڈیوڈ نے اسے گھور کر دیکھا۔

"بعض اوقات مریض کے لواحقین بھی کاغذات کی گمشدگی کا باعث بن جاتے ہیں۔" کلرک نے دفاعی انداز اختیار کیا۔ وہ دوبارہ کمپیوٹر پر آ گیا۔ "یہ دیکھیں۔ فائل روم میں جو لسٹ ہے وہ یہاں دیکھی جا سکتی ہے۔ لیکن وہ چارٹ وہاں نہیں ہے۔"

"ایک منٹ۔" ڈیوڈ نے کمپیوٹر اسکرین پر نظر ڈالی۔ "یہ کریک کوڈ" کا نشان کیسا ہے؟"

"یہ درخواست کا اشارہ ہے۔ کسی نے چارٹ کی نقل حاصل کرنے کے لیے درخواست دی ہو گی۔" کلرک نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

"کون سا چارٹ؟"

"دیکھتا ہوں...... اوہ، یہ نکی بروک کے چارٹ کی نقل کے لیے ہے۔"

ڈیوڈ اور کیٹ کے چہرے چمک اٹھے۔ "درخواست کس نے دی تھی؟"

کلرک نے کی بورڈ پر انگلیاں چلائیں۔ "جوزف کیا لو، اٹارنی ایٹ لا، الاکیا اسٹریٹ۔ درخواست کی تاریخ، مارچ، 2۔"

"ٹھیک ایک ماہ قبل۔" کیٹ بڑبڑائی۔

☆☆☆

وہ ایک عام سا دفتر تھا۔ جو جوزف کیا لو، اٹارنی ایٹ لا کا تھا۔

ڈیوڈ نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھولنے والا ہوائی کا باشندہ تھا۔ وہ خاصا تھیم شحیم تھا۔

"اوہ تم ڈیوڈ رین سم ہو۔" اس نے غیر دوستانہ انداز میں کہا۔

ڈیوڈ نے سر ہلاتے ہوئے کیٹ کا تعارف کرایا۔

"آ جاؤ۔" اس نے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا۔ دفتر میں حبس تھا۔ ایک مکمل فین چوں چوں کی آواز کے ساتھ گرمی کم کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ گلی میں کھلنے والی کھڑکی میں سے نظر آ رہا تھا۔ پرانا نا بجبرا ابجزرہ سال خوردہ فرنیچر...... کیٹ کو تمام علامتیں نظر آ رہی تھیں جو عکاسی کر رہی تھیں کہ ایک ناکام وکیل جدوجہد میں مصروف ہے۔ جگہ بھی مختصر تھی۔

"میں نے ابھی تک پولیس سے رابطہ نہیں کیا ہے۔" کیا لو نے آغاز کیا۔

"کیوں نہیں کیا؟" ڈیوڈ نے استفسار کیا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ تم اپنی پریکٹس کس طرح چلا رہے ہو؟ لیکن تمہیں میرے کلائنٹس سے دور رہنا چاہیے۔"

"تم جانتے ہو کہ ڈیکر مرڈر چارج میں پولیس کو مطلوب ہے۔"

کیا لو نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ ایک غلطی ہے۔"

"یہ بات تمہیں ڈیکر نے بتائی ہے؟"

"میں اب اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ اس تک پہنچ سکوں...... وہ کیسے بتائے گا؟ میری اپنی رائے ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ کام پولیس کرے گی۔"

"دیکھو۔" کیا لو ترخا۔ "میں جانتا ہوں کہ میں تمہاری کلاس سے بہت دور ہوں...... لیکن میرے تھوڑے سے کلائنٹ ہیں اور میں ان کے خلاف نہیں جا سکتا۔"

"تم جانتے ہو کہ دو انسان مارے جا چکے ہیں۔"

"پولیس کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے کہ یہ حرکت ڈیکر کی ہے۔" کیا لو بولا۔

"پولیس کا کہنا ہے کہ وہ ثبوت حاصل کر لیں گے...... چارلس ڈیکر ان کے نزدیک ایک بیمار اور خطرناک آدمی ہے۔ اسے مدد کی ضرورت ہے۔"

"مدد؟" کیا لو نے تیوری چڑھائی۔ "مدد یہ کریں گے کہ اسے اندر کر کے تالا بند کر دیں گے۔" کیا لو نے رومال نکال کر پیشانی صاف کی۔ کچھ سوچنے کے بعد وہ پھر بولا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ جلد یا بدیر پولیس یہاں آئے گی۔ میرے پاس امکانات بہت محدود ہیں۔" اس نے رومال واپس جیب میں رکھا اور ایک دراز کھولی۔ دراز میں سے ایک فولڈر نکال کر میز پر پٹخا۔ "اس میں وہ نقل ہے، جس کی تمہیں تلاش ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس ریکارڈ کی متلاشی صرف تم ہی نہیں ہو۔"

"کیا مطلب؟ کسی اور نے بھی اپروچ کیا تھا؟" ڈیوڈ نے حیرت محسوس کی۔

"ایسا تو نہیں ہوا۔ لیکن کوئی میرے دفتر میں گھس آیا تھا۔"

''کیسے؟''ڈیوڈ اور کیٹ دونوں چونکے۔

''چند روز قبل...... میری تمام فائلوں کو چھانا گیا۔ کوئی چیز چرائی نہیں گئی۔ چراتے بھی کیا۔ پچاس ڈالر پڑے تھے۔ اس وقت میں سمجھ نہیں سکا کہ یہ کیا گھن چکر ہے۔ لیکن جب تم نے فون پر گم ہونے والے ریکارڈ کے بارے میں بتایا تو مجھے سوچنا پڑا۔ کوئی اور بھی اس فائل کے پیچھے ہے۔''

''لیکن وہ اسے حاصل نہیں کر سکا؟''ڈیوڈ نے سوال کیا۔

''جس رات وہ میرے دفتر میں گھسا تھا، یہ ریکارڈ میرے گھر پر تھا۔''

''صرف یہی ایک کاپی ہے؟''

''نہیں۔ حفاظتی نقطۂ نظر کے تحت میں نے پانچ چھ نقول بنوالی ہیں۔''

''میں دیکھ سکتی ہوں؟''کیٹ کو بولنا پڑا۔ وہ بے چینی محسوس کر رہی تھی۔

''ہاں تم ڈاکٹر ہو۔''ڈیوڈ نے حمایت کی۔

کیٹ نے کور پر جینیفر بروک کا نام پڑھا۔ پھر ورق گردانی کے ساتھ مطالعہ شروع کیا...... روٹین کی چیزیں اس نے سرسری دیکھیں۔ جینی کی عمر 28 سال لکھی تھی۔ 36 ہفتے کا حمل تھا۔ ابتدائی ہسٹری اور فزیکل چیک اپ ڈاکٹر ٹیمنا کا نے پرفارم کیا تھا...... بے بی کا ہارٹ ٹھیک دھڑک رہا تھا۔ بلڈ ٹیسٹ بھی ٹھیک تھے...... کیٹ نے ڈلیوری روم ریکارڈ کی طرف توجہ دی۔

یہیں سے ابتری کے آثار ابھرنا شروع ہوئے۔ ابتری نہیں بلکہ خطرناک پیچیدگیاں...... حتیٰ کہ نرسوں کی صاف ستھری رائٹنگ تک کیڑے مکوڑوں میں تبدیل ہو گئی تھی۔ ایک جوان عورت کی موت کا اعلان کرنے کے لیے سرد اور غیر معیاری میڈیکل زبان استعمال کی گئی تھی۔ جہاں ٹوٹے پھوٹے، نامکمل الفاظ میں سیزرز، تشنج، مسکن ادویات کی غیر اثر پذیری، ایمرجنسی امداد، بگڑتا تنفس، سانس رکنا، نبض ڈوبنا، دل کا مساج، بچے کی کم ہوتی دھڑکن وغیرہ کے بارے میں شکستہ تحریر موجود تھی جسے پڑھنا تک مشکل تھا۔ اگلے صفحے پر ایک صاف ستھرا جملہ لکھا تھا۔ جو مریضہ کی موت کا اعلان تھا۔

ڈاکٹر وان کو ایمرجنسی میں طلب کیا گیا تھا۔ نومولود لڑکی تھی۔ جینیفر بروک کی موت کا وقت ڈیڑھ بجے لکھا تھا۔ ایک گھنٹے بعد نومولود بھی آخری سانس لے چکی تھی۔

''کیٹ۔''ڈیوڈ نے سرگوشی کی۔ ''نیچے دیکھو۔''اس کا اشارہ صفحے کی زیریں جانب تھا۔ جہاں آپریشن کے مرکزی کرداروں کے نام لکھے تھے۔

ہنری ٹیمنا کا، ایم ڈی

این رشفر، آر این (نرس)

ایلن اوبرائن، آر این (نرس)

نام پڑھ کر کیٹ کے ہاتھ برف کے مانند سرد پڑ گئے۔ وہ پلک جھپکائے بغیر تین ناموں کو گھور رہی تھی۔ تینوں اس دنیا میں نہیں تھے۔ تینوں ہلاک کر دیے گئے تھے...... مرڈر۔ فقط ایلن کا کیس الجھا ہوا تھا۔ جسے کیٹ کی ''نا اہلی'' کے کھاتے میں ڈال کر ایک حادثہ سمجھا جا رہا تھا۔

''ڈاکٹر وان کا نام کیوں نہیں ہے؟''اس نے خالی خالی نظروں سے ڈیوڈ کو دیکھا۔ ''شاید وہ کچھ بتا سکے۔''

''یہ ممکن نہیں۔''اٹارنی کیالو نے بتایا۔ ''جینی بروک کی موت کے کچھ عرصے بعد ہی اس کی کار حادثے کا شکار ہو گئی تھی۔''

''تمہارا مطلب ہے وہ کار ایکسیڈنٹ میں مارا گیا تھا؟''

''ہاں۔ وہ سب ختم ہو چکے ہیں۔''کیالو نے سر ہلایا۔ چارٹ، کیٹ کی بے جان انگلیوں سے پھسل کر میز پر جا گرا۔ یہ ڈاکیومنٹ نہیں، موت کا پروانہ ہے۔ کوئی شیطانی چیز اس کے ساتھ وابستہ ہے۔

''چند ہفتے قبل چارلس ڈیکر میرے دفتر آیا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ اس نے مجھے ہی کیوں منتخب کیا؟ کون جانتا ہے؟ شاید اس نے میری شہرت کی وجہ سے مجھ سے رابطہ کیا ہو۔ طبی نا اہلیت کی بنیاد پر مقدمے کی صورت میں وہ قانونی پوزیشن معلوم کرنا چاہتا تھا۔''

''اس کیس پر۔''ڈیوڈ نے تعجب کا اظہار کیا۔ ''یہ تو پانچ برس پرانی بات ہے...... تم اور میں جانتے ہیں کہ اس صورت میں کوئی مقدمہ نہیں بنتا۔''

''ہاں، لیکن وہ میری خدمات کے عوض کیش ادا کر رہا تھا۔ میں نے اس کے لیے چارٹ کی نقل حاصل کی...... علاوہ ازیں دونوں نرسوں کے علاوہ ڈاکٹر ٹیمنا کا کو خطوط لکھ دیے۔ لیکن تینوں کی جانب سے کوئی جواب نہیں آیا۔''

''شاید انہیں جواب دینے کا موقع ہی نہیں ملا۔ ڈیکر اس سے پہلے ہی ان تک پہنچ گیا۔''ڈیوڈ نے کہا۔

''لیکن کیوں؟ ڈیکر کو کیا ضرورت تھی؟''کیالو نے اعتراض کیا۔

''انتقام۔ انہوں نے اس کی محبت کو ختم کر دیا تھا۔

جواباً اس نے ان کو ہلاک کر دیا۔‘‘ ڈیوڈ نے اعتراض کا جواب دیا۔

’’میرے موکل نے کسی کو ہلاک نہیں کیا۔‘‘

’’تمہارے موکل کے پاس وجۂ قتل موجود تھی اور تمہارے ذریعے سے اس نے ان کے نام اور پتے بھی حاصل کر لیے تھے۔‘‘

’’تم ڈیکر سے کبھی نہیں ملے، میں مل چکا ہوں۔ وہ ایک بے ضرر شخص ہے...... غیر متشدد۔‘‘ کیا تو نے بتایا۔

’’بیشتر قاتل حیران کن حد تک عموی حلیہ رکھتے ہیں۔ میں بارہا ایسے لوگوں سے کورٹ میں مل چکا ہوں۔‘‘ ڈیوڈ نے کہا۔

’’لیکن میں نام نہاد قاتلوں کا وقاع کر چکا ہوں۔ ایک قاتل معصوم دکھائی دینے کے باوجود کوئی نہ کوئی علامت رکھتا ہے۔ دیکھنے والی آنکھ ہونی چاہیے۔ ڈیکر سے ملنے کے بعد مجھے یقین ہے کہ وہ قاتل تو کیا، اس میں یہ صلاحیت سرے سے ناپید ہے...... میں اس کے لیے افسردہ ہوں۔ وہ ٹھیک طرح اظہارِ خیال تک نہیں کر سکتا۔ اس نے کئی باتیں مجھے لکھ کر بتائی تھیں...... عورت اور بچہ واپس نہیں آ سکتے اور ڈیکر میں انتقام لینے کی صلاحیت نہیں ہے۔ میں نہیں سمجھ پایا کہ وہ کیا چاہ رہا ہے جبکہ اس کی مالی حالت بھی کمزور ہے۔‘‘

’’وہ کہاں مل سکتا ہے؟‘‘

’’اس کا پی او بکس نمبر ہے لیکن تین دن سے اس نے خط و کتابت چیک نہیں کی۔‘‘

’’کوئی پتا، فون نمبر؟‘‘

’’نہیں کچھ نہیں۔ پولیس ہی کچھ کرے تو کرے۔ اس سے زیادہ میرے پاس کوئی معلومات نہیں۔ مزید کچھ جاننا چاہتے ہو تو پھر چارلس ڈیکر سے ملنا پڑے گا۔‘‘ کیا تو نے بات ختم کر دی۔

’’وہ روپوش ہے۔‘‘ ڈیوڈ نے کہا۔

’’یا ہلاک ہو چکا ہے۔‘‘ جوزف کیا تو نے سپاٹ آواز میں کہا۔

☆☆☆

قبرستان میں بین ہالو بطور گراؤنڈ کیپر اڑتالیس برس گزار چکا تھا۔ اس طویل دورانیے میں اسے انوکھے معاملات سے واسطہ پڑا تھا۔ ان چیزوں کا تعلق مافوق الفطرت مظاہر سے نہیں تھا۔ زندہ لوگوں کے ناقابلِ فہم رویے اسے حیران کر دیتے تھے...... ان میں بیوہ، رنڈوے، لڑکیاں، لوگ وغیرہ سب ہی شامل تھے۔

آج کل اس کی مرکزِ نگاہ ایک پرانی شیوی کار تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ شیوی سے قبل ایک فورڈ کار آ کر ایک جانب رک جاتی۔ کچھ دیر بعد شیوی وہاں پہنچتی۔ جو روز پابندی سے وہاں حاضری رہی تھی۔ کار علی الصبح وارد ہوتی تھی۔ شیوی کا ڈرائیور ایک مخصوص قبر پر ایک گھنٹا گزارتا تھا۔ تاہم بین نے کبھی مداخلت نہیں کی۔

اس روز بھی بین بڑی سی قینچی کے ذریعے فالتو جھاڑ جھنکاڑ صاف کر رہا تھا۔ تب شیوی کار قبرستان میں داخل ہوئی...... ڈرائیور دراز قامت بدحال سا شخص تھا۔ بین زیادہ دور نہیں تھا۔ بین نے سر اٹھایا۔ دراز قد نے ہاتھ لہرایا۔ بین نے بھی مسکرا کر ہاتھ سے اشارہ کیا۔

وہ آدمی پھول لیے ایک قبر کی طرف چلا گیا۔ بین چند منٹ رک کر اسے دیکھتا رہا...... پھر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اجنبی ایک گھنٹے تک وہاں رہے گا...... وہ رخ بدل کر بوگن ویلیا کی تراش خراش میں مگن ہو گیا۔ وقت بہت تیزی سے گزرا تھا۔ معاً اسے خیال آیا، وہ مذکورہ قبر سے دور آ چکا تھا۔ وہ آدمی اور شیوی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔

بین نے گیٹ کی جانب دیکھا۔ شیوی باہر نکل رہی تھی۔ بین نگاہ ہٹانے والا تھا کہ اسے فورڈ نظر آئی، جو شیوی کے پیچھے جا رہی تھی۔ بین سر کھجانے لگا۔ دفعتاً اس کے ذہن میں ایک نئی سوچ نے سر ابھارا۔ وہ مخصوص قبر کی طرف چل پڑا۔ کچھ دیر بعد وہ قبر کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ اس نے قبر کا کتبہ پڑھا۔ جینیفر بروک 28 برس۔

بین نے عالمِ افسوس کے ساتھ سر ہلایا۔ آہ، جوان عورت کا غم۔ وہ آدمی یقیناً کوئی قریبی عزیز ہوگا۔ شاید شوہر...... قبر پانچ سال پرانی تھی۔ وہ یقیناً جینی بروک سے بے حد محبت کرتا تھا۔

☆☆☆

’’کچھ کھانے کا بندوبست کرو۔ سینڈوچ لے آؤ۔‘‘ پوکی نے اپنے ساتھی سارجنٹ برونی سے کہا۔ سینڈوچ آتے ہی فون بجنے لگا۔ پوکی نے منہ بنایا اور سینڈوچ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس وقت اس کے لیے بڑی ترجیح پیٹ پوجا تھی۔

سارجنٹ نے فون اٹھایا۔ فون ڈیوڈ زین سم کا تھا۔

’’وہ چاہتا ہے کہ اوبرائن کیس کی فائل کھول دی جائے۔‘‘ سارجنٹ نے بتایا۔

’’آخر اسے کیا تکلیف ہے...... اوبرائن کیس میں کیا

رکھا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ کم از کم ایک اہم چیز تو ہے۔"

"کیا؟"

"ڈاکٹر لیڈی۔" بروفی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پوکی ہنس دیا۔ "ڈیوڈ اس ٹائپ کا نہیں ہے۔"

"پھر، کیا بولوں؟"

"کہہ دو کال بیک کروں گا۔" پوکی نے سینڈوچ پر منہ مارا۔

"کب؟"

"اگلے برس، اگر وہ خوش قسمت رہا۔"

بروفی نے ماؤتھ پیس سے ہاتھ ہٹا کر کچھ کہا اور فون بند کر دیا۔

☆☆☆

ڈیوڈ نے گاڑی کا دروازہ زور سے بند کیا۔

"نہیں لگتا، وہ مزید تعاون کرے گا۔" کیٹ نے تبصرہ کیا۔

"ان کا کہنا ہے کہ مناسب شہادتوں کی غیر موجودگی میں مرڈر انوسٹی گیشن اوپن نہیں کی جاسکتی۔ ایلن اور برائن، ڈاکٹرز کی غفلت کے نتیجے میں ماری گئی۔" ڈیوڈ نے قدرے کڑواہٹ سے کہا۔

"لیکن انہیں اٹارنی کیالو سے تو بات کرنی پڑے گی۔"

"پوکی، ایلن اور برائن کیس دوسرے مرڈرز کیسز سے الگ رکھنا چاہتا ہے۔" ڈیوڈ نے بتایا۔ "میرا اندازہ ہے۔ اس وقت اس کے باڈی سے ... نے مجھ سے بات کی تھی۔ بات کے دوران وقفہ آیا تھا۔ مطلب پوکی وہاں بیٹھا تھا۔"

"یعنی ہمارے ساتھ کوئی نہیں ہے۔" کیٹ نے بددلی سے کہا۔

"غلط۔ درحقیقت، ہمیں ایک طرف کیا جارہا ہے..... حالات و واقعات تشویشناک نہیں بلکہ خطرناک ہیں۔"

"ڈیوڈ، خطرناک شروع سے تھے لیکن تم نے دیر لگا دی سمجھنے میں۔"

"او کے۔ مجھے اعتراف ہے۔ میری چھٹی حس اور تجربہ کہہ رہا تھا کہ تم سچائی پر ہو۔ دوسری طرف وکیل کی حیثیت سے میرے پاس بھی کوئی ٹھوس شہادت نہیں تھی۔"

"پھر تم نے میرا ساتھ کیوں دیا؟"

"پتا نہیں۔ لیکن اب تک جو کچھ میں دیکھ چکا ہوں، میڈیکل ریکارڈز کی چوری، کیالو کے دفتر کی تلاشی، دو عدد مرڈرز...... حتیٰ کہ میں ڈاکٹر دان کے کار حادثے کو بھی مرڈر ہی سمجھتا ہوں۔ یہ خوش قسمتی تھی کہ کیالو ایک نقل حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور وہ نقل تلف ہونے سے بھی بچ گئی۔... کم از کم چند سوالات واضح ہو گئے۔" ڈیوڈ کی پیشانی پر شکنیں تھیں۔

"مثلاً؟"

"مثلاً جینی بروک کی سرجری اٹینڈ کرنے والے سب کے سب مارے جاچکے ہیں۔ کوئی پُراسرار بات ہے۔ یہ کسی سائیکو پیتھ (ڈیکر) کا کام نہیں ہے۔ یہ بڑی پلاننگ ...... کے تحت کیا گیا ہے۔ کوئی کلیو ہے جسے چھپانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس کلیو کا براہ راست تعلق جینیفر بروک کی موت سے ہے۔" ڈیوڈ خاموش ہو گیا۔

"ہم کوئی چیز مس کر رہے ہیں۔ ڈیکر ہی کچھ بتا سکتا ہے۔ مجھے پہلے بھی شک تھا کہ کہیں پولیس اور ہم غلط آدمی کے پیچھے تو نہیں ہیں...... ہمیں انتظار کرنا چاہیے کہ پولیس ڈیکر کو قابو کر لے۔"

کیٹ سوچ رہی تھی، اگر ڈیکر گرفتار ہو گیا تو یہ ڈیکر کے حق میں اچھا ہو گا یا برا؟

"کیٹ، تم نے این رشر کے فلیٹ میں جو دیکھا، اس نے تم کو شعوری طور پر دہشت زدہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ بھی ہوا، تم نے شعوری طور پر اسے دہشت کے پس منظر میں ہی محسوس کیا...... تم ڈیکر کو قاتل سمجھنے پر مجبور تھیں۔ چند منٹ کے لیے تم زاویۂ نگاہ تبدیل کر دو اور آنکھیں بند کر کے تصور کرو...... ڈیکر کی آنکھوں اور چہرے کو تصور میں لاؤ۔" ڈیوڈ نے سمجھایا۔

"لیکن وہ میرے پیچھے آرہا تھا؟" کیٹ نے اعتراض کیا۔

"ممکن ہے کہ وہ تمہیں بتانا چاہ رہا ہو کہ وہ قاتل نہیں ہے۔ کیالو کی بات بھی ذہن میں رکھو۔ اٹارنی کیالو، ڈیکر کو قاتل ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس کا آخری جملہ میرے ذہن میں چبھ رہا ہے جس کے مطابق ڈیکر کو پولیس سے زیادہ کسی اور سے خطرہ ہے...... پلیز کیٹ ذرا تصور کرو۔ اگر ڈیکر بھی مارا گیا تو یہ اسرار حل نہیں ہو سکے گا۔ جب ڈاکٹر دان کار حادثے میں مارا گیا تھا تو ڈیکر آزاد نہیں تھا...... پانچ سال بعد ڈیکر کے باہر آنے کے بعد افراتفری اور خون خرابا شروع ہوا۔ کیوں؟ فرض کر لیتے ہیں کہ ڈیکر ہی ملزم ہے لیکن دوسرے امکان کو نظرانداز کرنا حماقت ہو

گی۔''

''کیسا امکان؟'' کیٹ نے ایک ابرو اوپر چڑھایا۔

''کسی اور کو ڈیکر سے خطرہ ہے، یعنی ڈیکر خود خطرے میں ہے۔''

☆☆☆

اس وقت تک جب بھی کیٹ کے تصور میں چارلس ڈیکر کی شبیہ، خصوصاً آنکھیں اُبھرتیں...... تو خوف اور وحشت اسے اپنی گرفت میں لے لیتا۔ اس نے گہری گہری سانسیں لے کر آنکھیں بند کرلیں۔ حتیٰ الامکان ذہن کو نیوٹرل کیا اور ڈیکر کے بارے میں سوچنا شروع کیا...... جینی بروک سے اس کی بے پناہ محبت، خودکشی کی کوشش...... قدم بہ قدم تصور میں تجزیہ کرتی ہوئی این رشر کے فلیٹ تک آن پہنچی۔

کیٹ نے بڑھتی ہوئی نبض کی رفتار کو نظرانداز کیا اور ڈیکر کے چہرے کو فوکس کیا...... مکمل تاثرات، وحشت نہیں، ویرانی...... ویران آنکھیں۔ کیا وہ قاتل کی آنکھیں تھیں؟

کیٹ نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ الجھن میں پڑ گئی۔

''کل میں پولی کو کارنر کروں گا۔'' ڈیوڈ نے کہا۔

''کیا تم اسے قائل کرلو گے؟''

''کرلوں گا۔ اسے مزید ایویڈنس چاہئیں، ہمیں اب انتظار کرنا چاہیے۔''

''میں نہیں کرسکتی۔ میرا کیریئر داؤ پر لگا ہے۔''

''اور زندگی؟''

''میرا کیریئر میری زندگی ہے۔''

''بہت فرق ہے دونوں میں۔''

''پھر بھی، یہ تمہاری جنگ نہیں ہے۔''

''تم غلط سمجھ رہی ہو۔''

دونوں خاموش ہوگئے۔

☆☆☆

وہ رات نہیں ایک رنگین سپنا تھا۔ سبز اور نیلے رنگوں نے مل کر نت نئے رنگ تخلیق کردیے تھے۔ نہ ہوش، نہ بے ہوشی...... کب ہوا، کیسے ہوا، کون جانے...... دونوں اس دنیا سے دور چلے گئے تھے...... بہت دور......

صبح کیٹ کی آنکھ کھلی تو ڈیوڈ غائب تھا۔ کچھ دیر وہ سوچتی رہی کہ وہ کہاں ہے؟ رات سپنا تھا یا حقیقت؟ پھر وہ اٹھ کر واش روم چلی گئی۔

واش روم سے نکل کر اس نے ڈیوڈ کو تلاش کرنا شروع کیا۔ سب سے پہلے کچن۔ پھر دوسرے کمرے...... ایک چھوٹا کمرا کھولا تو وہ ٹھٹک گئی۔ شیلف پر چند کتابیں رکھی تھیں۔ اس نے بڑھ کر ایک کتاب اٹھائی جس پر تو جارین سم لکھا تھا۔ وہ یک ٹک نام کو گھورتی رہی۔

''آئی ایم سوری۔'' اس نے آنسوؤں کو روکتے ہوئے سرگوشی کی۔ ''آئی ایم سوری۔''

وہ کچن سے ہوتی ہوئی واپس اپنے کمرے میں آگئی۔

''کیا حماقت ہے؟'' اسے فون کے نیچے ایک پرچہ نظر آیا جو ڈیوڈ اس کے لیے چھوڑ گیا تھا۔

وہ ایک بار پھر اناڑی کیا تو سے حاصل کردہ چارٹ لے کر بیٹھ گئی۔ ''ان کاغذات کے اندر کیا راز چھپا ہے؟'' اس نے ورق گردانی شروع کی...... یہ ایک انتہائی خطرناک پُراسرار ڈاکیومنٹ کی شکل اختیار کرگیا تھا۔ آخر ان چند کاغذات میں ایسی کیا خطرناک بات پوشیدہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ جس روز جینی بروک کی سرجری ہوئی...... اس روز کوئی بہت ہی غلط واقعہ ظہور پذیر ہوا تھا...... کیا ہوا تھا؟ جو جینی بروک کے ساتھ نومولود کی جان بھی لے گیا۔ نیز ڈاکٹرز اور نرسز بھی مارے گئے۔ کیٹ کا بدن لرز اٹھا۔ کون جانتا ہے؟ کیا صرف چارلس ڈیکر جبکہ وہ خود ایک پزل تھا، جگ پزل...... ایک دیوانہ، پولیس کے نزدیک...... گلے تراشنے والا عفریت۔

ایک بے ضرر انسان، بقول جوزف کیا تو۔ ایک بے چین، کھوئی ہوئی روح۔ ایک آدمی، دو چہرے۔

وہ سیدھی ہوکے بیٹھ گئی۔ ایک آدمی، دو چہرے۔ یعنی بٹی ہوئی شخصیت۔ نفسیاتی زبان میں شیزوفرینیا۔

☆☆☆

ہیئرنگ کے دوران، کیٹ ناموافق سوالات کے سامنے دل گیر تھی۔ بے بسی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس نے حتی الامکان دفاع کیا، لیکن کاغذی شواہد اس کے خلاف تھے۔ اس نے بدقت تمام اپنے ٹوٹتے چٹختے اعصاب کو قابو میں رکھا ہوا تھا۔ صرف سرجن گائے نے کیٹ کی اتھارٹی کے بارے میں مثبت رائے دی تھی۔ کیٹ نے دل ہی دل میں اس کا شکریہ ادا کیا۔ تاہم EKG کی رپورٹ حلق میں پھنس گئی تھی۔ کمیٹی میں سات ارکان تھے اور وہ تنہا...... وہی ہوا، جس کی وہ توقع کررہی تھی جس سے وہ خوف زدہ تھی۔ کمیٹی اس کا کیریئر نہیں، خود اسے ختم کررہے تھے۔ بالآخر

''مسیچوسٹس'' کی بلی تھیلے سے باہر آ گئی۔ کیٹ کا جسم لکڑی کے مانند اکڑ گیا۔ شکستہ دل، شکستہ جان......

کمیٹی نے ہیئرنگ اختتام پذیر کی اور رخصت ہو گئی۔ کیٹ، بے جان سی نشست میں بیٹھی رہ گئی...... وہاں صرف اسپتال کا اٹارنی اور ہیٹن کورٹ کھڑے رہ گئے۔ گمبھیر خاموشی تھی۔

''ڈاکٹر ہنیز لی، کیا یہ بات کرنے کا وقت نہیں ہے؟'' اٹارنی نے کہا۔

''کیسی بات؟''

''سیٹلمنٹ!''

کیٹ کی کمر اکڑ گئی۔ ''کیا یہ اظہار عجلت نہیں ہے؟''

''نہیں، یہ عجلت نہیں ہے بلکہ دیر ہو گئی ہے۔ کسی بھی وقت اسٹوری کھل جائے گی۔ اس وقت بھی ایک رپورٹر آفس میں موجود ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ ٹرائل ہو گا...... الزام ثابت ہونے کے بعد کہانی اخبار کی زینت بن جائے گی۔''

''لیکن کیس فائل ہوئے محض ایک ہفتہ ہوا ہے۔''

''ہم نے حتی الامکان معاملات کو پوشیدہ رکھا تھا۔ اب وقت آ گیا ہے...... جو کچھ کرنا ہے، تیزی سے کرنا ہے۔ صرف تمہاری رضامندی کی ضرورت ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ میں 1/2 ملین میں آؤٹ آف کورٹ سمجھوتا کرا لوں گا...... اگرچہ وہ 1/2 ملین سے اوپر جانے کی کوشش کریں گے۔''

''نہیں۔ میں شواہد جمع کر رہی ہوں اور بروقت ثابت کر دوں گی کہ......''

''تمہاری رضامندی کی ضرورت نہیں ہے۔ ٹرائل نہیں ہو گا۔ بلکہ سیٹلمنٹ ہو گی۔'' ہیٹن کورٹ پھنکارا۔

کیٹ کے جبڑے بھنچ گئے۔ ''ٹھیک ہے پھر میں اپنے اٹارنی کو ادائیگی کروں گی...... اسپتال کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے۔''

دونوں آدمیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں کے چہرے پر حیرت کے ساتھ ناخوشگوار تاثرات تھے۔

''تم اپنے پاؤں پر کلہاڑی چلا رہی ہو۔ سرجن گاٹے کا مسئلہ نہیں ہے۔ کورٹ میں تم تنہا ہو گی۔ ڈیوڈ رین ہم تمہیں چٹکیوں میں اڑا دے گا۔ میں جانتا ہوں، وہ کیا چیز ہے۔''

''مسٹر رین ہم کا اس کیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' کیٹ نے اطمینان سے دھماکا کیا۔

''کیا بکواس ہے؟''

''بکواس نہیں ہے۔ اس نے کیس چھوڑ دیا ہے۔''

ہیٹن کورٹ غرایا۔ ''یہ افواہ کس نے تمہارے کان تک پہنچائی ہے؟''

''خود اس نے۔''

ایک لمحہ کے لیے دونوں افراد سُن ہو گئے۔

''ڈیئر گاڈ۔'' اٹارنی نے پنسل ایک طرف پھینکی۔ ''ہم مصیبت میں پڑنے والے ہیں۔''

''اگلی ہیئرنگ میں تمہیں معطل کیا جائے گا۔ کوئی رعایت نہیں ہو گی۔'' ہیٹن کورٹ مشتعل ہو گیا تھا۔ یہاں، وہاں، کہیں بھی تم بھی ملازمت حاصل نہ کر سکو گی...... میں نے سیٹلمنٹ کے ذریعے تمہیں موقع دینے کی کوشش کی تھی...... تم کسی رعایت کی مستحق نہیں ہو۔ یہ میری آخری کوشش ہے۔ استعفٰی پر دستخط کرو...... رزیگنیشن کا ذکر ہو گا اور نہ مقدمے کا...... تم کسی اور شہر میں جاب کر سکتی ہو۔'' ہیٹن کورٹ بھنّا گیا تھا۔ کوئی مرد ڈاکٹر بھی ہوتا تو گھٹنے ٹیک دیتا...... کس مٹی کی بنی ہوئی ہے یہ عورت؟

کیٹ نے ریزیگنیشن لیٹر اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ لیٹر کو گھور رہی تھی۔

''ہم منتظر ہیں۔'' اٹارنی نے پُر امید انداز میں کہا۔

کیٹ کھڑی ہو گئی۔ براہِ راست ہیٹن کورٹ کی آنکھوں میں دیکھا اور لیٹر پھاڑ کے ہوا میں اچھال دیا۔ پلٹی اور کمرے سے نکل گئی...... کشتیاں جل گئی تھیں۔ وہ رونا چاہتی تھی، چلانا چاہتی تھی...... اس کی آنکھوں میں پانی تھا۔ تاہم وہ خاموش رہی۔ رونے کے لیے اس نے دل کو آزاد چھوڑ دیا۔ جو پَر کٹے پنچھی کے مانند سینے میں پھڑپھڑا رہا تھا۔ وہ جلد از جلد ڈیوڈ کے پاس پہنچنے کے لیے بے قرار تھی۔ اسے سہارے کی ضرورت تھی۔ ڈیوڈ کی بانہوں کا سہارا۔ وہ اس کے سینے سے لگ کر رونا چاہتی تھی۔

وہ دھندلی آنکھوں کے ساتھ کار ڈرائیو کر رہی تھی۔

☆☆☆

وہ دونوں نیم تاریک سڑکوں سے گزرتے ہوئے پارکنگ کی طرف جا رہے تھے۔ کیٹ نے ڈیوڈ کا بازو تھام رکھا تھا۔ ہیئرنگ کی تمام کہانی وہ اسے سنا چکی تھی۔ کیٹ کی فرسٹریشن بہت حد تک کم ہو چکی تھی۔

بی، ایم، ڈبلیو گھر کی جانب رواں دواں تھی۔ کیٹ نشست پر نیم دراز ہو گئی۔ مخصوص احساسِ تحفظ نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جو وہ ہمیشہ ڈیوڈ کی موجودگی میں

محسوس کر رہی تھی۔

معاً ڈیوڈ نے اطلاع دی کہ ان کا تعاقب ہو رہا ہے۔ اس کی نظر عقبی آئینے پر تھی۔ کیٹ نے سائڈ مرر میں دیکھا۔

''ڈیوڈ؟''

وہ خاموش رہا۔ انجن کی بھنبھناہٹ میں اضافہ ہوا۔ رفتار بڑھ گئی تھی۔

''ڈیوڈ، کیا ہو رہا ہے؟''

''وہ کار، ہمارے پیچھے ہے۔'' ڈیوڈ نے کہا۔

کیٹ نے پلٹ کر دیکھا۔ فاصلے پر دو روشن لیمپ نظر آرہے تھے۔

''تمہیں یقین ہے؟''

''وہ گاڑی پارکنگ کے ساتھ ہی نکلی تھی اور تب سے ہمارے پیچھے ہے۔''

''تم سنبھل کر بیٹھو۔ کچھ کرنا پڑے گا۔'' ڈیوڈ نے ارادہ ظاہر کیا۔

''یہ وہی ہے۔'' کیٹ نے نام نہیں لیا۔

''ہم ہائی وے سے اترنے والے ہیں۔'' ڈیوڈ نے خبردار کیا۔

ڈیوڈ نے رفتار پھر بڑھا دی تھی۔ جلد ہی وہ اپنے مطلوبہ موڑ تک پہنچ گیا۔ پتلی سڑک ہائی وے سے کٹ کر جنگل میں داخل ہو رہی تھی۔ ڈیوڈ نے اچانک موڑ کاٹا اور بی ایم ڈبلیو جنگل میں گھسا دی۔

''وہ اسپتال سے تمہاری نگرانی کر رہا تھا اور جب تم اکیلی تھیں......''

کیٹ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

''جم کے بیٹھنا۔'' ڈیوڈ نے پھر ہوشیار کیا۔ جھاڑیوں اور درختوں کی شاخیں ونڈشیلڈ سے ٹکرا رہی تھیں۔ عقبی گاڑی مستقل پیچھے تھی۔ اس کی روشنیاں کبھی اوجھل ہو جاتیں، پھر دوبارہ ظاہر ہوتیں......

ڈیوڈ نے طاقتور بی ایم ڈبلیو کی اہلیت سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا اور ناہموار تنگ راستے پر رفتار بڑھانے لگا۔ لگ رہا تھا وہ ریئر ویو میں جھانک لیتا۔ اس کی متلاشی نگاہیں سامنے کے علاوہ بائیں جانب بھی منڈلا رہی تھیں۔ یہ ویران جنگل نہیں تھا۔ کہیں کہیں مکانات بنے ہوئے تھے۔

معاً اس نے ایکسلریٹر چھوڑ کر اچانک نمودار ہونے والا بایاں موڑ کاٹا۔ گاڑی اچھل کر گڈمڈی نما راستے پر

آ گئی۔ مڑنے سے چند ثانیے پہلے وہ ٹیل لائٹس بند کر چکا تھا۔

سیٹ بیلٹ، کیٹ کے پیٹ میں گھس گئی۔ پچاس گز کا فاصلہ بی ایم ڈبلیو نے سیکنڈوں میں طے کیا اور ایک ڈرائیو وے سے ہوتی ہوئی تاریک گیراج میں گھس گئی۔ ڈیوڈ نے فی الفور لائٹس بند کر کے انجن کٹ کر دیا۔ گاڑی کی روشنی غائب ہوتے ہی گیراج گھور تاریکی میں ڈوب گیا۔

ڈیوڈ نے کیٹ کو سیٹ پر دھکیلا اور خود اس پر گر گیا۔

خاموشی، تاریکی...... غیر متوازن دھڑکنیں۔ چند منٹ بعد کچھ فاصلے سے انجن کی آواز سنائی دی۔ آواز سیدھی گزرتی ہوئی معدوم ہو گئی۔ مکمل سکوت طاری ہونے پر دھیرے دھیرے ڈیوڈ نے سر اٹھایا۔ مطمئن ہونے کے بعد وہ اٹھ بیٹھا۔ کیٹ کے چہرے پر پسینہ تھا۔ وہ بھی آہستہ آہستہ اٹھ گئی۔

''اب کیا کریں؟''

''یہاں سے تو نکلیں۔'' ڈیوڈ نے لائٹ آن کیے بغیر آہستہ سے گاڑی کو نکالا۔

''کہاں جائیں گے؟'' کیٹ نے سوال کیا۔

''الڈین کے گھر جانا پڑے گا۔'' ڈیوڈ نے بتایا۔

''تمہارے گھر نہیں؟''

''نہیں، تم اسپتال سے میرے آفس پہنچی تھیں۔ اس نے آفس دیکھ لیا ہے۔ آفس میں میرے گھر کا پتا اور فون نمبر موجود ہے اور ہم رسک نہیں لے سکتے۔''

☆☆☆

جگنس، غیر متوقع مہمانوں کو دیکھ کر حیرت سے پلکیں جھپکا رہی تھی۔ پھر اس نے تالی بجا کر مسرت کا اظہار کیا۔

''اوہ ڈیوڈ، کتنی خوشی کی بات ہے...... اگر تم فون کر دیتے تو میں بہتر لباس میں ملتی۔'' اس کی پرتجسس نظر بار بار کیٹ کی طرف جا رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ ٹیبل پر نشست سنبھال چکے تھے۔

''مجھے یقین نہیں آرہا، کیا یہ خواب ہے۔ میرا بیٹا آیا ہے۔ کیا دنیا ختم ہونے والی ہے۔''

''ماں، تمہیں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔'' اس نے گہرا سانس لے کر الفاظ منتخب کیے۔ ''ہمیں مدد چاہیے۔''

ماں کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے غور سے کیٹ کا جائزہ لیا۔ ڈیوڈ کا بازو حفاظتی انداز میں مستقل کیٹ کے شانے پر تھا۔

''تو تم نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ تمہارا انتخاب اچھا

ہے۔''

ڈیوڈ اور کیٹ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

ڈیوڈ کی آنکھوں میں بے چارگی تھی۔ کیٹ نے محسوس کیا کہ وہ خاموشی کو ترجیح دے رہا ہے۔

''ڈیوڈ، تم نے مجھے پہلے نہیں بتایا؟'' ماں نے شکوہ کیا۔ ''میں کب سے کہہ رہی تھی کہ کب تک اکیلے رہو گے؟ کیا نام ہے تمہارے انتخاب کا؟''

''کیٹ، ڈاکٹر کیٹ شیرنی۔''

''آئی سی، ڈاکٹر؟ حیرت انگیز۔''

ہلکی پھلکی باتوں کا سلسلہ فون کی گھنٹی نے منقطع کر دیا۔

ڈیوڈ اچھل پڑا۔ ''کیا ہوا؟'' اس نے ریسیور کان سے لگایا۔

پوکی کی فاتحانہ آواز سنائی دی۔ ''کام ہو گیا؟''

''کار مل گئی؟'' ڈیوڈ نے بے چینی سے سوال کیا۔

''گاڑی کو بھول جاؤ۔ بندہ مل گیا۔''

''ڈیکر؟''

''آدھے گھنٹے میں ڈاکٹر کو شناخت کے لیے لے آؤ۔''

''ہم پہنچ رہے ہیں۔ کہاں رکھا ہے اسے؟ ڈاؤن ٹاؤن اسٹیشن؟''

دوسری جانب قہقہہ آیا۔ ''نہیں، نہیں۔ اسٹیشن میں نہیں۔''

''پھر کہاں؟''

''سرد خانے میں۔''

☆☆☆

میڈیکل ایگزامنر کا نام کیلی تھا۔ مردہ خانے میں پہنچ کر اس نے اس اسٹین لیس اسٹیل کی لمبی دراز باہر کھینچی۔ وہ پھسلتی ہوئی بے آواز باہر آ گئی۔ لمبائی تقریباً چھ فٹ تھی۔ کیٹ، ڈیوڈ کے ساتھ چپک گئی۔ کیلی نے پلاسٹک بیگ کی زپ کھینچی...... وہ ایک آدمی کا چہرہ تھا۔ چہرے پر معصومیت کی جھلک تھی۔ گویا زندگی مذاق تھی۔

''ہاربر پر چند لانچ والوں نے شام میں اسے دریافت کیا تھا۔ لاش پیٹ کے بل تیر رہی تھی۔'' پوکی نے بتایا۔

کیٹ نے ہمت کر کے چہرے کا جائزہ لیا۔ جس پر دھبے پڑ گئے تھے۔ چہرہ بھی اس کی شکستہ شخصیت کے مانند ہو گیا تھا۔

کیٹ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''وہی ہے۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔ بگڑے ہوئے چہرے کے باوجود اس کی کھلی آنکھیں، بے روح، بے جان آنکھیں...... بولتی معلوم ہو رہی تھیں۔ کوئی ان کہی کہانی...... کوئی پراسرار داستان۔

کیٹ کے بدن میں نامعلوم یاسیت سرایت کر گئی۔

اس نے چہرہ پلٹ کر ڈیوڈ کے شانے میں چھپا لیا۔

''فار گاڈ سیک، کیلی بیگ بند کر دو۔'' ڈیوڈ نے کہا۔

کیلی نے دستانوں میں چھپے ہاتھوں سے بیگ بند کیا اور فولادی دراز واپس اندرونی خلا کے اندر پہنچا دی۔

چند منٹ بعد وہ کیلی کے آفس میں بیٹھے تھے۔

جینیفر بروک، اس کا بچہ، تین نرسیں، ڈاکٹر وان، چارلس ڈیکر...... کوئی بھی نہیں بچا۔ آپریشن ٹیبل پر ایلن کی موت سے شروع ہونے والی کہانی ایک سربستہ راز بن چکی تھی۔

پوکی نے دو کافی کپ تیار کر کے ڈیوڈ اور کیٹ کے سامنے رکھے۔ ''یہ میرے آسان کیسوں میں سے ایک ثابت ہوا۔ کوئی معما، کوئی الجھن، کوئی مقدمہ...... کچھ نہیں۔'' اس کے چہرے پر طمانیت تھی۔ ''یہ سب کچھ ڈاکٹر کیٹ کے تعاون کی وجہ سے ہوا۔''

کیٹ کافی کو گھور رہی تھی۔ ''اس کی موت کیسے واقع ہوئی؟''

پوکی نے شانے اچکائے۔ ''اس کا سر چٹخا ہوا ہے، غالباً نشے کی حالت میں وہ کسی پتھریلی جگہ پر گرا اور پانی میں جا پڑا......''

''مفروضہ؟''

''نہیں، اس کا ریکارڈ ہے۔'' کیلی نے جواب دیا۔ ''پوسٹ مارٹم کے بعد کچھ اور باتیں سامنے آسکتی ہیں۔''

''لاش، کتنی دیر پانی میں رہی ہوگی؟'' ڈیوڈ نے استفسار کیا۔

''ایک دن سے کم یا کچھ زیادہ۔'' پوکی نے کہا۔

''یعنی چوبیس گھنٹے۔'' ڈیوڈ نے پوکی کو دیکھا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ رات میں ہمارا تعاقب کون کر رہا تھا؟''

''تمہارا تخیل زیادہ کام کرنے لگا ہے۔'' پوکی نے تبصرہ کیا۔

''نہیں، وہ کار ہمارے پیچھے تھی۔ نشانات تلاش کرنا اتنا مشکل نہیں۔ تصدیق ہو جائے گی۔''

''نشانات ملے تو وہ کسی اور گاڑی کے بھی ہو سکتے ہیں۔''

''مردہ گاڑی ڈرائیو نہیں کرتا۔'' کیلی نے کہا۔

''پوسٹ مارٹم کب ہوگا؟'' ڈیوڈ بدمزہ ہو گیا۔

"پہلے سر کا ایکسرے ہوگا، پھر آج رات میں پھیپھڑوں سے آغاز کروں گی جس کے بعد یہ واضح ہو جائے گا کہ موت کی وجہ سر کی چوٹ تھی یا وہ ڈوبنے سے ہلاک ہوا تھا۔" کیلی نے لائحہ عمل بتایا۔

"اس کا سامان کہاں ہے؟"

"یہیں ہے۔ سامان کیا، چند اشیا ہیں۔" پوکی نے جواب دیا۔

کیلی نے کارڈ بورڈ کا ڈبا اٹھا کر میز پر رکھ دیا۔ پوکی نے ڈبا کھولا...... پلاسٹک کا کنگھا، سگریٹ پاکٹ، ماچس، بٹوا، جس میں چودہ ڈالر تھے...... مختلف آئی ڈی کارڈز...... آخری چیز چند چابیاں تھیں جن کے ساتھ ایک پلاسٹک ٹیگ منسلک تھا۔ ٹیگ پر "دی وکٹری ہوٹل" کا نام لکھا تھا۔

"وہ وکٹری ہوٹل میں رہائش پذیر تھا؟" کیٹ نے پوچھا۔

پوکی نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہم چیک کر چکے ہیں...... وہاں انسان کم اور چوہے زیادہ ہیں۔ آخری بار وہ بٹرڈے نائٹ کو وہاں دکھائی دیا تھا۔"

کیٹ، این رشٹر کے فلیٹ تک پہنچ گئی...... آئینے میں اس نے چارلس ڈیکر کی شکل دیکھی تھی۔ این کی لاش نے اس کے ہوش اڑا دیے تھے۔ اولین خیال اس کے ذہن میں یہی آیا تھا کہ وہ قاتل کی زد میں ہے...... یہی خیال اس کے ذہن میں موجود رہا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے ان آنکھوں میں جھانکا جو اسے این کے فلیٹ میں دکھائی دی تھیں۔ اس نے این کو بھلا کر آنکھوں پر توجہ مرکوز کی...... آنکھوں میں ویرانی اور اذیت کے ساتھ خوف بھی تھا۔ کیٹ نے آنکھیں کھول کر میز پر ایک بے مایہ انسان کا مختصر اثاثہ دیکھا۔ اس کا سب سے گراں مایہ اثاثہ جینیفر بروک، اس کی محبت تھی جو اس دنیا میں نہیں تھی۔ اب وہ خود بھی اس کے پاس چلا گیا تھا۔ میز پر اس کی خستہ حال اشیا اس کے کرچی کرچی خواب کے مانند بکھری ہوئی تھیں۔

"ڈیکر تم کون تھے، تم کون ہو؟" اس نے خود سے سوال کیا۔

پوکی مسکرایا۔ "ڈاکٹر اب تم گھر جا سکتی ہو۔ ہمارا مطلوبہ بندہ ختم ہو چکا ہے۔"

کیٹ نے ڈیوڈ کی طرف نگاہ کی مگر وہ کسی اور جانب دیکھ رہا تھا۔

"ہاں، اب میں گھر جا سکتی ہوں۔" کیٹ کی آواز بے تاثر تھی۔

☆☆☆

ڈیوڈ کی گاڑی میں، کیٹ نے خود سے بار ہا سوال کیا۔ "ڈیکر تم کون تھے؟" کیٹ کے ذہن میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ ڈیکر شکاری نہیں بلکہ خود شکار تھا۔

"کتنا آسان تھا یہ سب کچھ۔" وہ مدھم لہجے میں بولی۔

ڈیوڈ نے اسے دیکھا۔ "کیا آسان تھا؟"

"یہ سب کچھ...... کتنا سادہ، کتنا فول پروف......"

اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ڈیکر کی آنکھیں پھر اس کے تصور میں ابھر آئیں۔ "مائی گاڈ، عالم ہراس میں، اس کی آنکھوں کو میں نے غلط پڑھا تھا...... آہ وہاں تو کچھ اور لکھا تھا۔"

"کیا؟"

"خوف اور وحشت۔ وہ کچھ جانتا تھا۔ کوئی خوفناک راز۔ اسی وجہ سے وہ مارا گیا...... جیسے دیگر تمام ہلاک کر دیے گئے۔"

"ایسا ہی تھا تو اس نے تمہیں کاٹیج پر دھمکی کیوں دی؟"

"شاید وہ دھمکی نہیں تھی۔" کیٹ نے سر اٹھایا۔ "وہ انتباہ تھا...... وارننگ...... کسی اور کی جانب سے وہ مجھے خبردار کرنا چاہ رہا تھا۔"

"لیکن تم گواہ تھیں۔ تم نے اسے وہاں دیکھا تھا؟"

"اصل گواہ وہ تھا...... میں بعد میں پہنچی۔ نہ میں نے اسے قتل کرتے دیکھا۔ نہ اس نے اصل قاتل کو دیکھا۔ میری طرح، وہ بھی صحیح جگہ پر غلط وقت پر پہنچ گیا تھا۔ کتنے افراد مارے جا چکے ہیں ڈیوڈ...... ابتدا جینی بروک سے ہوتی ہے۔ کیا تو کا اندازہ ڈیکر کے بارے میں صحیح تھا۔ پانچ سال پہلے جب وہ جنونی کیفیت میں تھا تو اس نے دوسروں کو مارنے کے بجائے خود کو ختم کرنے کی کوشش کی۔"

"کیٹ ڈیکر بھی مر چکا ہے۔ حقیقت معلوم کرنے کا کوئی امکان نہیں بچا۔"

"نہیں ابھی چانس ہے۔"

"کیا تم وکٹری ہوٹل جانا چاہتی ہو؟" بالآخر ڈیوڈ لب کشا ہوا۔

"ہاں۔"

"ٹھیک ہے، میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

☆☆☆

وکٹری ہوٹل کی منیجر کا نام مسز جیکس تھا۔ اس کی آنکھیں

زردی مائل تھیں۔ موسم مناسب تھا، پھر بھی مسز تھیس نے سوئیٹر زیب تن کیا ہوا تھا۔

''چارلس؟'' اس کی آنکھوں میں تجسس تھا۔ ''ہاں، وہ یہاں مقیم تھا...... وہ مرچکا ہے۔ پولیس بھی یہاں آئی تھی۔''

''اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو ہم چارلس ڈیکر کا کمرا دیکھ لیں؟'' کیٹ نے نرمی سے کہا۔

''مقصد؟''

''ہم کچھ معلومات جمع کررہے ہیں۔''

''پولیس؟''

''نہیں، ہمارا تعلق پولیس سے نہیں ہے۔''

''پھر میں کچھ نہیں کرسکتی۔ پولیس پہلے ہی مجھے کافی پریشان کرگئی ہے۔ پولیس کی مرضی کے بغیر میں کسی کو وہاں جانے کی اجازت نہیں دے سکتی۔'' مسز تھیس نے وضاحت کے ساتھ انکار کردیا...... اس موقع پر ڈیوڈ نے مداخلت کرتے ہوئے چہرے پر اپنی بہترین مسکراہٹ سجائی۔

''تمہارا سوئیٹر خوب صورت ہے۔ نیا لگتا ہے؟''

مسز تھیس رخ پھیرتے پھیرتے رک گئی۔ ''میں زیادہ تر نئی چیزیں استعمال کرتی ہوں۔'' وہ ڈیوڈ کی طرف متوجہ ہوگئی۔ ''شوہر بھی نیا۔''

''اوہ۔'' ڈیوڈ نے ہاتھ اٹھایا۔ ''اس معاملے میں، میں خود کو معذور محسوس کرتا ہوں...... لیکن......''

''لیکن کیا؟''

ڈیوڈ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر بیس بیس ڈالر کے چار نوٹ نکالے۔ مسز تھیس کی آنکھوں میں حرص کے ساتھ حیرت بھی نمایاں تھی۔ ڈیوڈ نے نوٹ اس کے موٹے تازے ہاتھ کی جانب بڑھائے۔ ہوٹل منیجر کی نگاہ ڈالرز پر جمی ہوئی تھی۔ ''اونر کو خبر ہوئی تو میں ماری جاؤں گی۔''

''کچھ نہیں ہوگا، مجھے انسپکٹر سمجھو۔''

''لیکن تم انسپکٹر نہیں ہو۔''

''ہاں، نہیں ہوں۔'' ڈیوڈ نے ایک اور نوٹ برآمد کیا۔

مسز تھیس کے لیے یہ رقم بہت زیادہ تھی۔ اس کی ٹوٹی ہوئی مزاحمت، بے بنیاد دیوار کے مانند ڈھے گئی۔ اس نے نوٹ اٹھا کر گریبان میں اڑس لیے۔ بعدازاں انہیں کمرا نمبر 203 تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ زردی مائل کارپٹ کسی وقت براؤن رنگت کا حامل رہا ہوگا۔

''وہ یہاں تقریباً ایک ماہ تک رہا تھا۔ دوسروں کے مانند اس نے بھی کوئی پریشانی کھڑی نہیں کی تھی۔ وہ خاموش رہتا تھا۔'' منیجر نے بتایا۔

اچانک ایک بچی نے کمرے میں جھانکا۔ ''چارلس واپس آگیا؟''

''چارلس ہمیشہ کے لیے چلا گیا۔'' مسز تھیس نے بتایا۔

''کب آئے گا؟''

''بہری ہو؟ سمجھ میں نہیں آتا؟ یہاں کیا کررہی ہو؟ تم اسکول نہیں گئیں؟''

''وہ گس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' بچی نے کہا۔

''گس کا چہرہ بھی نظر آیا۔ وہ اپنی بہن سے بھی کچھ چھوٹا تھا۔ لڑکی کی عمر آٹھ، دس برس رہی ہوگی۔

''اماں کہاں ہے تمہاری؟'' مسز تھیس نے سوال کیا۔

''کام پر۔'' لڑکی نے شانے اچکائے۔

''چلو نکلو یہاں سے۔'' مسز تھیس نے دروازہ بند کردیا۔

کمرا چھوٹا اور نیم تاریک تھا۔ فضا میں سگریٹ کی بو رچی بسی تھی۔ دیواروں اور پردوں کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ کمرے میں بہت کم اور سستا سامان موجود تھا۔

''یہ بچے کون تھے؟'' کیٹ نے استفسار کیا۔

''لڑکی کا نام جولین اور چھوٹا بھائی گس تھا۔ ماں کو کوئی فکر نہیں ہے...... انہیں چھوڑ کر سارا دن غائب رہتی ہے...... پتا نہیں کہاں اور کیا کام کرتی ہے، مجھے تو پسند نہیں ہے لیکن کرایہ وقت پر دیتی ہے اس لیے میں نے بھی کبھی نہیں چھیڑا۔''

''بچے، ڈیکر کے بارے میں پوچھ رہے تھے؟'' ڈیوڈ نے کہا۔

''ہاں، اسے بچوں سے انسیت تھی۔'' مسز تھیس ایک طرف کرسی پر ڈھیر ہوگئی اور کیٹ، ڈیوڈ کے ساتھ کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ ایک غیر محسوس ویرانی اور اداسی محسوس ہورہی تھی۔ یہ ماحول کا اثر تھا یا پھر وہ پس منظر تھا جس سے کیٹ واقف تھی۔

ڈیوڈ کو ماہر نفسیات کا نسخہ اور تھوڑی سی ادویات ملیں۔ کمرے میں ایک فریم شدہ تصویر بھی موجود تھی۔ کیٹ نے باری باری دونوں اشیا دیکھیں۔ پھر فریم پر نظر جمادی۔ کچھ سوچ کر تصویر اس نے فریم سے باہر نکال لی۔ یہ ایک خوب صورت لڑکی کی تصویر تھی۔ کیٹ نے تصویر کی پشت پر نگاہ دوڑائی...... وہاں لکھا تھا۔

جب تک تم نہیں آجاتے۔

جینی

کیٹ کافی دیر تک اس فقرے کو گھورتی رہی۔ جو یقیناً جینیفر بروک نے چارلس ڈیکر کے لیے لکھا تھا۔ یہ تصویر ہی ڈیکر کا اصل خزانہ تھا۔ تصویر کے مڑے تڑے کونے اس امر کے گواہ تھے کہ ڈیکر نے تصویر اَن گنت بار فریم سے نکالی تھی۔

تصویر دھندلانے کے باوجود جینی کے حسن پر اثرانداز نہیں ہو سکی تھی۔ خصوصاً اس کی آنکھوں کی چمک، دیے کی لو کے مانند تھی۔ لگتا تھا کہ قبر کی تاریکی بھی ان آنکھوں کی چمک کو فنا کرنے میں ناکام رہی ہوگی۔ کیٹ کے دل میں درد کی ٹیس اٹھی۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھر کے تصویر اور فریم ڈیوڈ کو واپس پکڑا دیے۔

☆☆☆

کیٹ اور ڈیوڈ، ہوٹل سے باہر آئے تو خاموش تھے۔ وہ جس ڈور کو تھام کر چلتے وہ درمیان میں ٹوٹ جاتی۔ کیٹ اپنی صفات سے مجبور تھی۔ لیکن دونوں اب تک کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل کرنے میں بدستور ناکام رہے تھے۔ معاً ہوٹل کی برابر والی گلی سے دو ننھے بچے نمودار ہوئے۔ چاروں کچھ دیر ایک دوسرے کی طرف متوجہ رہے پھر بچوں نے پیش قدمی کی۔

”وہ مر چکا ہے۔ بڑے بے وقوف ہوتے ہیں، وہ یہ سوچتے ہیں کہ بچوں کو کچھ نہیں معلوم۔“ جیولین نے بلند آواز میں کہا۔

”وہ تمہارا دوست تھا، مجھے یقین ہے۔“ ڈیوڈ بولا۔

لڑکی نے سر اٹھایا پھر بالغ لڑکیوں کی طرح نیچے دیکھنے لگی۔ ”ہاں، شاید......“

”اس کے اور بھی دوست ہوں گے؟“

لڑکی نے پُرسوچ انداز میں ہونٹ چبایا۔ ”تم میلونی کوٹرائی کر سکتے ہو۔“

”میلونی کون ہے؟“

”میں بھی کتنی بے وقوف ہوں، میلونی کوئی نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”میلونی دراصل جگہ ہے...... جگہ کا نام ہے۔“ لڑکی نے اشارہ کر کے بتایا۔

ڈیوڈ نے شکریہ ادا کیا اور دونوں نئی امید کے ساتھ اگلی منزل کی جانب چل پڑے۔ میلونی، بار کا نام تھا۔ کاک ٹیل محفل کے درمیان سے گزرتے ہوئے، دونوں نے کاؤنٹر کے قریب دو اسٹول سنبھال لیے۔

بارٹینڈر کا نام سام تھا۔ سام بھی کوئی اہم بات نہ بتا سکا۔ سوائے اس کے کہ ڈیکر کون سی مخصوص ٹیبل پر بیٹھ کر پیتا تھا۔ اور شاعری کے نام پر کچھ لکھتا تھا۔ سام نے ان دونوں کو اس کی شاعری کا ایک نمونہ بھی دکھایا...... کیٹ نے نمونہ دیکھ کر اندازہ لگایا کہ ڈیکر نے نوآموز انداز میں جینی کا نام لیے بغیر اس کے بارے میں لکھا ہے۔ دوسری بات جو سام نے کی، وہ پولیس کے موقف کے برخلاف تھی۔ سام کے مطابق ڈیکر ایک بے ضرر انسان تھا...... قتل تو اس کے لیے ایک ناقابلِ قیاس بات تھی۔

بہرحال دونوں جب وہاں سے نکلے تو یہی محسوس ہوا کہ وہ اب بھی بند گلی میں کھڑے ہیں۔

انہوں نے دھیرے دھیرے چلنا شروع کیا۔ کیٹ نے پلٹ کر وکٹری ہوٹل کی جانب دیکھا اور تاسف سے کہا۔ ”کون تھا؟ کیا تھا؟ کہاں سے آیا تھا...... کوئی اشارہ، کوئی چیز پیچھے نہیں چھوڑ گیا۔“

”ہم میں سے بیشتر کے ساتھ شاید ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہاں اگر ہم کوئی یادگار کتاب لکھ دیں یا کوئی شاندار عمارت تعمیر کر جائیں...... پیچھے کچھ نہیں رہ جاتا۔“ ڈیوڈ نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

”ہاں، شاید...... لیکن بچے تو رہ جاتے ہیں۔“

ڈیوڈ معاً چپ رہ گیا...... پھر بولا۔ ”ہاں اگر ہم خوش قسمت رہے۔“

کیٹ کو فوراً لوحارین سم کا خیال آیا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ طویل وقفے کے بعد کیٹ نے کہا۔ ”اتنا تو ہم جان گئے ہیں کہ ڈیکر، جینی سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ وہ یقیناً ایک غیر معمولی عورت تھی۔ پانچ سال بعد بھی اس کا جادو کام کر رہا ہے، بدقسمتی یہ ہے کہ اس کا جادو کئی زندگیاں لے گیا۔ چار زندگیاں...... ایک خود اس کا محبوب اور تین افراد وہ جنہوں نے جینی کو آپریشن ٹیبل پر مرتے دیکھا۔ وہاٹ اے ٹریجڈی۔“

”کیا کرو گی اب؟“

”گھر جاؤں گی۔“

ڈیوڈ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ دونوں اپنے اپنے خیالات میں غوطہ زن تھے۔ کیا جدائی کی گھڑی ہے؟ کیا وہ ناک آؤٹ ہو گئی ہے؟ کیا مرنے والوں کا راز قبروں میں دفن ہو گیا؟ یا دفن کر دیا گیا؟ اور ڈیوڈ...... اس کے خیالات کی رو بھٹکنے لگی۔ نیلی آنکھیں تصور میں اُبھریں۔

”کیٹ!“ ڈیوڈ کی آواز سماعت سے ٹکرائی۔

"آں..... ہاں۔" وہ چونکی۔ "گھر آگیا۔"

کیٹ منتظر تھی کہ وہ کچھ اور بھی کہے گا..... ڈیوڈ خاموش رہا۔ دونوں گاڑی سے اترے۔ ڈیوڈ اس کا سوٹ اٹھا کر چلنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ دونوں الفت کا ہر مرحلہ طے کر چکے تھے۔

"کافی پیو گے؟" کیٹ نے پیشکش کی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ کیا جواب آئے گا۔

"نہیں، اس وقت نہیں۔ لیکن میں تمہیں کال کروں گا۔"

وہی رسمی الفاظ..... کیٹ سمجھ گئی۔ ڈیوڈ کلائی کی گھڑی دیکھ رہا تھا۔ کیٹ نے میکانیکی انداز میں لاک میں چابی لگا کر دروازہ کھول دیا اور اندر داخل ہونے کے لیے قدم اٹھایا۔ اس کی نظر سامنے دیوار پر گئی، اٹھا ہوا قدم خلا میں معلق رہ گیا۔ اس نے پلکیں جھپکائیں۔

اوہ گاڈ، یہ کیا ہو رہا ہے۔ اب کیوں؟ وہ ایک قدم پر غیر متوازن ہو کر لڑکھڑائی۔ عقب میں ڈیوڈ نے اسے سنبھال لیا۔ کیٹ کی سبز آنکھوں میں گہرا ہراس تھا۔ وہ سامنے دیوار کو گھور رہی تھی۔ دیوار کے وال پیپر پر نمایاں انداز میں اسپرے..... لہو رنگ پینٹ کے ذریعے "MYOB" لکھا تھا۔ حروف کے نیچے انسانی کھوپڑی بنی تھی۔ کھوپڑی کے نیچے ہڈیاں کراس کی شکل میں نظر آرہی تھیں۔

☆☆☆

"کوئی امکان نہیں ہے۔ ڈیوی، کوئی چانس نہیں ہے۔ کیس کلوز ہو چکا ہے۔" پوکی نے کپ سے کافی چکھی گئی۔

ڈیوڈ اور کیٹ پولیس اسٹیشن میں موجود تھے۔ پوکی کا ساتھی سارجنٹ بیرونی فون پر مصروف تھا۔

"پوکی، یہ ایک واضح دھمکی ہے۔" ڈیوڈ نے زور دے کر کہا۔

"یہ حرکت چارلس ڈیکر کی ہو سکتی ہے۔"

"کیٹ کے پڑوسی نے منگل کی صبح کیٹ کی رہائش گاہ چیک کی تھی۔ وہ پیغام بعد میں چھوڑا گیا ہے، ڈیکر پہلے ہی مر چکا تھا۔"

"پھر کسی لڑکے کی شرارت ہوگی۔" پوکی نے خیال آرائی کی۔

"بہت خوب۔ کسی لڑکے نے یہ ضرورت کیوں محسوس کی کہ مہارت سے اندر گھس کر MYOB (مائنڈ یور اون بزنس) لکھ دیا؟"

"بچوں کو سمجھنا مشکل ہے۔ میں آج تک اپنے بچوں کو نہیں سمجھ سکا۔" پوکی نے بیزاری کا اظہار کیا۔

ڈیوڈ دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر جھکا۔ "میں نے تمہیں بتایا تھا کہ رات کے وقت ایک کار نے ہمارا تعاقب کیا تھا۔ جواب میں تم نے کہا کہ یہ سب میرے تصور کی کارستانی ہے۔"

"میرا اب بھی یہی خیال ہے۔"

"پھر ڈیکر مارا گیا۔ غالباً ایک عام سا حادثہ..... نہیں ایسا نہیں ہے۔ ایک حادثہ، ایک اتفاق، ایک مرڈر..... دوسرا حادثہ، دوسرا اتفاق، دوسرا مرڈر..... تیسرا چوتھا..... کم آن مین۔ یہ ایک گہری سازش ہے، جس کی جڑیں ماضی میں پیوست ہیں۔ سازش کے پیچھے ایک شاطر ذہن کارفرما ہے۔ یہ ذہن میں رکھنا کہ ڈیکر کی موت کے ساتھ کھیل ختم نہیں ہوا۔ اگلی لاش کا انتظار کرنے سے پیشتر ہاتھ پیر ہلاؤ....."

پوکی نے کافی کپ نیچے رکھ دیا۔ "اوکے، پھر اور بتاؤ۔"

ڈیوڈ بیٹھ گیا۔ "کوئی خفیہ ہاتھ ہے جس نے چند ہفتوں میں بڑی صفائی سے چار افراد کی جان لے لی۔ غالباً کہ تم ایلن اور برائن کو مرڈر تسلیم نہیں کرتے اور میں ڈیکر کی موت کو حادثہ نہیں سمجھتا۔ قاتل، ڈیکر نہیں..... بلکہ وہ خود مقتول ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ فی الحال ایلن اور برائن اور ڈیکر کے لیے میرے پاس کوئی ثبوت نہیں۔ قاتل جتنا بھی شاطر ہو صحیح۔ وہ ایک فاش غلطی کر گیا۔"

"کیا؟" پوکی اور کیٹ دونوں چونکے۔

"جب سب ٹھنڈے ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ تب اس نے کیٹ کی رہائش گاہ میں گھس کر دیوار پر دھمکی اسپرے کر دی۔ یوں اس نے کیس میں پھر جان ڈال دی۔ مزید یہ کہ خفیہ ہاتھ کام کر رہا ہے، یہ دھمکی اس کا بین ثبوت ہے۔"

"وہ اتنا ہی شاطر ہے تو کھیل ختم ہونے کے بعد اس نے یہ غلطی کیوں کی؟" کیٹ کی آنکھوں میں چمک تھی۔

ڈیوڈ مسکرایا۔ "کیونکہ اس کا خوف ختم نہیں ہو رہا۔ وہ ڈرا ہوا ہے۔ بہت زیادہ....."

"کس سے ڈرا ہوا ہے؟"

"تم سے۔"

"کیا؟ مجھ سے؟" کیٹ نے بے یقینی سے ڈیوڈ کو دیکھا۔

"ہاں، تم نے ابھی تک کہیں سمجھوتا نہیں کیا۔ انضباطی کمیٹی، معطلی کی تلوار لیے تمہارے سر پر لٹک رہی ہے۔"

کیونکہ تم نے استعفیٰ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ تمہارے پاس ڈیفنس کے لیے کچھ بھی نہیں اور تم ڈٹی ہوئی ہو۔ EKG کی رپورٹ تمہیں اسپتال سے باہر کرنے کے لیے کافی تھی۔ ایلن سے تمہارا جذباتی رشتہ بھی تھا۔ تم بہت زیادہ سوال کرتی ہو۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ تم کچھ جانتی ہو، کوئی ایسی بات جو تم خود بھی شناخت نہیں کر پا رہی ہو۔ قاتل بھی جانتا ہے کہ تم جانتی ہو...... اگر نہیں جانتیں تو جلد جان جاؤ گی۔ تمہاری افتادِ طبع، تمہیں سازش یا راز کی تہ تک لے جائے گی...... یہ سمجھو۔'' ڈیوڈ خاموش ہو گیا۔

کیٹ کا منہ کھل گیا۔ پوکی نوٹ بک پر قلم گھسیٹ رہا تھا۔

''کیا سمجھوں میں؟'' کیٹ نے سرگوشی کی۔

''قاتل کا اگلا نشانہ تم ہو۔'' ڈیوڈ کے چہرے پر تکلیف دہ سنجیدگی تھی۔

کیٹ کی سانس رک گئی۔ ''کون ہو سکتا ہے؟ میرے علم میں تو کوئی بات نہیں، ہاں میں جستجو میں ضرور ہوں۔''

''جستجو علم کی بنیاد ہے۔''

''کوئی آئیڈیا ہے تمہارے پاس؟ مجھے تو یہ افسانہ لگ رہا ہے۔'' پوکی نے نسبتاً سنجیدگی سے کہا۔

''ڈیئر، حقیقت یہ ہے کہ میں بھی اندھیرے میں ہوں۔ تاہم حالیہ دھمکی نے قاتل کی کمزوری ظاہر کر دی ہے۔''

''مطلب؟''

''وہی، اول وہ ڈرا ہوا ہے، دوم اگلا ٹارگٹ ڈاکٹر کیٹ شیرزنی ہے، سوم کھیل ختم نہیں ہوا۔ ہمیں مل کر محنت کرنا ہوگی۔''

''اگر تمہاری تھیوری کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر تمہیں میری سیٹ پر ہونا چاہیے۔'' پوکی نے پُرسوچ انداز میں ظرافت کا مظاہرہ کیا۔

''میں اپنی جگہ رہ کر بھی تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ تمہیں اپنا اندازِ فکر تبدیل کرنا پڑے گا۔ مزید یہ کہ ڈاکٹر کیٹ کے لیے سیف ہاؤس کا بندوبست کرو۔''

''میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے والدین کا گھر ہی فی الوقت بہتر پناہ گاہ ہے۔'' پوکی نے ڈیوڈ کے دل کی بات کہہ دی۔ ''تاہم کہانی مجھے ہضم نہیں ہو رہی۔''

''کوئی چورن استعمال کرو۔''

''تمہارے مشورے پر میں نے ڈاکٹر ایوری کو چیک کیا۔ زہر اس نے اپنے پالتو کتے پر ہی استعمال کیا تھا۔ اس کی بیوی عارضۂ قلب میں مبتلا تھی۔ بعد ازاں ان کا انتقال حملۂ قلب کی وجہ سے ہی ہوا...... میں ہر چیز چیک کر چکا ہوں۔ ایوری بذاتِ خود قابلِ رحم ہے۔ اس پر شک کرنا ایک بے معنی سی بات تھی۔ اس میں اتنی پھرتی اور طاقت...... بلکہ ہمت ہی نہیں کہ کسی کی شہ رگ تراش سکے۔ اس کے پاس محرک بھی کوئی نہیں تھا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں مشکور ہوں۔'' ڈیوڈ نے اعتراف کیا۔ اس نے تاثرات سے مایوسی ظاہر نہیں ہونے دی۔ ڈیوڈ کے ذہن میں بار بار جینی بروک کی تصویر ابھرتی۔ کہانی کا آغاز اسی سے ہوا تھا۔

''کہاں کھو گئے؟'' پوکی نے انگلیوں سے میز بجائی۔

ڈیوڈ کے جواب دینے سے پہلے دستک کے بعد دروازہ کھلا، ایک اہلکار اندر آیا۔ پوکی نے نظر اٹھائی۔ آنے والے نے ایک لفافہ اس کے حوالے کیا اور الٹے قدموں نکل گیا۔

''لو جی، ڈیکر کی رپورٹ آگئی...... تمہاری کہانی کا ایک سوال تو ابھی حل ہو جائے گا۔'' پوکی نے لفافہ کھولا۔

کیٹ اور ڈیوڈ دونوں نے بے کلی محسوس کی۔ دونوں غور سے پوکی کے تاثرات پڑھ رہے تھے۔ کیٹ سے پہلے ڈیوڈ نے پوکی کے چہرے پر رپورٹ پڑھ لی۔

پوکی ٹھنڈی سانس بھر کے نشست میں نیم دراز ہو گیا۔ وہ ڈیوڈ کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کیٹ پر نظر ڈالی۔ کیٹ نے ڈیوڈ کو دیکھا۔ آنکھوں آنکھوں میں تینوں نے بات سمجھ لی۔

''زبان سے بھی بتا دو۔'' ڈیوڈ نے سکون کی سانس لی۔

''کھوپڑی کا ایکسرے فریکچر کی نشاندہی کر رہا ہے...... سر پر بھاری شے سے ضرب لگائی گئی ہے۔ موت کی وجہ شدید دماغی چوٹ ہے۔ وہ غرقاب ہونے سے کئی گھنٹے قبل ختم ہو چکا تھا۔'' پوکی نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔

☆☆☆

کیٹ، ڈیوڈ کی ماں کے ساتھ مصروفِ گفتگو تھی۔ ڈیوڈ اسے چھوڑ کر نکل گیا تھا۔ ملازمہ بھی وہیں تھی۔ محبت، انتقام جیسے موضوعات پر وہ ڈیوڈ کی ماں کے خیالات سے مستفید ہو رہی تھی۔ رخ نفسیات کی جانب بھی مڑا تھا۔ تب ہی کیٹ کا دھیان ڈاکٹر نیم چک کی طرف گیا۔ جو ڈیکر کا معالج رہا تھا۔ ڈاکٹر کا نسخہ اور دوائی وہ وکٹری ہوٹل میں، ڈیکر کے کمرے میں دیکھ چکی تھی۔ اس کے خیالات بھٹکنے لگے...... وہ ڈیوڈ کے تجزیے پر حیران تھی۔ ڈیکر کی غیر طبعی موت کی تصدیق نے دونوں کی الجھن دور کر دی تھی۔

وہ معالج ڈاکٹر نیم چک سے ملنے کے لیے بے چین ہو گئی۔ باہر طوفان کے آثار تھے۔ بارش شروع ہونے سے پہلے اسے نکل جانا چاہیے...... اس نے فی الفور اپنے ارادے پر عمل کر ڈالا...... ڈیوڈ کی ماں کو اسٹیٹ اسپتال کا بتا کر وہ اسی کی گاڑی لے کر روانہ ہو گئی۔

موسم کے تیور خراب تھے۔ تاہم وہ بروقت اسپتال پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔

ڈاکٹر نیم چک ایک لاغر اور چھوٹی آنکھوں والا شخص تھا۔ لباس کی حالت ایسی تھی جیسے وہ بستر سے اٹھ کر سیدھا چلا آیا ہے۔ رسمی باتوں کے بعد کیٹ نے ابتدائی سوال کیا۔

''چارلس ڈیکر کے لیے نفسیاتی علاج کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔'' اس نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ''میں نے شروع میں ہی انہیں بتا دیا تھا کہ ڈیکر پاگل دیوانہ نہیں ہے...... جب اس میں ایسی کوئی بات نہیں ہے تو پھر پاگل پن اور جرائم کے مابین تعلق کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔''

''کون اسے پاگل قرار دے رہا تھا؟''

''کورٹ، اور کون...... ان کا اپنا طریقہ کار ہے۔ وہ ثبوت اور شہادتوں کو دیکھتے ہیں اور وہ انہیں میسر تھیں۔''

''ڈاکٹر ہنری ٹیٹا کا پر حملے کی بات کر رہے ہو؟'' کیٹ نے کہا۔

''ہاں، مستزاد یہ کہ کورٹ نے اپنے ماہرین سے رائے لے کر فیصلہ کر دیا...... میں نے جو دیکھا، وہ کورٹ کے ماہرین کی آراء سے قطعی مختلف تھا۔''

''تم نے اس میں کیا دیکھا تھا؟''

''وہ ایک شکست خوردہ شخص لگتا تھا اور ڈپریشن کا شکار تھا۔ کبھی کبھی وہ وہم میں مبتلا دکھائی دیتا۔ سراب زدہ شخص کے مانند۔''

''تب وہ غیر متوازن یا دیوانہ نظر آتا۔'' کیٹ نے کہا۔

''ہاں، لیکن مجرم نہیں...... ایسا سراب زدہ شخص خطرناک نہیں ہوتا... بلکہ وہم یا سراب اس کی اذیت کے لیے ڈھال کا کام کرتا ہے۔ اسی لیے میں نے بھی اس ڈھال کو چھیڑنے کی کوشش نہیں کی۔''

''پولیس اسے قاتل کہتی ہے؟''

''مضحکہ خیز۔ وہ ایک نرم دل اور بے ضرر انسان تھا۔''

''یعنی قتل کا تو سوال ہی نہیں ہے۔''

''سوال اور وجہ بھی کوئی نہیں ہے۔'' نیم چک نے ہاتھ لہرایا۔

''جینی بروک، وجہ کیا ہو سکتی ہے؟''

''چارلس کا سراب جینی نہیں تھی۔ اس کی موت کو تو اس نے تقدیر کا لکھا سمجھ کے قبول کر لیا تھا۔''

کیٹ جزبز ہو کے رہ گئی۔ اس کے دونوں ابرو اوپر چڑھ گئے۔ ''کیا مطلب ہے؟ اور کیا وہم ہو سکتا تھا اسے؟''

''اس کی بیٹی، جو زندہ پیدا ہوئی تھی۔ ڈاکٹرز نے اسے یہی بتایا تھا۔ اور یہ انکشاف اس کے ذہن میں گرہ بن گیا۔ یہ اس کا خبط تھا کہ اس کی بیٹی زندہ ہے۔ یہ خبط ہی اس کے کرب و اذیت کی ڈھال تھی۔ امید تھی۔ وہ ہر سال اگست کے مہینے بیٹی کی سالگرہ کا چھوٹا موٹا اہتمام کرتا تھا۔ چاہے سالگرہ کے موقع پر وہ تنہا ہی کیوں نہ ہو۔ اس نے حال ہی میں مجھے بتایا تھا کہ اس کی بیٹی پانچ سال کی ہو گئی ہے...... وہ اس کی تلاش میں تھا۔ وہ اپنی بیٹی کو ایک شہزادی کی طرح پال پوس کر بڑا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میرے علم میں تھا کہ اس نے کبھی سنجیدگی سے بیٹی کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔''

''کیوں؟''

''وہ خوف زدہ تھا۔ سچ سے خوف زدہ تھا۔ اگر اس کی تلاش کے نتیجے میں حقیقت اس کے وہم کے برعکس ثابت ہوتی...... وہ اس تلخ حقیقت کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔''

کیٹ کے سینے میں ہوک سی اٹھی۔ ''کیا ایسا کوئی امکان تھا؟ کیا وہ بچی زندہ ہو سکتی ہے؟''

''اس کا امکان صفر ہے۔ پانچ سال سے وہ صرف ڈیکر کے تصور میں زندہ تھی۔''

☆☆☆

''بے بی از ڈیڈ...... بے بی از ڈیڈ......'' واپسی کے سفر میں موسم کے مانند کیٹ کے ذہن میں سوچ کی طوفانی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اس کا ذہن بچی پر اٹکا ہوا تھا۔ کسی کا خیال اس طرف گیا ہی نہیں جیسا کہ ڈیکر سوچتا رہا۔

کیا وہ زندہ ہو سکتی ہے؟ اگر وہ زندہ ہے تو اس وقت کیسی ہو گی؟ کیا اس کے بال باپ کے مانند سیاہ ہوں گے؟ کیا اس کی آنکھیں ماں جیسی روشن ہوں گی؟ جینی کا چہرہ کیٹ کے تصور میں ابھرا...... آنکھوں میں ابدی روشنی کی چمک...... ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ۔ جینی نے دیکھا کہ بارش کسی بھی لمحے شروع ہو جائے گی۔ تصور میں جینی کا چہرہ تحلیل ہو گیا اور ایک پانچ سالہ بچی کا چہرہ نمایاں ہونے لگا...... اگر وہ زندہ ہے تو کہاں ہے؟ کیا یہی وہ سربستہ راز ہے، جسے پوشیدہ رکھنے کے لیے خونریز کھیل کھیلا گیا۔

آسمان پر بجلی کڑکی۔ کیٹ کے ذہن میں بھی جھماکا

ہوا۔ وفعتاً اس نے بریک دبا دیے۔ اس کی چھٹی حس چلا رہی تھی کہ جینی بروک کی بیٹی زندہ ہے۔

☆☆☆

"آخر وہ کہاں چلی گئی؟" ڈیوڈ نے ریسیور کریڈل پر پٹخا۔ "نیم چک کا کہنا ہے کہ وہ اسٹیٹ اسپتال سے پانچ بجے نکل گئی تھی۔ اب تک اسے گھر پہنچ جانا چاہیے تھا۔" اس نے تشویش کے ساتھ اپنے پارٹنر گلگ مین کو دیکھا۔

"جب بھی اس کیس کے بارے میں سنتا ہوں، مزید کنفیوز ہو جاتا ہوں۔ اس کا آغاز طبی نااہلیت سے ہوا تھا۔ عام سا کیس تھا جبکہ اس کے اختتام پر متعدد قتل ہو چکے ہیں۔ کیا اب بھی کسی اور کا قتل ہونا باقی ہے؟" گلگ مین نے کہا۔

"کاش میں جان سکتا۔" ڈیوڈ کھڑکی کی طرف مڑا۔ موسم خراب تھا۔ اسے گھر جانا چاہیے تھا۔ لیکن وہ غور کرنا چاہتا تھا اور سوچنے کے لیے اس کی پسندیدہ جگہ کھڑکی کے پاس تھی۔

"کسی کی شہ رگ تراشنا، بے رحمی اور شقاوت کا مظہر ہے۔ اس کے لیے بے حسی، خودغرضی اور مضبوط اعصاب کے ساتھ مہارت کی ضرورت ہے۔" گلگ مین نے اظہار خیال کیا۔ "اس سے بہتر تو زہر ہے۔ اگر ہوشیاری سے کام لیا جائے تو یہ ایک پرفیکٹ مرڈر ہے۔" اس نے پھر خیال ظاہر کیا۔

"ایک چیز کے علاوہ۔" ڈیوڈ بولا۔

"وہ کیا؟"

"اگر آپ کا شکار ہاتھ نہ آئے..... قابو نہ آئے؟"

"ہاں، یہ پرابلم ہے۔" گلگ مین نے اعتراف کیا۔ "اس صورت میں تمہیں وحشت پھیلانی چاہیے۔ وارننگ، دھمکی، خوف کی فضا وغیرہ..... تاکہ شکار غلطی کرے۔"

ڈیوڈ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اسے دیوار پر بنی کھوپڑی اور ہڈیاں یاد آگئیں۔ اس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ بادل گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ ہر گزرتے ہوئے منٹ کے ساتھ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی خوفناک چیز ظہور پذیر ہونے والی ہے۔

اس نے کھڑے ہو کر کاغذات بریف کیس میں منتقل کیے۔ یہاں بیٹھے رہنا لاحاصل تھا۔ پریشان ہی ہونا ہے تو ماں کے گھر جا کر بھی ہوا جا سکتا ہے۔

"تمہیں پتا ہے، کون سی چیز اس کیس میں مستقل مجھے چبھتی رہی؟"

"وہاٹ؟" ڈیوڈ نے سوال کیا۔

"EKG، بیٹا کا اور این رشر کے ساتھ خونریزی کی گئی تو آخر ایلن او برائن کے ساتھ ایسا کیوں نہیں ہوا؟ اس کی موت کو ہارٹ اٹیک کا رنگ دیا گیا.....؟"

"تم کیا سمجھتے ہو؟" ڈیوڈ نے بریف کیس بند کیا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ قاتل کو خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑا ہوگا..... مطلب ایلن کے معاملے میں۔"

ڈیوڈ دروازے کی طرف چل پڑا تھا۔ "کیسی دشواری؟"

"الزام کو کیٹ شیزنی کی طرف "شفٹ" کرنے کی دشواری۔" گلگ مین نے بات ختم کی۔

ڈیوڈ دروازے تک پہنچ کر یک لخت اپنی جگہ جم گیا۔

"کیا کہا تم نے؟"

"گلگ مین نے اپنی بات دہرائی۔

"نہیں میں اس لفظ کا پوچھ رہا ہوں..... "شفٹنگ....."

"شفٹنگ دی بلیم۔"

"ہاں!"

"اگر ایسا نہ کیا جاتا..... پھر؟"

"تم جانتے ہو رینا....." گلگ مین نے کہا۔ "ایسی صورت میں مقدمے کی کارروائی اور نتائج صرف کیٹ شیزنی کو نہیں بھگتنے پڑتے۔ دوسروں کو بھی اپنا حصہ ڈالنا پڑتا....."

گلگ مین کی بات ادھوری رہ گئی۔

"او مائی گاڈ۔" ڈیوڈ نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا..... "مجھے خیال کیوں نہیں آیا؟ اوہ گاڈ قاتل شروع سے ہمارے سامنے تھا۔ وہ نگرانی کر رہا تھا۔ انتظار کر رہا تھا۔ گھات میں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کیٹ جوابات حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرے گی۔ وہ کیٹ سے خوف زدہ تھا۔ اسی "خوف" کے باعث ایک قتل اور ہونے والا ہے۔

☆☆☆

ساڑھے پانچ بجے کیٹ میڈیک اسپتال پہنچ چکی تھی۔ میڈیکل ریکارڈز سنبھالنے والے بیشتر کلرک جا چکے تھے۔ ایک لیڈی کلرک موجود تھی۔ جس نے گویا با دل ناخواستہ کیٹ سے سلپ لے کر کمپیوٹر کو چھیڑا۔ ڈیٹا سامنے آیا تو اس کا منہ بن گیا۔

"یہ ایک مردہ مریض کا ریکارڈ ہے۔" اس نے بیزاری سے کہا۔

"میں جانتی ہوں۔" کیٹ نے جواب دیا۔

دوسرا لڑکے کے لیے غیر فعال فائل تلاش کرنی پڑے گی...... تم اگر کل آجاؤ۔"

"چارٹ مجھے ابھی درکار ہے۔" کیٹ کی آواز میں تپش کا عنصر شامل ہونے لگا۔ کلرک نے پنسل کھٹکھٹاتے ہوئے کیٹ کو دیکھا اور مردہ دلی سے اٹھ کر فائل روم میں غائب ہوگئی۔ منٹ گزرنے لگے...... پانچ، دس، پندرہ...... پندرہ منٹ بعد اس کی شکل نظر آئی۔

کیٹ ریکارڈ لے کر کارنر ٹیبل پر بیٹھ گئی۔ ریکارڈ میں معمول سے ہٹ کر چند ہی صفحات شامل تھے۔ کیٹ نے کور پر نام دیکھا...... بروک، بے بی گرل۔

بے بی کا نام بھی نہ رکھا جا سکا تھا۔

کاغذات میں اسپتال کی فیس (FACE) شیٹ، ڈیتھ سرٹیفکیٹ اور مختصر سمری شامل تھے۔ موت کی تاریخ 17 اگست، صبح 2 بجے لکھی گئی تھی۔ یعنی بچی کی پیدائش ایک بجے ہوئی تھی۔ وجۂ موت سیریبرل اینوکزیا (CEREBRAL ANOXIA) لکھی تھی۔ یعنی بچی کا دماغ آکسیجن کی کمی کا شکار ہوگیا تھا۔ یہاں ڈاکٹر ہنری مگنا کا کے دستخط تھے۔

جینی بروک کا چارٹ، کیٹ نے اپنے ساتھ رکھا تھا۔ وہ ان گنت بار اسے پڑھ چکی تھی۔ ایک بار پھر اس نے جینی کا میڈیکل ریکارڈ پڑھنا شروع کیا۔ روٹین کی رپورٹ تھی۔ کوئی حیرت انگیز بات نہیں تھی۔ کوئی ایسی وارننگ نہیں تھی کہ ایک المیہ ظہور پذیر ہونے والا ہے۔ اس نے پیشانی رگڑی اور دوبارہ پہلے صفحے پر آگئی۔

اس نے غور سے جینی کی ہسٹری دیکھی۔ سب ٹھیک تھا۔ لیکن دورانِ حمل، بروک کی بچہ دانی سے مخصوص فلوئیڈ (FLUID) نکالا گیا تھا۔ تجزیے کے لیے ایسا کیا جاتا ہے۔ یہ بھی کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ یہ تجزیہ ہونے والے بچے کی سیکس (جنس) کی شناخت کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ اندر سب ٹھیک ہے۔

لیکن یہ مخصوص تجزیاتی رپورٹ، جینی کے چارٹ کے ساتھ منسلک نہیں تھی۔ کیٹ کے لیے یہ بھی عام بات تھی۔ یہ رپورٹ مریضہ کے آؤٹ پیشنٹ ریکارڈ میں رہ گئی ہوگی۔ کیونکہ یہ تجزیہ حمل کے ابتدائی مرحلے میں کیا جاتا ہے۔ اگر ڈاکٹر ہنری نے ضروری سمجھا ہوگا تو وہ رپورٹ بھی بہ آسانی غائب کردی ہوگی۔

کیٹ نے چارٹ بند کردیا۔ اسے غصے کا احساس ہوا۔ اٹھ کر فائل اس نے کلرک کے حوالے کی اور دوسرے ریکارڈ کا مطالبہ کیا۔

"امید ہے کہ دوسرا ریکارڈ کسی زندہ مریض کا ہوگا۔" کلرک نے کہا۔

"ہاں وہ زندہ ہے۔" کیٹ نے بے صبری سے جواب دیا۔

"نام؟" کلرک نے پہلی فائل وہیں چھوڑ دی۔

"ولیم سائمنی۔"

دو منٹ کے اندر مطلوبہ فائل کیٹ کے ہاتھ میں تھی۔ کیٹ فائل کھولنے سے گھبرا رہی تھی۔ اسے تقریباً یقین تھا کہ وہ کیا دیکھنے جا رہی ہے۔ وہ کلرک کی ڈیسک کے پاس کھڑی تھی۔

کیٹ نے بالائی کور کھولا۔ برتھ سرٹیفکیٹ کی نقل کیٹ کی آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔

نام: ولیم سائمنی

تاریخ پیدائش: اگست، 17

وقت: 03:00

اگست سترہ، وہی دن۔ وقت میں، محض ایک گھنٹے کا فرق۔ بے بی گرل بروک کی موت کے ٹھیک ایک گھنٹے بعد ولیم سائمنی منظرِ عام پر آتا ہے۔

دو نومولود...... ایک زندہ...... دوسرا مردہ۔ کیا اس سے بہتر کوئی وجہ ہوسکتی ہے...... مرڈر کی؟

"اوہ ہیزنی، اس وقت؟" شناسا آواز آئی۔ "تم ابھی تک چارٹس میں الجھی ہوئی ہو؟"

کیٹ کو کرنٹ لگا۔ وہ جھٹکے سے مڑی۔ گائے سائمنی اندر داخل ہو رہا تھا۔ کیٹ نے تیزی سے چارٹ بند کیا۔ لیکن اگلی ساعت میں اس نے دیکھ لیا کہ کور پر جلی حروف میں ولیم سائمنی کا نام لکھا تھا۔ اس نے ہر اس پر قابو پاتے ہوئے فائل سینے سے لگالی اور زبردستی چہرے پر مسکراہٹ سجائی۔

بوکھلاہٹ میں اسے کوئی جواب نہیں سوجھا۔ "تم، رات گئے...... کوئی سرجری وغیرہ؟" الٹا اس نے سوال کردیا۔

"پھر وہی خواری۔ کار ورکشاپ میں ہے۔ سوزن مجھے لینے آرہی ہے۔" گائے نے کلرک کی تلاش میں کاؤنٹر کی جانب نظریں دوڑائیں۔ جو وقتی طور پر غائب ہوگئی تھی۔ "وہ کہاں چلی گئی؟" گائے کا اشارہ لیڈی کلرک کی طرف تھا۔

"ابھی تو وہ یہیں تھی۔" کیٹ نے انچ انچ کرکے دروازے کی طرف کھسکنا شروع کیا۔

"تم نے ایوری کی بیوی کے بارے میں تو سنا ہوگا؟" گائے نے کیٹ کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی جگہ پر جم

گئی۔ دروازہ دو وقت کے فاصلے پر تھا۔ ”ہاں، افسوسناک خبر تھی۔“ کیٹ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

”کیا بات ہے...... تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟“ گائے نے بغور کیٹ کو دیکھا۔

”نہیں، مجھے جانا چاہیے۔“ وہ دروازے سے گزرنے کے لیے تیار تھی۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ عین اس وقت لیڈی کلرک کی آواز بلند ہوئی۔ ”ڈاکٹر شیرنی۔“

”وہاٹ؟“ کیٹ پھر گھومی۔

”چارٹ، تم اسے ڈپارٹمنٹ سے باہر نہیں لے جا سکتیں۔“ کلرک بولی۔ کیٹ نے سختی سے چارٹ سینے کے ساتھ چپکایا ہوا تھا۔ گائے کی موجودگی میں وہ اسے واپس نہیں کرسکتی تھی۔ گائے، فوراً کور پر نام پڑھ لیتا۔ نہ ہی وہ کونوں کے مانند کھڑی رہ سکتی تھی۔ اس کی دھڑکنیں تیز تر ہوتی جارہی تھیں۔

دونوں اسے تک رہے تھے۔ جواب کے منتظر تھے......

”اگر تم ابھی تک اسے مکمل پڑھ نہیں سکی ہو تو کاؤنٹر پر دیکھ لو۔“ کلرک نے پیشکش کی۔

وہ بمشکل اپنے قدموں کو قابو کرتے ہوئے کاؤنٹر کی جانب آئی۔ نبض کی رفتار بڑھتی جارہی تھی۔ ”مجھے ابھی اسے پڑھنا تھا۔“ اس نے غیرمحسوس انداز میں فائل الٹی کر کے کاؤنٹر پر رکھ دی۔

”ٹھیک ہے تم یہاں دیکھ لو...... جب تک میں ڈاکٹر گائے کی مطلوبہ چیزیں لے کر آتی ہوں۔“ کلرک نے گائے کی پرچی اٹھائی جس پر مطلوبہ ریکارڈ کے بارے میں لکھا تھا۔ پرچی لے کر وہ فائل روم میں غائب ہوگئی۔

بھاگو یہاں سے...... کسی بھی طرح...... کیٹ کے ذہن میں نعرہ بلند ہوا۔ دروازے کی طرف نہ بھاگنے کے لیے اس نے ساری توانائی خرچ کردی اور عام سے انداز میں چلنا شروع کیا۔ وہ باہر نکل کر ہال وے تک پہنچ گئی۔ اس وقت عقب میں دور کہیں دروازہ بند ہونے کی آواز اس کی سماعت سے دھماکے کے مانند ٹکرائی۔

گائے سائیٹنی، کوور کر...... اس کا دوست...... اور قاتل۔ صرف وہ جانتی تھی اور قاتل اس کے پیچھے تھا۔ وہ کتنی احمق تھی۔ اسے یقین تھا کہ EKG تبدیل کیا گیا تھا۔ یقینی بات تھی کہ وہ دوا کی وجہ سے مری تھی۔ کسی نے کولن کی وائل کو تبدیل کیا گیا تھا یا اس میں ملاوٹ کی گئی تھی۔

اس کا ذہن EKG میں ہی اٹکا رہ گیا۔

☆☆☆

سرجن گائے اس دروازے کو گھور رہا تھا جس میں سے کچھ دیر پہلے کیٹ گزر کر گئی تھی۔ وہ کیٹ کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے کبھی بھی کیٹ کو اتنا بدحواس نہیں دیکھا تھا۔ وہ الجھن زدہ ذہن کے ساتھ کاؤنٹر کی طرف مڑا اور کلرک کا انتظار کرنے لگا...... دو چارٹ ابھی تک وہاں پڑے تھے۔ اس کی نظر چارٹ کے کور پر گئی اور رگوں میں برف جم گئی...... وہ منجمد حالت میں نام کو گھور رہا تھا۔

بروک، بے بی گرل

نہیں۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ یہ کوئی اور بروک ہے......

اس نے فائل کھولی...... ماں کا نام اور ڈیتھ سرٹیفکیٹ دیکھا...... یوں لگا، کسی نے دل میں چھری گھونپ دی ہو۔ جینیفر بروک...... وہی عورت، وہی بچی۔ اس کے جبڑے بھنچ گئے۔ اسے سوچنا پڑے گا۔ اسے خود کو پرسکون رکھنا ہے۔ کوئی بھی اس کا تعلق، ماں اور بچی سے ثابت نہیں کرسکتا۔ متعلقہ افراد مرچکے ہیں اب کوئی نہیں ہے، جسے اس معاملے میں تشویش ہو......

یا کوئی ہے؟

دفعتاً اسے جھٹکا لگا۔ اس نے وہاں پڑے دوسرے چارٹ کی طرف دیکھا۔ وہ چارٹ جسے کیٹ نے ہچکچاہٹ کے ساتھ خود سے جدا کیا تھا۔ چارٹ الٹا پڑا تھا۔ گائے کے ذہن میں آنے والے خیال نے اس کی ٹانگیں لرزا دیں۔ اس نے جھپٹ کر چارٹ کو سیدھا کیا۔ اس کے بیٹے کا نام سامنے آگیا۔ اس کے پورے وجود پر چھا گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ولیم سائیٹنی کا نام دیکھ رہا تھا۔

کیٹ جان گئی تھی۔ اسے یا آخر یہاں تک پہنچنا ہی تھا کیٹ کو روکنا ہوگا، ہرصورت روکنا ہوگا۔

”یہ رہیں آپ کی فائلیں۔“ کلرک کی آواز آئی۔ پھر وہ عالم استعجاب میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ گائے سنی ان سنی کرتا ہوا دروازے کی جانب بھاگ رہا تھا۔

یہ چوہے بلی کی دوڑ تھی۔ نہیں ایک گوریلا، بلی کے تعاقب میں تھا۔

☆☆☆

کیٹ ایلیویٹر سے اسپتال کی روشن لابی میں اتری۔ وہاں افراد کی تعداد طوفانی آثار کے باعث کم ہوتی جارہی تھی۔ ایک سیکیورٹی گارڈ نظر آرہا تھا۔ کیٹ سیدھی پبلک فون کی طرف گئی۔ فون ناکارہ تھا۔ دوسرے پر کوئی آدمی مصروف تھا۔ کیٹ اس کے عقب میں بے قراری سے انتظار کرنے لگی۔ وہ پولیس کو فون کرنا چاہ رہی تھی اور آواز ڈیوڈ

کی سننا چاہتی تھی۔

وہ شخص فون سے ہٹنے پر آمادہ نظر نہیں آرہا تھا۔ کیٹ نے ادھر ادھر دیکھا۔ گارڈ بھی غائب تھا۔ لابی تیزی سے ویران ہوتی جارہی تھی۔ اس کا دل ہتھوڑے کے مانند پسلیوں کو کوٹ رہا تھا۔ جلد ہی وہ یہاں تقریباً تنہا رہ جاتی۔

اس نے فون پر لعنت بھیجی اور برسات میں اسپتال سے نکل گئی۔ ڈیوڈ کی ماں جنکس کی کار فاصلے پر کھڑی تھی۔ ٹروپیکل طوفانی بارش میں تیز ہوا، کیٹ کی رفتار میں حائل تھی۔ تاہم وہ گاڑی تک پہنچ گئی۔ گاڑی اس کی نہیں تھی، لہٰذا مطلوبہ چابی تلاش کرنے میں اسے چند سیکنڈ لگے...... وہ پوری طرح شرابور ہو چکی تھی۔

جیسے ہی وہ کار ڈور کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر گئی۔ ایک وزنی، چوڑے ہاتھ نے اس کا بازو جکڑ لیا۔ کیٹ نے سر اٹھایا۔ سرجن گائے، سیاہ بادل کی طرح چھایا ہوا تھا۔

''ادھر کھسکو۔'' وہ غرایا۔

''گائے، میرا بازو۔'' کیٹ نے احتجاج کیا۔

''میں نے کہا، پسنجر سیٹ پر جاؤ۔''

کیٹ نے مایوسی کے عالم میں اطراف میں دیکھا۔ فرار کا امکان معدوم تھا۔ نہ کوئی اس کی چیخ پکار سننے والا تھا۔ کیٹ برابر والی نشست پر چلی گئی۔

''چابیاں دو۔''

کیٹ نے غور کیا کہ وہ دوسری طرف کا دروازہ کھول کر نکل جائے لیکن اسے یقین تھا کہ گائے، اسے گاڑی سے نکلنے سے پیشتر پکڑ لے گا۔ نہیں یہ موقع نہیں ہے۔ کیٹ نے سوچا اور چابیاں اس کے حوالے کر دیں۔

''کہاں لے جارہے ہو؟''

''کسی بھی جگہ... میں بولوں گا اور تم سنو گی۔''

کیٹ کی نظر سگنل پر تھی۔ گاڑی رکی تو وہ نکل بھاگے گی۔ گائے اس کا ارادہ بھانپ چکا تھا۔ اس نے بازو پکڑ کے کیٹ کو اپنی جانب کھینچا اور رفتار بڑھائی۔ گاڑی بتی سرخ ہونے سے پہلے گزر گئی۔ فری وے پر جانے سے پیشتر وہ آخری سگنل تھا۔

کیٹ نے دیکھا کہ اسپیڈو میٹر کی سوئی ساٹھ کے ہندسے پر تھرک رہی تھی۔ اس کا چانس نکل گیا تھا۔ اب اس رفتار پر کوئی ایڈونچر کرنا، خود کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف تھا۔

گائے نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ''کیٹ تمہارا، اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تمہیں شکار بننے کی ضرورت نہیں تھی۔''

''ایلن میری مریضہ تھی...... ہماری مریضہ......''

''اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم مجھے اور فیملی کو برباد کر دو۔''

''اور ان کی زندگیاں جو مر چکے ہیں۔''

''وہ اب ماضی ہے...... اسے ماضی ہی رہنے دو۔''

''مائی گاڈ، میں سوچتی تھی کہ میں تمہیں سمجھ چکی ہوں...... تمہیں اپنا دوست سمجھتی تھی۔''

''مجھے اپنی بیوی سوزن اور بیٹے کی حفاظت کرنی ہے۔'' گائے نے کہا۔

''پانچ سال بعد وہ تم سے تمہارا بیٹا نہیں چھین سکتے تھے۔ کورٹ بھی ولیم کو تمہاری کسٹڈی میں دینے کا پابند ہو جاتا۔''

''میں جانتا ہوں...... حتیٰ کہ ولیم کو کوئی بھی پاگل ڈیکر کے حوالے کرنے پر تیار نہ ہوتا۔ ان سب کی مجھے چنداں فکر نہیں تھی نہیں نہیں...... مسئلہ سوزن کا تھا۔''

بارش کی وجہ سے ہائی وے مخدوش ہو گیا تھا۔ گاڑی کی رفتار زیادہ تھی۔ گائے کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے اسٹیئرنگ وہیل پر جمے ہوئے تھے۔ کیٹ نے سوچا کہ اگر وہ اس موقع پر گائے پر جھپٹ پڑے تو کوئی طاقت گاڑی کو بے قابو ہونے سے نہیں روک سکے گی۔ لیکن دونوں مارے جائیں گے۔ اسے کسی اور موقع کا انتظار کرنا ہو گا۔ کوئی بند گاڑی، ٹریفک جام...... کوئی ایسی چیز جو گائے کو رفتار کم کرنے پر مجبور کر دے۔

''میں بھی نہیں۔'' اس نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

''سوزن کا کیا تعلق ہے؟''

''وہ حقائق سے لاعلم ہے۔''

کیٹ، دریائے حیرت میں ڈوب گئی۔

''ہاں، وہ ولیم کو اپنا ہی بیٹا سمجھتی ہے۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''یہ میرا سیکرٹ ہے۔ پانچ سال سے میں نے سوزن کو لاعلم رکھا ہوا ہے...... وہ ولادت کے وقت بے ہوش تھی، جب ہمارا بچہ پیدا ہوا۔ ہلچل مچ گئی، رش...... پینک...... افراتفری...... C سیکشن کا بُرا حال تھا۔ وہ ہمارا تیسرا بچہ تھا کیٹ۔ ہمارا آخری چانس، آخری امید۔ وہ لڑکی تھی...... اور...... اور وہ بھی مردہ پیدا ہوئی۔'' گائے خاموش ہو گیا۔ گلا صاف کر کے وہ گویا ہوا تو اس کی آواز میں کرب تھا۔

''میرا دماغ کام نہیں کر رہا تھا کہ سوزن کو کیا بتاؤں گا۔ وہ پُرسکون حالت میں سوئی ہوئی لگ رہی تھی اور میں اس کے بازو پر مردہ بچی کو لیے کھڑا تھا۔''

''اور...... اور تم نے جینی بروک کا لڑکا لے لیا۔ بروک نے لڑکی کو نہیں لڑکے کو جنم دیا تھا۔ مجھے بہت تاخیر سے خیال آیا کہ جینی کی لڑکی زندہ ہے...... اس سے بھی زیادہ دیر یہ معلوم کرنے میں لگی کہ وہ لڑکی نہیں لڑکا تھا...... جس کا نام ولیم سائنبی تھا۔ اس وقت تم وہاں آگئے اور مجھے بھاگنا پڑا۔''

''گاڈ...... یہ سب خدا کی طرف سے تھا۔ اس وقت مجھے یہی لگا کہ یہ خدا کی مرضی ہے۔ جینی ایک لڑکے کو جنم دے کر مری تھی۔ صحت مند لڑکا۔ جو رو رہا تھا۔ کوئی اس کا نہیں تھا۔ باپ کا کچھ پتا نہیں تھا۔ وہاں بچے کا کوئی رشتے دار بھی نہیں تھا۔ دوسری طرف سوزن ہوش میں آرہی تھی۔ میں تیسری مرتبہ مردہ بچہ اس کے حوالے کرتا تو خود اس کا بچنا محال تھا۔ خدا نے ہماری مشکل آسان کر دی تھی۔ یہ آسمانی منصوبہ تھا۔ ہم سب، این، ایلن، ہنری نے ایسا ہی محسوس کیا۔ اگرچہ ہنری متفق نہیں تھا۔ میں نے اسے سمجھایا۔ درحقیقت میں نے اس کی منت سماجت کی......

''اسی وقت سوزن نے آنکھیں کھولیں اور کمزور آواز میں بے بی کے بارے میں پوچھا۔ ہنری نے ہتھیار ڈال دیے۔ ایلن دوسرے کمرے سے نومولود لڑکے کو لے کر آگئی اور اسے سوزن کی گود میں ڈال دیا۔ سوزن...... میری سوزن نے بچے کو دیکھا اور رونے لگی۔''

گائے نے آستین سے آنکھیں صاف کیں۔

''اس وقت سب کو احساس ہوا کہ یہ ٹھیک ہو گیا ہے۔''

ہاں ٹھیک تھا۔ اس سے بہتر کیا ہوتا۔ کیٹ نے سوچا۔ ماں کو بیٹا اور بیٹے کو ماں مل گئی۔ لیکن اس فیصلے نے چار پانچ افراد کی جان لے لی اور اب خود اس کی باری تھی۔

کار کی رفتار اچانک دھیمی پڑ گئی۔ ہیوی ٹریفک تھا۔ فاصلے پر پالی ٹنل نظر آرہی تھی۔ کیٹ ذہنی طور پر کودنے کے لیے تیار ہو گئی۔ اس نے دھیرے سے ہاتھ کو حرکت دی اور رفتار مزید کم ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

کیٹ کو موقع ہی نہیں ملا۔ گائے نے پالی ٹنل کی سمت سے رخ بدلا اور چھدرے جنگل کی ترچھی سڑک پر گاڑی ڈال دی۔ سڑک کی ابتدا میں ''پالی لک آؤٹ'' کا بورڈ لگا تھا۔ سڑک بلند پہاڑی پر چڑھ رہی تھی۔ چوٹی پر وہ مقام تھا جہاں سے ناکام عاشق خودکشی کرتے تھے...... مرڈر کے لیے وہ ایک بہترین مقام تھا...... ناہموار سڑک پر جھاڑ جھنکاڑ کے درمیان راستہ بناتی گاڑی اوپر جارہی تھی۔ درختوں کی جھکی ہوئی شاخیں ونڈ شیلڈ سے ٹکرا رہی تھیں۔ لیکن کیٹ کو صرف ایک بات کی پروا تھی، فرار کیسے فرار ہوا جائے؟ گائے کی طاقت بھی اس کے تن و توش کے مطابق تھی۔ کیٹ نتائج سے بے پروا ہو کر دروازے پر جھپٹی۔ دروازہ کھولنے سے پہلے ہی گائے نے عقب سے کیٹ کے لباس پر ہاتھ مارا...... کیٹ پلٹ کر دو مٹھیوں کے ساتھ حملہ آور ہوئی۔ کار نے لہرانا شروع کیا۔

گائے کی غیر معمولی قوت نے فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ اس کا ایک ہاتھ مستقل اسٹیئرنگ وہیل پر تھا۔ اگلا فینڈر درخت سے ٹکرایا۔ تاہم گائے گاڑی کو واپس سڑک پر لانے میں کامیاب ہو گیا۔ کیٹ ہانپ رہی تھی۔ چوٹی سو گز دور تھی۔

یہ فاصلہ چند سیکنڈ میں طے ہو گیا۔ گائے نے گاڑی روکی اور انجن بند کر دیا، بارش، بوندا باندی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ گائے کافی دیر تک خاموش بیٹھا رہا، پہاڑی کے دوسری جانب گہری کھائی تھی۔

''تم نے پاگل پن کیوں دکھایا؟'' آخر کار وہ بولا۔

''جان بچانے کے لیے کچھ تو کرنا تھا۔'' وہ نڈھال ہو چکی تھی۔ ''دوسروں کے مانند تمہیں آخر مجھے بھی قتل کرنا ہے۔''

''وہاٹ؟ مجھے کیا کرنا ہے؟''

کیٹ نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں گائے کی نظروں کو ٹٹول رہی تھیں۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا کہ گائے کیا کہہ رہا ہے۔ ''کیا یہ آسان تھا؟'' وہ نرمی سے بولی۔ ''این کا گلا گھونٹنا، اسے تڑپتے مرتے دیکھنا؟''

''اوہ گاڈ، تم کیا سمجھ رہی ہو؟'' گائے نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ گاڑی رکی ہوئی تھی۔ کیٹ بھاگنے کی کوشش کر سکتی تھی۔ گائے کی توجہ بھی اس کی جانب نہیں تھی۔ تاہم گائے کے رویے کے باعث اس کا منہ کھلا رہ گیا...... کیا گائے قاتل نہیں ہے؟ اچانک سرجن گائے نے سر اٹھایا اور ہنسنے لگا۔ اس کی ہنسی بلند تر ہوتے ہوئے قہقہوں میں تبدیل ہو گئی۔ اس کا پورا جسم ہل رہا تھا۔ پھر اس کی ہنسی سسکیوں میں تبدیل ہو گئی...... وہ دوسری گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی طرف توجہ نہ دے سکا۔

کیٹ نے اطراف میں نظر ڈالی تو ایک اور گاڑی بلندی کی طرف آتی دکھائی دی۔ بھاگنے کا یہ بہترین موقع تھا لیکن وہ ساکت اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ اسے بخوبی ادراک ہو گیا تھا کہ گائے اسے نقصان پہنچانا نہیں چاہتا۔ قتل تو دور کی بات تھی۔

گائے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ کیٹ بھی باہر آگئی۔ گاڑی کے سامنے سے گھوم کر وہ گائے کے قریب آگئی۔ اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''تم نے کسی کو قتل نہیں کیا؟''

گابے خاموش تھا۔ تاثرات میں اذیت اور الجھن کا عنصر نمایاں تھا۔ اداسی اس کے پورے سراپا سے جھلک رہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر ایک گہری سانس لی۔ ''میں اپنے بیٹے کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہوں...... لیکن، مرڈر؟'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اوہ گاڈ، یہ میرے بس کی بات نہیں تھی...... ڈیکر جب باہر آیا تو بچے کی تلاش میں تھا۔ وہ ایک بے ضرر انسان تھا۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا۔ تاہم میں اس کا بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔''

''اسے کیونکر معلوم ہوا تھا کہ نومولود بچ گیا تھا؟''

''وہاں ایک اور ڈاکٹر بھی تھا۔''

''ڈاکٹر وان؟''

''ہاں، تاہم بعدازاں وہ بھی ایکسیڈنٹ میں مارا گیا تھا۔ میں سمجھا کہ اب سب ٹھیک ہوگیا ہے۔ ڈیکر اسٹیٹ اسپتال میں تھا۔ گولی کا زخم ٹھیک ہونے کے بعد اس کا نفسیاتی علاج شروع ہوگیا تھا۔ اسے فاتر العقل قرار دے دیا گیا تھا۔ لہٰذا اس کی بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی......

''تاہم باہر آکر بظاہر اس نے چھان بین شروع کر دی۔ میرے خیال میں اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے سے معاملہ الجھنا شروع ہوجاتا۔ میں نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ لیکن جب ہنری ٹینا کا قتل ہوا تو مجھے پریشانی لاحق ہوئی۔ ہنری کو قتل کرنے کا جواز صرف ڈیکر کے پاس تھا...... پھر این میرے پاس آئی اور بتایا کہ ڈیکر کئی بار اس کا تعاقب کرچکا ہے۔ وہ سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ ہنری کا قتل اس کے علم میں تھا۔ میں نے اسے کچھ پیسے دیے کہ وہ سان فرانسسکو اپنے بھائی کے پاس چلی جائے لیکن وہ ڈیکر کے ہتھے چڑھ گئی۔''

''گابے، ڈیکر قاتل نہیں تھا۔ وہ تو خود کسی کے ہاتھوں مارا گیا تھا؟''

گابے نے ناقابلِ یقین نظروں سے کیٹ کو دیکھا۔ ''کیٹ تمہیں پتا ہے کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟''

''ہاں۔'' کیٹ نے ڈیکر کی سر کی چوٹ کے بارے میں بتایا۔ اپنی تمام تفتیش گوش گزار کی۔ کئی باتیں وہ گول کر گئی جس میں ٹوڈ کا ذکر بھی شامل تھا۔ ''گابے مجھے اپنی کوشش کرنی ہی تھی...... تم جانتے ہو کہ میرا پروفیشن ہی میری زندگی ہے۔ آج جب میں راز کی تہ تک پہنچی کہ ولیم سائینٹی کون ہے تو تم وہاں آگئے...... میں تم سے جان بچا کر بھاگی۔ اب تم کہہ رہے ہو کہ تم قاتل نہیں ہو...... اور ڈیکر خود مقتول ہے۔ تم پولیس سے تصدیق کرسکتے ہو۔''

دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

حیرت کی زیادتی سے سرجن کے نقوش بگڑ گئے پھر اس کی پیشانی پر موٹی سلوٹیں نمودار ہوگئیں، اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ عین اسی وقت دھندلی فضا میں سے ایک چہرہ نمودار ہوا۔ کیٹ دوسری گاڑی کو بھول چکی تھی۔ قدموں کی آہٹ کے ساتھ مخصوص ٹک ٹک کی آواز بھی سنائی دی۔

سوزن کو دیکھ کر گائے پر سکتہ طاری ہوگیا۔ ڈوبتی شام اور دھند کے باوجود سوزن کے سرخ بال شعلوں کا منظر پیش کر رہے تھے۔ کیٹ سانس روکے، سوزن کے ہاتھ میں موجود گن کو دیکھ رہی تھی۔

''گائے، تم ایک طرف ہوجاؤ۔'' سوزن نے گویا حکم جاری کیا۔ گائے سکتے کی کیفیت سے باہر نہیں آپایا تھا اور بے یقینی کے عالم میں اپنی بیوی کو دیکھ رہا تھا۔

''تم نہیں؟'' کیٹ نے سرگوشی کی۔ ''شروع سے۔ وہ چارلس ڈیکر......''

''کیٹ، تم نہیں سمجھو گی۔ تم ان مرحلوں سے نہیں گزری ہو جن سے ایک ماں کو گزرنا پڑتا ہے اور ایک ایسی ماں جو پہلے ہی دو مردہ بچوں کو جنم دے چکی ہو۔ خوف، اذیت، اندیشے، نہیں، نہیں، تم نہیں سمجھ سکتیں۔''

بھرائی ہوئی آواز گائے کے حلق سے نکلی۔ ''مائی گاڈ، سوزن۔ تمہیں احساس ہے کہ تم کیا کرچکی ہو؟''

''ہاں، جو تم نہیں کرسکتے تھے... اس لیے مجھے کرنا پڑا۔ طویل عرصے تک میں ولیم کے بارے میں نہیں جان سکی۔ گائے، تمہیں مجھے بتادینا چاہیے تھا۔ مجھے ٹینا کا سے معلوم ہوا تھا۔''

''اور تم نے اتنے افراد مار دیے، سوزن؟''

''ایلن کو بھی؟'' کیٹ نے کہا۔

''ایلن کو میں نے نہیں مارا۔''

''کیا مطلب؟''

''ڈائلنٹن دوا نہیں بلکہ پوٹاشیم کلورائیڈ تھا۔ تم نے ایلن کو ہلاکت خیز ڈوز دیا تھا۔'' سوزن نے شوہر کو دیکھا۔ ''ڈارلنگ، میں تمہیں بچانا چاہتی تھی اس لیے EKG میں نے تبدیل کردیا۔ جعلی EKG پر کیٹ کے دستخط بھی میں نے کیے تھے...... گائے اب تم ایک طرف ہوجاؤ۔'' سوزن نے گن سیدھی کی۔

''کیٹ مجھے معاف کرنا...... ولیم کی خاطر۔''

''نہیں سوزن، تم ایسا نہیں کرسکتیں۔''

''وہ میرے بیٹے کو لے جائیں گے۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا، میرا یقین کرو۔'' کیٹ نے کہا۔

''بے وقوفی مت کرو۔ میں کئی قتل کرچکی ہوں اور تم واحد گواہ ہو۔ صرف تم جانتی ہو۔''

''میں بھی جان گیا ہوں۔'' گائے کا سکتہ ٹوٹ گیا۔

''کیا تم مجھے بھی مار دو گی؟''

''تم میرے شوہر ہو۔ تمہاری طرف سے خطرہ نہیں ہے۔''

''سوزن گن مجھے دے دو۔'' گائے آہستہ سے آگے بڑھا۔ اس کی آواز میں نرمی اور التجا تھی۔ ''پلیز ڈارلنگ، میں سب سنبھال لوں گا...... کچھ نہیں ہوگا۔'' اس نے ہاتھ دراز کیا۔

سوزن نے ایک قدم پیچھے ہٹایا۔ ہاتھ کانپا۔ گن کا رخ گائے کی جانب ہوگیا۔ ''سوزن، کیا کررہی ہو؟''

''پلیز گائے......''

گائے نے ایک قدم اور بڑھایا۔ ''آئی لو یو۔''

''میں جانتی ہوں۔'' سوزن لرز اٹھی۔

''گن دے دو مجھے۔'' دونوں کے ہاتھوں کے درمیان چند انچ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

کیٹ کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ پاگل ڈیکر نہیں بلکہ سوزن تھی...... یا گائے کے ساتھ وہ سب تھے جنہوں نے پانچ سال پہلے بظاہر ایک اچھا فیصلہ کیا تھا۔

سوزن ایک لمحہ رک گئی۔ گائے محبت آمیز نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ سوزن کے چہرے پر شکست خوردگی کے آثار تھے۔ گائے نے بھی محسوس کرلیا اور ذرا بڑھ کے گن بیرل پکڑلی۔ اس نے گن کھینچی۔ تاہم سوزن کی گرفت ڈھیلی نہیں ہوئی تھی۔ دفعتاً اس کے اندر کوئی آخری چنگاری بھڑک اٹھی۔ سوزن نے گن واپس کھینچی۔

''گائے، گن چھوڑ دو۔'' وہ چلائی۔

''سوزن، مت کرو...... دے دو مجھے۔'' چند ثانیے کے لیے دونوں میں کشمکش ہوئی۔ معاً گن کا زاویہ بدل گیا اور دھماکے نے ان دونوں کو ساکت کردیا۔ دونوں تعجب اور تکلیف کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے...... گائے لڑکھڑا کے پیچھے ہٹا۔ گولی اس کی ٹانگ میں لگی تھی۔

''نہیں۔'' سوزن کی چیخ بلند ہوئی۔ وہ تیزی انداز میں کیٹ کی طرف مڑی۔ کیٹ نے لمحہ ضائع کیے بغیر دوڑ لگا دی۔ سوزن نے دھندلی فضا میں اندھا دھند گولی چلا دی۔

کیٹ محفوظ رہی، پتا نہیں گولی کس طرف گئی۔

کیٹ کو ہوش نہیں تھا کہ گاڑیاں اور سڑک کدھر

ہے...... اسے کس طرف جانا ہے۔ بس ایک ہی خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ دور نکل جاؤ۔ دھند کا تعاون اس کے ساتھ تھا۔

اچانک زمین بلندی کی طرف ترچھی ہوگئی۔ وہ ایک چٹان تھی جس پر کہیں کہیں جھاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ کیٹ مڑی تو اسے احساس ہوا کہ سڑک کی طرف جانے کے لیے اسے سوزن کا سامنا کرنا پڑے گا۔

عقب سے سوزن کی آواز آئی۔ ''یہ سڑک کہیں نہیں جاتی، کیٹ۔ احتیاط کرنا، ورنہ گہرائی میں گر کر ماری جاؤ گی۔''

کیٹ نے آوازوں سے محسوس کیا کہ سوزن قریب آتی جارہی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ شکار پھنس چکا ہے لیکن کیٹ شکار نہیں تھی۔ اس نے احتیاط ترک کردی اور اچھل کر بھاگی۔ ٹوٹی پھوٹی سڑک میں جابجا دراڑیں اور سوراخ تھے۔ بعض جگہ سے تو سڑک غائب ہی ہوگئی تھی۔ اس جگہ پر جھاڑیاں زیادہ تھیں۔ بعض جھاڑیاں تو چھوٹے درختوں میں تبدیل ہوچکی تھیں۔

تاریکی بھی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ نگاہ کی رسائی محدود ہوتی جارہی تھی۔ تاہم یہی تاریکی، سیاہ چادر بن کے کیٹ کو چھپا سکتی تھی۔

لیکن وہ کہاں چھپے گی؟ دائیں جانب دیوار نما پہاڑی سلسلہ تھا۔ بائیں سڑک کے بعد خستہ فٹ پاتھ کے بعد اندھی گہرائیاں تھیں۔ کوئی چانس نہیں تھا۔ اسے سیدھا آگے ہی جانا تھا۔ ایک قدرے گول فٹ بال نما پتھر سے الجھ کر گری اور فوراً ہی کھڑی ہوگئی۔ موت تعاقب میں تھی۔ کیٹ کو احساس نہیں ہوا کہ اس کے گھٹنے میں چوٹ آئی تھی۔ وہ چل رہی تھی نہ دوڑ رہی تھی۔ البتہ ذہن پوری رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ اگر وہ بچ نہ سکی تو گولی کا نشانہ بنے گی یا پھر اس کی لاش بائیں جانب کی گہرائی سے ملے گی......

ذرا دیر کے لیے دھند کا سایہ ہٹا تو کیٹ نے دائیں جانب پہاڑی نما دیوار پر گھنی جھاڑیاں دیکھیں۔ جھاڑیوں کے درمیان غار کا دہانہ بھی واضح تھا۔ پتا نہیں غار تھا یا کوہ تھی۔ مدد آنے تک وہ، وہاں چھپ سکتی تھی۔ تاہم وہ جھاڑیوں کی مدد سے اوپر جانے لگی۔ خطرہ تھا کہ اس کے قدموں سے کوئی پتھر کھسک کر نیچے نہ جا پڑے۔ جس کی آواز سوزن کو چوکنا کر سکتی تھی۔ جھاڑیوں کے بغیر اس کا وہاں پہنچنا ناممکن تھا۔ سوزن کے قدموں کی آواز سر پر تھی۔ کیٹ جھاڑیوں میں سمٹ کر سنگی دیوار کے ساتھ چپک گئی۔ اس وقت ہوا نے بادلوں کو اس جانب دھکیلا...... کیٹ کا نظر میں آنا ممکن نہیں تھا۔ البتہ کسی بھی قسم کی آواز جان لیوا ثابت ہوتی۔

سوزن کے قدموں کی آہٹ عین اس جگہ تھم گئی جہاں چند گز اوپر کیٹ مکھی کے مانند چپکی ہوئی تھی۔ آہٹ دوبارہ ابھری...... پھر آگے بڑھتی چلی گئی۔ ٹھنڈ کے باوجود کیٹ پسینے میں نہا گئی تھی...... کیچڑ، پسینہ، بارش کا پانی، وہ حال سے بے حال ہوچکی تھی۔ ٹانگ میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے ہمت جمع کی اور اوپر کھسکنا شروع کیا۔ سانس دھونکنی کے مانند چل رہی تھی۔ کیچڑ زدہ کھوہ تک پہنچ کر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں کھوہ کا کنارہ تھا اور دوسرے ہاتھ میں جھاڑی کی شاخ، کیٹ نے گہری گہری سانسیں لے کر بچی کچھی توانائی جمع کی اور کسی نہ کسی طرح کھوہ میں گھس گئی۔

بڑھتی ہوئی تاریکی اس کے لیے حفاظت کا سامان مہیا کر رہی تھی۔ وہ سمٹی ہوئی نڈھال حالت میں پڑی تھی۔ بند آنکھوں کے پیچھے ڈیوڈ کا تصور تھا۔ لیکن اسے کیسے پتا چلے گا؟ وہ اگر مر گئی تو اس کا ردعمل کیا ہوگا؟ کاش وہ ڈاکٹر ٹیم کو بتا دیتی کہ وہ مڈبیک اسپتال جائے گی لیکن اس وقت تو اس کا ارادہ ایسا نہیں تھا۔ وہ تو واپس ڈیوڈ کی ماں کے گھر جارہی تھی...... اسے یقین تھا کہ ڈیوڈ اسے ڈھونڈ رہا ہوگا۔

کیٹ نے چہرہ دونوں بازوؤں میں چھپا لیا اور رونے لگی۔ تاریکی چھانے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ غالباً موسم اور دھند کی وجہ سے مغالطہ ہورہا تھا کہ اندھیرا ہونے والا ہے۔ کیٹ کا سارا جسم اکڑ سا گیا تھا۔ اس نے وہاں بمشکل دس منٹ گزارے ہوں گے۔ معاً وہ چونک اٹھی۔ قدموں کی آہٹ پھر ابھری تھی۔ آواز اسی جانب آرہی تھی۔

''تم اوپر چھپی ہو؟'' سوزن کا قہقہہ بلند ہوا۔ ''میں مس کر گئی تھی۔ بہرحال بدقسمتی سے اس قسم کے سوراخوں کا دوسرا سرا بند ہوتا ہے کیٹ۔'' سوزن کی آواز میں جنون تھا۔ ''پتھروں کے لڑھکنے کی آواز آئی۔ وہ اوپر چڑھ رہی ہے۔

کیٹ کی سرکشی اور غصے نے سر اٹھایا۔ وہ پیچھے کی طرف اندر نہیں جاسکتی تھی۔ باہر نکل کر نیچے نہیں اتر سکتی تھی۔ وہ پاگل عورت گن لیے اوپر آرہی تھی۔ ایک ہی راستہ تھا۔ خطرناک رسک۔ کیٹ کو یہاں سے نکل کر مزید اوپر جانا پڑے گا۔

کیٹ نے نئے ولولے کے ساتھ حرکت کی۔ اس نے اطراف کا جائزہ لیا اور مٹھی کے برابر ایک پتھر اٹھا لیا۔ گن کے مقابلے میں پتھر کی کیا حقیقت تھی۔ تاہم اس وقت یہ بھی بہت تھا۔ کیٹ کو تھوڑا سا وقت چاہیے تھا۔ وہ احتیاط

سے دہانے کی طرف آئی...... سوزن کا چہرہ اوپر کی جانب ہی تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ دونوں کی نظروں میں ایک جیسا تاثر تھا۔ ایک زندگی کے لیے برسرِ پیکار تھی۔ دوسری جینے کے لیے لڑ رہی تھی۔ کیٹ نے بوکھلاہٹ میں دیکھا کہ سوزن اس کی توقع سے زیادہ اوپر آچکی تھی۔ دونوں میں سے کوئی پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا، کسی قسم کا سمجھوتا ممکن نہیں تھا۔ ایک کو مرنا تھا، یہی انجام تھا۔

سوزن نے نشانہ لیا۔ ادھر کیٹ نے تاک کر پتھر پھینکا۔ پتھر اوپر سے نیچے گیا تھا۔ وہ سوزن کے شانے سے ٹکرایا۔ وہ فائر بھول کر نیچے کی جانب پھسلی۔ ایک شاخ تھام کر اس نے خود کو سنبھالا۔

اس اثنا میں کیٹ کھوہ سے نکل کر پہاڑی پر چڑھنے لگی۔ خودرو جھاڑیوں کی شاخوں کے بغیر یہ ممکن نہیں تھا۔ بعض جگہ اسے پہاڑی رخنوں میں انگلیاں پھنسانی پڑتیں۔ متعدد شاخیں بمشکل ایک فٹ بلند تھیں۔ تاہم کہیں کہیں اسے قدم جمانے کا موقع بھی مل جاتا۔ ہاتھ پیروں پر خراشیں پڑ گئی تھیں۔ کانٹوں نے آستینوں کو چیتھڑوں میں تبدیل کر دیا تھا...... موت کا خوف اسے آگے بڑھا رہا تھا۔ اس وقت نیچے سے فائر کیا گیا۔ گولی پتھر سے ٹکرائی اور ایک چھوٹا ٹکڑا ٹوٹ کر کیٹ کے چہرے سے ٹکرایا۔

سوزن کوئی شوٹر نہیں تھی۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ باوجود اس کے امکان کم ہی تھا کہ وہ ٹھیک نشانہ لے پاتی۔ مستزاد یہ کہ موسم کی بدنمائی کے علاوہ وہ دونوں ہی ایک انتہائی بے تکی اور خطرناک جگہ پر گویا لٹکے ہوئے تھے۔

کیٹ نے سر اٹھا کے دیکھا اور لرز اٹھی۔ ڈھلوان پہلے ہی خاصی ترچھی تھی۔ لیکن اس کا انتہائی حصہ عمودی صورت اختیار کر گیا تھا۔ کیا وہ کم ہوتی ہوئی طاقت کے ساتھ اس مخدوش ٹکڑے کو کراس کر لے گی؟ وہاں بیل کی شکل کے نباتات موجود تھے...... کیٹ دیوانہ وار خود کو گھسیٹ رہی تھی۔ اس کے دونوں جوتے اتر چکے تھے۔

جوتوں کی غیر موجودگی میں کیٹ اپنے پیر زیادہ آزادی کے ساتھ استعمال کر رہی تھی۔ پہاڑی کی چوٹی چند فٹ دور تھی۔ اس کا بدن شل ہو چکا تھا۔ ایک ایک انچ جانے کے لیے عضلات ٹوٹے جا رہے تھے۔ بالآخر اس نے معرکہ سر کر لیا۔ سطح گیلی زمین پر لیٹی وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ اس کے دل نے کہا کہ آنکھیں بند کرو اور سو جاؤ۔ تاہم یہ ممکن نہیں تھا

کیٹ لڑکھڑاتی ہوئی اٹھی۔ وہ اتنی تھک چکی تھی کہ اوپر پہنچنے کی خوشی محسوس نہ کر سکی۔ اس نے دیکھا کہ پہاڑ کی چوٹی درحقیقت کچھ فاصلے پر تھی۔ تاہم یہ فاصلہ اتنا ترچھا نہیں تھا۔ کیٹ نے آگے بڑھنا شروع کیا...... لیکن چند قدم دور ہی سفر تمام ہو گیا۔

دھماکے کی آواز آئی۔ کیٹ نے کسی قسم کی تکلیف محسوس نہیں کی، سوائے حیرت کے۔ گولی اس کے شانے سے ٹکرائی تھی۔ وہ لہرائی...... زمین و آسمان گھوم گئے۔ وہ پشت کے بل گری اور چوٹی کی طرف لڑھک گئی...... بلکہ لڑھکتی چلی گئی۔

چوٹی کی مٹی میں اگنے والی سخت جان مخصوص گھنی جھاڑیوں نے، جس کی جڑیں گہرائی میں اتر جاتی ہیں، کیٹ کی جان بچالی۔

ٹانگوں میں الجھنے سے کیٹ کے گرنے کی رفتار کم ہوئی اور اس نے ہوش سنبھالتے ہوئے، صحت مند ہاتھ سے خودرو پودے کی جڑ تھام لی۔ وہ چوٹی کے کنارے پڑی تھی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا۔ وہ ذہن میں اترنے والی دھند صاف کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کیٹ نے نیچے گہرائی میں دیکھا۔ دور سڑک کسی پتلی لکیر کے مانند نظر آ رہی تھی۔ اس کے کانوں میں پولیس سائرن کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔ کیٹ نے واہمہ سمجھ کر سوزن کی طرف نظر ڈالی۔

سوزن گن تانے اس کے سر پر کھڑی تھی۔ سائرن کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ کیٹ کے حواس بحال ہو چکے تھے۔ سائرن کی آواز اس کا وہم نہیں تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”سوزن، مجھے مارنے کا اب کوئی فائدہ نہیں ہے۔“

”تم ولیم کے بارے میں جانتی ہو؟“

”آنے والے بھی جان جائیں گے۔“ کیٹ نے نحیف آواز میں کہا۔

”تم بتاؤ گی تو انہیں معلوم ہوگا۔“

”دیر ہو گئی ہے۔ میں بتاؤں یا نہ بتاؤں۔ خود کو سنبھالو۔“

”نہیں۔“ سوزن چیخ اٹھی۔

کیٹ نے دیکھ لیا کہ سوزن کا اعتماد ٹوٹ رہا ہے۔

”تمہیں مدد کی ضرورت ہے۔ میں تمہاری مدد کروں گی۔“ کیٹ نے کہا۔

دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں...... معاً ہوا کے دوش پر کیٹ کی سماعت نے ایک اور آواز سنی۔ وہ ڈیوڈ کی آواز تھی۔ جو بار بار اس کا نام لے کر پکار رہا تھا۔ کیٹ کو شک ہوا کہ یہ بھی اس کا وہم ہے۔

یک دم اس کے اندر زندگی نے کروٹ لی۔
''سوزن پلیز، گن چھوڑ دو۔''
سوزن کے جسم نے حرکت کی۔ تاہم گن اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے آوازیں سن لی تھیں۔
''کیا تمہیں احساس نہیں ہے؟'' کیٹ نے آواز بلند کرنے کی کوشش کی۔ ''اگر تم نے مجھے ختم کیا تو ولیم کو پاس رکھنے کا آخری سہارا بھی کھو دوگی۔''
کیٹ کے الفاظ نے سوزن کو جیسے نچوڑ کے رکھ دیا۔ اس کے ہاتھ پہلو میں گر گئے۔ گن زمین پر جا پڑی۔ وہ ساکت کھڑی تھی۔ پھر اس کا سر نیچے جھک گیا۔ جیسے وہ سوگ منا رہی ہو پھر وہ مڑی اور نیچے سڑک کی طرف دیکھا۔
نیچے سے بلند ہونے والی چیخ و پکار کہہ رہی تھی کہ ان دونوں کو دیکھ لیا گیا ہے۔
''یادیں...... اچھی یادیں...... اس کے پاس میری اچھی یادیں رہیں گی۔ صرف یادیں۔'' سوزن نے سرگوشی کی۔
وہ ہوا کا جھونکا تھا یا کچھ اور...... کیٹ کبھی نہ جان سکی۔ ایک لمحے سوزن سیدھی کھڑی نظر آئی۔ دوسرے لمحے وہ غائب ہو چکی تھی۔ دور گہرائی میں کوئی آواز نہیں۔ کوئی چیخ نہیں تھی...... صرف کیٹ کی سسکیاں تھیں۔ وہ ایک بار پھر سنگی بستر پر گر گئی۔ پھر وہ اشکبار ہو گئی، اس عورت کے لیے، جس نے اس کے سامنے جان دے دی...... اور ان لوگوں کے لیے جو اس سے پہلے مارے گئے تھے۔ اتنی اموات، سب غیر فطری، غیر طبعی...... وہ بھی محبت کے نام پر۔ سب کے سب محبت کے نام پر۔

☆☆☆

سب سے پہلے ڈیوڈ کیٹ تک پہنچا تھا۔ کیچڑ اور خون میں لت پت وہ بے ہوش پڑی تھی۔ ڈیوڈ پر وحشت اور دیوانگی کا غلبہ تھا۔ اس نے کیٹ کو اپنی جیکٹ میں لپیٹا۔
''تم نہیں مر سکتیں...... میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا...... تم سن رہی ہو کیٹ۔ تم نہیں مر سکتیں۔'' کیٹ کا بدن ساکت اور سرد تھا۔ ڈیوڈ نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ اس کے اختیار میں یہ تھا کہ وہ اپنے بدن کی گرمی اس تک پہنچائے۔ اس کی شرٹ پر کیٹ کے خون کے دھبے پڑ گئے۔ وہ متواتر اسے نام سے پکار رہا تھا۔
ریسکیو ورکرز کی آوازیں...... ایمبولینس کے سائرن۔ ڈیوڈ کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی توجہ کیٹ کی حرکت قلب اور تنفس پر تھی۔ ریسکیو ورکرز کے بغیر کیٹ نیچے ایمبولینس تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ان کارروائی میں تھوڑا وقت خرچ ہوا۔ ڈیوڈ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سپرمین بن کر خود اڑتا ہوا اسے لے کر اسپتال پہنچ جائے۔
''تم ٹھیک ہو؟'' کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''ڈیوی؟''
''ہاں۔'' ڈیوڈ نے پوکی کو دیکھا۔
''وہ ٹھیک ہو جائے گی یار۔'' پوکی نے کہا۔ اس وقت بروفی نے سوزن کی لاش کے بارے میں بتایا۔ ''اس کی گردن ٹوٹ گئی ہے۔''
''اور سرجن گائے؟''
''عجیب ردعمل تھا اس کا۔'' بروفی نے کہا۔ ''سوزن کی موت پر لگا جیسے، خبر اس کے لیے متوقع تھی۔ تاہم وہ اس المناک حقیقت کو تسلیم نہیں کر رہا...... وہ ذہنی طور پر اپ سیٹ ہے اور زخمی بھی ہے۔''

☆☆☆

کیٹ کو دیکھنے کے لیے ڈیوڈ نے انتظار گاہ میں چار گھنٹے گزارے۔ اسے لگا کہ وہ ازل سے وہاں انتظار میں تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے سے متصل آپریشن روم تھا۔ سرجری کے لیے تین گھنٹے صرف ہوئے تھے۔ ڈیوڈ کی دھڑکن ناہموار تھی۔ کیا کچھ غلط ہو گیا ہے؟
بالآخر ایک نرس نے کمرے میں جھانکا۔ ''تم ڈیوڈ رینسم ہو؟''
''یس۔''
''ڈاکٹر ٹیٹزلی کی سرجری مکمل ہو چکی ہے۔ وہ خطرے سے باہر ہے۔''
گھنٹوں سے تنے ہوئے ڈیوڈ کے اعصاب یک لخت نرم پڑ گئے۔ ''تھینک یو۔''
''مسٹر آپ گھر جا سکتے ہیں۔ ہم کال کر دیں گے، جیسے ہی وہ......''
''مجھے اسے دیکھنا ہے۔''
''وہ ہوش میں نہیں ہے۔''
''مجھے ہر صورت اسے دیکھنا ہے۔'' ڈیوڈ بے قابو ہونے لگا۔
''پانچ منٹ، مسٹر رینسم صرف پانچ منٹ۔'' نرس نے اس کے بگڑتے ہوئے تیور دیکھ لیے تھے۔
ڈیوڈ نے کوئی جواب نہیں دیا اور ریکوری روم سے گزر کر آپریشن روم میں آ گیا۔
کیٹ بستر پر تھی۔ آنکھیں بند اور گلابی رنگت زردی مائل۔ سفید بستر پر وہ کانچ کی گڑیا کے مانند دکھائی دے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

رہی تھی۔ ڈرپ، آئی وی، آکسیجن، کارڈیاک مانیٹر، نلکیاں...... تمام ضروری لائف سپورٹ سسٹم چوکس تھا۔ دو نرسز اور ایک ڈاکٹر بستر کے اردگرد متحرک تھے۔ ڈیوڈ سمجھ رہا تھا کہ اسے وہاں سے ہٹ جانا چاہیے۔ تاہم وہ ٹکٹکی باندھے کھڑا رہا، حتیٰ کہ نرس نے اسے ٹوک دیا۔ طوعاً و کرہاً اس نے جنبش کی اور آپریشن روم چھوڑ دیا۔

☆☆☆

وہ ہوش میں آ رہی تھی۔ پپوٹے لرز رہے تھے۔ کانوں میں آوازیں آ رہی تھیں۔ دھیرے دھیرے، تکلیف کے ساتھ کیٹ نے آنکھیں کھولیں۔ روشنی بُری لگی تھی۔ آنکھیں پھر بند ہو گئیں۔ وقفے سے اس نے پھر آنکھیں کھولیں۔ پلکیں جھپکائیں، پردۂ یادداشت مرتعش ہوا۔

ایک مسکراتا ہوا چہرہ نگاہ کے سامنے ڈگمگا کر ساکت ہو گیا۔ کیٹ کی نظر نام کے ٹیگ پر جم گئی۔ آر۔ این۔ جولیا۔ (رجسٹرڈ نرس RN)۔

''ڈاکٹر بیٹرنی، کیا تم مجھے سن رہی ہو؟'' جولیا نے سوال کیا۔

کیٹ نے نقاہت سے سر کو خفیف جنبش دی۔

''تم ریکوری روم میں ہو۔ کیا تم تکلیف میں ہو؟''

کیٹ لاعلم تھی۔ اس کی حسیات ایک ایک کر کے واپس آ رہی تھیں۔ دماغ نے ابھی تکلیف محسوس کرنے والا سگنل وصول نہیں کیا تھا۔ شدید کمزوری کا عالم تھا۔ اس نے ناک میں آکسیجن کی ترسیل کی سرسراہٹ محسوس کی۔

عزیز چہرے بستر کے گرد جمع ہو گئے۔ وہ سونا چاہ رہی تھی۔

''کیٹ؟''

اس نے آواز کی سمت دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ ڈیوڈ تھا۔ ذہن میں لہر اٹھی۔ کیٹ نے بے اختیار ہاتھ اٹھایا۔ ہاتھ کی آئی وی ٹیوبس نے یہ کوشش ناکام بنا دی۔ ناطاقتی کے باعث ہاتھ چند انچ اٹھ کر واپس بستر پر گر گیا۔

ڈیوڈ بستر کے ساتھ لگ گیا۔ اس نے ہاتھ کو ایسے تھاما جیسے وہ نازک کانچ کا بنا ہے۔

''خدا کا شکر ہے کہ تم ٹھیک ہو......''

''مجھے یاد نہیں۔''

''تمہاری تین گھنٹے تک سرجری کے بعد گولی نکال دی گئی ہے۔''

کیٹ کے ذہن میں پھر لہر اٹھی...... بارش ہوا...... پہاڑی...... اور سوزن......

''ڈاکٹر سوزن زندہ ہے؟'' اس نے نقاہت زدہ آواز میں سوال کیا۔

''نہیں۔ کیٹ، کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔'' ڈیوڈ نے اس کا ہاتھ سہلایا۔

''گائے؟''

''وہ فی الحال چل نہیں سکتا۔ لیکن وہ اسپتال کے علاوہ کئی جگہ فون کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ورنہ شاید ہم بروقت نہ پہنچ پاتے۔'' ڈیوڈ نے کہا۔

کیٹ، سرجن گائے کے بارے میں سوچنے لگی۔ ٹانگ کے ساتھ جس کی زندگی بھی ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔

''اس نے میری زندگی بچائی اور سب کچھ کھو دیا......'' کیٹ نے سرگوشی کی۔

''نہیں سب کچھ نہیں۔ ایک چیز اس کے پاس ہے۔''

کیٹ کی نظروں میں سوال اُبھرا۔

''اس کا بیٹا۔'' ڈیوڈ نے ان کہے سوال کا جواب دیا۔

''ہاں۔'' کیٹ نے سوچا۔ ''ولیم ہمیشہ گائے کا بیٹا رہے گا۔ خونی رشتہ نہ سہی، محبت کا رشتہ...... بہت مضبوط رشتہ۔ آہ، تمام ٹریجڈی سے کم از کم ایک اچھی چیز تو برآمد ہوئی۔'' پھر ذہن میں اک اور خیال نے راہ بنائی۔ ''نہیں ایک نہیں بلکہ دو۔'' اس نے ڈیوڈ کی نیلی آنکھوں میں دیکھا۔ کچھ کہنے کی کوشش کی۔

ڈیوڈ نے اس کی آنکھوں کی زبان سمجھنے کی کوشش کی اور چہرہ قریب کر لیا۔

''تم بزدل ہو ڈیوڈ؟'' کیٹ نے سرگوشی کی۔

''نہیں۔''

''پھر کہہ دو نا......''

ڈیوڈ نے کان کھجایا۔ ''کوشش کرتا ہوں۔''

''کب سے کوشش کر رہے ہو۔''

''آئی لو یو کیٹ...... آئی لو یو۔'' ڈیوڈ نے آہستہ سے کہا۔

''آئی لو یو ڈیوڈ۔'' کیٹ کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نظر آئی۔ اسے شدت سے نیند آ رہی تھی۔

''مسٹر ڈیوڈ، پلیز اب آپ جائیے۔'' ڈاکٹر ٹام کی آواز بلند ہوئی۔

ڈیوڈ نے سعادت مندی سے سر ہلایا اور جھک کر نرمی سے کیٹ کی پیشانی چوم لی۔

کیٹ نے آنکھیں موند لیں۔ ڈاکٹر ٹام، نرس کو ہدایت جاری کر رہا تھا۔

پوری کلاس بھری ہوئی تھی۔
سہیل نے فاتحانہ نگاہوں سے کلاس کی طرف دیکھا۔
سب اس کی طرف متوجہ تھے۔لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی۔
سب کے سب نوجوان اور خوبصورت اور سب امیر
گھرانوں کے بچے تھے۔اسی لیے ان کے چہروں پر سرشاری تھی، طمانیت تھی، حسن تھا۔سہیل اس سے پہلے جس کالج میں تھا، وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والوں کے لیے تھا۔ان بے چاروں کو اپنی زندگی گزارنی مشکل تھی۔لیکن علم کے شوق میں

مظلوم عاشق

منظر امام

سود و زیاں کا کاروبار زندگی کے ہر لمحے پروان چڑھتا رہتا ہے... کبھی اُتار تو کبھی چڑھاؤ... وہ زخم خوردہ تھا... تدبیر و ترکیب سے کام لینا جانتا تھا... مگر محبت کا جذبہ خودرو پودے کے مانند اُبھرتا ہے... اور پھیلتا چلا جاتا ہے... چاہ اور چاہے جانے کی خواہش میں دربدر ہونے والے مظلوم عاشق کی رودادِ غم...

دورِ جدید میں دل کا کاروبار کرنے والے عاشقوں کے لیے ہدایت نامہ.....

پڑھائی کیے جا رہے تھے۔ ایک موہوم سی امید میں کہ شاید حالات بدل جائیں۔ اسی لیے اُن کے چہروں پر غریبی نے اپنے نشانات بنا دیے تھے۔

تھکے تھکے چہرے، تھکے تھکے لوگ۔ ان میں سے کئی ایسے بھی تھے جو کالج کے بعد جاب کیا کرتے تھے۔

لیکن اس کالج کا ماحول ہی مختلف تھا۔ سہیل جب پہلی بار اس کالج میں داخل ہوا۔ اور اس نے یہاں کے لڑکے اور لڑکیوں کو دیکھا تو اسے اس شعر کی صداقت پر یقین کرنا پڑا کہ یہاں تو حسن کی نعمت بھی ہے دولت کی پروردہ...... یہ لڑکی فاقہ کش ہوتی تو بدصورت نظر آتی۔

اور جب وہ آخری انٹرویو کے لیے پرنسپل کے کمرے میں پہنچا تو پرنسپل نے اِدھر اُدھر کے سوالات کے بعد کہا۔ ''مسٹر سہیل، آپ جس کالج سے آئے ہیں، وہاں کے ماحول اور یہاں کے ماحول میں بہت فرق ہے۔''

''یس سر! اس کا اندازہ ہو گیا ہے۔'' اس نے کہا۔

''یہاں ایسی بہت سی باتیں ہوں گی جو شاید آپ کو بری لگیں۔ لیکن انہیں نظر انداز کرنا ہوگا۔ مثال کے طور پر لڑکے لڑکیوں کی دوستی وغیرہ۔ کیونکہ ان کا ماحول ہی ایسا ہے۔ یہ جس سوسائٹی سے تعلق رکھتے ہیں وہاں ایسی باتوں کا اثر نہیں لیا جاتا۔ سمجھ گئے؟''

''یس سر اتنا تو جانتا ہوں میں۔'' سہیل نے کہا۔ ''لیکن ایک بات ہے سر جو میں آپ کی کالج میں لانا چاہتا ہوں۔''

''ضرور۔'' پرنسپل اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''وہ کیا بات ہے؟''

''میں ان اسٹوڈنٹس کو علامہ فراست کی کتاب اخلاقیات سے ایک نہ ایک بات ضرور بتاؤں گا۔'' اس نے کہا۔ ''حالانکہ وہ نصاب میں شامل نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں یہ چاہتا ہوں۔ صرف دس منٹ کے لیے۔ اس کا تعلق میرے پورے لیکچر سے نہیں ہوگا۔ یہ ایک الگ بات ہوگی۔''

''ہاں، ہاں کیوں نہیں۔'' پرنسپل نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ''میں تو اس کتاب کا گرویدہ ہوں بلکہ یہ تو اسٹوڈنٹس کے لیے بھی اچھی بات ہوگی۔''

''شکریہ سر۔''

اسے کلاس روم میں بھیج دیا گیا۔

کلاس روم میں داخل ہوتے ہی اس کا دل خوش ہو گیا تھا۔ ایک سے ایک چہرے، ایک سے ایک لباس، ایک سے ایک پرفیوم۔ پوری کلاس مہکی ہوئی تھی۔

اس کا خیال تھا کہ اتنے ماڈرن نظر آنے والے اسٹوڈنٹس اس کا احترام نہیں کریں گے لیکن وہ سب کے سب کھڑے ہو گئے تھے۔ اور پوری کلاس گڈ مارننگ کی آوازوں سے گونج اٹھی۔ سہیل کو یہ سب بہت اچھا لگا تھا۔

''کیا آپ لوگ اس بات کی اجازت دیں گے کہ میں دوستو کہہ کے مخاطب کر سکوں۔'' اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یس سر!'' کمرا گونج اٹھا۔

''دوستو، سب سے پہلے تعارف ہو جائے۔'' اس نے کہا۔ ''میں سہیل مجید ہوں آپ کا استاد۔ میں کوشش کروں گا کہ استاد کے مرتبے کا خیال رکھتے ہوئے وہ سب کچھ بتانے کی کوشش کروں جو میں نے سیکھا ہے۔ یا جتنا میں جانتا ہوں۔''

اس کا پہلا تاثر ہی اچھا پڑا تھا۔ ''چلیں اب آپ اپنا اپنا تعارف کروائیں۔''

سب اپنا نام بتانے لگے۔ وہ درمیان میں کبھی کبھی کوئی مزاحیہ جملے بھی ادا کر دیتا اور پوری کلاس ہنس پڑتی۔ پھر جب ایک لڑکی کے تعارف کی باری آئی تو سہیل اس میں کھو کر رہ گیا۔ وہ بہت خوبصورت تھی اور سب سے مختلف بھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا بھی تعلق امیر گھرانے سے ہو سکتا تھا۔ لیکن اس نے نہ تو بھڑک دار لباس پہن رکھا تھا اور نہ ہی وہ منہ بگاڑ بگاڑ کر بول رہی تھی بلکہ ایک خاص قسم کی سادگی اور بے اختیاری تھی اُس میں۔

سہیل اس کو دیکھتا رہ گیا۔ نہ جانے کیوں کچھ لوگ پہلی نظر ہی میں اچھے لگنے لگتے ہیں۔ اور وہی تاثر تا دیر قائم رہتا ہے۔ وہ بھی ایسی ہی لڑکی تھی۔ اس نے ذرا سی دیر میں سہیل کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

سہیل اس کالج میں ادب کا لیکچرار بن کر آیا تھا۔ اس نے پہلے ہی دن اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا تھا۔ اس نے اس دن صرف غالب پر دھیان دیا تھا۔ لیکن صرف غالب ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ اس نے اردو ادب اور عالمی ادب کی تاریخ بھی بتا دی تھی۔

اس نے محسوس کیا کہ اس کا تاثر اچھا پڑا ہے۔ ان کی نگاہیں بتا رہی تھیں کہ انہوں نے اسے پسند کیا ہے۔ یہ بڑی کامیابی تھی لیکن وہ لڑکی جس نے اپنا نام نمرہ عالم بتایا تھا۔ وہ تو اس کے ذہن سے چپک کر رہ گئی تھی۔

وہ گھر واپس آ کر بہت دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے اپنے ہی ان خیالات پر شرم بھی آ رہی تھی۔ وہ تو کلاس میں علامہ فراست کی کتاب اخلاقیات کی باتیں

کرنے کا سوچ رہا تھا۔ اور پہلے ہی دن خود اس کی خلاقیات کا یہ حال ہو گیا تھا۔

اس نے اس کا دھیان اپنے ذہن سے جھٹکنے کی بہت کوشش کی لیکن ایسا ہو نہیں سکا۔

دوسرے دن اس نے کالج میں اور ہی انداز کا لیکچر دیا تھا۔ وہ فلاسفی آف لو پر بات کر رہا تھا۔ لیکن اس کی باتوں میں چھچھورا پن نہیں تھا۔ اس نے دنیا کی تاریخ اور شاعری سے حوالے دیے تھے۔ اسے اندازہ تھا کہ اس کی معلومات ایسے موقعوں پر کتنا کام آتی ہے۔

اس نے اپنا سکہ جما لیا تھا۔ لیکن وہ جس کے لیے یہ سب کچھ کر رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں بھی اس کے لیے ستائش کے جذبات تو تھے لیکن کوئی بات نہیں ہو سکی تھی۔ وہ ایک سلجھا ہوا، مہذب اور پڑھا لکھا انسان تھا۔ لیکن زندگی نے اسے محرومیوں کے سوا کچھ نہیں دیا تھا۔ سب سے پہلی محرومی اس کی کم صورتی تھی۔ اس کی شخصیت ایسی ہرگز نہیں تھی جو دیکھنے والے کو پہلی نظر میں اپنی طرف مائل کر سکتی۔ جب وہ باتیں کرتا تب لوگوں کو پتا چلتا کہ وہ ایک پڑھا لکھا انسان ہے لیکن اس کی باتیں سننے کا انتظار کون کرتا۔ اسی لیے لوگ اس کی طرف سے کترا کر گزر جاتے تھے۔

دوسری محرومی یہ تھی کہ اس کا تعلق ایک واجبی خاندان سے تھا۔ اس کے والدین کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ اسے اعلیٰ تعلیم دلوا سکتے۔ خاندان کے ایک شخص نے اس کی تعلیم کے اخراجات برداشت کیے تھے۔ اس کا احساس اسے ہمیشہ رہا تھا۔ وہ احساس کمتری کا شکار ہو گیا تھا۔ تیسری محرومی یہ تھی کہ اس کی زندگی میں ابھی تک کسی آنچل کا سایہ نہیں آیا تھا۔ کسی لڑکی نے اسے لفٹ نہیں دی تھی۔ اس نے ایک دو کے قریب ہونے کی کوشش بھی کی تھی تو اسے ناکامی ہوئی تھی۔ ان سب باتوں نے اسے حریص سا بنا دیا تھا۔

جب بھی وہ کسی خوبصورت لڑکی کو دیکھتا، اس کی نگاہیں اس کے گرد طواف کرنے لگتیں۔ اس کے دل میں بس اسے کسی طرح حاصل کرنے کی خواہش ہونے لگتی۔ جس طرح نمرہ کو دیکھ کر ہوئی تھی۔ اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ نمرہ یوں ہی نہیں ہو گی۔ نہ جانے کتنے اس کے خواب دیکھتے ہوں گے۔ نہ جانے کتنوں سے اس کی جان پہچان ہو گی۔ کیسے کیسے امیر نوجوان۔ ہینڈسم! اور وہ خود کیا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں۔ صرف اتنا ہی نا کہ وہ ادب کا استاد تھا۔ اور ادب پڑھاتا تھا۔ اس کے علاوہ اس میں اور کیا تھا۔

اس کے باوجود نادان دل کو سمجھانا اتنا آسان کہاں تھا۔

وہ جب کلاس میں جاتا تو اس کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو کر رہ جاتیں۔ وہ جب لیکچر دیتا تو اس وقت بھی اس کے سامنے نمرہ ہی ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کی اس بے خودی کو کلاس کے دوسرے طالب علموں نے بھی محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر معنی خیز انداز میں کھنکھارنے لگتے۔ وہ جھینپ کر رہ جاتا۔

اس کا خیال تھا کہ خود نمرہ نے بھی اس کی دلچسپی محسوس کر لی ہے۔ اس کی طنزیہ مسکراہٹ یہی بتاتی تھی۔

ایک دن اس نے کلاس میں سوال کیا۔ ”آپ کو یاد ہے۔ آپ نے ایک بار کتابِ اخلاقیات کی بات کی تھی۔ علامہ فراست کی۔“

”ہاں یاد ہے مجھے۔“ سہیل نے کہا۔

”لیکن اس کے بعد آپ نے اس کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔“

”ہاں۔“ سہیل دل ہی دل میں خوش ہو گیا۔ کتابِ اخلاقیات کے ذریعے اسے اور بھی اپنی قابلیت جتانے کا موقع مل سکتا تھا۔ اس نے اس کتاب کو آدھا پڑھ لیا تھا۔ اس کی فلاسفی اپنے ذہن میں اتار چکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ جب وہ ان میں سے کسی سبجیکٹ پر بولنا شروع کرے گا تو سب دنگ رہ جائیں گے۔ اور ہو سکتا ہے کہ اس بہانے نمرہ اس کے قریب ہو جائے۔ کیا ضروری ہے کہ حسن ظاہری ہی ہو۔ انسان کی ذہانت بھی اس کا حسن ہوا کرتی ہے۔

دوسرے ہی دن اس نے کلاس روم میں کہا۔ ”آپ لوگوں کو یاد ہو گا کہ میں نے ایک بار کتابِ اخلاقیات کا ذکر کیا تھا۔ اس کے بعد یہ سوچ کر رہ گیا کہ آپ سب الٹرا ماڈرن قسم کے ہیں، نہ جانے اس قسم کی باتوں میں دلچسپی لیں یا نہ لیں۔“

”نو سر۔“ ایک لڑکا کھڑا ہو کر بولا۔ ”کیوں نہیں لیں گے؟ تعلیم کا مطلب صرف یہی تو نہیں ہے کہ کورس کی کتابیں پڑھ لی جائیں۔ بلکہ ہر قسم کا علم حاصل کرنا ہی تعلیم ہے۔“

”بہت خوب!“ سہیل مسکرا دیا۔ ”بہت خوشی ہوئی سن کر۔ چلیں میں آپ کو بتاتا ہوں کہ نفس کتنے قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک ہے نفسِ مطمئنہ۔ ایک ہے نفسِ لوامہ اور ایک ہے نفسِ امارہ۔ ان تینوں کی الگ الگ تعریف ہے۔“

”اس کا مطلب ضمیر بھی تو ہو سکتا ہے سر۔“ ایک لڑکی نے پوچھا۔

”بالکل۔ اس کا مطلب ضمیر بھی ہو سکتا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”دیکھیں اس کی الگ الگ تعریف یہ ہے کہ نفسِ مطمئنہ مکمل اطمینان قلب کا نام ہے۔ ایک پُرسکون حالت۔ جب دل اور دماغ پر کوئی بوجھ نہ ہو۔ ایسا باکمال نفس پیغمبروں

اور ولیوں کے پاس ہوا کرتا ہے۔ لیکن اس کا حصول بہت مشکل ہے۔ اس کے لیے اپنے آپ سے جہاد کرنا پڑتا ہے۔ لڑنا پڑتا ہے۔ اپنی بے جا خواہشات کو کچلنا پڑتا ہے۔ اور یہ کام آسان نہیں ہے۔ عام انسان اس نفس کو بڑی مشکلوں سے حاصل کرتا ہے۔ یا کر ہی نہیں پاتا۔''

''اور نفس لوامہ کیا ہے سر؟''

''نفس لوامہ اختیاری ہے۔'' سہیل نے کہا۔ ''اس میں برائی کے ساتھ ساتھ ضمیر کی خلش بھی ہوتی ہے۔ اس میں گناہ بھی ہوتے ہیں اور پشیمانی کا مرحلہ بھی ہوتا ہے۔ یعنی سراسر انسانی فطرت کے مطابق ہوتا ہے۔ انسان اچھا بھی ہے اور برا بھی۔ اس نفس میں اس کے دونوں پہلو سامنے آجاتے ہیں۔''

''اور نفس امارہ؟'' سوال کیا گیا۔

''وہ سر بسر برائی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''یعنی اپنے آپ کو مکمل طور پر نفسانی خواہشات کے آگے سرینڈر کر جانا۔ اس میں انسان شیطان کا آلۂ کار بن جاتا ہے۔''

اس کے بعد اس نے ان تینوں انفاس کی تشریح اس انداز سے کی کہ سب اس کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ سب ہی متاثر تھے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ خاص طور پر نمرہ اسے ستائشی نگاہوں سے دیکھے جا رہی ہے۔ سہیل نے آج ایک معرکہ سر کر لیا تھا۔

اس کے بعد سے پورے کالج میں اس کی دھوم ہوگئی تھی۔ اس کی کلاس والوں نے اپنے دوستوں کو اس کے لیکچر کے بارے میں بتا دیا تھا۔

خود پرنسپل نے اسے بلا کر اس کی تعریف کی تھی۔ ''مسٹر سہیل، آپ کے بارے میں رپورٹ مل رہی ہے۔ آپ بہت خوبی سے اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔ استاد کا صحیح معنوں میں حق ادا کر رہے ہیں۔''

''سر، آپ کی تعریف نے میرا حوصلہ بڑھا دیا ہے۔'' اس نے کہا۔

یہ سب کچھ تو ہو رہا تھا لیکن سہیل جس کے لیے یہ سارے جتن کر رہا تھا۔ اس کی طرف سے ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی کہ وہ کسی قسم کی خوش فہمی میں مبتلا ہو جائے۔

وہ سوچتا رہا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ کیا وہ اسی طرح خاموش رہے جس طرح خاموشی سے اس نے زندگی گزار دی ہے یا کوئی پہل کر جائے۔ بہت سوچنے کے بعد اس نے فیصلہ کر لیا کہ چاہے کچھ ہو جائے وہ پہل ضرور کرے گا۔

اس کے پاس بہت دنوں سے ایک نظم موجود تھی۔ اس نے وہ نظم اسی قسم کے کسی موقع کے لیے رکھی ہوئی تھی کہ اگر اعتراض ہو جائے کہ شرم نہیں آتی کہ ایک استاد ہوتے ہوئے اور عمر میں بہت بڑے ہوتے ہوئے اس قسم کی حرکت کر رہے ہیں تو وہ اسی نظم کا سہارا لے سکے۔

اس نظم کے کچھ اشعار اس قسم کے تھے۔

حالانکہ بہت فرق ہے ہم دونوں میں جاناں
یہ پیار ہے میرا کہ ہے میری حماقت
یہ راز بتا دوں تجھے اے جانِ تمنا
جاتی ہے تو جائے میری عزت میری شہرت
آتا ہے تجھے یاد کوئی ہم سفر اپنا
تیرا وہی چہرہ وہی آنکھیں وہی قامت
انداز وہی ہے تیرا چہرہ بھی وہی ہے
باتوں میں وہی پھول کھلانے کی روایت
سن لے کہ بتا دیتا ہوں یہ راز میں تجھ کو
یہ بھید ہے میرا تو یہی ہے میری وحشت
محبوب کا ملنا تو قیامت ہی ہے لیکن
ہم صورت محبوب کا ملنا بھی قیامت

تو ایسے کسی نازک موقع پر وہ آسانی سے کہہ سکتا تھا کہ اس نے کسی زمانے میں ایک لڑکی سے محبت کی تھی۔ لیکن اس کا انتقال ہو گیا۔ اب نمرہ کو دیکھا تو اسی لیے پاگل ہو گیا کہ وہ بالکل اسی کی صورت کی ہے۔

اسی لیے اس نے نمرہ سے اپنے جذبات کا اظہار کر دیا۔ اس طرح اس کا جرم تو کم نہیں ہوتا لیکن اتنا ضرور ہوتا کہ اس کی مجبوری سمجھ لی جاتی۔ اس کے بعد وہ کالج سے استعفا دے کر چلا جاتا اور اگر نمرہ کی طرف سے حوصلہ افزائی ہوتی تو پھر بات ہی کیا تھی۔ پھر تو اس کے سُونے آنگن میں ستارے اتر آتے۔

اب وہ موقع کی تلاش میں تھا۔ اس نے ایک دن نمرہ کو سیڑھیوں پر اکیلے بیٹھے دیکھ لیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا اور بہت بے تکلفی سے مخاطب کیا۔ ''ہیلو نمرہ۔''

''اوہ... آپ ہیں سر۔'' نمرہ اس کو دیکھ کر جلدی سے کھڑی ہوگئی۔

''میں تم کو یہاں بیٹھے دیکھ کر چلا آیا ہوں۔'' سہیل نے کہا۔ ''اگر تمہاری اجازت ہو تو میں بھی بیٹھ جاؤں۔''

''کیوں شرمندہ کر رہے ہیں سر، ضرور بیٹھیں۔'' نمرہ نے کہا۔

سہیل اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس انداز سے گفتگو شروع کرے کہ نمرہ اس کی باتوں میں محو ہو کر رہ جائے۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے کہا۔ ''نمرہ کیا تم کو یہ معلوم ہے کہ کچھ لوگوں میں اتنے زبردست مقناطیسی اثرات ہوتے ہیں کہ وہ

دوسروں کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ یہ ایک کیمیکل اور سائنسی پروسس ہے اور اس کا تعلق اورا سے ہوتا ہے۔''

''سر میں نے ان کے بارے میں سنا تو ہے لیکن جانتی نہیں ہوں۔ یہ اورا کیا ہوتا ہے؟''

''یہ ایک ہالہ ہے جو ہر انسان کے گرد ہوتا ہے۔ دیکھنے والی آنکھیں اس اورا... کو آسانی سے دیکھ لیتی ہیں۔ ہر انسان کی مختلف کیفیت کا اورا مختلف ہوا کرتا ہے۔ بعض انسان کا اورا بہت پُرنور اور روشن ہوتا ہے۔ جیسے تمہارا ہے۔ جن لوگوں کا ایسا اورا ہوتا ہے۔ ان میں دوسروں کو اپنی طرف کھینچنے کی زبردست صلاحیت ہوتی ہے۔ جیسے تم، تمہارا اورا بہت خوبصورت ہے۔''

''سچ کہہ رہے ہیں سر؟'' ثمرہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''بالکل سچ۔''

''آپ کتنی اچھی باتیں کرتے ہیں سر۔'' ثمرہ نے کہا۔ ''جی چاہتا ہے آپ کی باتیں سنتی رہوں۔ کلاس میں بھی میں آپ ہی کی طرف دیکھتی رہتی ہوں۔''

سہیل کا دل دھڑکنے لگا۔ ثمرہ نے اس کی حوصلہ افزائی کردی تھی۔ اب اس کی منزل سامنے بہت ہی سامنے تھی۔ اب صرف تھوڑی سی ہمت اور درکار تھی۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے ثمرہ کی طرف دیکھا۔ ''ثمرہ۔ مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

''ضرور کریں سر۔''

''ثمرہ بات یہ ہے کہ... وہ کچھ بولتے بولتے خاموش ہوگیا۔ شاید ثمرہ نے سمجھ لیا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''سر، ایک بات کہوں۔ آپ کتاب اخلاقیات پڑھاتے ہیں نا۔ تو ذرا اس کا صفحہ نمبر 333 دیکھ لیجیے گا۔''

اسی دوران ثمرہ کو اس کے کچھ دوست نظر آگئے جو سامنے سے گزر رہے تھے۔ وہ سہیل سے ایکسکیوز کہہ کر ان کے پاس چلی گئی۔

سہیل کے ماتھے پر پسینے آگئے۔ ذرا سی دیر میں اس کی ساکھ ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی کوئی وقعت نہیں رہی تھی۔ ابھی تو بات صرف اس کے اور ثمرہ کے درمیان تھی۔ اگر اس نے اپنے دوستوں کو بھی بتادیا تو پھر کیا عزت رہ جاتی۔ وہ تو دو کوڑی کا ہو جاتا۔ اس نے بڑی مشکلوں سے اپنی ساکھ قائم کی تھی۔ لیکن اس کم بخت دل نے سب تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ بہت دل گرفتہ اور خود کو چور محسوس کر رہا تھا۔ اس نے اس دن کوئی کلاس بھی نہیں لی۔ وہ اپنی طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے

مجھے تو کسی نے منع نہیں کیا

بوڑھے میاں بیوی چہل قدمی کے لیے اپنے گھر کے پارک میں گئے اور چہل قدمی کرنے کی وجہ سے کچھ تھک سے گئے تو پارک کی ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ جھاڑی کے دوسری طرف سے کچھ آواز آنا شروع ہوگئی جو کسی آدمی کی آواز تھی اور لگ رہا تھا کہ اپنے ساتھ آئی ہوئی لڑکی کو شادی کی پیشکش کرنے والا ہے۔ اس پر بڑے میاں کی بیوی نے آہستہ سے کہا کہ تم سیٹی بجا کر ان کو احساس دلاؤ کہ ہم لوگ ان کی باتیں سن رہے ہیں۔

اس پر بڑے میاں نے برجستہ کہا۔ ''سیٹی بجاؤں کس لیے مجھے تو کسی نے سیٹی بجا کر منع نہیں کیا تھا شادی نہ کرنا۔''

کاشف عبید، نگرام

گھر واپس آگیا۔

اس کی وہ رات بے چینی میں گزری تھی۔

وہ ساری رات سوچتا رہا۔ اس کی زندگی میں کیا کوئی خوشی نہیں تھی۔ کیا کوئی اس کا محبوب نہیں بن سکتا تھا۔ کیا کوئی اس کے قریب نہیں آسکتا تھا۔ کیا کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو اس کو پیار کی نگاہوں سے دیکھ سکے۔

ایسا نہیں تھا کہ لڑکیاں اس کے پاس نہ آئی ہوں۔ لیکن ان کے انداز مختلف ہوا کرتے تھے۔ وہ صرف اس کا احترام کرنے کے لیے آیا کرتی تھیں۔ پیار کرنے کے لیے کوئی بھی اس کے پاس نہیں آئی تھی۔ اس نے جس کی طرف دیکھا، جسے پسند کیا وہ اس کا احترام کر کے چلی گئی۔ کیسی محرومی تھی۔

اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ دوسرے دن وہ کالج جائے۔ پورے کالج میں اس کی یہ کہانی پھیل گئی ہوگی۔ لڑکے اور لڑکیاں مزے لے لے کر ایک دوسرے کو سنا رہے ہوں گے۔ ظاہر ہے ثمرہ نے سب کو بتا دیا ہوگا۔ سب کی نگاہوں میں اس کے لیے تمسخر ہوگا۔ ہونٹوں پر طنز بھری مسکراہٹیں ہوں گی۔ بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ سب کچھ نارمل تھا۔

نہ تو کسی نے اسے دیکھ کر اس کا دبے اشاروں میں مذاق اُڑایا۔ نہ ہی کسی نے ایک دوسرے کو دیکھ کر اس کی طرف اشارے کیے اور نہ ہی پرنسپل نے اسے اپنے کمرے میں

بلایا۔ یعنی سب کچھ ٹھیک تھا۔ اور یہ نمرہ کی شرافت تھی۔ اس نے سہیل کی عزت رکھ لی تھی۔

اس نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ سہیل کی طرف سے اس کے دل میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔ وہ جذبوں کی شدت سے واقف تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ سہیل نے جو کچھ بھی کیا ہے وہ اس کا ایک اضطراری فعل تھا۔ ہر انسان کی زندگی میں ایسے فیز آیا کرتے ہیں۔

سہیل جب کلاس میں پہنچا تو وہاں بھی ایسی کوئی بات نہیں تھی سب کچھ نارمل تھا نمرہ سے اس کی نگاہوں کا تبادلہ بھی ہوا تھا۔ لیکن کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ نمرہ نے اس کی عزت رکھ لی تھی۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ نمرہ سے ایکسکیوز کرلے گا۔ اور کہہ دے گا کہ وہ نہ جانے کیوں بہک سا گیا تھا۔ اور اب اسے احساس ہو گیا ہے۔

اسی دن کلاس سے فارغ ہونے کے بعد اس نے نمرہ کو روک لیا۔ ”نمرہ تم رک جانا۔“

یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ عام سا روٹین تھا۔ بہت سے لیکچرار کسی اسٹوڈنٹ کو کوئی بات سمجھانے کے لیے روک لیا کرتے تھے۔ نمرہ اس کے کہنے پر رک گئی تھی۔ جب کلاس خالی ہو گئی تو اس نے نمرہ کی طرف دیکھا، وہ بہت کٹیلی نگاہوں سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اس نے نمرہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تم سے آج ایک ضروری بات کرنی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تم میرے بارے میں غلط خیال کرو۔ میں اس خیال کو دور کرنا چاہتا ہوں۔ میں جو کچھ بھی ہوں۔ ایک شریف اور مہذب انسان ہوں۔ لیکن ہر انسان کی زندگی میں ایک فیز ایسا بھی آتا ہے جب وہ اپنے آپ میں نہیں رہتا۔ یہ انسانی فطرت ہے۔ لیکن عقلمندی اسی میں ہوتی ہے کہ اپنی غلطی کو تسلیم کرلیا جائے۔“

نمرہ نے کچھ نہیں کہا۔ وہ بس اس کی طرف دیکھتی رہی۔

سہیل نے اپنے آپ کو سنبھال کر پھر کہا۔ ”نمرہ میں ایک محروم قسم کا شخص ہوں۔ میری زندگی میں خوشی کے لمحات بہت ہی کم آتے ہیں۔ اور جب آتے ہیں تو درمیان میں اتنی باریکیاں آجاتی ہیں کہ میں خود پر جبر کر کے رہ جاتا ہوں۔“

”میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔“ نمرہ نے کہا۔ ”آپ ہمیں کتاب اخلاقیات سے درس دے رہے ہیں۔ میں ایک بار پھر کہوں گی کہ آپ اس کتاب کا صفحہ نمبر 333 دیکھ لیں۔ اس کے بعد بات کیجیے گا۔“

وہ اٹھ کر چلی گئی۔

سہیل کٹ کر رہ گیا۔ اب تو شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ نمرہ کے لیے اب اس کی باتیں برداشت سے باہر ہو گئی تھیں۔ اسی لیے وہ طنز کر رہی تھی۔ کتاب اخلاقیات پڑھانے والا خود اخلاقی حدوں کو پار کر رہا تھا۔ ایک استاد ہونے کے ناتے یہ بات بہت غلط تھی۔

اسی دن اس نے پرنسپل کے پاس جا کر اپنا استعفا پیش کردیا۔ پرنسپل حیران رہ گیا تھا۔

”ارے کیا بات ہو گئی سہیل صاحب؟“ اس نے پوچھا۔ ”یہ کیا حرکت ہے؟“

”بس سر، ایک ایسی ایمرجنسی ہو گئی ہے کہ میں اس شہر ہی سے کچھ دنوں کے لیے باہر جا رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”ارے بھائی اگر جانا ہی ہے تو چھٹی لے لیں۔“

”نو سر۔“ اس نے کہا۔ ”یہ ممکن نہیں ہوگا۔“

”چلیں جیسی آپ کی مرضی۔ ویسے آپ کو چھوڑتے ہوئے ہمیں افسوس ہوگا۔“

پرنسپل نے اس کا استعفا منظور کرلیا تھا۔ اس کالج سے جاتے ہوئے سہیل کا دل رو رہا تھا۔ اس نے اپنی حماقت سے اپنے پیروں پر کلہاڑی مار لی تھی۔ کیا ضرورت تھی اس قسم کی حرکت کرنے کی۔ اچھی خاصی نوکری تھی۔ اچھا خاصا ماحول تھا۔ اچھی خاصی عزت تھی۔ سب ختم ہو گئی تھی۔

وہ گھر آیا تو بہت غمگین تھا۔ عجیب طرح کی اداسی تھی۔ اپنے آپ پر افسوس ہو رہا تھا۔ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔

نمرہ یقیناً اس کی طرف سے بہت مایوس اور حیران تھی۔ اسے اندازہ نہیں ہوگا کہ اس کا استاد اس کی طرف اس انداز سے مائل ہو سکتا ہے۔ اسی لیے وہ بار بار کتاب اخلاقیات کا حوالہ دے رہی تھی۔ یہ کتاب سہیل کے پاس تھی۔ لیکن اس نے ابھی اس کا پورا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ وہ صرف صفحہ نمبر 233 تک پہنچا تھا۔ جبکہ نمرہ نے صفحہ نمبر 333 کا حوالہ دیا تھا۔

اس نے وہ کتاب نکال لی۔ جلدی جلدی لیکن انتہائی شرمندگی کے ساتھ اس نے صفحہ نمبر 333 کھولا۔ اس میں صرف تین چار ہی جملے لکھے ہوئے تھے۔

”بہادر وہ ہے جو کوئی قدم اٹھا لینے کے بعد پیچھے نہ ہٹے۔ اس کو آگے بڑھتے جانا چاہیے۔ ورنہ زندگی کی خوشیاں اس سے ہمیشہ دور رہیں گی۔“

وہ اپنا سر تھام کر رہ گیا۔ اس کے بعد اس نے کسی اور کالج میں نوکری کی کوشش نہیں کی بلکہ آج کل وہ کریانے کی دکان چلا رہا ہے اور کتاب اخلاقیات کو اس نے اسی دن بیچ دیا تھا۔

غیر قانونی کام کرنے والے اپنی دنیا میں مست و مگن رہتے ہیں... لیکن غیر معمولی دنیا کے حالات و واقعات میں کچھ بھی رونما ہو سکتا ہے... زیاں کا سودا کرنے والے ایک مجرم کا قصّہ جس نے کسی کی محنت پر شب... خون ماردیا تھا... کچھوؤں کی اسمگلنگ سے شروع ہونے والی سنسنی خیز کہانی کے نت نئے موڑ...

انوکھا کاروبار

تنویر ریاض

تانبے جیسی رنگت اور بے ترتیب بالوں والا وہ شخص ہیتھرو ائرپورٹ کے کسٹم سے کسی دشواری کے بغیر گزرتا چلا گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں سوٹ کیس اور دوسرے میں ٹاٹ کا بڑا سا تھیلا تھا جس پر واضح الفاظ میں کوکونٹ لکھا ہوا تھا۔ اس سامان کی تلاشی مدغاسکر میں ہی ہو گئی تھی جب انسپکٹر نے سوٹ کیس پر سرسری نظر ڈالی اور تھیلے پر ہاتھ لگا کر ناریل کی موجودگی محسوس کرتے ہوئے مسافر کو آگے بڑھنے کا اشارہ کر دیا۔ بہرحال وہ ایک ایسی

جگہ سے آیا تھا جہاں ناریل بکثرت پائے جاتے ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے استقبال کے لیے کوئی نہیں آئے گا۔ اسی لیے وہ تیزی سے باہر جانے والے دروازے کی طرف بڑھا جس کے سامنے ایک قطار میں ٹیکسیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ ایک ڈرائیور اس کا سوٹ کیس لینے کے لیے آگے بڑھا اور جیسے ہی اس شخص نے ٹیکسی میں بیٹھنے کے لیے پچھلا دروازہ کھولا۔ اس کے جسم کو ایک جھٹکا لگا اور وہ آگے کی طرف لڑکھڑاتا ہوا گر پڑا۔ اس کی کمر کے وسط سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ ناریل کا تھیلا ٹیکسی کے برابر ہی زمین پر گر پڑا۔ اور یہی تھیلا جیفری رینڈ کی طلبی کا سبب بن گیا جو ریٹائر ہو چکا تھا۔

رینڈ اس سے پہلے بھی امریکی سفارت خانے جا چکا تھا لیکن یونائیٹڈ اسٹیٹس فش اینڈ وائلڈ لائف کے مسٹر رالف کوبر سے یہ اس کی پہلی ملاقات تھی۔ اس نے رسمی تعارف کے بعد کہا۔ ”تم جانتے ہو کہ میں ریٹائر ہو چکا ہوں۔“

کوبر ایک گنجا اور مائل بہ فربہی شخص تھا۔ اس نے موٹے شیشوں کا چشمہ لگا رکھا تھا اور وہ خود بھی ریٹائرمنٹ کے قریب تھا۔ وہ چہرے پر بناوٹی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔ ”مسٹر رینڈ، تمہارا نام ایک اعلیٰ سرکاری شخصیت نے تجویز کیا ہے، اس کے مطابق تم اس کام کے لیے انتہائی موزوں شخص ہو۔ تمہیں روزانہ کی بنیاد پر معاوضہ مع اخراجات دیا جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم نے سرد جنگ کے دوران بہت عمدہ طریقے سے جاسوسی کی ہے اور اب بھی تم کچھ افریقی معاملات میں اصول سمجھے جاتے ہو۔“

رینڈ نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”میں افریقی معاملات کا ماہر نہیں ہوں۔“

رالف کوبر نے اپنی میز پر پڑی ہوئی رپورٹ کے صفحات پلٹتے ہوئے کہا۔ ”اس رپورٹ کے مطابق تم اپنی بیوی سے انیس سو اکہتر میں ملے جب تم ایک مشن کے سلسلے میں مصر گئے تھے۔ اس کے بعد انیس سو بہتر، انیس سو چوہتر، انیس سو چورانوے اور انیس سو چھیانوے میں وہاں گئے۔ انیس سو ترانوے میں تم بحیرۂ احمر میں سفر کرنے والے ایک جہاز پر تھے اور انیس سو چورانوے میں تم نے افریقا کے مشرقی ساحل پر واقع جزیرے میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔“

رینڈ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”اس میں افریقا کے کچھ دوروں کا ذکر نہیں ہے۔ میری بیوی کا تعلق قاہرہ سے ہے اور ہم اکثر وہاں جاتے رہتے ہیں۔“

کوبر نے کاغذات میز پر رکھ دیے اور بولا۔ ”مجھے خاص طور پر تمہارے مشرقی افریقا کے جزائر کے دوروں سے دلچسپی ہے کیونکہ اس کاروبار کا تعلق مدغاسکر سے ہے۔ میں حال ہی میں جنوبی افریقا سے واپس آتے ہوئے وہاں رکا تھا۔ اس جزیرہ کے جانور اور پودے بہت شاندار ہیں۔ یہ ایک ہزار میل طویل ہے اور انیس سو ساٹھ میں فرانسیسیوں سے آزادی ملنے کے بعد یہ ایک علیحدہ قوم کی حیثیت سے رہ رہے ہیں۔ ان میں زیادہ تر ملایا، انڈونیشیا، عرب اور افریقی باشندے ہیں۔“

”ان سب باتوں کا مجھ سے کیا تعلق ہے؟“ رینڈ نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

کوبر نے اسے تانبے کی رنگت اور بے ترتیب بالوں والے آدمی کی تصویر دکھائی جس کی آنکھیں بند تھیں اور بولا۔ ”یہ ہینگا تولیارا ہے۔ اسے دو دن پہلے ہیتھرو ایئرپورٹ پر قتل کر دیا گیا۔“

”قتل؟ وہ کیسے؟“

”اسے گولی ماری گئی ہے۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ کا خیال ہے کہ اسے سائلنسر لگے ہتھیار سے قتل کیا گیا ہے جو غالباً کسی چھتری میں چھپایا گیا تھا۔ ہم از کم کسی نے بھی اسے دیکھا نہ فائر کی آواز سنی۔ وہ یہ تھیلا لے کر ٹیکسی میں بیٹھ ہی رہا تھا۔“

یہ کہہ کر اس نے میز کے نیچے سے وہ تھیلا نکالا جس پر نمایاں الفاظ میں ’ناریل‘ لکھا ہوا تھا۔

رینڈ نے ہاتھ لگا کر تھیلے کو دیکھا اور پھر اسے کھول کر اپنا ہاتھ اس میں ڈال دیا۔ اچانک اس کے حلق سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی جیسے کسی جاندار نے اس کی انگلی پر زور سے کاٹا ہو۔ وہ چلاتے ہوئے بولا۔

”اس تھیلے میں کیا ہے؟“

”مجھے افسوس ہے۔“ رالف نے کہا۔ ”مجھے بتا دینا چاہیے تھا۔“ اس نے تھیلا الٹا کیا اور ایک درجن درمیانی جسامت کے کچھوے میز کی سطح پر پھیل گئے۔

”ہم نے انہیں صاف کیا اور خوراک بھی دی۔ انہیں دوبارہ تھیلے میں ڈالنے کا مقصد یہ تھا کہ تم اندازہ کر سکو، انہیں کس طرح کسٹم سے نکالا گیا۔“

”کچھوے۔“ رینڈ نے انہیں حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس وقت بھی اس نے اپنی زخمی انگلی زور سے دبا رکھی تھی۔

”ہاں، یہ چمکتی ہوئی کھال والے کچھوے بڑے نایاب ہیں۔ مادہ کچھوے جب پوری طرح جوان ہو جائیں تو بلیک مارکیٹ میں ان کی قیمت دس ہزار ڈالر ہے۔ انہیں

لندن کے راستے مدغاسکر سے طوطے پیدا اسمگل کیا جارہا تھا اور
اس شخص کو قیصرہ پر طیارہ تبدیل کرنا تھا لیکن یہ کچھوے میرے پاس
پہنچ گئے۔'' پھر وہ دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولا۔
''تھیلے پر 'کوبرا' لکھا دیکھ کر سفارت خانے کے لوگوں نے یہی
سوچا ہوگا کہ یہ میرے لیے تحفہ ہے۔''
''تم مجھ سے اسمگلنگ کے کیس کی تحقیقات کروانا
چاہتے ہو؟'' رینڈ نے غیر یقینی انداز میں کہا۔
''ہاں اور اب اس میں یہ قتل بھی شامل ہو گیا ہے۔ تم
افریقا کے مشرقی ساحل سے بخوبی واقف ہو۔ تم نے وہاں
کافی عرصہ جاسوسی کی ہے۔''
''یقیناً وہاں امریکی بھی ہوں گے جو یہ کام کر سکیں۔''
''وہاں کسی امریکی کی موجودگی شبہات پیدا کر سکتی
ہے۔ اسی لیے ہم نے تمہاری حکومت سے مدد کے لیے کہا۔
یہ دس بلین ڈالر کا غیر قانونی کاروبار ہے مسٹر رینڈ۔''
''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''
اس نے کچھوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
''ان کا ذریعہ معلوم کرو اور ان لوگوں کو تلاش کرو جو اس
اسمگلنگ اور تولیارا کے قتل میں ملوث ہیں۔ اس طرح کم از کم
ہم مدغاسکر سے اس اسمگلنگ کو روک سکیں گے۔''
اس طرح رینڈ مدغاسکر کے دارالحکومت انٹانا ناریوو
پہنچ گیا جو عرف عام میں تانا کہلاتا ہے۔ اس شہر میں پندرہ
لاکھ سے زیادہ افراد روزانہ گرمی کی شدت برداشت کرتے
ہیں۔ ان دنوں موسم بہار رخصت ہو رہا تھا۔ اس لیے ابھی
گرمی شروع نہیں ہوئی تھی۔ جب رینڈ نے امریکی سفارت
خانے کے لیے کام کرنے کی حامی بھری تو اسے اپنی بیوی لیلیٰ
کو سمجھانے میں بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑا جو بیس سال
سے اس کی شریکِ زندگی تھی وہ اب بھی ریڈنگ یونیورسٹی
میں پڑھا رہی تھی اور سیمسٹر کے ختم ہونے میں چند ہفتے باقی
تھے۔ اس لیے رینڈ کو اکیلے ہی رختِ سفر باندھنا پڑا۔
تانا کو گرد آلود شہر کہا جاتا ہے لیکن رینڈ کو جلد ہی معلوم
ہو گیا کہ یہ فضائی آلودگی گرد کی نہیں بلکہ دھوئیں کی تھی جو کہ
دور دراز واقع جنگلوں اور گھاس کے میدانوں سے اٹھ رہا
تھا۔ سڑکوں پر چھکڑے رواں دواں تھے جنہیں بیل اور سانڈ
کھینچ رہے تھے۔ جب وہ ایک آدمی کے پاس سے گزرا جو
ایک مرغے کو اپنے کندھے پر رکھ کر جا رہا تھا تو اس نے فیصلہ
کر لیا کہ وہ اس شہر میں کبھی رہنا پسند نہیں کرے گا۔
طویل ہوائی سفر کے دوران رینڈ نے جزیرے کی
منفرد جنگلی زندگی کے بارے میں ایک سرکاری رپورٹ پڑھی
جو کوبرا نے اسے دی تھی۔ مدغاسکر اس روئے زمین پر واحد
جگہ تھی جہاں بندر نما جانور آزادانہ رہتے تھے۔ وہاں تین
فٹ لمبے گرگٹ اور منفرد رینگنے والے جانور بشمول چمک دار
کچھوے پائے جاتے تھے۔ انیس سو ترانوے میں کمیونسٹ
آمریت کے بعد جمہوریت آئی اور اس کے ساتھ ہی آزاد
معیشت کے نام پر کاروباری کھیلے ہونے لگے۔ اس صورت
حال کا اسمگلروں نے بھی فائدہ اٹھایا اور انہوں نے محسوس کیا
کہ جانوروں کی غیر ملکوں کو برآمد ایک منافع بخش کاروبار
ہے۔ اس کام میں کوئی خطرہ بھی نہیں تھا۔ کسٹم افسروں کی
زیادہ تر توجہ منشیات کی اسمگلنگ پر ہوتی تھی۔ وہ آسٹریلیا
سے لائے گئے کلغی دار طوطے کے انڈوں اور مدغاسکر سے
آنے والے چمک دار کچھوؤں کو نظر انداز کر دیتے تھے۔
یہاں تک کہ اگر کوئی اسمگلر پکڑا جاتا تو اسے جیل نہیں بھیجا
جاتا تھا بلکہ معمولی جرمانہ دے کر اس کی جان چھوٹ جاتی
تھی۔
رینڈ کو تولیارا کے گھر کا پتا دے دیا گیا تھا۔ اس نے
وہاں جانے کے لیے ٹیکسی کرائے پر لی۔ وہ ایک دو منزلہ
عمارت تھی جس کے گیٹ سے ایک راستہ اندرونی صحن تک
جاتا تھا۔ یہ علاقہ شہر کے دوسرے حصوں سے بہتر نظر آرہا
تھا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ عمارت کا گیٹ مقفل نہیں
تھا۔ اس نے ڈرائیور سے انتظار کرنے کے لیے کہا اور خود
اندر چلا گیا۔ اس کی نظر صحن میں لگے ہوئے گھنے سایہ دار
درخت پر گئی جس پر سبز رنگ کی چھپکلی ایک شاخ پر رینگتی
ہوئی تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ خطرہ محسوس
کرتے ہوئے پیچھے ہٹا۔ تبھی اس نے اپنے عقب میں ایک
ہلکا قہقہہ سنا۔ کوئی کہہ رہا تھا۔
''پریشان مت ہو۔ میکس تمہیں نقصان نہیں پہنچائے
گی۔'' یہ کسی عورت کی آواز تھی۔
وہ پھر بھی اسے نہ دیکھ سکا پھر اوپر کی بالکنی میں روشنی
ہوئی تو اس نے دیکھا کہ سنہرے بالوں والی ایک جوان
عورت دوسری منزل سے لوہے کی سیڑھیوں کے ذریعے نیچے
اتر رہی ہے۔ اس نے ایک لمبا ہاؤس کوٹ پہن رکھا تھا اور
جب قریب آئی تو اس نے دیکھا کہ وہ ننگے پیر تھی۔
''میرا نام ایڈیلیڈ تولیارا ہے اور تم......؟''
''رینڈ۔ میں برطانوی ہوں۔''
''میں سمجھ گئی تھی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس
کا لہجہ برطانوی نوآبادی میں رہنے والوں جیسا تھا اور رینڈ کو
اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ وہ بولی۔ ''تم آسٹریلوی ہو؟''

"بہت اچھے مسٹر رینڈ۔" وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ "یہ تم نے کیسے جانا؟"

"تمہارے نام سے۔ آسٹریلیا میں ایک شہر کا نام بھی ایڈیلیڈ ہے۔"

"بالکل۔" وہ اس کے قریب آتے ہوئے بولی۔ "اب تم کیا چاہتے ہو؟ کیا میرے شوہر کی راکھ لے کر آئے ہو؟"

"نہیں۔ میں سمجھ سکتا ہوں کہ تمہیں اس کی موت سے گہرا صدمہ پہنچا ہے۔"

"مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ وہ ٹانا کے کسی قحبہ خانے کے بجائے لندن ائرپورٹ پر مارا گیا۔"

رینڈ نے بے چینی سے چھپکلی کی طرف دیکھا جو عین اس کے سر پر ایک شاخ سے لٹکی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اندر چل کر بات کریں؟"

"وہاں بہت گرمی ہے۔ شیڈ کے نیچے آجاؤ۔ وہاں میز کرسیاں لگی ہیں۔"

وہ اس کے پیچھے صحن عبور کرتا ہوا اس جگہ تک گیا جہاں ایک سبز رنگ کی لوہے کی میز اور چار اسی جیسی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایڈیلیڈ نے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجائی۔ ایک گھریلو ملازم آیا تو اس نے رینڈ سے پوچھا کہ وہ کیا پینا پسند کرے گا۔

"کوئی بھی ٹھنڈی چیز منگوا لو۔"

"یہاں کا پانی ٹھیک نہیں ہے لیکن میرے پاس افریقی بیئر ہے جسے ٹسکر کہتے ہیں۔"

وہ پہلے بھی افریقی بیئر پی چکا تھا۔ اس نے کہا۔ "وہی ٹھیک رہے گی۔"

"دو ٹسکر!" ایڈیلیڈ نے ملازم سے کہا اور وہ سر جھکائے واپس چلا گیا۔

"کیا تم یہاں اکیلی رہتی ہو؟" رینڈ نے پوچھا۔

"ہاں، جب میرا شوہر یہاں نہیں ہوتا اور اب تو وہ ہمیشہ کے لیے چلا گیا ہے۔" پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "لیکن یہاں میرے بہت سے دوست ہیں اور کبھی کبھی وہ رات کو رک بھی جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ میرا نوکر بھی یہیں رہتا ہے۔"

"میں تم سے تیلنگا کے کاروبار کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے ملازم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو دو بوتلیں اور گلاس لے کر آگیا تھا۔

اس عورت نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اپنے لیے گلاس میں بیئر انڈیلی اور بولی۔ "میں تین سال پہلے آسٹریلیا سے ٹیچر کے طور پر کام کرنے کے لیے یہاں آئی تھی۔ تیلنگا وہ پہلا شخص تھا جس سے اس جزیرے پر میری ملاقات ہوئی۔ میں جانتی تھی کہ وہ دوسرے ملکوں کو سامان برآمد کرتا ہے لیکن شادی ہونے تک مجھے اس کاروبار کا علم نہیں تھا۔ میرے نزدیک یہ بھی ایک بے ضرر کام تھا۔"

"باہر کے ملکوں کو جانور اسمگل کرنا اور بیچنا ان دنوں ایک منافع بخش کاروبار ہے۔ تمہارا شوہر جو کچھوے لے کر گیا تھا۔ جب وہ بڑے ہو جاتے تو ہر ایک کی قیمت دس ہزار ڈالر ہوتی۔"

"اتنی زیادہ؟" وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ کچھوے وہ کہاں سے حاصل کرتا تھا؟"

اس نے اپنا سر ایک جانب جھکایا جیسے سوچ رہی ہو کہ اس سوال کا کیا جواب دیا جائے پھر بولی۔

"مجھے بتایا گیا تھا کہ مدغاسکر کے جنگل ان جانوروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ جیسے جیسے آبادی بڑھ رہی ہے۔ اسی حساب سے جنگل جلائے جا رہے ہیں۔ تیلنگا نے بتایا تھا کہ اگر ان جانوروں کو پکڑ کر برآمد نہ کیا جائے تو یہ مر جائیں گے۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ اس بات میں کچھ سچائی ہے۔" رینڈ اس سے اتفاق کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جانوروں کی یہ تجارت غیر قانونی ہے اور کئی لوگ اس سے بھاری منافع کما رہے ہیں۔ کیا تمہارا شوہر یہ جانور خود پکڑتا تھا؟"

"نہیں، وہ یہ جانور فرانز نامی شخص سے خریدتا تھا جو آئسکریم بار پر ہوتا ہے۔ پہلے وہ آئسکریم بیچا کرتا تھا۔ اب وہسکی اور عورتیں بیچتا ہے۔"

"کیا تم مجھے اس سے ملوا سکتی ہو؟"

وہ لمحہ بھر کو ہچکچائی پھر بولی۔ "ہاں لیکن مجھے اس سے کیا فائدہ ہوگا؟"

"شاید اس طرح تم اپنے شوہر کے قاتل کو تلاش کرنے میں مدد کر سکو۔"

اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے کہا۔ "میں ایسا کر سکتی ہوں۔ تم اپنی بیئر ختم کر لو۔ پھر ہم چہل قدمی کریں گے۔ آئسکریم بار یہاں سے صرف نصف میل کے فاصلے پر ہے۔"

رینڈ نے ٹیکسی واپس کر دی اور ایڈیلیڈ کے ساتھ چہل قدمی کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس عورت نے اب بھی جوتے پہننے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ رینڈ دیکھ رہا تھا کہ اس کے پیر کے ناخنوں پر ریت کی تہ آرہی ہے اس نے کہا۔

''کیا تمہارے پاؤں گندے نہیں ہو جائیں گے؟''

''مجھے جوتے پسند نہیں ہیں۔ اس موسم میں پیروں پر پسینا آجاتا ہے۔''

گوکہ سہ پہر کا وقت تھا۔ اس کے باوجود نصف درجن کے قریب لوگ آئسکریم بار میں ٹہل رہے تھے جبکہ چند دوسرے میزوں پر بیٹھے ماچس کی تیلیوں سے جوئے کی طرح کا کوئی گیم کھیل رہے تھے۔ دیکھنے میں وہ ملاگیشین لگ رہے تھے گوکہ رینڈ کو اس بارے میں یقین نہیں تھا۔ بار کے آخری سرے پر دو سانولی عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں لیکن کوئی مرد ان کی جانب نہیں دیکھ رہا تھا۔

ایڈیلیڈ نے بار میں موجود لوگوں میں ایک سے آہستہ سے کوئی بات کی تو وہ رینڈ کو دیکھنے لگا۔ اس کا لباس دوسرے لوگوں سے بہتر تھا۔ اس کی قمیص پر شولڈر لگے ہوئے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ شپ آفیسر ہے۔ اس کا دبلا جسم اور سوجی ہوئی رنگت سے لگ رہا تھا کہ وہ حال ہی میں بیماری سے اٹھا ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ان کے ساتھ ایک میز پر بیٹھ گیا۔

ایڈیلیڈ نے کہا۔ ''یہ کیپٹن فرائر ہے اور یہ مسٹر رینڈ۔''

فرائر نے مسکراتے ہوئے مصافحہ کیا اور بولا۔ ''تمہیں جانوروں سے دلچسپی ہے؟''

''اس وقت تو میں چمک دار کھال والے کچھوؤں کے لیے آیا ہوں۔''

''یہ بہت نایاب ہیں اور سب ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔''

''مسز تولیارا کا شوہر ان کی اسمگلنگ کرتے ہوئے ہیتھرو ائرپورٹ پر مارا گیا۔''

''مجھے یہ سن کر افسوس ہوا تھا۔ ایسے واقعات بہت کم ہوتے ہیں۔ یہ کوئی پرتشدد کھیل نہیں ہے۔''

''تم کیا بیچتے ہو؟'' رینڈ نے پوچھا۔

''سانپ اور کچھوے کیونکہ یہ طویل سفر میں بھی خوراک اور پانی کے بغیر زندہ رہتے ہیں جبکہ پرندوں اور بندروں کو لے جانا بہت مشکل ہے۔ صرف دس فیصد پرندے ہی زندہ بچ پاتے ہیں۔''

''کیا کسٹم والے چیکنگ نہیں کرتے؟''

فرائر نے بارٹینڈر کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک اور رم!'' پھر ان دونوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں کچھ چاہیے؟''

رینڈ اور ایڈیلیڈ نے اپنے لیے بیئر منگوائی۔ فرائر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''جب زیادہ سختی ہو رہی ہو تو ہم ان جانوروں کو کشتیوں کے ذریعے جزیرے سے باہر بھیج دیتے ہیں۔ مڈغاسکر میں کوئی کوسٹ گارڈ نہیں ہے۔''

''لیکن ہیلگا تو یہاں سے اورلینڈو، فلوریڈا کے لیے روانہ ہوا تھا اور اسے لندن سے صرف جہاز تبدیل کرنا تھا پھر وہ ائرپورٹ سے باہر کیوں نکلا؟''

کیپٹن فرائر کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ اس نے ائرپورٹ پر ہی سودا کرلیا ہوگا۔ ایسا اکثر ہوتا ہے۔ آج کل ایک محفوظ طریقہ یہ بھی ہے کہ جانوروں کو کشتی کے ذریعے یہاں سے مشرق میں واقع فرنچ آئی لینڈ یا جنوبی افریقا لے جایا جائے۔ وہاں ان جانوروں کی سپلائی کو جعلی دستاویزات کے ذریعے قانونی بنا دیا جاتا ہے۔''

''کیا تمہارے پاس اس مقصد کے لیے کوئی کشتی ہے؟''

فرائر اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہارے لیے اس کا بندوبست کرسکتا ہوں۔''

ایڈیلیڈ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''فرائر! یہ گاہک نہیں بلکہ سراغ رساں ہے۔''

''میں اس کاروبار کے بارے میں جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' رینڈ نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے خیال میں کچھوے اور سانپ میں سے کسے اسمگل کرنا زیادہ آسان ہے؟''

''سانپوں کو؟'' فرائر نے فوراً ہی جواب دیا۔ ''یہ کسی بھی خلا میں آسانی سے سما سکتے ہیں۔ اگر تمہیں کشتی کی ضرورت ہے تو میں تمہیں دو لڑکوں سے ملوا سکتا ہوں۔''

''میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ کچھوے کہاں سے آتے ہیں؟''

''جنوب مغربی ساحل پر واقع شہر میں تولیئر نام کا ایک قصبہ ہے۔ وہاں ایک عورت جینی رہتی ہے، اس کے بارے میں کسی سے بھی پوچھ سکتے ہو۔ وہ کچھوؤں کے تاجر کے طور پر پہچانی جاتی ہے۔''

رینڈ ایک چھوٹے جہاز کے ذریعے تولیئر پہنچا۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جہاں کے لوگوں کی اکثریت غریب تھی۔ ساحل پر ماہی گیر مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ اسے ساحل پر ہی ایک ہوٹل مل گیا جو سیاحوں کے لیے مخصوص تھا۔ رینڈ نے ایک کمرا کرائے پر لیا اور اپنا مختصر سامان رکھ کر جینی کی تلاش

میں نکل پڑا۔ جس پہلے شخص سے اس نے جینی کے بارے میں پوچھا تو وہ اسے گھورتا ہوا چل دیا پھر اس نے ایک نوعمر لڑکے کو پکڑا جو اپنی عمر کے مقابلے میں زیادہ ہوشیار نکلا۔ اس نے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''پہلے میری فیس نکالو۔''

رینڈ نے ایک نوٹ اس کی ہتھیلی پر رکھا جسے اس نے فوراً ہی مٹھی میں دبا لیا اور بولا۔ ''اس سڑک کے آخری سرے پر اس کا ٹین کی چھت والا مکان ہے۔'' یہ کہہ کر وہ وہاں سے چل دیا۔

رینڈ محتاط انداز میں تیز تیز قدم اٹھاتا اس سڑک پر چل دیا۔ راستے میں اس کا سامنا لڑکوں کی کئی ٹولیوں سے ہوا جو اسے دیکھ رہے تھے۔ یہ ایسی جگہ نہیں تھی جہاں وہ رات میں نکل سکتا۔ سڑک کے آخری سرے پر اسے ٹین کی چھت والا ایک ہی مکان نظر آیا۔ اس نے بوسیدہ دروازے پر دستک دی۔ چند لمحوں بعد ایک مقامی عورت نے دروازہ کھولا تو وہ بولا۔ ''میں کچھوے خریدنے میں دلچسپی رکھتا ہوں۔''

''اندر آجاؤ۔'' اس نے فرانسیسی میں جواب دیا۔

رینڈ یہ زبان بخوبی سمجھتا تھا البتہ اسے عورت کو فرانسیسی بولتے دیکھ کر حیرت ہوئی پھر اسے یاد آگیا کہ ماضی میں یہ جزیرہ فرانس کی نوآبادی رہ چکا ہے۔ اس لیے مقامی لوگ بھی فرانسیسی بول لیتے ہیں۔

''تم ہی جینی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، میں تمہیں کچھوے دکھاتی ہوں۔''

وہ دبلی پتلی پرکشش عورت تھی، اس کے بال اور آنکھیں سیاہ تھیں۔ البتہ عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ وہ تیس اور پچاس کے درمیان بھی ہو سکتی تھی۔ وہ اس کے پیچھے چلتا ہوا ٹین کی چھت والی جھونپڑی میں پہنچا جہاں لکڑی کے مستطیل نما صندوقوں میں تقریباً دو درجن کے قریب چمک دار کھال والے کچھوے رکھے ہوئے تھے۔ رینڈ نے انہیں انگلی سے چھو کر دیکھا۔ وہ سب ایک دوسرے سے مختلف تھے۔

''تم یہ کچھوے کتنے میں فروخت کرتی ہو؟''

اس عورت نے مقامی کرنسی میں جو قیمت بتائی وہ ایک برطانوی پونڈ کے برابر تھی جبکہ رالف کوبز کا کہنا تھا کہ امریکا میں ان کی قیمت دس ہزار ڈالر ہے۔ قیمتوں میں اتنا زیادہ فرق رینڈ کی سمجھ سے باہر تھا۔

''یہ قیمت مقامی لوگوں کے لیے ہے۔'' اس عورت نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''تم جیسے غیر مقامی لوگوں سے ایک کچھوے کے تین پونڈ لیتی ہوں۔''

اس قیمت میں بھی یہ سودا برا نہیں تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''تم تیلاگا تولیا رانام کے شخص کو جانتی ہو۔ کیا وہ بھی تمہارا گاہک ہے؟''

''وہ کشتی میں آتا ہے اور ایک وقت میں کئی کچھوے لے کر چلا جاتا ہے لیکن میں نے اسے چند ہفتوں سے نہیں دیکھا۔''

''وہ مر چکا ہے۔'' رینڈ نے کہا۔ ''اسے لندن میں گولی ماردی گئی۔''

''میں نہیں سمجھتی تھی کہ وہ اتنا خطرناک شہر ہے۔''

رینڈ نے دروازے کے باہر جھانک کر دیکھا جہاں کچھ نوجوان لڑکے گھوم رہے تھے۔ رینڈ بولا۔ ''یہ بھی کوئی محفوظ جگہ نہیں ہے۔''

''تم ان لڑکوں کی بات کررہے ہو؟'' وہ سادگی سے بولی۔ ''یہ میری حفاظت کرتے ہیں۔''

''تمہارے پاس یہ کچھوے کہاں سے آتے ہیں؟ میں ان کا منبع جاننا چاہتا ہوں۔''

''ساحل پر سے۔ مقامی لوگ انہیں پکڑ کر چھوٹی کشتیوں کے ذریعے میرے پاس لے آتے ہیں۔''

''اگلی کھیپ کب آئے گی؟''

جینی کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ''ممکن ہے کہ آج رات ہی آجائے۔ لیکن وہ تم پر بھروسا نہیں کریں گے کیونکہ تمہارے کپڑے بالکل نئے ہیں۔ وہ تمہیں پولیس کا کوئی سپاہی سمجھ سکتے ہیں۔''

''مجھے جنگل میں جانے کے لیے لباس تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔'' رینڈ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا باقی سامان ہوٹل میں ہے۔''

''تم نے ہوٹل میں رہنے کی ضرورت کیوں محسوس کی جبکہ تم تاروں کی روشنی میں ریت پر بھی لیٹ سکتے ہو۔''

''گدے پر نہ لیٹوں تو میری ہڈیوں میں درد شروع ہو جاتا ہے۔'' رینڈ نے کہا۔ ''میں رات میں دوبارہ کب آؤں؟'' اس نے جینی کو کچھ فرانک دیتے ہوئے پوچھا۔

''تقریباً دس بجے کے قریب۔''

رات ہوتے ہی قصبے کا ماحول بدل گیا۔ دور کہیں سے ایسی آواز آرہی تھی جیسے کوئی ہندوستانی ستار بجا رہا ہو۔ ساحل کے ساتھ ساتھ جگہ جگہ الاؤ روشن تھے اور لوگوں کی ٹولیاں اس کے گرد رکوع کی حالت میں جھکی ہوئی تھیں۔ شاید یہ بھی وہاں کی رسم تھی۔ وہ بڑی احتیاط سے آگے بڑھ

رہا تھا تا کہ کسی بڑی مشکل سے محفوظ رہ سکے۔ وہ ایک سفید سوٹ میں ملبوس شخص کے پاس سے گزرا جس کے ہاتھ میں ایک تہ کی ہوئی چھتری تھی اور وہ کسی طرح بھی مقامی نہیں لگ رہا تھا۔

جینی اس کا انتظار کررہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی بولی۔

"وہ آج رات کو عنقریب آنے والے ہیں۔" اس کے ہاتھ میں ایک بڑی سی ٹوکری تھی جو خریداری کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔

"تم کیسے جانتی ہو؟"

"کیا تم نے چند منٹ پہلے فضا میں راکٹ دیکھا تھا۔ یہ کرائٹر کا سگنل ہے۔ اس کی کشتی تھوڑی دیر میں یہاں پہنچنے والی ہے۔"

وہ پانی کے ساتھ چلتے اور لہروں کو ریت سے ٹکراتا دیکھتے رہے۔ یہ منظر دیکھ کر اسے اپنا لڑکپن یاد آ گیا جب وہ برائٹن کے ساحل پر جایا کرتا تھا۔ لہروں کے ساتھ سنگریزے بہتے ہوئے آتے اور ساحل کی ریت میں دھنس جاتے۔

اس سے پہلے کہ رینڈ کچھ محسوس کرتا۔ چھوٹی کشتی ان کے نزدیک پہنچ چکی تھی اور ایک نوجوان ملایشین اسے ساحل پر کھینچنے کے لیے اتر آیا تھا۔ "جینی! آج صرف نو عدد ہی ہیں۔" اس نے فرانسیسی میں کہا۔

جینی نے ٹاٹ کا کور اٹھا کر ان پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ رینڈ بہ آسانی کچھوؤں کی کھال پر بنی ہوئی چمک دار لکیریں دیکھ سکتا تھا جو انگلیوں کے نشانات کی طرح ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔

"میں یہ سب لے جاؤں گی۔" وہ جلدی سے بولی۔

کرائٹر نے رینڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تمہارے پاس پہلے سے خریدار موجود ہے۔"

"شاید!" اس نے کچھوؤں سے بھرا ہوا تھیلا اٹھا کر ریت پر رکھا اور جیب سے کئی نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

"اگلی بار زیادہ کچھوے لے کر آؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ کشتی کی جانب بڑھ گیا۔ یہ ساری کارروائی چند منٹوں میں مکمل ہو گئی۔

جینی نے بیزاری سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "وہ عام طور پر میرے لیے ستر اسّی کچھوے لے کر آتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ کسی اور کو بھی کچھوے بیچ رہا ہے۔"

رینڈ کو وہ شخص یاد آ گیا جو سفید سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس نے جینی سے پوچھا۔ "کیا یہاں برسات کا موسم شروع ہو چکا ہے؟"

"نہیں، اگلے مہینے سے پہلے بارش نہیں ہو گی۔"

"کیا تم نے کچھ دیر پہلے کسی اجنبی کو دیکھا تھا جس نے سفید سوٹ پہن رکھا ہے اور اس کے ہاتھ میں چھتری بھی ہے؟"

"یہاں ہمیشہ سیاح آتے رہتے ہیں۔" جینی نے بے پروائی سے جواب دیا۔

رینڈ نے جینی کے ہاتھ سے بیگ لے لیا اور بولا۔

"میں یہ کچھوے بعد میں خریدوں گا۔ پہلے ساحل کا ایک چکر لگا کر آتا ہوں۔ اگر کرائٹر پہلے کسی دوسری جگہ اترا ہو گا تو تمہارے خیال میں وہ کون سی ہو سکتی ہے؟"

"شاید اینگل کوو، یہاں سے شمال کی جانب دو میل کے فاصلے پر ہے۔"

"کیا میں ساحل کے ساتھ ساتھ جا سکتا ہوں؟"

"رات میں؟"

"ابھی اسی وقت۔"

وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ "جنگل میں سے ہو کر جانا زیادہ محفوظ رہے گا۔ وہاں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے لیکن وہاں کے رہنے والے دوستانہ برتاؤ کرتے ہیں۔"

رینڈ وہ تھیلا اس کی جھونپڑی تک لے کر آیا اور دوبارہ ساحل کی طرف چل دیا۔ آسمان ستاروں سے روشن تھا۔ پورے چاند کی روشنی میں اسے چلنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ آگے چل کر اس نے جب روشن الاؤ دیکھے اور سمجھ گیا کہ وہ اینگل کوو پہنچ گیا ہے۔ تبھی اس نے سفید سوٹ والے کو دوبارہ دیکھا۔

جیسے ہی رینڈ اس کے قریب پہنچا وہ شخص آہستہ سے گھوما اور اس نے اپنی تہ کی ہوئی چھتری فضا میں بلند کی۔ رینڈ نے ایک جانب چھلانگ لگائی لیکن اسے معمولی تاخیر ہو گئی۔ سائلنسر لگے ریوالور سے نکلی ہوئی گولی اس کے سر کے برابر سے چھوتی ہوئی گزر گئی اور رینڈ کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی اور سورج کی روشنی میں وہ دیکھ سکتا تھا کہ وہ کسی ماہی گیر کی جھونپڑی میں ہے۔ "نئی زندگی مبارک ہو۔" ایک آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس نے آہستہ سے گردن موڑ کر دیکھا۔ اس کے سرہانے ایڈیلیڈ تولیار کھڑی ہوئی تھی۔

"مجھے کیا ہوا تھا؟" رینڈ نے نحیف آواز میں پوچھا۔

"تمہیں گولی لگی ہے۔ خوش قسمتی سے وہ تمہاری کھوپڑی کو چھوتی ہوئی نکل گئی۔ میں نے اس جگہ پر سرسوں کا تیل لگا دیا ہے۔"

"مجھ پر گولی اس سفید سوٹ والے نے چلائی تھی۔ اب وہ کہاں ہے؟"

"میں نہیں جانتی۔ وہ سمجھ رہا ہوگا کہ تم مر چکے ہو۔"

"اس نے ہی تمہارے شوہر کو بھی قتل کیا تھا۔"

ایڈیلیڈ نے لمحہ بھر کے لیے اپنی آنکھیں بند کیں پھر بولی۔ "تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"اسکاٹ لینڈ یارڈ والوں کو شبہ ہے کہ تولیارا کو ایسے سائلنسر لگے ریوالور سے قتل کیا گیا جسے ایک چھتری کے اندر چھپایا گیا تھا کیونکہ کسی نے گولی کی آواز نہیں سنی اور نہ ہی قاتل کو فائر کرتے دیکھا۔ یہاں بھی برسات کا موسم نہیں ہے۔ لیکن وہ شخص ایک تہ کی ہوئی چھتری لیے پھر رہا تھا۔ وہ یقیناً کوئی غیر ملکی ہی ہے اور جب میری نظر اس پر پڑی تو اس نے چھتری کا رخ میری جانب کر دیا اور میں ریت پر گر پڑا۔ کیا تم اسے جانتی ہو؟"

"ہاں۔ میں اسے جانتی ہوں۔"

رینڈ نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس کے سر میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ وہ کراہتے ہوئے بولا۔ "تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"اپنے شوہر کا کام پورا کر رہی ہوں۔"

"تم نے گزشتہ شب کرائٹر سے کچھوے خریدے تھے؟"

"کیا اس میں کوئی برائی ہے؟"

"جینی نام کی عورت ساحل پر ان کچھوؤں کا انتظار کر رہی تھی۔"

ایڈیلیڈ نے ناک سکیڑتے ہوئے کہا۔ "وہ خود ایسی حرکتیں کرتی ہے۔ اس نے ایک دفعہ حیلگا کو بھی تنگ کیا تھا۔"

"اب وہ سفید سوٹ والا کہاں ہے؟"

"اس کا نام سنڈنی مولین ہے اور وہ جنوبی افریقا کا رہنے والا ہے۔"

"اس نے تمہارے شوہر کو کیوں قتل کیا؟"

"میں نہیں سمجھتی کہ اس کے پاس حیلگا کو قتل کرنے کی کوئی وجہ ہوگی۔"

"لیکن وہ کچھوے اسمگل کرنے میں تمہاری مدد کے لیے یہاں آیا تھا۔"

"گزشتہ بار ایک دفعہ آیا تھا۔ اس کے لیے حیلگا کو ایک مرتبہ پکڑ جانا پڑا۔"

"اس پورے کاروبار میں مولین کا کیا کردار ہے؟"

"تم خود ہی پوچھ لینا۔ وہ مجھ سے ملنے جلد ہی واپس آئے گا۔"

"یہاں واپس آئے گا مگر کس لیے؟" رینڈ فوراً ہی چوکنا ہو گیا۔

"اسے یہاں کوئی کام ہے پھر ہم اکٹھے چلے جائیں گے۔ میرے پاس تھیلے میں چیسٹہ کچھوے ہیں۔"

"کیا تم انہیں ناریل کی بوریوں میں ڈال کر کسٹم سے گزر جاؤ گی؟"

یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا اور اس نے چاروں طرف دور دور تک نگاہ دوڑائی کہ کہیں سنڈنی مولین تو واپس نہیں آ رہا۔ اس بار وہ تیار رہنا چاہ رہا تھا۔

"ہاں، میں انہیں کسٹم سے نکال لوں گی۔" ایڈیلیڈ نے اسے یقین دلایا۔

کچھ فاصلے پر رینڈ کو کسی کشتی کے آنے کی آواز آئی۔ ایڈیلیڈ کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اس نے کہا۔ "تم کہیں چھپ جاؤ۔ میں مزید لڑائی برداشت نہیں کر سکتی۔"

"کیا یہ وہی ہے؟"

"شاید۔" اس نے رینڈ کو جنگل کی طرف جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اگر تم کچھوے لے جا رہی ہو تو وہ واپس کیوں آ رہا ہے؟"

"میں نہیں جانتی۔" وہ پریشان ہوتے ہوئے بولی۔ "وہ ان کے ساتھ کچھ کرتا ہے۔"

"کچھ کرتا ہے؟" رینڈ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

وہ کشتی اب نظر آ رہی تھی اور اس کا رخ ساحل کی طرف تھا۔ رینڈ تیزی سے پیچھے ہٹا اور درختوں کی آڑ میں ہو گیا۔ وہ مولین کو کشتی کا اسٹیئرنگ سنبھالے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ اس نے انجن بند کیا اور کشتی تھوڑی دور آگے بڑھ کر رک گئی۔ ایڈیلیڈ اس سے ملنے کے لیے بھاگی۔ مولین پانی میں سے گزرتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ اس وقت بھی اس کے ہاتھ میں چھتری تھی۔

ایڈیلیڈ اس سے باتیں کر رہی تھی تاکہ اس کا دھیان بٹ جائے اور رینڈ کے بارے میں سوالات نہ کرے لیکن جیسے ہی وہ قریب آئے رینڈ نے مولین کو کہتے ہوئے سنا۔

"لاش کہاں ہے؟"
"میں اسے کھینچتی ہوئی جنگل کی طرف لے گئی تھی۔" ایڈیلیڈ نے جواب دیا۔

اس نے ریت کا معائنہ کیا اور پھر اس کا بازو پکڑتے ہوئے بولا۔ "سچ بتاؤ، ریت پر اسے کھینچے جانے کے نشان نظر نہیں آرہے۔"

"میں......"

"وہ زندہ ہے۔" وہ غراتے ہوئے بولا۔ "کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟"

ایڈیلیڈ کے چہرے کا رنگ فق ہوا لیکن اس نے فوراً ہی اپنے آپ پر قابو پالیا اور لگاوٹ سے بولی۔ "دفع کرو اسے۔ یہ بتاؤ کہ تمہیں تھیلگا کو کیوں قتل کرنا پڑا؟"

"اس سے تمہیں کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔" اس نے اپنی چھتری نیچے پھینک دی اور اسے گھونسا مارنے کے لیے بازو گھمایا۔

ہوش مندی کا تقاضا تو یہ تھا کہ رینڈ گھنی جھاڑیوں کے پیچھے چھپا رہتا لیکن ایڈیلیڈ پر حملہ ہوتے دیکھ کر اس سے برداشت نہ ہوسکا اور وہ اپنی خفیہ پناہ گاہ سے باہر آکر چلاتے ہوئے بولا۔ "میں یہاں ہوں۔" اس سے پہلے کہ مولین چھتری تک پہنچتا۔ رینڈ نے اس پر جست لگا دی اور وہ دونوں ریت پر گتھم گتھا ہوگئے۔ وہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کررہے تھے جبکہ رینڈ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کا مولین سے کوئی جوڑ نہیں ہے۔ پھر ایک مرحلہ ایسا آیا کہ مولین نے اسے زیر کرلیا۔ اب وہ اس کے اوپر تھا اور اس کے ہاتھ رینڈل کی گردن پر تھے۔ تبھی اس کے عقب میں ایک ہلکی سی آواز سنائی دی۔ رینڈ نے بے آواز ریوالور سے نکلی ہوئی گولی کی آواز پہچان لی۔ دوسرے ہی لمحے اس کی گردن پر مولین کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

"میں ایسا کرنے پر مجبور ہوگئی تھی۔" ایڈیلیڈ نے کہا۔ اس نے ہاتھ میں وہی چھتری پکڑی ہوئی تھی۔

مولین پشت کے بل لیٹا ہوا سانس لینے کی کوشش کررہا تھا۔ رینڈ اس پر جھکتے ہوئے بولا۔ "تم مر رہے ہو، مجھے بتاؤ کہ اس کاروبار کی حقیقت کیا ہے؟"

مولین نے اپنا منہ کھولا لیکن کچھ نہ کہہ سکا۔ پھر اس نے جیکٹ کی اوپر والی جیب پر ہاتھ رکھا اور بڑبڑاتے ہوئے کچھ کہا۔ رینڈ نے سننے کی کوشش کی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "ناریل میں ہیرے" اور پھر اس کی آواز ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔

"کیا میں نے اسے مار ڈالا؟" ایڈیلیڈ نے پوچھا۔

"ہاں اور اس کے عوض میری جان بچالی۔" یہ کہہ کر اس نے مولین کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک تہ کیا ہوا لفافہ نکالا جسے ٹیپ لگا کر بند کردیا گیا تھا۔

"تم اس کے بارے میں جانتی ہو؟" اس نے ایڈیلیڈ سے پوچھا۔

"یہ کیا ہے؟"

رینڈ نے لفافے کا کونا پھاڑا اور اس میں رکھی ہوئی چیزیں اپنے ہاتھ کی ہتھیلی پر انڈیلتے ہوئے بولا۔ "ہیرے اور یہ سب مناسب سائز کے ہیں۔ یہ کم از کم پچاس تو ہوں گے۔"

"جنوبی افریقا ہیروں کے لیے مشہور ہے۔ مجھے یہ بات پہلے سمجھ لینی چاہیے تھی۔"

"مرنے سے پہلے اس کے آخری الفاظ تھے۔ "ناریل میں ہیرے" لیکن وہ انہیں کیسے اسمگل کرتا تھا۔"

"پھلوں کے اندر رکھ کر۔" ایڈیلیڈ نے کہا۔ "تھیلگا نے ایک دفعہ مجھے بتایا تھا کہ وہ ایک ٹیوب کے ذریعے انہیں خوراک دیتا ہے لیکن ہم کبھی یہ نہ جان سکے کہ در حقیقت وہ کیا کررہا تھا۔"

"ہیروں کی اسمگلنگ اور وہ بھی اسمگل شدہ پھلوں کے ذریعے۔ یہ میرے لیے ایک نئی چیز ہے۔" رینڈ نے اعتراف کیا۔ "لیکن یہ اب بھی معلوم نہیں ہوسکا کہ اس نے تمہارے شوہر کو کیوں قتل کیا تھا؟"

"اب میں کیا کروں گی؟" ایڈیلیڈ نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

"میری تجویز یہ ہے کہ تم لاش کو یہیں چھوڑ دو۔ پھلوں کو آزاد کردو اور گھر جاؤ۔ لندن کے معاملات میں سنبھال لوں گا۔" اس نے چھتری نما گن اٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہ قصہ تو ختم ہوا۔ اب کیا کرنا ہے؟"

"تمہارے لیے ختم ہوا ہے۔ مجھے ابھی ایک چھوٹا سا کام اور کرنا ہے۔"

اچانک ہی اسے احساس ہوا کہ مرنے سے پہلے مولین نے جو الفاظ ادا کیے، ان کا مفہوم کیا تھا۔

رالف کوبر نے رینڈ کا گرم جوشی سے استقبال کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے تمہاری رپورٹ پڑھی۔ تم نے انتہائی شاندار کام کیا ہے۔ مولین کی موت کے بعد یہ سارا اسمگلنگ آپریشن بند ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اسمگلروں کے اور بھی کئی گروہ کام کررہے ہیں لیکن یہ سب

سے اہم تھا۔"

"اور وہ چھتری نما گن؟"

رالف کوبر نے تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ماہرین کا کہنا ہے کہ اسی ہتھیار سے ہیلگا کو قتل کیا گیا۔ جیسا کہ تم نے بھی شبہ ظاہر کیا تھا اور ہیروں کی اسمگلنگ سب کے لیے حیران کن ہے۔ تم نے رپورٹ میں لکھا ہے کہ مولین کو حادثاتی طور پر گولی لگ گئی جب تم اس سے ہتھیار کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔"

"تم دیکھ یہ واقعہ اسی طرح پیش آیا۔"

"کیا اس نے یہ بتایا کہ ہیتھرو ائرپورٹ پر ہیلگا کو گولی کیوں ماری تھی؟"

"نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ میں اس سوال کا جواب دے سکتا ہوں۔" ریڈ نے کہا۔ "تم جانتے ہو کہ ایک چیز شروع سے ہی میرے سامنے تھی لیکن میں اسے نہیں دیکھ سکا۔"

"وہ کیا چیز تھی؟" کوبر نے پوچھا۔

"اگر تولیارا کو فلوریڈا جانے کے لیے ہیتھرو ائرپورٹ سے جہاز تبدیل کرنا تھا تو وہ کسٹم سے گزر کر ائرپورٹ کی عمارت سے باہر کیوں آیا اور کہاں جانے کے لیے ٹیکسی میں سوار ہو رہا تھا؟"

"ممکن ہے کہ اس کا قیام کئی گھنٹوں کا ہو؟"

"اگر ایسا تھا تب بھی اس نے یہاں اور فلوریڈا دو جگہ کسٹم سے گزرنے کا خطرہ کیوں مول لیا۔ وہ ٹرانزٹ لاؤنج میں ٹھہر سکتا تھا اور اپنے سامان کے ساتھ ساتھ ناریل کے تھیلوں کو بھی براہِ راست فلوریڈا جانے والے جہاز میں رکھوا سکتا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کا ارادہ سرے سے فلوریڈا جانے کا نہیں تھا۔ وہ لندن میں ہی اپنے طور پر گاہک تلاش کر رہا تھا۔ مولین کسی امکانی خطرے کے پیشِ نظر اس کی حفاظت کے لیے موجود تھا لیکن جب اس نے تولیارا کو پٹری بدلتے دیکھا تو گولی مار دی۔"

رالف کوبر بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ "تولیارا کو قتل کر کے اسے کیا ملا۔ ناریل، کچھوؤں اور ان میں چھپائے گئے ہیرے۔ وہ ان سب سے ہاتھ دھو بیٹھا۔"

"میں نے اپنے آپ سے یہ سوال کیا تھا۔ غالباً اس نے نتائج پر غور کیے بغیر بے اختیار یہ کارروائی کی تھی لیکن یہ خلافِ قیاس لگتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک امکان اور بھی تھا۔ وہ غالباً جانتا تھا کہ تولیارا کو قتل کر کے وہ نقصان میں نہیں رہے گا اور اسمگل شدہ کچھوؤں کا تھیلا پولیس کے قبضے میں پہنچنے کے بعد بالآخر اس کے پارٹنر کی میز پر ہی پہنچے گا جو تم ہو مسٹر کوبر۔"

"یہ مضحکہ خیز بات ہے۔" کوبر چلّاتے ہوئے بولا۔ "تم کیا ثابت کرنا چاہ رہے ہو؟"

"صرف سچائی۔ جب تم نے میری خدمات حاصل کیں تو میں نے سوچا کہ تم ریکارڈ کی خاطر کسی قسم کی تحقیقات کروانا چاہتے ہو اور یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ میں اتنا آگے چلا جاؤں گا۔ تم نے خود مجھے بتایا تھا کہ ضبط کیے گئے جانور امریکا لے جائے جا رہے تھے۔ اگر تم کسی وجہ سے انہیں اپنے پاس نہیں رکھتے تو ان سے وہ ہیرے ضرور نکال لیتے جو ان کچھوؤں کے جسم میں داخل کیے گئے تھے۔ تم نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ حال ہی میں جنوبی افریقا جا چکے ہو۔"

کوبر نے شعلہ بار آنکھوں سے ریڈ کو دیکھا اور بولا۔ "یہ بہت برا ہوا کہ سڈنی مولین تمہارے دعوے کی حمایت کرنے کے لیے زندہ نہیں ہے۔"

"اس نے مرنے سے پہلے اس بارے میں بات کی تھی۔" ریڈ نے نرمی سے کہا۔

"اس نے کیا کہا تھا؟"

"اس کے اصل الفاظ تھے۔ "ناریل میں ہیرے۔" پہلے مجھے ان کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا پھر تمہاری بات یاد آئی کہ سفارت خانے کا عملہ تمہیں کوکونٹ کا تھیلا پیش کرتے ہوئے مذاق اُڑا رہا تھا کیونکہ اس پر کوبر لکھا ہوا ہے۔ یہ درحقیقت ناریل کا ریشہ ہے جو رسی اور چٹائی بنانے میں استعمال کیا جاتا ہے اور اسی لیے مرتے وقت اس نے ناریل کا لفظ ادا کیا۔"

کوبر آہستہ سے ہنستے ہوئے بولا۔ "میں چاہوں گا کہ وہ لوگ عدالت میں بھی اسی طرح قہقہے لگائیں۔"

"مجھے شبہ ہے کہ ثبوت اور گواہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ معاملہ عدالت میں جا سکے گا۔ بہرحال میں نے اپنی رپورٹ میں ان شبہات کا ذکر کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے لیے اس کاروبار سے الگ ہونے کا یہ مناسب وقت ہے۔"

رالف کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے کہ ہم نے کافی گفتگو کر لی۔ اب تم جا سکتے ہو مسٹر ریڈ۔"

"خدا حافظ۔" ریڈ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں اپنا بل تمہیں بھیج دوں گا۔"

خدشہ

سلیم انور

بعض لوگ واقعی ان صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں جو ان کو وقت سے پہلے رونما ہونے والے حالات و حادثات کی آگہی دے دیتی ہیں... حرف بہ حرف درست ثابت ہونے والے خدشے کی نشاندہی کا دلچسپ احوال...

مغرب کی وادیوں سے موصول ایک مجرمانہ کارروائی کی پیش بندی.....

"گڈ ایوننگ، وارڈن۔" رپورٹر جمی سالمن نے اپنے ہیٹ کو سر پر جماتے ہوئے کہا اور کرسی پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا۔

"گڈ ایوننگ۔"

"تم کچھ پریشان سے دکھائی دے رہے ہو، وارڈن۔" رپورٹر جمی نے کہا۔ "کیا تمہارے بُرے قیدیوں میں سے کوئی تمہارے لیے مشکلات پیدا کر رہا ہے؟"

وارڈن براؤن نے آہستگی سے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔

"کاش ایسا ہی ہوتا۔ میں جیل میں ہر قسم کے ہنگامے اور گڑبڑ کو ہینڈل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ لیکن جب کوئی قیدی یہاں سے رخصت ہوتا ہے تو میری پریشانی شروع ہو جاتی ہے۔ خاص طور پر ایسا قیدی جس نے سلاخوں کے پیچھے خود کو بہت عمدہ ثابت کیا ہو۔"

"لیکن یہ بات تمہارے لیے پریشانی کا باعث نہیں ہونی چاہیے، وارڈن۔" جمی نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ "جب کوئی شخص جیل سے چلا جاتا ہے تو پھر اس کی ذمے داری

تم پر عائد نہیں ہوتی۔"

"مجھے معلوم ہے، جمی۔" وارڈن براؤن نے تاسف بھرے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن درحقیقت مجھے ڈین ہیلنگر کے بارے میں فکر لاحق ہے۔ اس کی نیت اچھی نہیں لگتی۔ وہ قاتل ہوسکتا ہے۔"

"اچھا، مجھے یاد آگیا۔" جمی نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ پانچ سال پہلے کی بات نہیں ہے؟ میں نے اس کے مقدمے کی کوریج کی تھی؟"

وارڈن براؤن نے اثبات میں سرہلا دیا۔ "ڈین ہیلنگر کو آج رہائی ملی ہے۔ وہ ایک ماڈل قیدی تھا لیکن مجھے ہمیشہ یہی محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنی قید کی مدت پوری ہونے کا انتظار کررہا ہے۔ اور یہ کہ اسے اپنا کوئی ادھورا کام نمٹانا ہے جسے وہ آزادی ملنے کے بعد سرانجام دے گا۔ اس نے ایسی کسی بات کی کبھی نشان دہی تو نہیں کی۔ اس لیے کہ جاگتے میں وہ زیادہ بات نہیں کیا کرتا تھا۔ البتہ یہ بات عجیب سی لگے گی کہ وہ سوتے ہوئے باتیں کرنے کا عادی تھا۔ محافظوں کا کہنا ہے کہ وہ ہمیشہ برنارڈ نامی کسی شخص کے پیچھے پڑا رہتا تھا اور نیند کے عالم میں اسی کا نام بڑبڑاتا رہتا تھا۔"

یہ سن کر رپورٹر جمی ہنس دیا۔ "شکر ہے کہ وہ کسی طوائف کا نام نہیں لیتا تھا۔" یہ کہہ کر وہ کرسی ... سے اٹھ گیا۔ "تم سے پھر ملاقات ہوگی، وارڈن۔ میں اپنے کان اور آنکھیں کھلی رکھوں گا۔ اگر شہر میں ڈین ہیلنگر سے میری مڈبھیڑ ہوئی تو میں تمہیں اس کی سرگرمیوں سے مطلع کرتا رہوں گا۔" پھر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

شہر کے دوسرے حصے میں ڈین ہیلنگر اپنے چھوٹے سے بیڈروم میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ جب وہ تھک گیا تو اس نے خود کو بیڈ پر گرالیا۔

نفرت کی لہر نے اس کے وجود کو اس طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا جیسے شیطان کا سایہ کسی پر مسلط ہوجاتا ہے۔ نفرت کی شدت سے اس کا جسم کپکپا رہا تھا۔ اسے برنارڈ جیمز سے ہمیشہ نفرت رہی تھی۔ حتیٰ کہ وہ ان دنوں بھی اس سے نفرت کرتا تھا جب وہ دونوں ایسٹ سائڈ میں فروٹ کے چھکڑوں سے پھل چوری کیا کرتے تھے۔ جب برنارڈ پکڑا جاتا تھا تو وہ بہت چیخا چلایا کرتا تھا۔

ریفارم اسکول میں اپنی سزا پوری کرنے کے بعد برنارڈ کو ایک اچھی ملازمت مل گئی تھی اور اس نے خود کو سدھار لیا تھا۔ البتہ جہاں تک ڈین ہیلنگر کا تعلق تھا تو اس کا چلبلا پن اپنی جگہ قائم تھا۔ جب تک برنارڈ ان کے لیے کسی قسم کی پریشانی کا باعث نہیں تھا، اس نے برنارڈ کی بھی پروا بھی نہیں کی تھی۔

پھر وہ برنارڈ کو تقریباً بھلا چکا تھا لیکن ایک رات جب ڈین ہیلنگر نے بینک لوٹنے کی کوشش کی تو برنارڈ نے اسے بینک کے باہر منڈلاتے ہوئے دیکھ لیا اور پہچان لیا کہ وہ ڈین ہیلنگر ہے۔ اس نے پولیس کو خبر کردی۔ پولیس نے اسے رنگے ہاتھوں گرفتار کرلیا۔ ہیلنگر کو بچ نکلنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔

اور اب ڈین، برنارڈ سے انتقام لینے کی آگ میں جل رہا تھا۔ وہ رات کے دو بجنے کا انتظار کررہا تھا تاکہ برنارڈ کو اس کے رومنگ ہاؤس میں جاکر قتل کردے جہاں وہ کرائے کے کمرے میں رہ رہا تھا۔

اس کی نظریں گھڑی پر جمی ہوئی تھیں۔ اسے گھڑی کی سوئیاں نہایت سست رفتاری سے حرکت کرتی محسوس ہورہی تھیں۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ایک سگریٹ سلگائی اور ایک بار پھر کمرے میں ٹہلنا شروع کردیا۔ اس کی نظریں بار بار گھڑی کی جانب اٹھ رہی تھیں۔

جب دو بجنے میں پندرہ منٹ باقی رہ گئے تو اس نے اپنا اوورکوٹ پہن لیا۔ ہیٹ کو سر پر اس طرح لگایا کہ پیشانی ڈھک جائے اور کوٹ کا کالر اٹھالیا۔

پانچ منٹ بعد وہ باہر سڑک پر تھا۔

برنارڈ صرف دو بلاک کے فاصلے پر اولڈ مسز براؤن کے رومنگ ہاؤس میں رہتا تھا۔ ڈین نے سوچا کہ وہاں چوری چھپے داخل ہونا اس کے لیے کوئی دشوار نہیں ہوگا کیونکہ وہ خود بھی وہاں کرائے دار رہ چکا تھا اور اس عمارت کے تمام حصوں سے بہ خوبی واقف تھا۔ وہاں ایک عقبی کھڑکی بھی تھی۔ جب وہ کسی واردات کے لیے نکلتا تھا تو اسی کھڑکی کو استعمال کرتا تھا۔ اس لیے کہ مسز براؤن کی اپنے کرائے داروں کو سخت ہدایات تھیں کہ وہ اپنے آنے جانے کے لیے داخلی راستے کو استعمال میں لایا کریں تاکہ وہ ان کی آمدورفت سے پوری طرح باخبر رہ سکے۔

"کیا ماچس ہوگی، دوست؟"

اس اچانک آواز پر ڈین تیزی سے گھوم گیا۔ ساتھ ہی اس کی انگلیاں اپنے اوورکوٹ کی جیب میں موجود ریوالور کے دستے پر مضبوطی سے جم گئیں۔ لیکن اس کے سامنے جو شخص تھا اس کی خستہ حالی سے ظاہر ہورہا تھا کہ وہ خطرناک نہیں ہے۔

ڈین نے اپنی دوسری جیب میں موجود ماچس نکال کر خاموشی سے اس شخص کی جانب بڑھادی۔ اس شخص نے اپنی سگریٹ سلگانے کے بعد ماچس ڈین کو لوٹا دی اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا اندھیرے میں آگے بڑھ گیا۔

مسز براؤن کا رومنگ ہاؤس بلاک کے درمیان پڑوس سے الگ تھلگ واقع تھا اور بیچ... میں ایک پتلی سی گلی ان دونوں کو جدا کرتی تھی۔

ڈین آہستہ قدموں سے رومنگ ہاؤس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ مکان میں مکمل اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس نے فٹ پاتھ پر سے دیکھا کہ رومنگ ہاؤس کے داخلی دروازے پر ایک سفید سائن بورڈ لگا ہوا تھا لیکن اسے سائن بورڈ دیکھ کر کوئی تجسس نہیں ہوا۔

''غالباً 'کرائے کے لیے کمرا دستیاب ہے' کا بورڈ لگا ہوا ہے۔'' وہ خود سے بڑبڑایا۔ پھر اس کے حلق سے ہلکا سا قہقہہ بلند ہو گیا۔ کل مسز براؤن کو اس سائن بورڈ میں یہ تبدیلی کرنا پڑے گی کہ ''کرائے کے لیے کمرے دستیاب ہیں۔''

ڈین نے تیزی کے ساتھ اندھیری سڑک پر دونوں جانب نظریں دوڑائیں۔ سڑک سنسان تھی۔ تب وہ لپک کر گلی میں داخل ہو گیا اور رومنگ ہاؤس کے عقبی حصے میں پہنچ گیا۔ اس نے کچن کی کھڑکی کا پٹ اٹھایا تو وہ کھل گئی۔ وہ کچن میں داخل ہو گیا۔

مکان میں ایک عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ ایسی بو جو اس نے پہلے کبھی نہیں سونگھی تھی۔ اسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہونے لگا اور کھانسی آ گئی۔ تب اس نے اپنی سانس روک لی۔ اسے خوف تھا کہ اس کی کھانسی کی آواز نے کسی کو اس کی جانب متوجہ نہ کر دیا ہو۔

وہ سانس روکے کھڑا رہا۔ لیکن کہیں سے کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ وہ کپکپا کر رہ گیا۔ اسے یہ رومنگ ہاؤس مردہ گھر کے مانند محسوس ہو رہا تھا۔

اس نے دبے پاؤں کچن عبور کیا اور دروازہ کھول کر ہال میں آ گیا۔ وہاں وہ عجیب سی بو بہت تیز تھی۔ ڈین کی آنکھوں سے پانی بہنا شروع ہو گیا اور اسے اپنا سر بے حد ہلکا محسوس ہونے لگا۔ وہ ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ زینے کی جانب بڑھنے لگا۔

اسے سیڑھیاں چڑھنا بے حد دشوار لگ رہا تھا جیسے کسی پہاڑ پر چڑھ رہا ہو۔ اس نے سوچا کہ وہ ایک منٹ کے لیے زینے پر بیٹھ جائے اور قدرے ستا لے۔ کیا ہوا اگر برنارڈ مزید چند منٹ اور زندگی کی سانسیں لے لے گا... مزید چند منٹ... مزید چند منٹ!

☆☆☆

''ہیلو! پلیز وارڈن براؤن کو فون لگاؤ۔'' رپورٹر جی خاصا پُرجوش ہو رہا تھا۔ ''ہیلو، وارڈن، میرے پاس تمہارے لیے ایک بڑی خبر ہے... اب تمہیں ڈین بیلنگر کے بارے میں کبھی فکرمند ہونے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ وہ شہر کے دوسرے حصے میں واقع ایک رومنگ ہاؤس میں مردہ پایا گیا ہے... نہیں، نہیں اسے گولی نہیں ماری گئی ہے۔ اس کی موت انتہائی غیر معمولی حالات میں واقع ہوئی ہے۔ لگتا ہے کہ رومنگ ہاؤس کی مالکن اولڈ مسز براؤن نے کسی فیومی گیشن ایکسپرٹ کو طلب کیا تھا تاکہ ان کا کروچز اور کیڑے مکوڑوں سے نجات حاصل کر سکے جنھوں نے اس کے کرائے داروں کی زندگیاں اجیرن کر رکھی تھیں۔

''اسپرے کرنے والے کل رات کسی وقت آئے تھے اور انھوں نے ایک نئے قسم کے زہریلے کیمیکل کا پورے مکان میں اسپرے کر دیا تھا۔ اس سے قبل مسز براؤن نے اپنے رومنگ ہاؤس کو تمام کرائے داروں سے خالی کرا لیا تھا اور کسی کو بھی چھتیس گھنٹوں سے قبل وہاں واپس آنے کی اجازت نہیں تھی۔

''لگتا ہے کہ اس کیمیکل کے بخارات انسانی جان کے لیے بھی اتنے ہی مہلک تھے جتنے کہ ان کا کروچز اور کیڑے مکوڑوں کے لیے۔ ان فیومی گیشن والوں نے رخصت ہونے سے پہلے رومنگ ہاؤس کے داخلی دروازے پر ایک بورڈ بھی لگا دیا تھا جس پر لوگوں کو خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے وارننگ درج تھی۔

''کیا کہا وارڈن؟ ہاں، وہ ڈین بیلنگر عقبی گلی سے کچن کی کھڑکی کے راستے رومنگ ہاؤس میں داخل ہوا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اسے داخلی دروازے پر آویزاں وارننگ کا سائن بورڈ دیکھنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا ہوگا۔

''اور وارڈن جب ڈین بیلنگر جیل میں قید کے دوران نیند کے عالم میں بار بار کسی برنارڈ کا نام لیا کرتا تھا تو وہ اسی برنارڈ کو شوٹ کرنے کے ارادے سے رومنگ ہاؤس میں چوری چھپے داخل ہوا تھا۔ برنارڈ مسز براؤن کے رومنگ ہاؤس کا ایک کرائے دار ہے اور ڈین بیلنگر کو بینک لوٹنے کے الزام میں سزا اسی برنارڈ کی مخبری کی وجہ سے ہوئی تھی۔

''ڈین بیلنگر کے اوورکوٹ کی جیب میں ایک ریوالور پایا گیا ہے جو اس کے ارادے کا ٹھوس ثبوت ہے۔ تمہارا خدشہ بالکل درست ثابت ہوا، وارڈن۔ ڈین بیلنگر اپنے مذموم ارادے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ کسی کی جان لینے کے ارادے سے وہاں گیا تھا اور اپنی ہی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔''

رپورٹر جی نے پُرجوش آواز میں پوری کہانی بیان کر دی تھی۔

انگارے

طاہر جاوید مغل

سولھویں قسط

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خود غرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کررہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کئی مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثر و رسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ڈنمارک سے اپنے پیارے وطن پاکستان لوٹا تھا۔ مجھے کسی کی تلاش تھی۔ یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی میرے ساتھ ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس نے میری زندگی کو تہ و بالا کر دیا۔ میں نے سرِراہ ایک زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا جسے کوئی گاڑی ٹکر مار کر گزر گئی تھی۔ مقامی پولیس نے مجھے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور یہیں سے جبر و ناانصافی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے مجھے شکیل داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرغنہ تھے جو رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کر رہا تھا۔ میرے چچا حنیف سے بھی زبردستی ان کی آبائی زمین ہتھیانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر کو برداشت نہ کر سکا اور شکیل داراب کے دستِ راست انسپکٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ اس جرأت کی سزا اسے یہ ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن فائزہ سمیت جلا کر راکھ کر دیا گیا اور وہ خود دہشت گرد قرار پا کر جیل پہنچ گیا۔ انسپکٹر قیصر اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں MMA کا یورپی چیمپئن تھا، وسطی یورپ کے کئی بڑے بڑے گینگسٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن وطن پہنچتے ہی یہ زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی تھی۔ میں نے اپنی چچی اور چچازاد بہن فائزہ کے قاتل لالہ نظام کو بیدردی سے قتل کر دیا۔ انسپکٹر قیصر شدید زخمی ہو کر اسپتال پہنچا۔ شکیل داراب ایک شریف النفس زمیندار کی بیٹی عاشرہ کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہوا تھا۔ وہ ایک عارف نامی نوجوان سے محبت کرتی تھی جسے میں نے زخمی حالت میں اسپتال پہنچانے کی ”غلطی“ کی تھی۔ میں نے شکیل داراب کی ایک نہایت اہم کمزوری کا سراغ لگایا اور یوں اس پر دباؤ ڈال کر عاشرہ کی جان اس سے چھڑا دی۔ میں یہاں بیزار ہو چکا تھا اور واپس ڈنمارک لوٹ جانے کا تہیہ کر چکا تھا مگر پھر ایک انہونی ہوئی۔ وہ جادوئی حسن رکھنے والی لڑکی مجھے نظر آ گئی جس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاند گڑھی میں نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں تاجور کے ساتھ گاؤں پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہو گیا۔ انیق بطور مددگار میرے ساتھ تھا۔ مجھے پتا چلا کہ تاجور کا منگیتر صفت اسحاق اپنے ہمنواؤں زمیندار عالمگیر اور پیر ولایت کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والد دین محمد کے گرد گھیرا تنگ کر رہا تھا۔ پیر ولایت نے گاؤں والوں کو باور کرا رکھا تھا کہ اگر تاجور کی شادی اسحاق سے نہ ہوئی تو چاند گڑھی پر آفت آ جائے گی۔ ان لوگوں نے چاند گڑھی کے راست گو امام مسجد مولوی فدا کو بھی اپنے ساتھ ملا رکھا تھا۔ تاجور کے گھر میں آئی مہمان نمبرداری کو کسی نے زخمی کر دیا تھا۔ اس کا الزام بھی تاجور کو دیا جا رہا تھا۔ ایک رات میں نے چہرے پر ڈھاٹا باندھ کر مولوی فدا کا تعاقب کیا۔ وہ ایک ہندو میاں بیوی رام پیاری اور وکرم کے گھر میں داخل ہوئے۔ پہلے تو مجھے یہی غلط فہمی ہوئی کہ شاید مولوی فدا یہاں کسی غلط نیت سے آئے ہیں لیکن پھر حقیقت سامنے آ گئی۔ مولوی فدا ایک خدا ترس بندے کی حیثیت سے یہاں وکرم اور رام پیاری کی مدد کے لیے آئے تھے۔ تاہم اسی دوران میں وکرم اور رام پیاری کے کچھ مخالفین نے ان کے گھر پر ہلا بول دیا۔ ان کا خیال تھا کہ پی پی کا شکار وکرم ان کے بچے کی موت کا باعث بنا ہے۔ اس موقع پر مولوی فدا نے دلیری سے وکرم اور رام پیاری کا دفاع کیا لیکن جب حالات زیادہ بگڑے تو میں نے بلوائیوں کے ڈھاٹے وکرم کو کندھے پر لادا اور رام پیاری کو لے کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ میں نمبرداری کو زخمی کرنے والے کا کھوج لگانا چاہتا تھا۔ یہ کام مولوی صاحب کے شاگرد طارق نے کیا تھا۔ وہ تاجور کی جان لینا چاہتا تھا کیونکہ اس کی وجہ سے مولوی صاحب کسی بلیک میلنگ کا شکار ہو رہے تھے۔ طارق سے معلوم ہوا کہ مولوی جی کی بیٹی زینب ایک عجیب بیماری کا شکار ہے۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں ٹھیک رہتی ہے لیکن جب اسے وہاں سے لایا جائے تو اس کی حالت غیر ہونے لگتی ہے۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سجاول نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجور کو حملہ آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے بھیس بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کر رکھا ہے اور یوں مولوی صاحب کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی بچی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ میں نے مولوی صاحب کو اس ”بلیک میلنگ“ سے نکالنے کا تہیہ کیا مگر اگلی رات مولوی صاحب کو قتل کر دیا گیا۔ میرا شک عالمگیر اور اسحاق وغیرہ پر تھا۔ رات کی تاریکی میں، میں نے عالمگیر اور اسحاق کو کسی خاص مشن پر جاتے دیکھا۔ وہ ایک ویرانے میں پہنچے۔ میں نے ان کا تعاقب کیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ عالمگیر، سجاول کے کندھے سے کندھا ملائے بیٹھا تھا۔ میں نے چھپ کر ان کی تصاویر کھینچ لیں۔ پھر میں اقبال کا تعاقب کرتا ہوا یاسر تک جا پہنچا اور چھپ کر ان کی باتیں سنیں۔ وہ بے بس و مظلوم شخص تھا اور چھپ کر ایک قبرستان میں اپنے دن گزار رہا تھا۔ ایک دن میں اور انیق پیر ولایت کے والد پیر ساتاجی کے اس ڈیرے پر جا پہنچے جو کسی زمانے میں جل کر خاکستر ہو چکا تھا اور اس سے متعلق متعدد کہانیاں منسوب تھیں۔ اس ڈیرے پر لوگ دم درود وغیرہ کرانے آتے تھے۔ تاجور کی قریبی دوست ریشمی شادی کے بعد دوسرے گاؤں چلی گئی تھی۔ اس کا شوہر شکی مزاج اور تشدد پسند شخص تھا۔ اس نے ریشمی کی زندگی عذاب بنا رکھی تھی۔ ایک دن وہ ایسی غائب ہوئی کہ اس کا شوہر ڈھونڈتا رہ گیا۔ میں تاجور کی خاطر ریشمی کا کھوج لگانے کا بیڑا اٹھا بیٹھا اور ایک الگ ہی دنیا میں جا پہنچا۔ ریشمی ایک ملنگ کا روپ دھار چکی تھی اور آستانے پر اپنی دلکش، سریلی آواز کے باعث پاک بی بی کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ درگاہ پر ہم سب قید تھے لیکن قسمت نے ساتھ دیا اور حالات نے اس تیزی سے کروٹ لی کہ درگاہ کا سب نظام درہم برہم ہو گیا۔ میرے ہاتھوں پردے والی سرکار کا خون ہو گیا۔ آگ و خون کا دریا عبور کر کے ہم بالآخر پہاڑوں کے درمیان تک جا پہنچے۔ یہاں بھی مسلح محافظوں سے ہمارا مقابلہ ہوا۔ اس دوران انیق وغیرہ ہم سے بچھڑ گئے۔ میں اور تاجور بھاگتے ہوئے ایک جنگل میں پہنچے۔ لیکن ہماری جان ابھی چھوٹی نہیں تھی۔ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا کے مصداق ہم سیالکوٹی سجاول ڈکیت کے ڈیرے پر جا پہنچے تھے۔ یہاں سجاول کی ماں (مائی جی) مجھے اپنا ہونے والا جمائی سمجھی۔ جس کی پوتی مہناز عرف مانی سے میری بات طے تھی۔ یوں سجاول سے ہماری جان بچ گئی۔ یہاں سجاول نے میرا مقابلہ باقر سے کرا دیا۔ سخت مقابلے کے بعد میں نے باقر کو چت کر دیا تو میں نے سجاول کو مقابلے کا چیلنج کر دیا۔ میرے چیلنج نے سجاول سمیت سب کو پریشان کر دیا تھا۔ اسی دوران ایک خط میرے ہاتھ آ گیا جسے پڑھ کر چاند گڑھی کے عالمگیر کا مکروہ چہرہ سامنے آ گیا۔ اس خط

کے ذریعے میں سجاول اور عالمگیر میں دباؤ ڈالنے میں کامیاب ہو گیا۔ متوقع مقابلے کے بارے میں سوچتے سوچتے میرا ذہن ایک بار پھر ماضی کے اوراق پلٹنے لگا۔ جب میں ڈنمارک میں تھا اور ایک کمزور پاکستانی کو گوروں اور انڈین غنڈوں سے بچاتے ہوئے خود ایک طوفان کی لپیٹ میں آ گیا۔ وہ غنڈے ٹیکساری گینگ کے لوگ تھے جس کا سرغنہ جان ڈیرک تھا۔ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے انہوں نے میری یونیورسٹی دوست ڈیزی کے ساتھ اخلاقی کھیل کھیلا، پھر ڈیزی غائب ہو گئی۔ اس واقعے کے بعد میری زندگی میں ایک انقلاب آ گیا۔ مجھے چھ ماہ جیل ہوئی۔ پھر میرا رجحان مکس مارشل آرٹ کی طرف ہو گیا اور ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے MMA کی فائٹس میں جھنڈا گاڑتا رہا اور دوسری طرف سنائی ماسک کی اوٹ میں ٹیکساری گینگ کے غنڈوں سے برسرِپیکار رہا۔ اسی مارشل آرٹ کی بدولت میں نے سجاول سے مقابلہ کیا اور سخت مقابلے کے بعد برابری کی بنیاد پر میں نے ہار مان لی لیکن سجاول کا دل جیت لیا۔ سجاول سے کہہ کر میں نے انیق کو بلوا لیا۔ سجاول ایک حسین دوشیزہ شکیل کو دنیا بنا دلہن کی طرح سجا سنوار کر ریان فردوس (وڈے صاحب) کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں، انیق اور جاناں ساتھ تھے۔ ہم وڈے صاحب کے محل نما شگلے پارا ہاؤس پہنچے۔ وڈا صاحب اپنے دو بیٹوں کے ہمراہ بیرونائی سے پاکستان شفٹ ہوا تھا۔ بیرونائی میں اس کی خاندانی دشمنی تھی۔ سب ٹھیک تھا کہ اچانک چند نقاب پوشوں نے پارا ہاؤس پر حملہ کر دیا جن کا سرغنہ ثاقب تھا۔ سخت مقابلہ ہوا۔ سجاول نے جان جوکھوں میں ڈال کر بڑی بیگم صاحب کی جان بچائی لیکن سرغنہ ثاقب نے اس کے بیٹے ابراہیم اور ایک مہمان کو یرغمال بنا لیا مہمان کا نام سن کر میں چونک گیا یعنی شکیل داراب۔ پھر میں نے اور سجاول نے چھوٹے صاحب کو اغواکاروں کے چنگل سے نجات دلائی۔ اس معرکے میں کچھ اغواکار مار دیے گئے اور کچھ پکڑے گئے۔ سجاول کو پارا ہاؤس میں کلیدی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ پارا ہاؤس میں کوئی بڑا چکر چل رہا تھا۔ کھوج لگانے پر پتا چلا کہ بڑے صاحب کے دونوں بیٹوں میں زہریلا عنصر پایا جاتا ہے۔ زینب والا معاملہ بھی اسی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اسی وجہ سے زینب کو بھی اغوا کر لیا گیا تھا۔ ابراہیم اور کمال احمد کے لیے جو لڑکیاں تیار کی گئی تھیں وہ پارا ہاؤس پہنچ چکی تھیں۔ ایک تقریب میں دونوں لڑکیوں کی رونمائی کی گئی تو ان میں ایک زینب تھی۔ اب مجھے زینب کے بارے میں پریشانی لاحق ہو رہی تھی۔ زینب، ابراہیم سے منسوب کی گئی تھی۔ ابراہیم نے مجھ پر اور سجاول پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ میں نے ابراہیم سے ملاقات کی اور اس سے معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ دونوں بھائیوں میں زہریلا پن موجود ہے اسی لیے ان کے لیے ایسی لڑکیاں ڈھونڈی گئی ہیں۔ لیکن میں نے ابراہیم کو آگاہ کیا کہ زینب پوری طرح محفوظ نہیں ہے اور شادی کی صورت میں اسے نقصان ہو سکتا ہے۔ یہ سن کر ابراہیم پریشان ہو گیا۔ ادھر آقا جان جو پارا ہاؤس کا کرتا دھرتا تھا، اس نے سرغنہ ثاقب کے فرار کا ڈراما رچایا۔ ایک بار پھر پارا ہاؤس میں دھماکے گونج اٹھے۔ تابڑتوڑ گولیاں چلنے لگیں اور مقابلے میں سرغنہ ثاقب اور اس کا ساتھی عبرت ناک موت مارے گئے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ہم نے افراتفری اور گہرے دھوئیں کا فائدہ اٹھایا۔ جھک کر بھاگتے ہوئے مہمان خانے تک پہنچے اور پھر اپنے کمروں کی طرف نکل گئے۔ رضوان کو میں نے اپنے کمرے تک پہنچایا اور اس میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔

اب سب سے پہلا مسئلہ یہی تھا کہ رضوان کو حفاظت سے چھپایا کہاں جائے؟ فوری طور پر کمرے کی قدِ آدم الماری کے سوا کوئی اور جگہ نظر نہیں آئی۔ میں نے انیق کے ساتھ مل کر بہ عجلت الماری کا ایک پورشن سامان سے خالی کیا۔ اور رضوان کو کھڑی پوزیشن میں وہاں گھسا دیا۔ یہاں اسے آکسیجن کی کوئی کمی تو نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے دروازہ باہر سے لاک کر دیا اور الماری سے نکلنے والا سامان اور کپڑے وغیرہ چھوٹے سے اسٹور میں چھپا دیے۔

پارا ہاؤس کے رہائشی حصے میں لگنے والی آگ پر مکمل قابو پا لیا گیا تھا۔ یہ آگ بس دو تین کمروں تک ہی محدود رہی تھی۔ ایک ساتھ پانچ موٹر بائیکس نے دھماکوں سے آگ پکڑی تھی۔ بڑی گاڑی اس کے علاوہ تھی۔ یہ ساری گاڑیاں کھلی جگہ پر کھڑی تھیں۔ اگر یہ عمارت کے نزدیک ہوتیں تو کہیں زیادہ نقصان ہوتا۔

سجاول بھی جلد ہی ہمارے پاس پہنچ گیا۔ میں نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور اسے بتایا۔ ”ہم بندہ لے آئے ہیں۔ ابھی الماری میں بند کیا ہے۔ صورتِ حال ذرا بہتر ہوتی ہے تو پھر اس سے بات کرتے ہیں۔“

سجاول نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ احاطے میں اب بہت سارے گارڈز اور ملازمین جمع ہو چکے تھے۔ علی اور قادر خان وغیرہ بھی نظر آ رہے تھے۔ سجاول نے دبی آواز میں کہا۔ ”ان لوگوں نے ثاقب اور اس کے ساتھی کو مار ڈالا۔“

”ہاں، ہم بھی دونوں کی لاشیں دیکھ کر آئے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”لگتا ہے کہ یہ کام آقا جان ہی کا ہے، وہ یہاں جس طرح کے کھیل چاہے کھیل رہا ہے۔ پہلے ان لوگوں کو بھگایا گیا ہے، پھر مار دیا گیا ہے۔“

میں نے دل میں سوچا۔ ’سجاول! تم نے بھی تو اپنے ڈیرے پر ایسا ہی کام دکھایا تھا۔ پہلے لڈو پیڑے والے کمرے میں (عقوبت خانے میں) کشمی افضل کو چھوڑا تھا پھر اسے بھاگنے کے ناکردہ جرم میں موت کی سزا دے ڈالی تھی......‘

”کیا سوچ رہے ہو تم؟“ سجاول نے کہا۔

”یہی کہ اگر یہ سارا ڈراما تھا تو اس ڈرامے سے ہم نے بھی تو کچھ فائدہ اٹھا ہی لیا ہے۔ رضوان اب ہمارے

پاس ہے۔"

"فائدہ تو تب ہو گا جب یہ بندہ کوئی پکا ثبوت دے سکے گا آقا جان کے خلاف۔"

"لگتا ہے کہ میری طرح تمہیں بھی یقین ہے کہ یہ دونوں تازہ قتل بھی آقا جان نے ہی کروائے ہیں۔"

سجاول نے میری بات کا جواب دینے سے پہلے گہری سانس لی اور اس کا صندوق جیسا سینہ کشادہ تر ہو گیا۔ اپنی تیکھی مونچھیں سہلا کر بولا۔ "دراصل میرے کانوں تک بھی کچھ اس طرح کی باتیں پہنچ رہی تھیں۔ میں نے ایک دن وڈے صاحب سے پوچھا تھا کہ باغی گروپ کا کیا بنا۔ اس نے بتایا کہ صغیر اور ناقب وغیرہ سمیت سب بند ہیں۔ ان کو ان کے کیے کی سزا ضرور ملے گی۔ مگر وڈے صاحب کی باتوں سے لگتا تھا کہ وہ انہیں بہت زیادہ سخت سزا دینا نہیں چاہتا۔ دوسری طرف آقا جان اس معاملے میں کسی طرح کی رعایت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کم از کم بروناٹی سے آنے والے سرغنہ ناقب اور اس کے ساتھی حارث کو تو وہ جان سے مار دینا چاہتا تھا تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔"

"اور اس نے مار دیا۔" میں نے کہا۔

"ہاں، آقا جان بڑا اکڑ ہے اور شاید کئی معاملوں میں وہ ٹھیک ہی ہے۔ وڈے صاحب کی نرم دلی اسے کئی معاملوں میں نقصان بھی پہنچاتی ہو گی۔"

"لیکن کئی معاملوں میں وہ خود بھی تو وڈے صاحب کو نقصان پہنچا رہا ہے۔" انیق نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "اگر یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ زینب کے خون کی غلط رپورٹ آقا جان کی مرضی سے ہوئی تو یہ کتنی بڑی بات ہے۔ سراسر دھوکا ہے وڈے صاحب اور ابراہیم کے ساتھ۔"

سجاول نے ناگواری سے انیق کی طرف دیکھا۔ وہ انیق کی بات کم ہی برداشت کرتا تھا لیکن انیق کی اس بات میں چونکہ خاصا وزن تھا اس لیے وہ کوئی سخت فقرہ کہنے سے باز رہا۔

انیق نے اسے بھی اپنی بڑی کامیابی سمجھا اور مطمئن انداز میں میری طرف دیکھا۔ اس کا یوں میری طرف دیکھنا سجاول کو پھر مشتعل کر گیا۔ وہ لال چہرے کے ساتھ بولا۔ "تم اپنی چونچ بند ہی رکھا کرو تو بہتر ہے۔ ابھی ہمارے پاس کیا ثبوت ہے کہ وہ غلط رپورٹ آقا جان نے کروائی یا یہ کہ لیڈی ڈاکٹر کو اس نے مروایا۔ بغیر ثبوت کے تو کچھ بھی کہا جا سکتا ہے۔ میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ تم...... نو کے بجائے سات مہینے میں ہی پیدا ہو گئے تھے یا یہ کہ تم نے جنس تبدیل کروائی ہے اور لڑکا ہے ہو......"

انیق کڑوا سا گھونٹ بھر کر رہ گیا۔

میں نے اس گفتگو کو برخاست کرنا مناسب سمجھا اور سجاول کے ساتھ اٹھ کر باہر آ گیا۔ رائفلیں ہمارے کندھوں سے جھول رہی تھیں۔ حلمی نے ہمیں صورت حال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ کس طرح ناقب اور اس کے ساتھی نے تہ خانے سے بھاگنے کی کوشش کی۔ کس طرح دو طرفہ فائرنگ میں ایک گاڑی کو آگ لگی اور موٹر سائیکلوں نے بھی آگ پکڑ لی۔ اس نے ناقب اور حارث کی ہلاکت کا بھی بتایا۔ بلکہ اس نے یہ بھی کہا کہ شاید حارث نے گرفتاری سے بچنے کے لیے خود کو گولی ماری ہے۔ دونوں لاشیں اٹھائی جا چکی تھیں۔ گارڈز میں سے دو افراد زخمی ہوئے تھے، انہیں اسپتال پہنچا دیا گیا تھا۔ حلمی یا کسی گارڈ کی بات سے بالکل یہ اشارہ نہیں ملا کہ کسی نے ہمیں ہنگامے کے دوران میں رہائشی حصے میں گھستے اور رضوان کو وہاں سے نکالتے دیکھا ہے۔

میں نے حلمی سے پوچھا۔ "وڈے صاحب اور اہلِ خانہ تو خیریت سے ہیں نا؟"

اس نے ملائشین لہجے کی اردو میں جواب دیا۔ "بالکل خیریت سے ہیں۔ صرف مس سنبل اور ایک دوسری خواص دھوئیں کی وجہ سے کچھ دیر کے لیے بے ہوش ہو گئی تھیں۔ اب وہ بالکل ٹھیک ہیں۔"

آقا جان نے ہم سے کوئی بات نہیں کی۔ اس کی تیوری مسلسل چڑھی ہوئی تھی اور وہ کرخت لہجے میں گارڈز کو مختلف ہدایات دینے میں مصروف تھا۔ کچھ گارڈز ان نہایت قیمتی موٹر بائیکس کا معائنہ کر رہے تھے جو کچھ دیر پہلے ایک قطار میں کھڑی تھیں مگر اب یہاں وہاں پڑی تھیں اور جل کر ڈھانچوں کی شکل اختیار کر گئی تھیں۔

یہ ہنگامہ سرد ہوتے ہوتے رات کے بارہ بج گئے۔ قریباً ساڑھے بارہ بجے کا وقت تھا جب میں نے بیڈ روم میں الماری کا دروازہ کھولا اور رضوان بی بی کو باہر نکالا۔ کھڑے کھڑے اس کی ٹانگیں اکڑ چکی تھیں۔ انیق بھی میرے ساتھ تھا۔ فی الحال ہم نے رضوان کو سجاول کے سامنے کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

رضوان کی حالت پتلی تھی۔ چہرے پر چوٹوں کے نشان ابھی تک موجود تھے۔ اس کا وزن کافی کم ہو چکا تھا۔ آنکھوں میں جیسے ایک ہراس سا جم کر رہ گیا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی۔ "اب گھبرانے کی بات نہیں۔ تم بالکل محفوظ ہو۔ پہلے نہا کر کپڑے بدلو، پھر اطمینان سے بات کریں گے۔"

”مجھے یقین نہیں آرہا کہ میں آپ کو اور اینی کو یہاں اس عمارت میں دیکھ رہا ہوں...... یہ سب کیسے ہوا ہے؟...... اور یہ آگ......؟“

”میں نے کہا ہے ناں یہ ساری باتیں ہوں گی، پہلے فریش ہوجاؤ۔“

قریباً ایک گھنٹے بعد رضوان کافی بہتر حالت میں ہم دونوں کے سامنے بیٹھا تھا۔

میں نے کہا۔ ”پہلے تم بتاؤ، تم پر کیا بیتی؟“

رضوان نے اگلے پندرہ بیس منٹ میں رک رک کر اور آنکھوں کی نمی صاف کر کر کے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔

ملنگی ڈیرے کی تباہی کے بعد مجاور کرنالی کی طرح ڈاکٹر ارم بھی اپنی جان بچانے اور بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ رضوان کو کھو کر وہ بالکل جنونی ہو رہی تھی۔ وہ اس کی تلاش میں چاند گڑھی جا پہنچی لیکن رضوان اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں سے نکل کر لاہور پہنچ چکا تھا۔ وہ اس کی ٹوہ لگاتی ہوئی لاہور چلی گئی۔ اس کے پاس رضوان کا ایک موبائل نمبر موجود تھا، وہ اس نمبر پر رضوان سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے فون پر رو رو کر رضوان کو بتایا کہ وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس نے کہا۔ ”رضوان تم نے میرے ساتھ بہت برا کیا۔ مجھے زخم دے کر ڈیرے سے نکل گئے۔ میں وہاں اس واش روم میں مر بھی سکتی تھی لیکن تمہاری محبت نے مجھے زندہ رکھا۔ میں وہ سب کچھ بھولنے کو اور تمہیں معاف کرنے کو تیار ہوں۔ بس تم میرے پاس واپس آجاؤ......“

رضوان اس کی شکل دیکھنے کا روادار نہیں تھا۔ اس نے اس کی غلامی میں بڑی اذیت جھیلی تھی مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ آسانی سے اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ اس نے کہا۔ ”ڈاکٹر، مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت دو۔“

وہ بولی۔ ”میرے پاس آجاؤ، پھر جتنا چاہے سوچ لینا۔ میں تمہیں دیکھے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میرا ایک ایک پل کانٹوں پر گزر رہا ہے۔“

رضوان اس سے خوف زدہ تھا۔ اس نے ٹال مٹول کر کے ایک دو ہفتے گزارے پھر ڈاکٹر ارم کا فون سننا بند کر دیا۔ ہر بندے کی کوئی نہ کوئی مجبوری ہوتی ہے۔ رضوان کی بھی مجبوری اس کی ایک بہن تھی۔ اس کا نام مہرین تھا۔ وہ اس سے دو سال چھوٹی تھی اور اسے بہت پیاری تھی۔ اس کی شادی مظفر آباد میں ہوئی تھی۔ اس کا ایک بیٹا تھا اور وہ اپنے پراپرٹی ڈیلر خاوند کے ساتھ خوش تھی۔ مگر ایک بدقسمتی مہرین کا راستہ دیکھ رہی تھی۔ مہرین کا خاوند ابرار، پردے والی سرکار اور کرنالی وغیرہ کا مرید تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اندھی بہری عقیدت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر ارم نے مجاور کرنالی کے ذریعے مہرین کے خاوند کو قابو کیا اور میاں بیوی کے درمیان زبردست قسم کا اختلاف پیدا کر دیا۔ ابرار کو یقین ہو گیا کہ مہرین اس پر تعویذ گنڈے کرا رہی ہے اور اس کی نیت میں فتور ہے۔ چند دن میں ہی مہرین کی مارکٹائی کی نوبت آ گئی۔ رضوان اس صورتِ حال سے آگاہ تھا اور بے حد حیران و پریشان تھا پھر ایک روز اسے اپنے سیل فون پر ڈاکٹر ارم کا ایک طویل ایس ایم ایس موصول ہوا۔ اس پیغام کا لب و لہجہ سخت تھا۔ ڈاکٹر ارم نے اس سے کہا کہ وہ فوراً اس سے ملے ورنہ مہرین کے سلسلے میں اس کی پریشانیاں بڑھتی جائیں گی۔ اس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں رضوان کو بتایا کہ ہاتھ پاؤں چلانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ وہ جتنا پھڑکے گا جال سخت ہوتا جائے گا۔ وہ پہلی فرصت میں اس سے ملے۔

رضوان اس عورت کی خصلت بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ وہ اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئی ہے اور اب کچھ بھی کر سکتی ہے۔ اپنی معصوم بے گناہ بہن کی زندگی کو عذاب بننے سے بچانے کے لیے وہ ایک دن ارم کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ رضوان نے ”کم“ بتایا۔ لیکن اس کے کم بتانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ اپنی بہن کے سکھ کے بدلے رضوان نے بدترین اذیتیں جھیلنا قبول کر لیں۔ ڈاکٹر ارم پہلے اسے خوشاب لے گئی پھر وہاں سے پارا ہاؤس میں لے آئی۔ اپنے ایک جاننے والے کے ذریعے اسے پارا ہاؤس کے اسپتال میں ملازمت مل گئی تھی۔ وہ ہفتے میں ایک بار فون پر اس کی بات اس کی بہن مہرین سے کروا دیتی تھی اور ساتھ ہی یہ بھی باور کرا دیتی تھی کہ اپنی بہن کی مسکراتی ہوئی آواز اسے تب تک ہی سنائی دے گی جب وہ بے دام کا غلام بنا رہے گا اور کسی بھی حکم پر چوں و چرا نہیں کرے گا۔

رضوان کی باتیں سن کر میری نگاہوں کے سامنے وہ سارا منظر گھوم گیا جو میں نے ڈاکٹر ارم کے قتل سے ایک رات پہلے اس کے اپارٹمنٹ میں دیکھا تھا۔ خوبرو رضوان کے لیے ارم کی محبت سراسر تشدد اور انتقام میں بدل چکی تھی۔ وہ اسے مسلسل نشے کے انجکشن لگا رہی تھی اور جانوروں سے بدتر سلوک کر رہی تھی اور پھر اس کے لیے قدرت کی لاٹھی حرکت میں آئی تھی۔ ارم کو کس نے قتل کیا اور کیوں؟ اس کا علم رضوان کو نہیں تھا۔ بہرحال وہ اس کی نگاہوں کے سامنے

اپنی جان کی بازی ہاری تھی۔ اس رات وہ کچن میں ارم کے لیے سوپ تیار کرنے کے بعد اس کے کپڑے استری کر رہا تھا، اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ ارم سستانے کے لیے لیٹی ہوئی تھی اور اونگھ رہی تھی۔ رضوان نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ دو افراد تیزی سے اندر آگئے۔ ان کے پیچھے دو اور داخل ہو گئے، ان کے چہروں پر اسکائی ماسک اور ڈھاٹے تھے۔ دو نے رضوان کو دبوچ لیا، دو نے اونگھتی ہوئی ارم کو چھاپ لیا۔ رضوان کو فرش پر گرا کر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا۔ رسی تو پہلے ہی اس کے گلے میں جھول رہی تھی۔ اسی رسی کے ساتھ رضوان کے ہاتھ پشت پر باندھ کر اور بُری طرح دھمکا کر اسٹور میں بند کر دیا گیا۔

ارم سخت مزاحمت کر رہی تھی۔ اسی مزاحمت کے دوران میں ایک حملہ آور کے چہرے سے نقاب کھسک گیا اور رضوان نے دروازے کے کی ہول سے اس کا چہرہ دیکھ لیا۔ وہ اسپتال کے سینئر گارڈز میں سے ہی ایک شخص تھا۔ بہرطور بے رحم گارڈز نے ارم کی ایک نہیں چلنے دی۔ انہوں نے کچن سے ہی ایک چھری حاصل کی اور اس کے پے در پے وار کر کے ارم کو لہولہان کر دیا۔ ہر وار پر اس کا جسم حملہ آوروں کی گرفت میں اچھلتا تھا اور وہ خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کرتی تھی۔ وہ ٹھنڈی ہو گئی تو حملہ آوروں نے اسے جوں کا توں چھوڑ دیا۔ اس کے بعد انہوں نے موقعِ واردات سے انگلیوں وغیرہ کے سارے نشانات صاف کیے۔ ان کی حرکات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس خونی واردات کو کوئی اور رنگ دینا چاہ رہے ہیں۔ انہوں نے کچن میں کچھ برتن توڑے۔ رضوان کی کلائی کی ٹوٹی ہوئی گھڑی کو ارم کی لاش کے پاس گرایا اور اس طرح کے کچھ مزید اقدام کیے۔ ان کی گفتگو سے رضوان کو اندازہ ہوا کہ وہ اسے بھی مار دینا چاہتے ہیں لیکن وہ اس کی لاش یہاں نہیں چھوڑیں گے بلکہ اس کے لیے وہ لانڈری کی ایک بڑی ٹرالی اپنے ساتھ لائے ہیں اور اس کے جسم کو اس میں چھپا کر یہاں سے نکال لے جائیں گے۔ خوش قسمتی سے رضوان کو اسٹور روم میں ایک ایسا ٹوٹا ہوا شیشہ مل گیا جس سے اس نے اپنے ہاتھ کی بندش کاٹ لیں اور ایک روشن دان کا اندرونی فریم اکھاڑ کر بھاگ نکلا۔ حملہ آوروں کو خبر ہونے تک وہ عقبی سیڑھیوں تک پہنچ چکا تھا۔ اس کا تعاقب کیا گیا مگر وہ گارڈ جیا کی دو باڑیں پھلانگ کر پارا ہاؤس کے بڑے اسٹور روم تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا (بعدازاں اس نے رہائشی حصے میں جا کر جس چھری سے سنبل کو دھمکایا تھا وہ اسے اسٹور روم سے ہی ملی تھی)

رضوان کی ساری روداد تو ہمیں معلوم ہو چکی تھی۔ اب اس کی آنکھوں میں گہرا تجسس نظر آ رہا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ ہم دونوں یہاں کیونکر اور کیسے پہنچے۔ میں نے اسے مختصر احوال سنایا۔ میں نے چلتی گاڑی سے تاجور کے پیچھے چھلانگ لگائی تھی اور پھر ہم دونوں سجاول کے ٹھکانے پر پہنچ گئے تھے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کا بیشتر حصہ میں نے رضوان کے گوش گزار کیا۔

آخر میں رضوان نے پوچھا۔ ”اب سجاول صاحب کہاں ہیں؟“

انیق نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ”اس شخص کے نام کے ساتھ صاحب لگانا ایسے ہی ہے جیسے گینڈے کو جناب عالی یا پھر ”یا حضرت“ کہہ کر بلانا۔ تم اسے سیدھا سیدھا امریش پوری کہہ سکتے ہو۔“

”اور وہ اس بات پر خوش ہو کر تمہیں سیدھا سیدھا قبر میں پہنچا دے گا۔“ میں نے رضوان سے کہا۔ رضوان سوالیہ نظروں سے کبھی میری اور کبھی انیق کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے رضوان کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس عاقبت نااندیش کی باتوں پر نہ جانا۔ اس نے تو عنقریب سجاول کے ہاتھوں انا للہ ہونا ہے یا کم از کم چار چھ ہڈیاں تڑوانی ہیں۔“

انیق چہکا۔ ”آپ جب میری ہڈیاں ٹوٹنے کی بات کرتے ہیں تو مجھے فوراً پہلوان حشمت یاد آ جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ بُرے سے بُرے کام میں بھی اچھائی کا پہلو ہوتا ہے۔ میری ٹوٹ پھوٹ ہو گی تو پہلوان حشمت سے ملنے کا موقع تو پیدا ہو گا۔ یقین کریں ان کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ لگتا ہے کہ زندگی کی کہانی میں کوئی رنگ ہی نہیں۔“

”لیکن ہمیں رنگ نظر آ رہے ہیں۔ تم اپنی چونچ ذرا بند رکھو۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا تو اس نے اُلو کی طرح گردن جھکالی۔

میں نے رضوان سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”اگر تمہیں کچھ لوگوں کی شکلیں دکھائی جائیں تو تم ان میں سے حملہ آور کا چہرہ پہچان لو گے۔ میرا مطلب ہے جس کا نقاب اس کے چہرے سے کھسکا تھا؟“

”ایک سو ایک فیصد جی۔“ وہ مغموم لہجے میں بولا۔ ”میں وہ منظر کبھی بھول نہیں سکتا ہوں۔ ڈاکٹر ارم دیوانوں کی طرح ہاتھ چلا رہی تھی۔ اس کا منہ اتنی سختی سے ڈھانپا گیا تھا کہ اس کی آواز نکل نہیں پا رہی تھی۔ اس نے استری اسٹینڈ کو گرانا چاہا تا کہ ہے تر اگر شور پیدا کر سکے لیکن ان لوگوں

نے اسے قربانی والے بکرے کی طرح اٹھا کر فرش پر پھینک دیا......"

میں رضوان کا خوب صورت چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اس کی بلوری آنکھوں میں تاسف تھا۔ "کیا تمہیں ڈاکٹر کی موت کا افسوس ہے؟" میں نے پوچھا۔

"شاید ہے۔ بے شک اس نے بہت برا سلوک رکھا میرے ساتھ...... لیکن کبھی کبھی وہ مجھے ڈاکٹر کے بجائے مریضہ لگتی تھی۔ شاید اسے علاج کی شدید ضرورت تھی مگر وہ کسی کی سنتی ہی کب تھی۔ وہ جس طرح دنیا سے گئی ہے اس کا مجھے ہمیشہ دکھ رہے گا۔ اس کے علاوہ بہت پریشانی بھی ہے۔ پتا نہیں ڈاکٹر کے قتل کی خبر کس طرح اس کے وارثوں تک پہنچے گی۔ اگر ان لوگوں نے بھی یہی سمجھا کہ ڈاکٹر کو میں نے مارا ہے تو پھر......" وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ اس کے گلے میں جیسے پھندا سا لگ گیا تھا۔

میں اور اتنیق سمجھ گئے کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں اپنی پیاری بہن کی تصویر تھی اور اس کے مستقبل کے اندوہناک اندیشے تھے۔

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اگر تم اپنی بہن یا دوسرے وارثوں کی طرف سے فکر مند ہو تو یہ فکرمندی ذہن سے نکال دو۔ ہم سب سنبھال لیں گے۔ تم بس اپنی توجہ اس بات پر رکھو کہ ڈاکٹر ارم کے اصل قاتل کو پکڑوانا ہے۔"

رضوان نے ڈری ڈری اور الجھی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا۔ "مجھے لگتا ہے جی کہ آپ اس قتل کی وجہ کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتے ہیں۔ شاید یہ کوئی بہت سنگین معاملہ ہے۔"

"ہاں کچھ لوگوں کے لیے بہت سنگین ہے۔ دراصل...... یہ ایک غلط ٹیسٹ رپورٹ کا معاملہ ہے۔ اس غلط فہمی یعنی بوگس رپورٹ کی وجہ سے پارا فیملی کا ایک بڑا نقصان ہونے والا تھا۔ سمجھو کہ اہلِ خانہ میں سے کسی کی قیمتی جان جانے والی تھی۔ لگتا یہی ہے کہ ڈاکٹر ارم سے یہ بوگس رپورٹ تیار کروانے والے نے ہی اس کی جان لی ہے۔ وہ اپنا جرم چھپانا چاہ رہا ہے اور وہ اس پارا ہاؤس کا ایک اہم ترین شخص ہے۔"

کچھ دیر بعد ہم نے سجاول کو بھی وہاں بلا لیا اور رضوان سے اس کا مکمل تعارف کرایا۔ سجاول کی نہایت دبنگ شخصیت نے رضوان کو بھی بے حد متاثر کیا۔ وہ اس کے سامنے دبا دبا نظر آنے لگا۔

سجاول سے مشورہ کرنے کے بعد میں نے فوراً قادر خان کو سجاول والے پورشن میں بلایا۔ قادر خان میرا احسان مند تھا اور میری بات مانتے ہوئے ہر خطرہ مول لینے کو تیار ہو جاتا تھا۔ حالانکہ اسے معلوم تھا آقا جان کی نگاہ یہاں ہر معاملے پر بے حد سخت ہے پھر بھی جب میں نے اس سے کہا کہ مجھے اسپتال کے اردگرد موجود گارڈز کا ڈیٹا چاہیے تو اس نے ایک گھنٹے کے اندر اندر مجھے معلومات فراہم کر دیں۔ وہ اپنے سیل فون پر تقریباً پچیس سیکیورٹی گارڈز کا ڈیٹا لے کر آ گیا۔ ہر گارڈ کی تصویر اور کوائف وغیرہ اس ڈیٹا میں موجود تھے۔

میں نے تنہائی میں رضوان سے کہا کہ وہ پوری یکسوئی سے ان تصاویر کو دیکھے اور معلوم کرے کہ جس گارڈ کو اس نے موقعِ واردات پر دیکھا وہ ان لوگوں میں موجود ہے یا نہیں۔

رضوان نے تصاویر دیکھنا شروع کیں۔ نویں دسویں تصویر پر ہی وہ بری طرح ٹھٹک گیا اور اس نے ایک تصویر پر انگلی رکھ دی۔

"یہی ہے وہ بندہ۔" اس نے پورے یقین سے کہا۔

یہ بھاری مونچھوں والا ایک تیس بتیس سالہ شخص تھا۔ ناک غیر معمولی طور پر موٹی تھی اور بال پیشانی سے اڑے ہوئے تھے۔ اسے دیکھ کر رضوان کا سفید رنگ زردی مائل ہو گیا تھا۔ یقیناً اسے قتل کی رات کے مناظر یاد آ گئے تھے۔

میں نے اس بندے کے کوائف دیکھے اس کا نام وحید تھا۔ ذات ڈوگر، سکنہ سمبڑیال لکھا ہوا تھا۔ رضوان نے باقی تصویریں بھی دیکھیں اور ایک بار پھر تصدیق کی کہ یہی وہ بندہ ہے جو قتل کی رات دیگر تین بندوں کے ساتھ ڈاکٹر ارم کے اپارٹمنٹ میں گھسا اور واردات میں شریک ہوا۔

میں نے فوراً دوبارہ قادر خان کو بلایا اور اسے وحید ڈوگر کی تصویر دکھا کر اس کے بارے میں پوچھا۔ قادر خان کو ابھی کچھ پتا نہیں تھا کہ ہم یہ چھان پھٹک کس لیے کر رہے ہیں۔ وہ تصویر دیکھ کر بولا۔ "یہ تو آقا جان کا خاص الخاص بندہ ہے۔ بنگلے میں آقا جان کے باڈی گارڈز کے ساتھ بھی رہ چکا ہے۔ کوئی ایک مہینا پہلے اسے آقا جان نے ہی پارا ہاؤس میں شفٹ کرایا تھا۔"

اہم ترین بندہ ہمارے سامنے آ چکا تھا۔ اس کو چار چوٹ کی مار لگائی جاتی تو یہ سب کچھ بک سکتا تھا۔ مجھے اپنے جسم میں سنسناہٹ محسوس ہوئی۔ سجاول کا چہرہ بھی تمتما گیا۔ ہمیں لگا کہ آقا جان کے گرد گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔

میں نے قادر خان سے کہا۔ "اس بندے کا پتا کرو۔ یہ اس وقت کہاں ہے؟ لیکن اس کو کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے۔"

خاموشی سے آکر مجھے بتاؤ۔“

وہ بولا۔ ”شاہ زیب بھائی! مجھے بتا کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے پتا ہے کہ وہ پارا ہاؤس میں نہیں ہے۔ وہ بھاگ چکا ہے۔ اسے ڈھونڈا جارہا ہے۔“

”ڈھونڈا جارہا ہے؟“ میں ششدر رہ گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک طرح کی مایوسی رگ و پے میں اترتی محسوس ہوئی۔

”جی ہاں، کوئی چار دن پہلے اس نے اسپتال کا لاکر کھولا۔ اس میں ڈاکٹروں اور نرسوں وغیرہ کی تنخواہ کے لیے تقریباً سات لاکھ روپے پڑے تھے۔ وہ نکال کر لے گیا۔ سچ کہتے ہیں کہ جب چوکیدار ہی چور بن جائے تو پھر سب کچھ ہوسکتا ہے۔ پولیس میں رپورٹ درج ہوگئی ہے اور اب اسے ڈھونڈا جارہا ہے۔“

میں سر پکڑ کر رہ گیا۔ یہاں سازش کے تانے بانے بڑے گنجلک تھے۔ جرم کرنے والا ہر نشان مٹا رہا تھا۔ لگ بھی رہا تھا کہ اس وحید نامی بندے کو بھی جان بوجھ کر منظر سے ہٹایا گیا ہے۔ سازشی جان چکا تھا کہ دباؤ کس مہرے پر آسکتا ہے۔ اس نے بساط پر سے اس مہرے کو اوجھل کردیا تھا۔ اور سازشی کون تھا؟ نوے فیصد امکان یہی تھا کہ وہ آقا جان ہی ہے۔

انیق نے کہا۔ ”ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے سو جھوٹ بولنے پڑ جاتے ہیں۔ جہانگیر کی بدویانتی پر پردہ ڈالنے کے لیے اس کے پارٹنروں کو کیا کچھ کرنا پڑ رہا ہے۔“

سب کچھ ٹائیں ٹائیں فش تھا۔ ایک بار پھر ہم اسی جگہ کھڑے تھے جہاں ڈاکٹر ارم کے قتل کے وقت تھے۔ اگر رضوان کو کسی گواہی کے لیے پیش کیا جاتا تو شاید اس کی یہ گواہی تو مان لی جاتی کہ اس نے ڈاکٹر کی جان نہیں لی۔ مگر یہ وکیل ہرگز نہ مانی جاتی کہ ڈاکٹر کے قتل میں آقا جان ملوث ہے۔ اس کے لیے مضبوط تر ثبوت کی ضرورت تھی اور یہ ثبوت اس وحید ڈوگر نامی گارڈ کے اعترافی بیان سے ہی مل سکتا تھا۔ وہ گارڈ اب اوجھل ہوچکا تھا۔

رات کو میری ملاقات ایک بار پھر تو عمر ابراہیم سے ہوئی۔ وہ کافی کمزور اور پریشان نظر آتا تھا۔ اب وہ اپنے دل کی بات کھل کر مجھ سے کرنے لگا تھا اور یہ میری ایک بڑی کامیابی تھی۔ اس نے مجھے واضح لفظوں میں بتایا کہ وہ شادی نہیں کرے گا اور اگر کرے گا تو زینب سے کرے گا۔ اس نے مجھے اس نئی لڑکی کے بارے میں بھی بتایا جو زینب کے متبادل کے طور پر یہاں پہنچائی گئی تھی، دونوں صاحب کی خواہش تھی کہ ابراہیم اس لڑکی کو اپنی دلہن کے طور پر قبول کرلے۔

ابراہیم نے مجھے اس کی تصویر دکھائی۔ وہ بھی وسطی پنجاب کے کسی علاقے کی لگتی تھی۔ اس نے حجاب کیا ہوا تھا۔ وہ درمیانی شکل وصورت کی تھی مگر مٹاپا واضح تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ مٹاپا پچھلے آٹھ دس ماہ میں ہی اس پر چڑھا تھا۔ غالب خیال یہی تھا کہ اسے IMMUNE والے زہر کی جو ڈوز دی جاتی رہی ہے، یہ اسی کا ردعمل ہے۔ لڑکی کو ایک نظر دیکھ کر ہی کہا جاسکتا تھا کہ وہ ابراہیم کی دلہن بننے کے لائق نہیں ہے۔ مٹاپے کی وجہ سے اس کی آنکھیں چھوٹی اور ناک موٹی دکھائی دینے لگی تھی۔ خیر یہ تو ظاہری خامیاں تھیں لیکن اگر یہ لڑکی حسین وجمیل بھی ہوتی تو یقیناً ابراہیم اسے دلہن کے طور پر قبول نہ کرتا۔ دلہن کے طور پر اس کے دل ودماغ میں زینب پوری طرح نقش ہوچکی تھی۔

ابراہیم نے کہا۔ ”اس لڑکی کے بھی ٹیسٹ ہوئے ہیں۔ طبی لحاظ سے تو یہ میرے لیے تقریباً فٹ ہے لیکن میں اس سے شادی کا سوچ بھی نہیں سکتا اور میں نے والد اور والدہ کو یہ بات صاف بتادی ہے۔“

”کیا آپ چاہتے ہیں کہ اب زینب کو دوبارہ زہر کی ڈوز دی جائے اور تیار کیا جائے؟“

اس نے اپنا ماتھا مسلا۔ ”میں کچھ بھی نہیں چاہتا۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا۔“

”ابراہیم! مسئلے کا وہ حل سوچو جو تمہارے لیے اور تمہاری بیوی کے لیے مستقبل میں مسئلے پیدا نہ کرے۔“

”آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟“

”شاید آپ سے کچھ باتیں چھپائی بھی جارہی ہیں یا ان کو غلط طریقے سے بیان کیا جارہا ہے۔ آپ زیادہ دور نہ جائیں۔ نیٹ پر ہی جا کر دیکھ لیں۔ آپ کو پتا چل جائے گا کہ اس قسم کی IMMUNITY رکھنے والوں کی اولاد میں بھی زبردست میڈیکل پیچیدگیاں نمودار ہوسکتی ہیں۔ آپ ایک پوری نسل کو ایک طبی مسئلے سے دوچار کرسکتے ہیں۔“

”یہ سب کچھ میرے ذہن میں بھی آتا ہے اسی لیے تو میں زینب کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کررہا ہوں...... مگر......“

وہ کہتے کہتے خاموش ہوگیا مگر اس کے تاثرات وہ سب کچھ بتارہے تھے جو وہ کہنا چاہتا تھا۔ وہ کہنا چاہتا تھا، وہ سادہ سی گم صم سی لڑکی میرے اندر بہت گہرائی تک اتر چکی

ہے۔ وہ میرے قریب آتے آتے مجھ سے بہت دور چلی گئی ہے۔ اب میں اسے ذہن سے نکال نہیں سکتا۔ جتنا اس کی سوچوں سے دور بھاگتا ہوں اتنا ہی وہ مجھ کو گھیر لیتی ہیں۔

میں نے قیمتی صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''ابراہیم! آپ مجھے دل کے بہت اچھے لگے ہیں۔ میں بھی آپ کے بارے میں سوچتا ہوں۔ آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن میں تب ہی کچھ کر سکوں گا جب آپ مجھے اس مسئلے کی بنیاد کے بارے میں بتائیں گے۔ آپ کے والدین آپ سے اتنا پیار کرتے ہیں، اس کے باوجود وہ آپ کو کھانے میں زہر کیوں دیتے ہیں۔ یقیناً اس کے پیچھے کوئی خاص مجبوری ہی ہوگی۔ میں اس مجبوری کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔''

ابراہیم کے دبلے پتلے چہرے پر ایک بار پھر شدید تذبذب نظر آیا۔ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری اور الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''ابراہیم! میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں، آپ جو کچھ بتائیں گے، ہمیشہ میرے سینے میں رہے گا۔ اگر میں اپنے وعدے سے پھر دوں تو آپ میری جان لے لیجیے گا۔''

میں نے کچھ ایسے اخلاص سے کہا تھا کہ وہ چونک کر میری جانب دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر نیم رضامندی کے آثار نظر آنے لگے۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر کچھ دیر تمہید باندھنے میں صرف کی اور مجھ سے دوبارہ رازداری کا عہد لیا۔ اس کے بعد بولا۔ ''آپ نے والد صاحب کو دیکھا ہے۔ ان میں آپ کو کیا علیحدہ چیز نظر آتی ہے؟''

میں نے ذرا توقف کر کے کہا۔ ''ان کے چہرے پر اور جلد پر سرخ داغ......؟''

''یہ داغ پیدائشی نہیں ہیں اور نہ کسی بیماری کی وجہ سے ہیں......''

اچانک ابراہیم کے سیل فون پر کال کے سگنل آئے۔ اس نے اسکرین دیکھنے کے بعد کال ریسیو کی اور بات کرنے لگا۔ وہ ملائی زبان میں بول رہا تھا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ اپنی والدہ بڑی بیگم سے بات کر رہا ہے۔ کوئی اہم ایشو تھا۔ ابراہیم کے چہرے سے بھی پریشانی مترشح تھی۔

مجھے لگا کہ شاید اسی شادی اور زینب والے معاملے پر بات ہو رہی ہے لیکن جلد ہی یہ اندازہ غلط ثابت ہو گیا۔ کہیں کہیں انگلش کے الفاظ بھی استعمال ہو رہے تھے۔ ان الفاظ سے پتا چلا کہ یہ پرسوں پیش آنے والا وہی سنگین معاملہ ہے جس میں ثاقب اور اس کے ساتھی حارث کو ہلاک کر دیا گیا ہے۔ ان دونوں افراد کے حوالے سے وڈے صاحب اور شاید بڑی بیگم بھی نرم رویہ اختیار کرنا چاہتے تھے مگر آقا جان نے انہیں مار ڈالا تھا۔ اس کا یہ اقدام اگر درست بھی تھا تو بھی اس کے نتیجے درست نکلنے والے نہیں تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ابراہیم اور اس کی والدہ دونوں ڈرے ہوئے ہیں اور شاید دیگر اہلِ خانہ کا بھی یہی حال ہے۔ ایسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی ایسے شخص سے ڈر رہے ہیں جو ان سے کہیں زیادہ طاقتور ہے اور انہیں اس اقدام کی سزا دے سکتا ہے۔

اس گفتگو کے بعد ابراہیم کا موڈ کافی خراب ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش بھی ہے۔

اس نے بے چینی کے عالم میں اپنی نوکیلی داڑھی میں انگلیاں چلائیں۔ پھر میری طرف دیکھ کر جھجکتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آپ ابھی جائیں۔ پھر بات کریں گے۔''

میں نے اٹھ جانا مناسب سمجھا اور اس کے عالیشان کمرے سے نکل کر کوریڈور میں آ گیا۔

پارا ہاؤس کے اندر بہت کچھ اسرار میں پنہاں تھا۔ بھاری دبیز پردوں کے پیچھے کوئی انجانی کہانی چل رہی تھی۔ اب آہستہ آہستہ یہ بات کھل رہی تھی کہ آقا جان ہی یہاں کرتا دھرتا کا کردار ادا کر رہا تھا۔ اس میں بہت سی خامیاں بھی تھیں لیکن وہ ان خامیوں کو کمال ہوشیاری سے اوجھل رکھتا تھا اور جو خامیاں اہلِ خانہ کی نظر میں آ بھی جاتی تھیں، ان سے چشم پوشی کی جاتی تھی۔

کوریڈور کے آخری سرے پر آقا جان سے آمنا سامنا ہوا۔ اس نے مجھے کڑی نظروں سے گھورا لیکن بولا کچھ نہیں۔ ابراہیم سے میرا بڑھتا ہوا تعلق اسے بالکل پسند نہیں تھا۔ کوریڈور کے آخری سرے سے تھوڑا آگے، بڑے فوارے کے پاس علمی اور کمال احمد کھڑے دکھائی دیے، ان کے چہروں پر بھی گہری سنجیدگی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ پارا ہاؤس کے سارے اہم لوگ کسی پریشانی میں مبتلا ہیں اور یہ پریشانی پرسوں سرغنہ ثاقب اور حارث کی ہلاکت کے بعد شروع ہوئی تھی۔

مجھے کچھ جھنجلاہٹ بھی ہو رہی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میرے اور ابراہیم کے درمیان کافی اچھا ماحول بنا ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ ابراہیم زہرخورانی والے اسرار پر سے پردہ اٹھانے پر رضامند ہو گیا ہے مگر بڑی بیگم کی کال

نے سارا معاملہ چوپٹ کر دیا تھا۔ ابراہیم نے بات شروع کرتے ہوئے ان سرخ داغوں کا ذکر کیا تھا جو وڈے صاحب کے جسم پر پائے جاتے تھے۔ میرے علم میں اب تک یہی تھا کہ چند برس پہلے وڈے صاحب کو کوئی عارضہ لاحق ہوا تھا جس کے بعد اس کے جسم پر یہ داغ نمودار ہوئے اور اس کی قوتِ سماعت پر بھی اثر پڑا۔ لیکن اب ابراہیم نے تھوڑی دیر پہلے کہا تھا کہ یہ داغ کسی بیماری کا نتیجہ نہیں ہیں، تو کیا ان کا تعلق زہر خورانی سے تھا؟

ابھی میں کوریڈور سے چند قدم ہی آگے گیا تھا کہ ٹھٹک کر رک گیا۔ رہائشی حصے کی طرف سے ایک دم رونے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ یوں لگا جیسے ایک ساتھ کئی عورتوں نے نوحہ بلند کیا ہو۔ آوازیں مدھم تھیں مگر مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ ان میں شاید بڑی بیگم کی آواز بھی ہے۔

میں نے دیکھا کوریڈور کے آخری سرے پر کھڑے آقا جان کا چہرہ دھواں دھواں سا ہو گیا ہے۔ وہ تیزی سے اندرونی حصے کی طرف چلا گیا پھر شاید دروازے وغیرہ بند کر دیے گئے تھے، آوازیں معدوم ہو گئیں۔

میرے ذہن میں وہی چند منٹ پہلے والے مناظر آ گئے۔ ابراہیم بڑی پریشانی کے عالم میں والدہ سے باتیں کر رہا تھا اور میرے قیافے کے مطابق اس گفتگو کا تعلق ثاقب اور اس کے ساتھی کی موت سے ہی تھا۔ تو کیا ابھی تھوڑی دیر پہلے جو آہ و فغاں بلند ہوئی تھی، اس کا تعلق اسی واقعے سے جڑتا تھا۔

میں، انیق اور سجاول کے پاس واپس پہنچا۔ وہ جاننا چاہ رہے تھے کہ میرے اور ابراہیم کے درمیان کیا گفتگو ہوئی ہے لیکن میں نے انہیں جو کچھ بتایا اس نے انہیں حیران کیا۔

میں نے کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ آقا جان نے دلیری دکھاتے ہوئے ثاقب اور حارث کو مار تو ڈالا ہے لیکن اس کا نتیجہ پارا ہاؤس والوں کے لیے اچھا نہیں نکلا۔ وہاں اندر رونا پیٹنا مچا ہوا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے کوئی خاص واقعہ ہو گیا ہے۔"

"کہاں؟" سجاول نے پوچھا۔

"ہو سکتا ہے کہ یہاں ہوا ہو...... یا پھر بروناکی میں...... لیکن ہوا ضرور ہے۔"

"شاید سنبل کچھ بتا سکے۔" انیق نے کہا۔

سجاول ترخ کر بولا۔ "تم ایسا کرو کہ جا کر اپنی اس اماں کی گود میں ہی بیٹھ جاؤ۔ وہ جو جو سیانی جائے گی، تم کو بتاتی جائے گی۔ تمہارے دماغ میں شاید گوبر بھرا ہوا ہے، اگر ہم اس طرح ہر جگہ تمہاری اس والدہ (سنبل) کا استعمال کریں گے تو وہ پکڑی جائے گی اور سب جوتے کھا کر یہاں سے نکلیں گے۔"

سجاول کی بدزبانی سے انیق کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ اپنے غصے کو دباتے ہوئے بولا۔ "سردار اماں بہن کو بیچ میں نہ لاؤ۔ یہ ٹھیک نہیں ہے......"

"اوئے خنزیر کے بچے، آگے سے زبان چلاتا ہے۔" سجاول پھٹ پڑا۔

اس سے پہلے کہ وہ انیق کا گریبان پکڑ لیتا اور کوئی خطرناک کارروائی شروع ہو جاتی، میں دونوں کے درمیان آ گیا۔ میں نے گرانڈیل سجاول کو اپنی بانہوں میں لے لیا اور انیق کو اشارہ کیا کہ وہ باہر نکل جائے۔ وہ فوراً میری ہدایت پر عمل کرتا تھا مگر اس مرتبہ اس نے نہیں کیا۔ غصے بھرے لہجے میں بولا۔ "شاہ زیب بھائی! گالی مجھ سے برداشت نہیں ہو گی۔ آپ سردار کو سمجھا لیں۔"

"اوئے چٹنی بنا دوں گا تیری...... دفع ہو جا یہاں سے۔"

"جا رہا ہوں۔" وہ طیش سے بولا اور باہر نکل گیا۔ اسے بہت کم غصہ آتا تھا لیکن آخر انسان تھا۔ آج بیچ گیا تھا۔

اگلا آدھ گھنٹا میں نے علیحدہ علیحدہ سجاول اور انیق کو سمجھانے بجھانے میں صرف کیا۔ معاملہ کسی حد تک سنبھل گیا۔ سجاول نے زور دیا کہ جب وہ بات کر رہا ہو تو انیق بیچ میں نہ بولا کرے۔ میری اس مفاہمتی گفتگو کے دوران میں ہی چند گاڑیاں تیز رفتاری سے پارا ہاؤس میں داخل ہوئیں۔ سیاہ رنگ کی شاندار بیوک کو دیکھ کر میں پہچان گیا کہ نوجوان سیاست زادہ شکیل داراب "تشریف" لایا ہے۔ ہم نے کافی فاصلے سے اسے دیکھا۔ وہ کریم کلر کے پینٹ کوٹ میں تھا۔ اردگرد باوردی گارڈز تھے اور ہٹو بچو کا شور تھا۔ وہ بڑے تیز قدم اٹھاتا ہوا اندرونی حصے میں اوجھل ہو گیا۔ اس کی آمد یقیناً پارا ہاؤس کی موجودہ صورتِ حال اور ہر دم بڑھتی ہوئی بے چینی کے حوالے سے ہی تھی۔

بند دروازوں اور بھاری پردوں کے پیچھے کچھ ہو رہا تھا۔ کوئی ہلچل سی تھی۔ میں نے سوچا کہ جاناں کو فون کروں شاید وہ کچھ جان گئی ہو لیکن یہاں فون کرنا ہرگز خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کال ٹریس اور ریکارڈ ہو سکتی تھی۔ بہر حال ہماری یہ مشکل ایک اور طرح سے آسان ہو گئی اور اس طرح

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر 5-L / 79 ڈاکخانہ 5.L / 78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

2016
ماہنامہ
کراچی
پاکیزہ
انجم انصار اور رفعت سراج ......کے قسط وار ناولوں کی دلفریب اقساط
دو ثمن بلال کا سلسلے وار ناول ...... اے عشق تیرے ہیں کھیل عجب کا خوب صورت اختتام
خوب صورت عنوان اور پر اثر بیان لیے سحر ساجد کا دلنشین ناولٹ ...... من جانبازم
سیما رضا ردا کی دلکش تحریر ...... ہم کو عشق بد نام کیا ناول کی صورت
محرم الحرام کی مناسبت سے فلسفۂ شہادت پر اختر شجاعت کا پر فکر مضمون
نزہت اصغر ......
وہ آئے بزم میں ...... ملاقات کرائیں گی معروف
رائٹر ثمینہ عظمت علی سے
ان کے علاوہ
شگفتہ شاہ، نیلم احمد بشیر کی خصوصی تحریروں کے ساتھ ساتھ پڑھیے ام ایمان،
عقیلہ حق، عنیزہ سید، ہاجرہ ریحان، فرحین اظفر، نادیہ احمد،
صدف آصف، و دیگر مایہ ناز لکھاریوں کی حسین کاوشیں

آسان ہوئی کہ ہم خود بھی دنگ رہ گئے۔ شکیل داراب اور پارا ہاؤس کے بڑوں کے درمیان ہونے والی گفتگو رات قریباً دس بجے تک جاری رہی۔ اس دوران میں دو تین اور قیمتی گاڑیاں بھی پارا ہاؤس میں آئیں اور باہر گئیں۔ ایک گاڑی نے مسلسل کئی چکر لگائے۔

رات قریباً ساڑھے دس کا عمل تھا جب انچارج گارڈ قادر خان ہمارے پاس پہنچا اور اس نے ہمیں اطلاع دی کہ محترم شکیل داراب صاحب ہم سے ملنا چاہتے ہیں۔ یہ غیر متوقع صورتِ حال تھی۔ بہرحال اتنا یقین تو مجھے تھا کہ جلد یا بدیر شکیل سے تفصیلی ملاقات ہونی ہے۔ مہمان خانے میں شکیل داراب کی آمد کی خبر نے جیسے ہلچل سی مچادی۔ فالتو دروازے بند کردیے گئے، سیکیورٹی الرٹ ہوگئی۔ قریباً پانچ منٹ بعد گورا چٹا، وجیہہ شکیل داراب ہمارے درمیان موجود تھا۔ آج پہلی بار میں اسے کچھ منتشر اور تھکا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اس کی سرمئی ٹائی کی ناٹ ڈھیلی تھی اور بال کچھ بکھرے ہوئے تھے۔

''کیسے ہو شاہ زیب؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''جیسا بھی ہوں، آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔''

وہ بولا۔ ''تم سے پوچھنے کو تو بہت کچھ ہے۔ مثلاً یہ کہ وعدے کے مطابق تم ڈنمارک واپس کیوں نہیں گئے۔ چاند گڑھی میں تم کیا کرتے رہے ہو؟ اور سجاول کے ساتھ تمہارا تعلق کب اور کیسے بنا؟ لیکن میں یہ سب کچھ نہیں پوچھوں گا۔ سمجھو کہ حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے ہیں کہ میں ان باریکیوں میں پڑنا نہیں چاہتا۔''

میں نے کہا۔ ''پہلے آپ مجھے یہ بتائیں کہ پارا ہاؤس میں خیریت تو ہے ناں۔ میں نے کچھ دیر پہلے اندر سے رونے دھونے کی آوازیں سنی تھیں۔ دل میں وسوسے اٹھ رہے ہیں۔''

''پارا ہاؤس میں تو خیریت ہی ہے لیکن کہیں اور... خیریت نہیں ہے۔ ایک بڑا فساد ہوگیا ہے۔ ایک اہم شخص کی موت بھی ہوئی ہے جس کی وجہ سے پارا ہاؤس کے اندر سوگ کی کیفیت ہے۔ میں اسی سلسلے میں تم سے اور سجاول سے ایک اہم بات کرنے آیا ہوں۔''

''آپ کہیں۔ ہم سن رہے ہیں۔'' سجاول بولا۔

شکیل نے ذرا چونک کر سجاول کی طرف دیکھا۔ جیسے پہلی دفعہ اس کی طرف متوجہ ہوا ہو۔ گہری سانس لے کر بولا۔ ''لالہ نظام اکثر تمہارا نام لیا کرتا تھا، اب اس کا بھائی وریام تمہارا نام لیا کرتا ہے۔ وہ دونوں بتاتے رہے ہیں کہ تم کام کے بندے ہو۔ یہاں پارا ہاؤس پر جو حملہ ہوا تھا اس میں، میں نے خود بھی تمہاری اور شاہ زیب کی کارکردگی دیکھی ہے۔ میں بہت خوش ہوا ہوں۔''

سجاول نے کہا۔ ''میں بھی لالہ نظام اور وریام سے آپ کا نام سنتا رہا ہوں اور آپ تو ویسے بھی ایک مشہور سیاست داں ہو۔ آپ کی تصویریں اخبار اور ٹی وی پر بھی آتی رہتی ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ کسی نہ کسی دن آپ سے ملاقات ضرور ہوگی لیکن اس طرح ہوگی یہ پتا نہیں تھا۔ ثاقب وغیرہ نے جب دوسری منزل پر آپ کو گن پوائنٹ پر رکھا ہوا تھا، میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ آپ کو اس حالت میں یہاں سے نکلنے نہیں دوں گا۔''

شکیل نے تعریفی نظروں سے اسے دیکھا۔ میں اندر ہی اندر حیران ہو رہا تھا۔ شکیل داراب عوامی نمائندہ ہونے کا دعوے دار تھا۔ لوگوں کو دن رات اخلاق اور انسانیت کے بھاشن دیتا تھا، لیکن ایک ڈکیت سے اس کے ناتے تھے۔ براہِ راست نہ سہی، لالہ نظام اور وریام کے ذریعے سہی لیکن سجاول کہیں نہ کہیں شکیل کی گڈ بکس میں تو تھا اور یہ سجاول ان گنت بے گناہوں کا خون کرچکا تھا، لوگوں کی مال و جان اور عزت اس کی ٹھوکروں میں رہتی تھی۔ وہ سجاول کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی اپنے ہاتھوں میں آنے والے گوہرِ نایاب کو دیکھتا ہے اور سجاول اسے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے کوئی پرستار کسی بہت بڑے فنکار کا دیدار کرتا ہے اور دیکھا جائے تو دونوں قریب قریب ایک ہی ''فیلڈ'' سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک اپنے بول بچن اور وعدوں کے ذریعے عوام الناس کو لوٹتا تھا اور دوسرا ہتھیاروں کے ذریعے۔

شکیل نے امپورٹڈ سگریٹ نکال کر اپنے سرخ و سپید ہونٹوں میں دبایا اور ایک نہایت قیمتی لائٹر نکالا جس میں ڈائمنڈ لگا ہوا تھا۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور بڑی نفاست سے کش لے کر بولا۔ ''ریان فردوس صاحب ایک بڑی مشکل میں ہیں۔ برونائی میں ان کی پرانی خاندانی دشمنی ہے۔ اس دشمنی کی وجہ سے ہی وہ اپنا وطن چھوڑ کر یہاں پاکستان آئے اور اس دور دراز جگہ پر خود کو ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ لیکن ان لوگوں نے یہاں بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ تازہ ترین واقعہ وہی ہے جو چند دن پہلے تم لوگوں کے سامنے ہوا۔ ثاقب اور اس کے تین ساتھی یہاں پاکستان پہنچے۔ پوری سازش تیار کی اور پارا ہاؤس پر ہلا بول دیا۔ ان کے ارادے نہایت خطرناک تھے۔ وہ بڑی بیگم کو اغوا کرنا چاہ رہے تھے۔ ناکامی کے بعد انہوں نے ابراہیم کو

اغوا کیا اور کسی نامعلوم جگہ پر لے جانے کی کوشش کی۔ یہ ایک نہایت سنگین کارروائی تھی جو ناکام ہوگئی اور اس کو ناکام بنانے میں تم لوگوں کی ہمت کا بھی بہت دخل ہے۔''

شکیل داراب نے ذرا توقف کر کے اپنے قیمتی سیل فون کو چیک کیا اور اسے سائیلنٹ پر کرتے ہوئے بولا۔ ''ناقب اور اس کا ساتھی حارث پکڑے گئے تھے۔ ریان فردوس صاحب ان کو سزا دینا چاہتے تھے لیکن زیادہ سخت نہیں۔ درحقیقت وہ اپنے دشمنوں سے ہمیشہ بہت محتاط رہے ہیں۔ وہ ان کی فطرت کو بڑی اچھی طرح جانتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جیسے تیسے وقت گزرتا رہے۔ لیکن کبھی کبھی حالات اپنی مرضی کے رخ پر خود ہی چل نکلتے ہیں۔ یہاں پاراہاؤس میں بھی یہی کچھ ہوا ہے۔ ناقب اور حارث نے موقع پاکر تہ خانے سے بھاگنے کی کوشش کی اور مارے گئے۔ ان کی موت کی وجہ سے وہاں برونائی میں شدید ردِعمل ہوا ہے......''

اس موقع پر میرا دل چاہا کہ شکیل داراب کو اپنی معلومات سے آگاہ کروں اور اسے بتاؤں کہ یہ واقعہ ہوا نہیں ہے بلکہ اسٹیج کیا گیا ہے اور اس کا ذمے دار یقیناً آغا جان ہے لیکن مجھے ٹھیک سے اندازہ نہیں تھا کہ میرے اس انکشاف کا ردِعمل کیا ہوگا، یا ہوگا بھی کہ نہیں، لہٰذا میں نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ سجاول بھی میری طرف دیکھ کر خاموش رہا۔

شکیل داراب اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھا، اس نے کہا۔ ''ریان فردوس صاحب کے اندیشے کے عین مطابق مخالفوں کا ردِعمل شدید ہوا ہے۔ انہوں نے ایک قریبی جزیرے میں بڑی کارروائی کی ہے اور ریان صاحب کے مفادات کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ تم یوں سمجھ لو کہ ریان صاحب کی ہزاروں ایکڑ اراضی مع عمارات اور تنصیبات، مخالف گروپ کے قبضے میں چلی گئی ہے۔ دوطرفہ لڑائی میں کافی جانی نقصان بھی ہوا ہے۔ مرنے والوں میں بڑی بیگم کا سگا بھائی آدم بھی شامل ہے جو ریان صاحب کے بعد برونائی میں سارا انتظام و انصرام چلا رہا تھا۔ آدم کی موت نے اہلِ خانہ کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ یہ لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اگر اب بھی امن اور صلح کی تلاش میں رہے تو سب کچھ کھو دیں گے۔ اب ان کے پاس ٹکر لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔''

شکیل خاموش ہوا تو سجاول نے کہا۔ ''آپ جو کچھ بتا رہے ہیں اس سے تو واقعی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مخالف ہر صورت میں وڈے صاحب اور ان کے خاندان کا جینا حرام کرنا چاہتے ہیں۔ برونائی سے ہزاروں میل دور یہاں آکر بھی ان پر کارروائیاں ڈال رہے ہیں۔''

شکیل داراب پُرسوچ لہجے میں بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ ریان فردوس صاحب اور ان کے بیٹوں کو کچھ ایسے باہمت اور وفادار ساتھیوں کی ضرورت ہے جو ان کے دائیں بائیں کھڑے ہو سکیں۔ بے شک تنخواہ دار ملازموں کی ایک پوری فوج ان کے پاس موجود ہے، لیکن تنخواہ دار ملازموں اور جاں نثار ساتھیوں میں فرق ہوتا ہے۔ میری ایک خواہش ہے، اگر تم لوگ مانو تو......''

''جی آپ فرمائیں۔'' سجاول نے کہا۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ ریان فردوس صاحب کا ساتھ دو...... اور ان چند لوگوں میں شامل ہو جاؤ جو تنخواہ دار نہیں بلکہ واقعی ریان فردوس صاحب کے وفادار ساتھی ہیں اور دل و جان سے اس فیملی کی بھلائی چاہتے ہیں۔''

میں اور سجاول ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ انیق بھی خاموشی سے صورتِ حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ شکیل نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات تو تم بھی جان گئے ہو گے کہ اس فیملی کے پاس روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے۔ وہ اپنے دوستوں اور ساتھیوں کو ان کی توقعات سے کہیں بڑھ کر نوازتے ہیں۔''

پھر شکیل داراب نے نیا سگریٹ سلگایا اور سجاول کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''ویسے بھی تمہارے ساتھ اس فیملی کا معاملہ کچھ اور طرح کا ہو گیا ہے۔ بڑی بیگم تمہیں بہت زیادہ اہمیت دیتی ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ تمہیں اپنے عزیزوں کی طرح سمجھنے لگی ہیں۔ اگر اس مشکل وقت میں تم ان لوگوں کا ساتھ دو گے تو تمہاری عزت و توقیر اور بڑھ جائے گی۔''

سجاول نے اپنی مونچھوں کو سہلایا اور اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ''معافی چاہتا ہوں جی، مجھے عزت و توقیر کی کوئی ایسی تمنا نہیں ہے اور میں اپنی اصل بھی بڑی چنگی طرح جانتا ہوں، جس دن آپ نے ان لوگوں کو بتا دیا کہ میں مسٹر سجاول نہیں ڈکیت سجاول ہوں، تو یہ میرے سائے سے بھی بدکیں گے۔''

''لیکن میں کیوں بتاؤں گا؟'' شکیل نے کہا۔ ''اگر بتانا ہوتا تو اسی دن بتا دیتا جب تمہیں پہلی بار پاراہاؤس میں دیکھا تھا۔ یہ سوچ ذہن سے نکال دو کہ یہ بات کبھی میری زبان پر آئے گی۔''

"لیکن جناب، یہ کوئی راز رہنے والی بات تو نہیں ہے۔ آج یا کل یا ایک دو ماہ بعد یہ بات کسی نہ کسی طرح ان لوگوں کے کانوں میں پڑ ہی جاتی ہے کہ میری اصل کیا ہے۔"

شکیل داراب نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ "دیکھو سجاول! میرا تم کو ایک مشورہ ہے۔ ابھی تم اس بارے میں بالکل خاموش رہو، جس طرح چل رہا ہے، اس کو چلنے دو۔ مجھے یقین ہے کہ تم بہت زیادہ فائدے میں رہو گے...... بلکہ تم دونوں۔" اس نے میری طرف دیکھا۔

شکیل داراب کی آنکھوں میں بلا کی ذہانت چمک رہی تھی اور وہ سیاست داں تھا جو اڑتی چڑیا کے پر گنتا تھا اور وقت سے پہلے حالات کے درست اندازے لگا لیتا تھا۔ سجاول بے حد دبنگ ہونے کے باوجود شکیل کی شخصیت سے مرعوب تھا۔ اس نے شکیل سے زیادہ بحث مباحثہ مناسب نہیں سمجھا اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ "شکیل صاحب، ہمیں ریان فردوس صاحب کے لیے کیا کرنا ہوگا؟"

"ان کے ساتھ برونائی جانا ہوگا۔ آقا جان اور حلمی بھی ساتھ ہوں گے۔ یہ لوگ پہلے بات چیت کے ذریعے معاملہ حل کرنے کی کوشش کریں گے...... دوسری صورت میں مخالف گروپ کو سبق سکھایا جائے گا...... اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کے لیے جزیرے کے حالات بہت سازگار بھی ہیں۔ وہاں بے شمار لوگ ہیں جو مخالف گروپ کی کارستانیوں سے تنگ ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ریان فردوس صاحب واپس آئیں اور ایک دفعہ ان کے درمیان کھڑے ہو کر مخالفوں کو منہ توڑ جواب دیں۔"

شکیل نے اپنی گفتگو میں دو تین بار جزیرے کا لفظ استعمال کیا تھا۔ میں نے اس بارے میں پوچھا تو شکیل نے بتایا کہ برونائی کے ساحل سے کچھ فاصلے پر یہ ایک بڑا جزیرہ ہے جو دو تین نسلوں سے ریان فردوس کے خاندان کی ملکیت ہے۔ اب اس کے ایک حصے پر کچھ اور لوگ ناجائز قبضہ کیے ہوئے ہیں اور اس قبضے کو بڑھا رہے ہیں۔

میں نے ان "کچھ اور لوگوں" کی تفصیل پوچھی تو ہم پر پہلی بار یہ انکشاف ہوا کہ وڈے صاحب ریان فردوس نے دو شادیاں کی تھیں۔ یعنی ان کی باقاعدہ شادیوں کی تعداد دو تھی۔ بڑی بیگم درحقیقت وڈے صاحب کی دوسری بیوی تھی۔ پہلی بیوی سے ایک بیٹا تھا اور اب وہی بیٹا وڈے صاحب کا دشمن نمبر ایک بنا ہوا تھا۔ وہ بے حد غصیلا اور جانباز شخص تھا۔ ابراہیم اور کمال احمد وغیرہ میں ہرگز اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ اپنے اس سوتیلے بھائی کی ریشہ دوانیوں کا سامنا کر سکیں۔ وڈا صاحب خود بھی عمر کے اس حصے میں تھا کہ اس میں عافیت پسندی آچکی تھی۔

شکیل داراب سے ہماری گفتگو قریباً ایک گھنٹا جاری رہی۔ اسی دوران میں موبائل فون سائیلنٹ ہونے کے باوجود اسلام آباد سے اس کی ایک ضروری کال آگئی اور اسے جانا پڑا۔ بہرحال اس نے کہا کہ وہ کل دوپہر تک واپس آجائے گا اور اس بارے میں مزید بات ہوگی۔ اس نے جانے سے پہلے مجھ سے میرے سارے کوائف مانگے اور ان کو ایک کاغذ پر درج کیا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ میں سجاول اور انیق سے ان کے کوائف یا شناختی کارڈز کی کاپیاں لے لوں۔ ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ (جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ کوائف سفری کاغذات کی تیاری کے لیے حاصل کیے گئے تھے)

شکیل داراب کے جانے کے بعد میں اور سجاول پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ سجاول کا خیال تھا کہ خواہ مخواہ قربانی کا بکرا نہ بنا جائے۔ سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا جائے اور ان حالات کے بارے میں جاننے کی کوشش کی جائے جو ہمیں وہاں پیش آسکتے ہیں۔ ہماری اس گفتگو کے دوران میں ہی جاناں کی کال آگئی۔ وہ بنگلے میں میری بیوی کی حیثیت سے موجود تھی اور گاہے بگاہے مجھ سے ٹیلی فونک رابطہ کرتی رہتی تھی۔ اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ "شاہ زیب! یہ عالمگیر کون ہے؟"

میں چونک گیا۔ "کیوں، کیا بات ہے؟ تم نے یہ نام کہاں سنا؟"

"بس سمجھیں کہ کانوں میں پڑ گیا۔ میرے جسم کا ہر حصہ آپ کی خدمت میں ہی تو لگا رہتا ہے۔ کل آقا جان اور میڈم باتیں کر رہے تھے۔ آقا جان کہہ رہے تھے کہ یہ سب کچھ اسی عالمگیر کی وجہ سے ہوا ہے۔ میں اس کو سبق ضرور سکھاؤں گا۔"

"یہ وہی چاند گڑھی والا بندہ ہے۔ چلو اس بارے میں پھر بات کریں گے۔ تم کیسی ہو؟" میں نے جلدی سے بات کا رخ بدلا۔

اس نے رسمی انداز میں سب اچھا کا جواب دیا۔ میں نے اس کے مزید بولنے سے پہلے ہی فون بند کر دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جاناں فون پر کسی طرح کی اہم گفتگو کرے۔

"کیا کہہ رہی تھی تمہاری زوجہ؟" سجاول نے طنزیہ

لہجے میں پوچھا۔

"عالمگیر کی بات کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ آقا جان اسے کسی ذریعے سے سبق سکھانے والا ہے، یا شاید سکھا رہا ہے۔"

"یہ تو ہونا ہی ہے۔" سجاول نے کہا۔ "یہ معاف کرنے والا شخص نہیں اور عالمگیر نے اسے ٹھیک ٹھاک چکا لگایا ہے۔ اس کے ایک فراڈ کی وجہ سے آقا جان کو یہاں کئی فراڈ کرنے پڑے ہیں۔"

سجاول کا اشارہ زینب والے واقعے کی طرف تھا۔ میرا اپنا خیال بھی ایسا ہی تھا۔ ابھی ہماری گفتگو جاری تھی کہ انیق ہانپتا ہوا سا اندر آیا۔ اس نے چھوٹتے ہی کہا۔ "آپ نے کچھ سنا ہے؟"

"تم نے کچھ سنایا ہے؟" سجاول نے برا سامنہ بنایا۔

سجاول کو جواب دینے کے بجائے انیق نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا اخبار ہمارے سامنے کھول دیا۔ یہ آج ہی کا تھا۔ اخبار کے اندرونی صفحے پر ایک دو کالمی خبر دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا۔ اس خبر میں ایک ایسی تصویر بھی جسے میں دیکھتے ہی پہچان گیا۔ یہ چہرہ میرے لیے ہرگز اجنبی نہیں تھا۔ خبر کی سرخی کچھ اس طرح تھی۔ چاند گڑھی کے مقامی زمیندار عالمگیر کے گودام میں آگ، کروڑوں کی زرعی مشینری جل کر خاکستر ہوگئی۔ زمیندار کے ڈیرے پر بھی نامعلوم افراد کی اندھا دھند فائرنگ، ایک شخص ہلاک چار کے قریب زخمی۔ زمیندار عالمگیر نے بھاگ کر بمشکل جان بچائی۔ واردات کسی پرانی دشمنی کا شاخسانہ لگتی ہے۔

اس خبر میں ایک اطلاع نے مجھے بری طرح چونکایا اور کسی حد تک خوش بھی کیا۔ کہتے ہیں کہ دشمن کے مرنے پر خوشی نہیں کرنی چاہیے کیونکہ آخر سجن بھی مر جاتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی کوئی دشمن ایسا ہوتا ہے جس کی موت واقعی راحت کا احساس دیتی ہے۔ اس واردات میں مرنے والے شخص کا نام اسحاق عرف ساقا تھا اور خبر میں اسی کی تصویر تھی......

ہاں، تاجور کا وہی منگیتر جو دن رات لٹھ لے کر اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ وہ اسے منکوحہ بنانا چاہتا تھا اور اس سلسلے میں اس نے چاند گڑھی کے بہت سارے لوگوں کو اپنا ہمنوا بنا رکھا تھا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اپنے ایک اہم دشمن سے تاجور کی جان ہمیشہ کے لیے چھوٹ گئی ہے۔ ساقے کو ڈیرے پر ہونے والی فائرنگ میں دو گولیاں لگی تھیں اور وہ موقع پر ہی دم توڑ گیا تھا۔

سجاول بھی آگے جھک کر یہ خبر پڑھ رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی سرخ آنکھوں میں تجسس کروٹیں لے رہا تھا۔ بے شک عالمگیر اس کا دوست تھا مگر جب سے سجاول نے الٹے حروف والا خط پڑھا تھا اور اس خط میں عالمگیر کی جانب سے اپنے لیے توہین آمیز فقرے لکھے دیکھے تھے اس کا دل کھٹا ہو گیا تھا۔

"لو جی کتنی جلدی تصدیق ہوگئی جاناں والی اطلاع کی۔" میں نے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ جو کچھ عالمگیر کے ساتھ ہوا...... یہ آقا جان وغیرہ کی طرف سے ہے؟"

"پچانوے فیصد امکان اسی بات کا ہے۔" میں نے کہا۔ پھر میری نظر خبر کی نچلی سطور پر پڑی۔ میں نے ذرا بلند آواز میں پڑھا۔ "حملہ آور مقامی نہیں تھے۔ ان کا تعلق جنوبی پنجاب سے لگتا تھا۔ یہ جعلی نمبر پلیٹوں والی دو گاڑیوں پر آئے اور کارروائی کے بعد بڑی ہوشیاری سے فرار ہو گئے۔ ان کے پاس جدید اسلحہ تھا اور وہ اپنے کام میں ماہر لگتے تھے۔"

انیق نے کہا۔ "پارا ہاؤس والوں کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے جی۔ بڑی پاور ہے ان لوگوں کی۔ اور سب سے بڑی پاور روپیا۔"

اس خبر سے آقا جان کے لمبے ہاتھوں کا پتا چلتا تھا اور یہ بھی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ معاف کرنے والا شخص نہیں ہے۔ عالمگیر نے زینب وغیرہ کے سلسلے میں اسے دھوکا دیا تھا اور مالی نقصان پہنچایا تھا۔ آقا جان نے یہ ہضم نہیں کیا تھا اور عالمگیر کو قرار واقعی سزا دینے کی کوشش کی تھی۔ یہ عالمگیر کی خوش قسمتی تھی کہ حملے کے وقت روپوش ہو کر اس نے جان بچالی۔

یہ سچویشن کم از کم میرے لیے تو تسلی بخش ہی تھی۔ ہم نے کوشش کر کے ایک اور اخبار منگوایا۔ اس میں بھی یہ خبر موجود تھی۔ ساقے کی لاش کی تصویر بھی تھی جو زیادہ واضح تھی۔ وہ ڈیرے پر ہلاک ہوا تھا۔ اس کی لاش ننگی چارپائی پر پڑی تھی۔ منہ کھلا ہوا تھا اور چہرے پر اذیت تھی۔

ہم دیر تک اس خبر اور اس کے نتائج پر تبصرہ کرتے رہے۔ ساتھ ساتھ نیا موضوع بھی زیر بحث تھا اور یہ موضوع وہی تھا جس کو کچھ دیر پہلے شکیل داراب نے بڑی رازداری سے چھیڑا تھا۔ ایک تیسری بات بھی میرے ذہن میں مسلسل کھٹک رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے میرے ہاتھ ایک بہترین موقع آیا تھا کہ میں ابراہیم سے زہر خورانی کی حقیقت کے بارے میں کچھ جان سکوں مگر بدقسمتی سے عین موقع پر بڑی بیگم کی

کال آ گئی اور وہ سابرا ماحول ہی درہم برہم ہو گیا۔ میں ابراہیم سے اگلی ملاقات کے لیے بے چین تھا۔

اس ملاقات کے لیے مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ صبح سویرے میں غیر متوقع طور پر جلدی جاگ گیا۔ کھڑکیوں کے پردے ہٹا کر دیکھا ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ گلاب کے رنگ برنگ پھول حدِ نگاہ تک باادب کھڑے تھے۔ ان پر ہلکا سا کہرا تھا اور اوس کے قطرے تھے۔ یہ صبح کی کنواری، شفاف ہوا تھی جس میں سانس لے کر زندگی بحال ہونے لگتی ہے۔ میں نے ایک پتھر یلے بیچ پر پارا ہاؤس کے ”چھوٹے شہزادے“ ابراہیم کو اداس بیٹھے دیکھا۔ یقیناً اس کے اردگرد گارڈز موجود تھے لیکن ایک دو کے سوا نظر نہیں آ رہے تھے۔ ابراہیم کے ہاتھوں میں ایک گلدستہ تھا۔ شاید اس نے خود ہی تیار کیا تھا۔ وہ محویت سے گلدستے کو دیکھ رہا تھا۔ خانساماں کی پالتو بندریا لوسی اس کے اردگرد گھوم رہی تھی لیکن اس کے قریب نہیں جا رہی تھی۔ جیسے اس سے ڈرتی ہو۔ اس وقت وہ عجیب سے انداز میں بولتی تھی اور الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگتی تھی۔ ابراہیم اپنے اردگرد سے لاتعلق گلاب کے ہفت رنگ پھولوں کو تکتا چلا جا رہا تھا۔ پھر اس نے گلدستے کو بے پروائی سے ایک پودے کی جڑ میں پھینکا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا رخ اپنی رہائش گاہ کی طرف تھا۔ موقع غنیمت جان کر میں نے ایک گرم شال کی بکل ماری اور کنگھی سے بال درست کرتا ہوا اس کے پیچھے لپکا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا اور علیک سلیک کے بعد اپنے ساتھ لے لیا۔ میں مختلف راہداریوں سے ہو کر اس کے عالیشان کمرے میں پہنچا۔ یہاں بہت کچھ بدلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ابراہیم اپنا سامان سمیٹ رہا ہے اور بات صرف ابراہیم کی ہی نہیں تھی۔ پورے پارا ہاؤس میں ایک نامعلوم ہلچل تھی۔ سارے معمولات درہم برہم تھے۔ جیسے کہیں جانے کی تیاری تھی۔ میں نے اس سلسلے میں ابراہیم سے کوئی سوال پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ خود ہی بتاتا تو دیگر بات تھی۔ غالباً وہ خود بھی یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس دن ہماری بات ادھوری رہ گئی تھی۔ اس نے کچھ زیادہ تمہید نہیں باندھی۔ میرا حال احوال پوچھنے کے بعد بولا۔ ”اس روز میں آپ کو اس اہم معاملے کے بارے میں بتانے لگا تھا جس کی وجہ سے میں اور بھائی کمال ایک خاص طرح کی خوراک لینے پر اور ایک خاص انداز سے جینے پر مجبور ہیں۔“

”میں سن رہا ہوں ابراہیم..... بلکہ یہ سب کچھ سننے کے لیے میں کل سے ہی بے چین ہوں۔“

”تم پیش گوئی کرنے والوں کو کیا سمجھتے ہو؟“ ابراہیم نے غیر متوقع سوال کیا۔

”پیش گوئی...... یعنی وقت سے پہلے کسی چیز کے بارے میں قیافہ لگا لینا۔ یہ ایک طرح سے غیب کا علم ہے...... اور کہتے ہیں کہ غیب صرف اللہ کی ذات ہی جانتی ہے۔“

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن ہمارے بزرگ اور خفیہ علوم کے بہت سے ماہرین بھی کہتے ہیں کہ رمل اور ستارہ شناسی وغیرہ کے اصولوں کے مطابق ہم کچھ پیش گوئیاں کر سکتے ہیں اور جب اس میں کمال حاصل ہو جائے تو بہت سی پیش گوئیاں درست بھی ثابت ہو جاتی ہیں۔ یہ دراصل اللہ ہی کی دی ہوئی ذہانت اور فراست ہے جس سے کچھ خاص لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔“

ذرا توقف کرنے کے بعد ابراہیم نے اپنی چھدری داڑھی میں انگلیاں چلائیں اور بولا۔ ”وہاں برونائی میں ایک ذوالقرنین فارسی نامی عمر رسیدہ بزرگ ہیں۔ وہ پیش گوئیاں کرنے میں ماہر ہیں۔ پچھلے پچاس ساٹھ سالوں میں ان کی بہت سی پیش گوئیاں بالکل درست ثابت ہوئی ہیں۔ انہوں نے ہی ایک مرتبہ پیش گوئی کی تھی کہ ہمارے والد ریان فردوس درمیانی عمر میں ایک خوفناک حادثے سے بال بال بچیں گے۔ یہ حادثہ ممکن ہے کہ زہر خورانی کی شکل میں ہو۔ اس وقت والد صاحب کی عمر بمشکل سے آٹھ دس سال رہی ہوگی۔ تب تک ہمارا کوئی ایسا دشمن بھی سامنے نہیں آیا تھا جس پر کسی طرح کا شک و شبہ کر سکتے لیکن اس پیش گوئی کے قریباً تیس سال بعد یہ سب کچھ حرف بحرف درست ثابت ہوا۔ ہمارے کچھ بدخواہوں کی طرف سے والد صاحب کو زہر دیا گیا اور وہ موت سے قریباً ہمکنار ہونے کے بعد واپس آئے۔ والد صاحب کے جسم پر جو داغ نظر آتے ہیں اور ان کی قوتِ سماعت میں جو خرابی ہے وہ اسی خوفناک واقعے کی یادگار ہے۔“

ابراہیم نے اپنے دشمنوں کے بارے میں نہیں بتایا لیکن میری چھٹی حس نے کہا کہ یہ وہی لوگ ہیں جن کا تذکرہ ایک دن پہلے شکیل داراب نے کیا ہے۔ یعنی ابراہیم کا سوتیلا بھائی اور اس کی والدہ وغیرہ۔

ابراہیم نے کہا۔ ”شاہ زیب! آپ کے ذہن میں یقیناً یہ سوال ابھر رہا ہوگا کہ والد صاحب کو پیش آنے والے حادثے کا ہم دونوں بھائیوں کو زہر دینے سے کیا تعلق ہے؟

تو یہ تعلق ہے...... اور بہت گہرا ہے۔ کیا تم کچھ اندازہ لگا پا رہے ہو؟"

"نہیں ابراہیم، آپ کچھ بتائیں گے تو پتا چلے گا۔"

"میں نے ذوالقرنین فارسی کی پیش گوئی آپ کو پوری نہیں بتائی۔ اس پیش گوئی کا ایک دوسرا حصہ بھی تھا...... اور وہ یہ کہ شادی کے بعد والد صاحب کی جو نرینہ اولاد ہوگی اس کی زندگی کا خاتمہ بھی کسی نہ کسی اسٹیج پر زہرخورانی کی وجہ سے ہوگا اور اس میں بچ نکلنے کے امکان بہت کم ہیں۔ شروع میں اس پیش گوئی کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی گئی تھی لیکن جب کئی برسوں بعد اس پیش گوئی کا پہلا حصہ حرف بحرف درست ثابت ہوگیا یعنی والد صاحب زہرخورانی کے بعد موت کے کنارے سے واپس آئے تو ہمارے والدین بدترین تشویش میں مبتلا ہوگئے۔ اس وقت میری عمر بارہ سال اور بھائی کمال کی تقریباً چودہ سال ہوگی۔ والدین ہمیں دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ آپ اس کرب کو سمجھ سکتے ہو جو پیش گوئی کا پہلا حصہ سچ ثابت ہونے کے بعد ہمارے ماں باپ نے محسوس کیا ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "جو کچھ آپ بتا رہے ہیں، اس کے بعد تو ان کا جینا یقیناً حرام ہوگیا ہوگا۔"

"شاید یہ لفظ بھی اس کیفیت کو پوری طرح بیان نہیں کر پائے۔ وہ جیتے جی مر گئے تھے۔ انہوں نے دوبارہ اس پیش گو بزرگ کو ڈھونڈا اور اس سے رائے طلب کی۔ اس نے کہا جو تقدیر میں لکھا ہے وہ ضرور ہوتا ہے، اسے کوئی ٹال نہیں سکتا۔ بس ہم اپنی سی کوشش کر سکتے ہیں۔ یہ کوشش جو آپ دیکھ رہے ہیں وہی ہے جو اس 'پیش گو' نے تجویز کی تھی۔ اس نے کہا کہ ہم دونوں بھائیوں کو مستقبل کے اس حادثے کے لیے ابھی سے تیار کیا جانا چاہیے، کچھ ایسا کیا جائے کہ ہمارے جسموں کے اندر ہر طرح کے زہر کے لیے مدافعت پیدا ہو جائے۔ اس نے ہمیں ایک بڑے بدھ سنیاسی کے پاس بھیجا۔ آپ اسے بدھ کیمیاگر بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس شخص نے ہمارے لیے ایک ایسا زہریلا کشتہ تیار کیا جو بہت تھوڑی مقدار میں ہمیں روزانہ دیا جاتا تھا۔ شروع شروع میں دونوں بھائی بہت سے مسائل کا شکار ہوئے۔ بیمار بھی پڑ گئے۔ ایک دو موقعے تو ایسے آئے جب ہم نے ہمت ہار دی مگر پیش گو ذوالقرنین نے ہمیں اور ہمارے والدین کو پیچھے نہیں ہٹنے دیا۔ آہستہ آہستہ یہ زہرخورانی ہمارے جسم کی ضرورت بن گئی۔ اب تو ایسا ہے کہ اگر ہمیں عام کھانا دیا جائے تو چند روز میں ہی ہمارا معدہ کام کرنا بند کر دیتا ہے۔ قے اور مسلسل متلی ہونا شروع ہو جاتی ہے۔"

اب بات بڑی حد تک میری سمجھ میں آرہی تھی۔ یہ زہرخورانی کوئی آج کا روگ نہیں تھا۔ لڑکپن سے ہی یہ دونوں بھائی ایک مسلسل IMMUNITY کے لیے سرگرداں تھے۔ ابراہیم نے ایک عمیق سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اب ہم عام لوگوں سے مختلف ہو چکے ہیں۔ آپ دیکھیں گے میرے جسم پر کبھی مچھر یا مکھی نہیں بیٹھتی۔ کوئی کیڑا مکوڑا ہمیں نہیں کاٹتا۔ اگر کوئی چھوٹا کیڑا مکوڑا کاٹے تو مر جاتا ہے۔ ہمیں کبھی کوئی جلدی بیماری نہیں ہوتی۔ ہمارے پیشاب کا رنگ عام لوگوں کے رنگ سے مختلف ہوتا ہے۔ ہمارا تھوک بالکل سفید اور کاسٹک سوڈے جیسی تاثیر رکھتا ہے۔ ہم یہ احتیاط بھی رکھتے ہیں کہ کوئی ہمارا جھوٹا کھانا نہ کھائے۔ اس طرح کی اور کئی چیزیں ہیں۔"

میں نے گہری سانس لی۔ "اور ان میں سے ایک اہم ترین بات یہ بھی ہے کہ آپ کسی عام لڑکی سے شادی نہیں کر سکتے...... اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اگر آپ شادی کریں اور یہ کامیاب ہو جائے تو آپ کی اولاد بھی آپ جیسی خصوصیات لے کر پیدا ہوگی۔"

اس نے سر جھکا لیا۔ اس کا چہرہ غم و اندوہ کی تصویر تھا۔ میں بھی ہکا بکا سا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک زہریلے سانپ جیسا تھا لیکن "معصوم اور مجبور سانپ" وہ ہرگز ویسا نہیں تھا جیسا وہ بن گیا تھا۔ وہ اور اس کا بھائی تو اس وقت نوعمر لڑکے تھے جب انہیں زہر کی ڈوز دینا شروع کر دی گئی۔ یہ سراسر ان کے ماں باپ کا فیصلہ تھا۔ ماں باپ نے اپنے بچوں کو ایک متوقع حادثے سے بچانے کے لیے ایک ایسا راستہ اختیار کیا جس نے ان کی زندگیوں کو ہی زہرآلود کر دیا۔ اس میں کسی حد تک تو ہم کا عمل دخل بھی دکھائی دیتا تھا۔ مجھے کچھ دیر پہلے دیکھا ہوا وہ منظر یاد آیا جب بندریا لوسی ابراہیم کے قریب جاتے ہوئے ڈر رہی تھی اور یہ کوئی پہلا موقع نہیں تھا۔ ایک دفعہ پہلے بھی میں نے اسی طرح اسے کمال احمد سے خوف زدہ ہوتے اور چلا کر بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ شاید اس کے حیوانی ذہن میں ابھی تک اس زہر کے اثرات موجود تھے جو ایک مرتبہ ہم نے تجربے کے طور پر دیا تھا اور وہ مرتے مرتے بچی تھی۔ اس کی غیر معمولی حسیات اسے بتاتی تھیں کہ ان دونوں بھائیوں کے نزدیک جانا خطرناک ہے۔ یہ حالات کی ستم ظریفی تھی۔ ابراہیم جانتا تھا کہ وہ زینب کو حاصل نہیں کر سکتا۔ وہ اس کی زندگی برباد کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ (ساڑھے تین

سال پہلے اس کے بڑے بھائی کی بیوی کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ یقیناً اس کے ذہن میں محفوظ تھا) مگر دوسری طرف زینب کو خود سے دور کرنا بھی اس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ ابھی تک پارا ہاؤس میں ہی تھی۔

میں کچھ دیر ابراہیم کے بولنے کا انتظار کرتا رہا پھر اجازت لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ آج کا انکشاف بہت گمبھیر تھا۔ میں جب دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا، ایک لمحے کے لیے مجھے لگا کہ شاید ابراہیم، ثاقب کے قتل اور اس سے پیدا ہونے والے "خطرات" کے بارے میں کچھ کہنے لگا ہے لیکن پھر یہ موضوع اس کے ہونٹوں تک نہیں پہنچا۔ میں نے بھی اس بارے میں کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا اور باہر آ گیا۔

اگلی صبح ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے مجھے اور انیق کو ہلا کر رکھ دیا۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ہمیں یہ کچھ سننے کو ملے گا۔ جاناں چونکہ بنگلے میں چلی گئی تھی۔ لہٰذا میں اور انیق ایک ہی کمرے میں سوتے تھے۔ دروازہ دھڑ دھڑ بجایا گیا تو ہم ہڑبڑا کر جاگ گئے۔ انیق بڑبڑایا۔ "یا اللہ خیر...... لگتا ہے کہ سورج مغرب سے طلوع ہوا ہے اور قیامت کا اعلان ہو گیا ہے۔"

میں نے جا کر دروازہ کھولا۔ سامنے اسپیشل فورس کے تین گارڈز کھڑے تھے۔ "سجاول صاحب کدھر ہے۔" ایک پٹھان گارڈ نے بہت تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"ہمیں کیا پتا۔ اپنے کمرے میں ہوگا۔"

"وہ کمرے میں نہیں ہے۔ کہیں بھی نہیں ہے۔ کچھ...... اور باتیں بھی سننے میں آ رہی ہیں۔"

"اور باتیں؟" میں حیران ہوا۔

اسی دوران میں دو مزید گارڈز ہانپتے ہوئے پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ "دیکھ لیا ہے جی۔ کچھ پتا نہیں چل رہا۔"

میں اور انیق دروازے کی طرف بڑھے۔ ہم جاننا چاہ رہے تھے کہ سجاول کے ساتھ کیا ہوا ہے مگر گارڈز نے ہمیں برآمد تک نہیں پہنچنے دیا۔ "نہیں جی، ابھی آپ ادھر ہی رہیں۔ حلمی صاحب اور آقا صاحب آ رہے ہیں۔ وہی آپ کو ساری بات بتائیں گے۔"

"ساری بات؟ لیکن ہوا کیا ہے؟ کیا چھپا رہے ہو تم لوگ؟" میں نے چیخ کر کہا۔

"آپ سے گزارش کی ہے نا کہ آپ ابھی ذرا رکے رہیں۔" گارڈ بولا۔ وہ ہنا لیکن طوطا چشم دکھائی دے رہا تھا۔

اسی اثنا میں، میں نے دیکھا کہ دو گارڈز ہمارے کمرے میں سے برآمد ہوئے۔ انہوں نے ہماری رائفلیں قبضے میں کر لی تھیں۔ ہمارے سیل فونز بھی ان کے پاس تھے۔ میری رگوں میں خون سنسنا گیا۔ صورتِ حال ہمارے اندازے سے زیادہ سنگین تھی۔ کہیں...... سجاول نے کوئی گڑبڑ تو نہیں کر ڈالی تھی؟

بمشکل ایک منٹ گزرا ہوگا کہ آقا جان اپنے سرخ انگارا چہرے کے ساتھ وہاں آ دھمکا۔ مجھے دیکھتے ہی سانپ کی طرح پھنکارا۔ "چونا لگا دیا ناں۔ مجھے اس حرامی کی آنکھ میں پہلے ہی سؤر کا بال نظر آتا تھا۔"

"ہوا کیا ہے آقا جان؟"

"یہ پوچھو کیا نہیں ہوا ہے۔ وہ تمہارا یار حرام زادہ لوٹ کر لے گیا ہے پارا ہاؤس کو۔ کئی کروڑ کے تو زیور ہی ہوں گے...... سیونگ سرٹیفکیٹس، ڈالرز، یورو، بہت کچھ شامل ہے۔ دو بڑے سیف لوٹے ہوئے ہیں۔"

ہم سناٹے میں رہ گئے۔ انیق نے ہراساں نظروں سے میری طرف دیکھا۔ وہ کئی بار مجھ سے اس قسم کے خطرے کا اظہار کر چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں آقا جان سے کچھ پوچھتا اس نے گارڈز کو کڑک کر حکم دیا۔ "ابھی یہ لوگ حفاظتی تحویل میں ہیں۔ یہ ان ہی کمروں میں رہیں گے۔ اگلے حکم کا انتظار کرو۔"

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے مہمان خانے کے تینوں دروازے باہر سے بند کر دیے گئے۔ باہر برآمدوں میں بھاگ دوڑ مچی ہوئی تھی۔ انیق نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "دیکھ لیا نا شاہ زیب بھائی۔ مجھے یہی ڈر تھا۔"

"لیکن ابھی تو کچھ پتا نہیں چل رہا یار...... کہ ہوا کیا ہے؟"

انیق بولا۔ "میں نے پرسوں ہی دیکھ لیا تھا کہ سجاول کے تیور ٹھیک نہیں۔ اس کی باتیں کھوکھلی تھیں۔ اس کے ذہن میں کچھ اور چل رہا تھا۔ آپ کے سامنے ہی اس نے قربانی کے بکرے والی بات بھی کہی تھی۔"

"یار ابھی تفصیل تو سامنے آنے دو۔ تم پہلے ہی سارے جہاز ڈبو کر بیٹھ گئے ہو۔" میں نے ذرا جھنجلا کر کہا۔

تھوڑی دیر بعد اس واقعے کی کچھ مزید تفصیلات معلوم ہوئیں۔ پتا چلا کہ بے ہوشی والے اسپرے کے ذریعے دو گارڈز کو بے ہوش بھی کیا گیا ہے۔ دونوں سیف توڑے نہیں گئے تھے، بلکہ ان کی چابیاں حاصل کی گئی تھیں اور انہیں کھولا گیا تھا۔ وہ سیف محفوظ رہتے تھے۔ سب سے

پہلے وڈے صاحب کو ہی اس واقعے کا علم ہوا اور انہوں نے اپنے بیڈ روم کے قریب ایک بٹن پش کر کے خطرے کا الارم بجایا۔ تب تک سجاول فرار ہو چکا تھا۔ غالب امکان یہ تھا کہ اس نے فرار کے لیے پارا ہاؤس کے اسپتال کی ایک ایمبولینس استعمال کی ہے۔ ایمبولینس کے ڈرائیور کو شاید گن پوائنٹ پر رکھا گیا تھا۔ یہ بھی پتا چلا کہ سیکیورٹی انچارج قادر خان اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ سجاول کے تعاقب میں گیا ہے۔ ہمیں یہ اطلاعات سیکنڈ انچارج رفاقت نے پہنچائیں۔ وہ آہنی گرل والی کھڑکی کی دوسری جانب کھڑا تھا اور ہم سے بات کر رہا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''مس سنبل کے بارے میں کچھ پتا چلا؟ وہ کہاں ہے؟''

''وہ تو جی یہیں پر ہے۔ وہ بھی اس اطلاع پر سخت پریشان ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں اسے دیکھ کر آیا ہوں۔''

''قادر خان سے فون پر رابطہ نہیں ہوا؟''

''نہیں، جی صاحب مسلسل کوشش کر رہے ہیں مگر کال نہیں مل رہی۔ اب کچھ اور لوگ بھی ان کے پیچھے گئے ہیں۔''

قریباً آدھ گھنٹے بعد پتا چلا کہ پارا ہاؤس سے نکلنے والی ایمبولینس لیہ سے قریباً بیس کلومیٹر دور دریا کے کنارے گھنے سرکنڈوں میں کھڑی مل گئی ہے۔ وہ بالکل خالی تھی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ شاید وہاں پہلے سے سجاول کے چند ساتھی موجود تھے۔ ان کے پاس ایک دوسری جیپ تھی۔ مسروقہ مال اس میں منتقل کیا گیا تھا اور کسی نامعلوم مقام کی طرف لے جایا گیا تھا۔

قادر خان سے بھی فی الحال کوئی رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ اس بات کا اندیشہ موجود تھا کہ شاید قادر اور اس کے دونوں ساتھی بھی سجاول وغیرہ کے ہتھے چڑھ گئے ہیں یا پھر انہیں مار ڈالا گیا ہے۔ قادر خان سانپ والے اذیت ناک حادثے سے گزرا تھا اور اس کے ساتھ ایک تعلق سا پیدا ہو چکا تھا۔

پارا ہاؤس میں پہلے ہی ایک زبردست بے چینی پائی جا رہی تھی۔ اب اس نئے واقعے نے مزید افراتفری پیدا کر دی تھی۔ ابھی تک ہمارا سامنا وڈے صاحب سے نہیں ہوا تھا۔ لگتا یہی تھا کہ وہ اس غیر یقینی صورتِ حال میں خود بھی ہمارے سامنے آنا نہیں چاہتا۔ ہمیں بس گاہے بگاہے آقا جان کا تپا ہوا چہرہ ہی نظر آ رہا تھا۔ وہ ہمارے اردگرد جیسے کسی سانپ کی طرح پھنکار رہا تھا۔ سامنے کی طرف سے اس کے سر کے قریباً نصف بال اڑے ہوئے تھے۔ جب وہ غصے اور پریشانی کے عالم میں ہوتا تھا، اس کے چہرے کے ساتھ ساتھ اس کا نصف سر بھی پسینے سے چمکنے لگتا تھا۔ اس پسینے کو وہ بار بار سفید رومال سے صاف کرتا تھا۔

انیق نے کہا۔ ''اگر ایک آدھ گھنٹے میں امریش پوری (سجاول) پکڑا نہیں جاتا تو یقیناً ہماری کم بختی آ جاتی ہے اور شاید سنبل کی بھی۔ یہ لوگ ہم سے اس خبیث کا پتا ٹھکانا پوچھیں گے۔''

''اور ہم بتا دیں گے......؟''

''بتانا ہی پڑے گا، ورنہ......''

''ورنہ کیا؟''

''وڈا صاحب تو شاید اتنی سختی نہ دکھائے لیکن یہ خصیلا لومڑ آقا جان تو ہمارے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہے۔''

میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''نہیں انیق! تم میری اجازت کے بغیر کسی طرح کا کوئی قدم نہیں اٹھاؤ گے۔ ابھی ہمیں سجاول کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتانا۔''

میری سنجیدگی نے جیسے اسے چونکایا۔

یہی وقت تھا جب ہیوی موٹر بائیکس کے ہوٹر سنائی دیے اور ہمیں پتا چلا کہ شکیل داراب یہاں آن وارد ہوا ہے۔ ہم اسے دیکھ نہیں پائے لیکن اندازہ یہی ہوا کہ وہ اپنی سیاہ گاڑی سے اتر کر سیدھا وڈے صاحب کے پاس ہی گیا ہے۔ اس بات کا امکان موجود تھا کہ وہ جلد ہی ہمارے پاس بھی آئے گا۔

وہ آیا ضرور...... مگر قریباً دو گھنٹے بعد۔ اس دوران میں ہمارے اردگرد صورتِ حال بدستور تشویشناک رہی۔ مہمان خانے کے تینوں دروازے باہر سے بند تھے، بلکہ اب دروازوں کے باہر مسلح گارڈز بھی چکرا رہے تھے۔ شکیل داراب کی آمد کے موقع پر گارڈز ہٹ گئے اور ایک دروازہ کھول دیا گیا۔ شکیل داراب کے ساتھ علمی بھی تھا مگر وہ ہم سے بات کیے بغیر واپس چلا گیا۔ شکیل داراب اندر آیا۔ اس کا گورا چٹا چہرہ پریشانی کی تصویر تھا۔ وہ بلاتمہید بولا۔ ''یہ کیا ہوا ہے شاہ زیب، ہم اس کے لیے کیا کچھ سوچ رہے تھے اور اس نے کیا کر دکھایا، بڑی بیگم تو سکتے کی کیفیت میں ہیں۔''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں شکیل صاحب! ہمیں جو کچھ معلوم ہوا ہے، آپ لوگوں سے ہوا ہے۔''

''مگر، کچھ بھی تھا، وہ تم لوگوں کے ساتھ تھا۔''

''تو پھر ہمیں الزام دیجیے۔'' میں نے اطمینان سے

کہا۔

''بات کا غلط مطلب مت لو۔ لیکن اگر وہ نہیں ملتا تو تم لوگوں کو یہ تو بتانا ہی ہوگا کہ اسے کہاں تلاش کیا جائے؟''

''ہم تو اس سے سرِراہ ملے تھے۔ ہم سے زیادہ تو اس کے ٹھکانوں کے بارے میں آپ جانتے ہوں گے، آپ کا اس سے پرانا تعلق ہے۔''

''میرا تعلق صرف لالہ نظام اور وریام کے واسطے سے تھا۔ لالہ نظام مر گیا اور وریام کو بھی اس کے ڈیرے کا کچھ پتا نہیں۔ وریام اور سجاول کی صرف ایک ملاقات ہوئی تھی اور وہ بھی چاند گڑھی کے عالمگیر نامی زمیندار کے ذریعے سے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ یہ عالمگیر...... سجاول کے ٹھکانوں کو جانتا ہوگا۔ مجھے پتا ہے، چاند گڑھی میں بھی یہ بات مشہور ہوئی تھی کہ سجاول اور عالمگیر کا یارانہ ہے۔''

شکیل نے بے قراری سے پہلو بدلا۔ ''لالہ وریام نے میری ہدایت پر عالمگیر سے رابطہ کرنے کی کوشش کی ہے لیکن پتا چلا ہے کہ اتوار کے دن اس پر کوئی قاتلانہ حملہ ہوا ہے اور وہ تب سے روپوش ہے۔ اس کا ایک قریبی ساتھی مارا بھی گیا ہے۔''

ہم اخبار کے ذریعے اس بارے میں جان چکے تھے لیکن میں نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ شکیل نے پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔ ''سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس شخص نے اتنی بڑی بے وقوفی کیوں کی؟ وہ چھپ نہیں سکے گا۔ ہم اسے زمین کی ساتویں تہ سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔ اس کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا اور جو کچھ ہاتھ آنے والا تھا اس سے بھی وہ بدبخت محروم ہو گیا ہے۔ اس کے لیے بہت سے راستے کھل سکتے تھے۔ وہ اتنا کچھ حاصل کر سکتا تھا کہ اس کے فرشتوں کو بھی توقع نہ ہوتی۔''

''کہیں ایسا تو نہیں شکیل صاحب کہ اسے کسی چکر میں پھنسا دیا گیا ہو۔'' میں نے کہا۔

''اب تم بھی احمقوں والی بات کر رہے ہو۔ سب کچھ آنکھوں کے سامنے ہے۔ شک وشبے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔'' شکیل جیسے چیخ گیا۔

میں نے کہا۔ ''آپ مجھے میرا فون واپس دلا دیں، میں خود اس سے رابطے کی کوشش کرتا ہوں۔''

''کوئی فائدہ نہیں۔ سیکڑوں بار کوشش ہو چکی ہے۔ اس کا فون آف جا رہا ہے۔ تمہیں کسی اور طریقے سے ہماری مدد کرنا ہوگی۔''

''اور وہ طریقہ؟''

''جو بھی تم مناسب سمجھو۔ اس کا ایک ٹھکانا کہیں آزاد کشمیر میں بھی ہے، کوٹلی سے کچھ آگے۔ مجھے لگتا ہے کہ تم اس ٹھکانے کے بارے میں کچھ نہ کچھ تو بتا ہی سکتے ہو۔''

''نہیں، یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ ہم دونوں یہ نام پہلی بار آپ سے سن رہے ہیں۔''

شکیل کے چہرے پر سرخی لہرا گئی۔ خود پر ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو شاہ زیب! اپنے لیے مسائل پیدا نہ کرو اور نہ اس لڑکی کے لیے جو تمہارے ساتھ یہاں آئی ہے۔ ہم اب بھی تمہارے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ آنے والے دنوں میں تم دونوں کے بارے میں سوچ سکتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''پہلی بات تو یہ ہے جناب کہ وہ لڑکی (سنبل) ہمارے ساتھ نہیں سجاول کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ ہم اس کے برے بھلے کے ذمے دار نہیں۔ دوسری جو نرم گوشے والی بات آپ نے کی ہے، اس کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ دس پندرہ منٹ کے اندر ہی ہم یہاں معزز مہمان سے قیدی بن گئے ہیں۔ ہمارے ہتھیار، موبائل وغیرہ لے کر ہمیں یہاں لاک کر دیا گیا ہے۔''

''دراصل فوری طور پر ان لوگوں کی سمجھ میں کچھ آیا ہی نہیں۔ بہرحال یہ کوئی ایسا نہ حل ہونے والا مسئلہ نہیں ہے۔ میں آقا جان سے بات کرتا ہوں۔ اصل میں یہاں کے سارے اہم فیصلے وہی کرتا ہے لیکن...... تمہارا تعاون بہت ضروری ہے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کیا تعاون کر سکتا ہوں۔''

''دیکھو شاہ زیب! مجھے بے خبر نہ سمجھو۔ میں نے تمہارے بارے میں کافی کچھ جان لیا ہے۔ لاہور سے نکلنے کے بعد تم کوپن ہیگن نہیں گئے بلکہ چاند گڑھی جا پہنچے...... کسی تاجور نامی لڑکی سے تمہارا چکر چل رہا ہے۔ تاجور کی سہیلی ریشمی کی مدد کرتے ہوئے تم ملنگی ڈیرے پہنچے...... وہاں پردے والی سرکار سے تمہارا ٹکراؤ ہوا اور تم نے اسے قتل کیا۔ اس کے بعد تم سجاول اور اپنے ساتھی انیق کے ساتھ یہاں پارا ہاؤس میں پائے گئے ہو۔ ظاہر ہے کہ تمہارا یہاں آنا بھی بے مقصد تو نہیں رہا ہوگا۔''

''آپ جناب کا کیا خیال ہے۔ میرا کیا مقصد رہا ہو گا؟'' میں نے بے باکی سے شکیل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے پُرسوچ لہجے میں جواب دیا۔ ''ہو سکتا ہے کہ

تمہارا وہی پراوماس وغیرہ کا چکر ہو۔ وہ تاجور نامی لڑکی اب
تمہارے ساتھ نہیں۔ اس کے ماں باپ اور بھائی بھی چاند
گڑھی سے اوجھل ہو چکے ہیں۔ شاید تم اسی کو ڈھونڈنے کے
چکر میں یہاں ہو؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف
دیکھا اور میرے چہرے پر کوئی تاثر نہ پا کر بولا۔ ''دوسری
صورت یہ ہوسکتی ہے کہ تم اسی لوٹ مار کے لیے پاراہاؤس
میں گھسے تھے مگر تمہارا ساتھی سجاول تمہیں بھی ڈبل کراس کر
گیا اور ایک بڑی نقب لگا کر چمپت ہو گیا۔'' اس نے ایک
بار پھر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اگر وہ میرے
تاثرات سے کچھ جاننا چاہ رہا تھا تو اسے یقیناً مایوسی ہوئی ہو
گی۔

میں نے کہا۔ ''ایک تیسری وجہ بھی تو ہو سکتی ہے اور وہ
آپ کی نظروں سے اوجھل رہتی ہے۔ شاید اس کا سبب یہ
ہے کہ بہت سے لوگ یہ سوچ ہی نہیں سکتے کہ کسی مفاد کے
بغیر بھی کوئی کام کیا جا سکتا ہے یا کسی کے کام آیا جا سکتا
ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' وہ میرے تیکھے لہجے کو
نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔

''آپ نے چاند گڑھی سے اور تو بہت کچھ معلوم کر لیا
ہے لیکن یہ نہیں کیا کہ چاند گڑھی میں کچھ ماہ پہلے قتل ہونے
والے امام مسجد مولوی فدا کی یتیم بچی کہاں اور کس حال میں
ہے..... جی ہاں..... میں اس لڑکی زینب کی بات کر رہا ہوں
جو اسلام آباد کے اسپتال سے اغوا کر کے دلہن بننے کے لیے
یہاں پہنچائی گئی ہے اور اس سارے کارنامے کے پیچھے اس
حرامی عالمگیر کا ہاتھ ہے۔ میں اسی عالمگیر کی جڑیں کاٹنے
کے لیے یہاں آیا تھا۔ عالمگیر اور اس کے ساتھیوں نے اس
یتیم بچی کے لیے ان پاراہاؤس والوں سے قریباً سوا
کروڑ..... جی ہاں سوا کروڑ روپیا اینٹھا ہے اور ابھی کم از کم
دو مزید لڑکیاں اس نے پاراہاؤس میں فروخت کی ہیں۔''

میرے اس انکشاف نے شکیل داراب کو کچھ زیادہ
ششدر نہیں کیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اس حوالے سے کافی
کچھ جانتا ہے۔ بہرحال اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ موٹی رقمیں
لے کر لڑکیوں کو یہاں پہنچانے والا چاند گڑھی کا عالمگیر ہی
ہے۔

میری بات سننے کے بعد اس نے ایک گہری سانس لی
اور بولا۔ ''جہاں تک مجھے معلوم ہے یہاں آنے والی لڑکیاں
بڑی حد تک بے آسرا ہیں اور انہیں یہاں ایک اچھی زندگی
ملنے والی ہے۔ بہرحال یہ تو پاراہاؤس والوں کے معاملات
ہیں، ان کی کچھ مجبوریاں ہیں اور وہ ان کی قیمت ادا کر رہے
ہیں۔ میرا سوال اپنی جگہ پر ہے۔ اگر میں تمہاری یہ بات
مان بھی لوں کہ تم اس زمیندار عالمگیر کو سبق سکھانے یا سزا
دینے کے لیے یہاں پہنچے ہو تو..... تمہارا تعلق اس ڈکیت
سجاول سے کیسے بنا؟''

''آپ جانتے ہو کہ عالمگیر اور سجاول کا دوستانہ ہے۔
سجاول کو کسی طرح پتا چل گیا تھا کہ عالمگیر اس سے بالا بالا
کوئی کھیل کھیل رہا ہے۔ کسی بہت امیر کبیر فیملی کو ایک ایک
لڑکی سوا کروڑ میں فروخت کر رہا ہے۔ وہ بھی اس بات کا
کھوج لگانا چاہتا تھا۔''

''لیکن میرا سوال اب بھی اپنی جگہ ہے۔ تمہارا اور
سجاول کا میل کہاں ہوا؟'' شکیل نے پھر نکتہ اٹھایا۔

وہ اس درمیانی کڑی کے بارے میں جاننا چاہ رہا تھا
جو میں اسے بتانا نہیں چاہ رہا تھا۔ یعنی میرا اور تاجور کا اتفاقاً
سجاول کے ڈیرے کی طرف چلے جانا اور پھر کئی ہفتوں تک
وہاں رہنا۔ مجھے محسوس ہوا کہ شکیل جیسے کھاگ شخص کو مطمئن
کرنے کے لیے تھوڑا بہت تو بتانا ہی پڑے گا۔ میں نے مختصر
الفاظ میں اسے آگاہ کیا کہ کس طرح اتفاقاً ایک روز کوٹلی کے
ایک ہوٹل میں میرا اور سجاول کا آمنا سامنا ہوا۔ مجھے معلوم تھا
کہ سجاول اور عالمگیر میں دوستانہ ہے لیکن میرے پاس ایک
خط تھا جو الٹے حرفوں میں لکھا گیا تھا۔ اس میں عالمگیر نے
لڑکیوں کی فروخت کا ذکر کیا تھا اور ساتھ ہی سجاول کو بُرے
لفظوں سے یاد کیا تھا۔ یہ خط پڑھنے کے بعد سجاول کا دل
عالمگیر کی طرف سے کھٹا ہوا اور اس نے میرے ساتھ مل کر
لڑکیوں والے معاملے کا کھوج لگانے کا فیصلہ کیا۔

شکیل اب بھی مطمئن نہیں تھا۔ اس نے تیکھے لہجے میں
پوچھا۔ ''کیا یہ سارے معاملے ہوٹل میں ہی بیٹھے بیٹھے طے ہو
گئے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے سجاول نے ٹرک ڈرائیور کا بھیس بدلا۔
تمہارے ساتھی لڑکے کو ہیلپر بنایا اور تمہیں ساتھ لے کر
''لکڑی اور لڑکی'' کو لے کر یہاں پہنچ گیا؟''

''ہم اس کے ایک ٹھکانے پر گئے تھے۔'' میں نے
اقرار کیا۔ ''مگر کوٹلی سے یہ طویل فاصلہ ہم نے ایک بند
گاڑی میں طے کیا تھا اور ہماری آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی
تھی۔ وہاں سے نکلتے وقت بھی ہمیں پٹی باندھ کر نکالا گیا۔''

(اور یہ بات کافی حد تک حقیقت تھی۔ سجاول اس
سلسلے میں ہمیشہ بہت محتاط رہتا تھا۔ باہر سے ڈیرے میں
داخل ہونے والوں کی آنکھوں پر پٹی باندھی جاتی تھی اور
کبھی کبھی انہیں خوامخواہ گھما پھرا کر ڈیرے پر پہنچایا جاتا تھا)

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

اس گفتگو کے بعد بھی شکیل پوری طرح مطمئن تو نہیں ہوا۔ تاہم میرے اندازے کے مطابق اسے میرے بیان کے ساتھ ستر فیصد حصے پر یقین آ گیا۔

میں جانتا تھا کہ سجاول نے جو کچھ بھی کیا ہے لیکن شکیل میرے ساتھ بگاڑنا نہیں چاہے گا۔ وہ جانتا تھا کہ میں اس کے ایک اہم ترین راز کا امین ہوں...... اس راز کا کھلنا شکیل بلکہ ساری وارا فیملی کی سیاسی زندگی کے لیے ایک بھونچال ثابت ہو سکتا تھا۔ سیالکوٹ شہر کے ایک شاندار گھر کا عقبی دروازہ دس مرلے کے ایک ایسے گھر کے اندر کھلتا تھا جہاں شکیل کے اسکول کے زمانے کی ایک حسین ٹیچر (جواب اتنی حسین بھی نہیں تھی) رہتی تھی اور شکیل نے اس کے ساتھ خفیہ نکاح کر رکھا تھا۔ اپنی ٹیچر کے ساتھ ہو جانے والے عشق کو اس نے بڑے بھونڈے طریقے سے ایک مجرمانہ عمل میں بدل رکھا تھا۔

شکیل کو یقیناً معلوم ہوگا کہ حفاظتی اقدام کے طور پر میں نے یہ راز اور اس کے ثبوت یقیناً اپنے کسی دوسرے با اعتماد ساتھی یا ساتھیوں کو بھی فراہم کر رکھے ہوں گے اگر وہ یہاں بیٹھے بیٹھے مجھے شوٹ بھی کر دیتا تو اس کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اسی اثنا میں شکیل کے لیے وڈے صاحب عزت مآب کی طرف سے بلاوا آ گیا اور وہ مجھ سے صبح ملنے کا وعدہ کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس سے پتا چلتا تھا کہ وہ آج رات پارا ہاؤس میں ہی گزارے گا۔

رات قریباً بارہ بجے کا وقت ہوگا۔ پارا ہاؤس میں خاموشی چھا چکی تھی۔ بس پہرے داروں کے بوٹوں کی ٹھک ٹھک تھی یا کسی وقت رکھوالی کے کتوں کا شور سنائی دیتا تھا۔ سردی آج کچھ زیادہ تھی۔ ہم نے کمرے میں گیس ہیٹر آن کر رکھا تھا اور ٹی وی دیکھنے کے ساتھ ساتھ آئندہ صورتِ حال پر غور کر رہے تھے۔ سجاول کا ابھی تک کچھ پتا نہیں چلا تھا، نہ ہی قادر خان اور اس کے دو ساتھیوں سے رابطہ ہو پایا تھا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا اس بات کا اندیشہ بڑھتا جا رہا تھا کہ شاید قادر خان اپنے دونوں بندوں سمیت سجاول کے ہتھے چڑھ چکا ہے۔ سجاول کی سفاکی اب ہمارے لیے کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں تھی۔ مجھے منشی افضل کی موت کا منظر ابھی تک یاد تھا...... اور پھر ایک دفعہ سجاول نے "اصغر" نامی ملنگ کے ساتھ جو سلوک کیا تھا وہ بھی بھولنے والا نہیں تھا۔ سجاول نے اسے "پھانسی کی سزا" دی تھی۔ وہ معجزانہ طور پر بچ گیا تھا مگر سجاول نے اسے پھر بھی شوٹ کر دیا تھا۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ درست تھیں لیکن پتا نہیں کیوں میرے دل میں اب بھی امید کی کرن سی تھی۔ شاید میں نے سجاول سے کچھ زیادہ ہی توقعات لگا رکھی تھیں اور یہ توقعات یہ "سب کچھ" دیکھنے کے بعد مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ میں بندے کو بڑی حد تک پہچان لیتا ہوں لیکن غلطی تو بابا آدم سے بھی ہوئی تھی۔ تو کیا میں بھی غلطی کر چکا تھا......؟

اچانک بیرونی دروازے پر آہٹ ہوئی۔ میں اور انیق چونک گئے۔ امید نہیں تھی کہ اتنی رات گئے کوئی مہمان خانے میں آئے گا۔ دروازے کو ان لاک کیا گیا اور کچھ گارڈز اندر آ گئے۔ سیکنڈ انچارج رفاقت علی ان کے ساتھ تھا۔

"کیا بات ہے رفاقت؟" میں نے پوچھا۔

"آپ دونوں کو عزت مآب نے یاد کیا ہے۔" اس نے ذرا بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"دونوں کا آنا ضروری ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد ہم اٹھ کر چل دیے۔ برآمدے میں پہنچ کر سامنے ایک گاڑی نظر آئی۔ یہی وقت تھا جب مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ گارڈز کے تیور ذرا بدلے ہوئے تھے۔ اپنی رائفلوں پر ان کی گرفت "جارحانہ" تھی۔ دو رائفلیں باقاعدہ ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

"آپ گاڑی میں سوار ہو جائیں۔" رفاقت نے ذرا تحکم سے کہا۔

"لیکن تم تو کہہ رہے تھے کہ وڈے صاحب سے ملنا ہے؟"

"وڈے صاحب اس وقت پارا ہاؤس سے باہر ہیں۔" پٹھان گارڈ نے مختصر سا جواب دیا اور انیق کو گاڑی کی طرف دھکیلا۔

میں نے رفاقت کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ مجبور ہے۔ ہمیں وہی کرنا ہوگا جو کہا جا رہا ہے۔ ورنہ گارڈز کسی حد تک بھی جا سکتے ہیں۔ انیق نے پُرتشویش سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ بات ماننی ہے یا انکار کرنا ہے۔ میں نے آنکھوں آنکھوں میں اس سے کہا کہ ابھی ان کے کہنے کے مطابق ہی چلتے ہیں...... اس کے ساتھ ہی میں قدم بڑھا کر گاڑی کے عقبی دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک بڑی لوڈر نما گاڑی تھی۔ تقریباً ویسی ہی جیسی پولیس کے محکمے میں قیدیوں کو لے جانے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ کھڑکیوں کے شیشے بلائنڈ تھے اور

باہر کی طرف آہنی جالی لگی ہوئی تھی۔ دونوں طرف لمبی نشستیں تھیں اور درمیان سے فرش خالی تھا۔

ہمارے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ باہر سے لاک کر دیا گیا اور گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ آگے روانہ ہو گئی۔ میرا دھیان پتا نہیں کیوں آقا جان ہی کی طرف جا رہا تھا یقیناً انیق کی سوچ کا رخ بھی یہی تھا۔ آقا جان یہاں پارا ہاؤس میں ہارڈ لائنر کی حیثیت رکھتا تھا اور وڈے صاحب کا "وفادار" ہونے کے باوجود اپنی من مانیاں کرتا تھا۔ وہ جن کو قصوروار سمجھتا تھا ان کے ساتھ اس کا رویہ بے حد سخت ہوتا تھا۔

جلد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ ہم سیکیورٹی کے مختلف مراحل سے گزر کر پارا ہاؤس کی اونچی دیواروں سے باہر نکل آئے ہیں۔ "کہاں لے جا رہے ہیں یہ لوگ؟" میں نے انیق سے رائے طلب کی۔

"ہو سکتا ہے آپ کی سسرال لے جا رہے ہوں۔ میرا مطلب ہے بنگلے کی طرف جہاں آپ کی وائف (جاناں) قیام پذیر ہیں۔"

"تمہاری کھوپڑی ٹھیک کام نہیں کر رہی۔ مین گیٹ سے نکلنے کے بعد ہم دائیں طرف مڑے ہیں، بنگلا بائیں جانب ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"تو پھر ہو سکتا ہے کہ یہ ہمیں ربڑی کھلانے لے جا رہے ہوں۔ کیونکہ بائیں طرف جائیں تو لاہور آ جائے گا اور پھر لاہور سے "ذرا آگے" کراچی۔"

"تمہاری یہ ربڑی والی بات مجھے بھی درست لگ رہی ہے اور میرا خیال ہے کہ ہمارے لیے یہ ربڑی آقا جان نے ہی تیار کروائی ہے۔"

"اور ہو سکتا ہے کہ وہ اس گاڑی کے پیچھے پیچھے ہمارے ساتھ آ رہا ہو۔" انیق نے گاڑی کے عقبی دروازے کی درز سے جھانکنے کی ناکام کوشش کی۔

بہرحال نظر نہ آنے کے باوجود ہمیں اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی گاڑی مسلسل ہمارے پیچھے آ رہی ہے۔ گاہے بگاہے اس پیچھے آنے والی گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی چمک کسی کھڑکی میں نظر آتی تھی۔

پانچ دس منٹ اسی طرح گزر گئے۔ جب اس بند گاڑی نے کسی جگہ رکنے کا نام نہیں لیا تو میں نے سوچا کہ گاڑی کے ڈرائیونگ کیبن کی طرف دستک دی جائے اور ان لوگوں سے دریافت کیا جائے کہ کیا وہ واقعی "لاہور" یا پھر "کراچی" جا کر رکنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ گاڑی میں گھڑگھڑاہٹ ہموار ہوئی، پھر وہ بری طرح ڈگمگانے لگی۔ اس کی رفتار کم ہوئی اور وہ سڑک کے کنارے کسی جگہ رک گئی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ اس کا اگلا بایاں ٹائر فلیٹ ہو گیا ہے۔ غالباً ناہموار سڑک پر کوئی شیشہ یا میخ وغیرہ ٹائر میں لگ گئی تھی۔

کھڑکیوں سے باہر دیکھنا ناممکن تھا۔ ہم مکمل تاریکی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پوری گاڑی بج رہی تھی۔ باہر سے مدھم آوازیں سنائی دینے لگیں۔ گارڈز باتیں کر رہے تھے۔ ساتھ ساتھ پہیا بدلنے کے لیے سامان نکالا جا رہا تھا۔ دفعتاً میرے کانوں میں آقا جان کی کرخت آواز پڑی اور یہ اندیشہ درست ثابت ہو گیا کہ وہ بدبخت ہمارے ساتھ یہاں موجود ہے۔ یقیناً وہ پیچھے آنے والی گاڑی میں سوار تھا اور اب اس لوڈر کے ڈرائیور وغیرہ پر برس رہا تھا۔ اس نے ڈرائیور یا ہیلپر میں سے کسی کو گندی گالی دی اور جلدی ہاتھ چلانے کا حکم دیا۔ اسی دوران میں اس کے سیل فون کی مخصوص گھنٹی بجی اور وہ کال سننے میں مصروف ہو گیا۔ وہ مادری زبان میں بات کر رہا تھا۔ میں صرف اتنا اندازہ لگا سکا کہ اس کا مخاطب کوئی علی ہے۔ بہرحال انیق میرے ساتھ گاڑی کے اندر موجود تھا اور وہ آقا جان کا بولا ہوا ہر ہر لفظ سمجھ رہا تھا۔ تاریکی میں مجھے انیق کے تاثرات تو صاف نظر نہیں آ رہے تھے مگر اس کے پہلو بدلنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ گفتگو اہم ہے۔ بات کرتے کرتے آقا جان کچھ فاصلے پر چلا گیا لیکن اس گفتگو کا اہم ترین حصہ انیق سن چکا تھا۔

اس نے سرگوشی کے لہجے میں انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ "شاہ زیب بھائی! تمہاری ربڑی والی بات درست تھی۔ ہمیں بڑی اسپیشل ربڑی بڑے اہتمام کے ساتھ کھلانے کا ارادہ رکھتے ہیں یہ لوگ۔"

"سیدھی طرح بتاؤ۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔

وہ بولا۔ "یہ کنجر زادہ ہمیں اپنے کسی نجی ٹارچر سیل میں لے کر جا رہا ہے۔ ہم سے سجاول کا اتا پتا اگلوانا چاہتا ہے۔"

میری رگوں میں خون نے اچھالا مارا۔ ہاتھ پاؤں میں سنسناہٹ جاگ گئی۔ آخر آقا جان نے اپنی اصل دکھا ہی دی تھی لیکن وہ جانتا نہیں تھا کہ اس نے کہاں ہاتھ ڈالا ہے۔ اس نے ہمیں "انڈر اسٹیمیٹ" کیا تھا۔ یہ اسے سبق سکھانے کا وقت تھا۔

"پھر کیا ارادہ ہے؟" انیق نے سرگوشی کی۔

"ربڑی کھانے اور کھلانے کے لیے یہ موقع اچھا ہے۔ وہاں ربڑی والی دکان (ٹارچر سیل) پر پہنچ گئے تو پھر

پتا نہیں وہاں کتنے بندے ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میں تیار ہوں۔'' وہ جوش سے بولا۔

''تمہاری جیب میں ایک لائٹر تھا؟''

''ہاں...... ہے...... یہ لیں۔'' انیق نے لائٹر میری ہتھیلی پر رکھ دیا۔ میں نے لائٹر آن کیا اور فوم کی نشست کے ایک کونے کو آگ دکھا دی۔ ایک ننھا سا شعلہ پیدا ہوا اور بڑھنے لگا۔ میں نے دھڑا دھڑ گاڑی کی کھڑکیاں بجانا شروع کیں۔ ''دروازہ کھولو'' میں چلایا۔

اب انیق بھی میرا ساتھ دے رہا تھا۔ شروع میں تو ہمارے شور کو معمول کی کارروائی سمجھا گیا۔ لیکن جب دھواں درزوں میں سے باہر نکلنا شروع ہوا اور ہمارا شور بھی بڑھ گیا تو گارڈز کو بدحواسی میں عقبی دروازہ کھولنا پڑا۔ یہ ایک چاندنی رات تھی۔ اردگرد سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے تیزی سے موقع محل دیکھ لیا۔ یہاں ہماری والی بند گاڑی کے علاوہ ایک کار موجود تھی۔ گارڈز کی تعداد تقریباً چھ تھی۔ ان میں سے دو گاڑی کا ٹائر بدلنے میں مصروف تھے۔ باقی چار میں سے دو کی رائفلیں کندھوں پر جھول رہی تھیں۔ دو کی رائفلیں ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ دھوئیں کے سبب ہم بری طرح کھانستے ہوئے باہر نکلے تھے۔ خاص طور سے انیق کی کھانسی تو نہایت شدید تھی، اور میں جانتا تھا کہ اس میں ایکٹنگ بھی شامل ہے۔ وہ کھانستے کھانستے گھٹنوں کے بل گر گیا۔ اس کا سانس جیسے رک گیا تھا۔

ایک گارڈز نے اس کے قریب جھک کر اسے سیدھا کرنا چاہا اور اس کی یہ غلطی نہ صرف اسے اس کی رائفل سے محروم کر گئی بلکہ اسے اپنے سینے کے نچلے اور نازک حصے پر سر کی ایک ایسی زوردار ٹکر سہنا پڑی کہ وہ اچھل کر کئی فٹ پیچھے گرا۔

انیق کے ایکشن میں آتے ساتھ ہی میں نے سامنے والے گارڈ پر چھلانگ لگا دی تھی۔ سب سے پہلے میں نے اس کی آٹومیٹک رائفل ہی اوپر اٹھائی۔ وہ بے دریغ ٹریگر دبا چکا تھا۔ تڑتڑ کی لرزہ خیز آواز کے ساتھ بہت سے شعلے چاندنی میں پرواز کر گئے۔ میں نے رائفل بردار کی ناف میں زوردار لات رسید کر کے رائفل اس سے چھین لی۔ میں نے آقا جان کو اپنی سفید گاڑی کے پاس کھڑے دیکھ لیا تھا۔ میں اس کو گن پوائنٹ پر لے کر باقیوں سے ہتھیار رکھوانا چاہتا تھا لیکن وہ حالات کی نزاکت بھانپ چکا تھا، اس سے پہلے کہ میں پوری طرح رائفل کو اپنی گرفت میں لے پاتا اور اسے للکارتا، وہ نشیب میں چھلانگ لگا کر جھاڑیوں میں اوجھل ہو گیا۔ ایک گارڈ اپنی سیون ایم ایم سونت کر میرے سامنے آیا، میں نے اس کی ٹانگوں کو نشانہ بنایا۔ پنڈلی پر ایک گولی کھا کر وہ اوندھے منہ میرے قدموں میں گرا۔ تاہم تب تک تین گارڈز ایک ساتھ مجھ پر ہلا بول چکے تھے۔ شاید وہ مجھے گولی مارے بغیر پکڑنا چاہتے تھے اور بند گاڑی کا دروازہ کھولنے کے بعد یہ ان کی دوسری بھول تھی۔ انہوں نے مجھ سے رائفل چھیننے کی کوشش کی اور میں نے اگلے تیس چالیس سیکنڈ میں انہیں روئی کی طرح دھنک ڈالا۔ دوسری طرف انیق بھی بڑی کامیابی سے اپنی رائفل کا دفاع کر رہا تھا۔ وہ اپنے دو مدِمقابل سے گتھم گتھا تھا اور انہیں مسلسل گھونسے اور ٹکریں رسید کر رہا تھا۔ میرے حریفوں میں سے دو اپنی ہڈیاں تڑوا چکے تھے اور اب کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں تھے۔ تیسرے کی رائفل بھی اس کی گرفت سے نکل چکی تھی۔ اور وہ خنجر برآمد کرنے کی لاحاصل کوشش میں تھا لیکن پھر اچانک پانسا پلٹا۔ یہ تین موٹر سائیکلیں تھیں جو برق رفتاری سے موقع پر پہنچیں۔ ہر بائیک پر دو دو افراد سوار تھے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا یہ لوگ آقا جان کے قریبی ساتھیوں میں شمار ہوتے تھے اور کچھ تاخیر کے ساتھ پارا چنار سے روانہ ہوئے تھے۔ انہوں نے میدان جنگ گرم دیکھا تو آتے ساتھ ہی کود پڑے۔ ان میں سے ایک نے تو موٹر بائیک براہِ راست میری ٹانگوں میں گرائی اور دونوں سوار اچھل کر مجھ سے لپٹ گئے۔ ان کا واسطہ کسی عام شخص سے نہیں ایم ایم اے کے بورلی چیمپئن سے تھا مگر مجھے انیق کی طرف بھی دیکھنا پڑ رہا تھا۔ وہ اب نیچے گر گیا تھا اور اس سے رائفل چھیننے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ میں نے اب تک فائر کرنے سے گریز کیا تھا مگر لگتا تھا کہ اب فائر کرنا پڑے گا۔ میں نے دوسری گولی اس شخص پر چلائی جس نے انیق کی گردن پر پاؤں رکھا ہوا تھا اور رائفل کو مروڑ دے رہا تھا تاکہ وہ اس کی گرفت سے نکل جائے۔ اس بار بھی میں نے ٹانگ پر ہی فائر کیا تھا۔ لمبا تڑنگا پٹھان گارڈ جس کے وزن سے انیق کی گردن ٹوٹنے کے قریب تھی تڑپ کر گرا۔ تاہم گرتے گرتے بھی وہ انیق والی رائفل لے گیا۔ میں نے تیسرا فائر اس شخص پر کیا جو خطرناک انداز میں اپنی رائفل انیق پر تان رہا تھا۔ گولی اس کے پیٹ میں لگی اور وہ سفید کار سے ٹکرا کر گر گیا۔ جب ان لوگوں نے مجھے مرنے مارنے پر آمادہ دیکھا تو رائفلیں سونت لیں۔ میری ایک رائفل کے مقابلے میں کم و بیش چار رائفلیں میری طرف اٹھ گئیں۔ ایسے ہی وہ مقام ہوتے ہیں جہاں مارشل آرٹ ناکام ہو جاتا ہے۔

اور بدمعاش و خونخوار غلبہ پالیتے ہیں۔ میں نے مارشل آرٹ کے علاوہ جو کچھ سیکھا تھا وہ ایسی پچویشنز کا مقابلہ کرنے کے لیے سیکھا تھا جب ایک ٹریگر دبا کر کسی شہ زور کو اوندھے منہ لٹا دیا جاتا ہے، جب کسی گینگسٹر کے پالتو قاتل، جوڈو کراٹے کے کسی نہتے کھلاڑی پر پگھلے ہوئے سیسے کی بارش کر دیتے ہیں اور وہ اپنے سارے فن و ہنر سمیت پلک جھپکتے میں راہی عدم ہو جاتا ہے۔ انیق کو تو انہوں نے دبوچ لیا تھا لیکن میرے ہاتھ میں آٹومیٹک رائفل تھی۔ میں ان کے لیے خطرے کی علامت تھا۔ وہ کسی بھی وقت مجھ پر فائر کھول سکتے تھے۔ کم از کم شدید زخمی تو کر ہی سکتے تھے۔ میری نگاہ اس تاریک نشیب کی طرف تھی جہاں کچھ دیر پہلے مجھ سے بچنے کے لیے آقا جان نے جست لگائی تھی۔ آخری کوشش کے طور پر میں خود کو اس نشیب میں گرا سکتا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں اس نازک فیصلے پر عمل کرتا۔ ایک للکار سنائی دی۔ یہ آواز میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ یہ سجاول کی آواز تھی۔ وہ دہاڑا تھا۔ ”رک جاؤ...... کوئی گولی نہ چلائے...... رک جاؤ۔“

میں نے مڑ کر دیکھا، کیچڑ میں لتھڑی ہوئی ایک بڑی جیپ کی جھلک نظر آئی۔ اس کی تیز ہیڈ لائٹس اردگرد کے سارے منظر کو روشن کر رہی تھیں۔ اس بڑی جیپ پر کم و بیش آٹھ افراد سوار تھے۔ ان میں سے کئی ایک نے اپنی رائفلیں آقا جان کے ساتھیوں کی طرف تان رکھی تھیں۔ سجاول کی سرخ آنکھیں تاریکی میں کسی شکاری جانور کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس کے سر پر ایک بڑا خاکی پٹکا تھا۔ وہ جست لگا کر جیپ سے اترا۔ اس کی رائفل بدستور آقا جان کے شوٹرز کی طرف تھی۔ اس نے بلند آواز سے کہا۔ ”کوئی بھی گولی نہ چلائے..... نہیں تو سب چلا دیں گے۔“

یہ بڑا ڈرامائی قسم کا سین تھا۔ جیسے اس چاندنی رات میں...... اس ویران جگہ پر اس جما دینے والی سردی کے تھپیڑوں میں کسی فلم کی عکس بندی ہو رہی ہو۔ دونوں طرف سے رائفلیں اٹھی ہوئی تھیں۔ مجھ سمیت سب نے انگلیاں ٹریگرز پر رکھی ہوئی تھیں۔ یہی وقت تھا جب آقا جان چلاتا ہوا نشیب میں سے برآمد ہو گیا۔ اس کا پینٹ کوٹ جھاڑ جھنکاڑ اور مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے۔ اسٹاپ اٹ..... آئی سے اسٹاپ اٹ۔“

کوئی گولی نہیں چلا رہا تھا مگر رائفل رکھنے کو بھی کوئی تیار نہیں تھا۔ انیق کو بدستور تین افراد نے جکڑا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا اس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا اور اس کا سویٹر تار تار ہو چکا تھا۔ آقا جان کے چہرے پر بھی کئی خراشیں نظر آ رہی تھیں۔ سجاول کی گرجدار آواز ابھری، وہ بولا۔ ”شاہ زیب! تم الٹے قدموں چل کر یہاں میرے پاس آ جاؤ۔“

میں نے ایسا ہی کیا اور سجاول کے پاس پہنچ گیا۔ یہی وقت تھا جب میری نگاہ کیچڑ میں لتھڑی ہوئی جیپ کے اندر گئی۔ میں ششدر رہ گیا۔ وہاں انچارج گارڈ قادر خان رسیوں سے بندھا پڑا تھا۔ قادر خان کے چہرے پر چوٹوں کے کئی نشان تھے۔ اس کا ایک ساتھی بھی اس کے پہلو میں تھا اور اس کی مشکیں بھی کسی ہوئی تھیں۔ یہ کیا ماجرا تھا؟ قادر خان کی جگہ سجاول اور سجاول کی جگہ قادر خان نظر آ رہا تھا۔

سجاول نے آقا جان سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”یہ اچھا صلہ مل رہا ہے ہم کو...... میں تو سمجھا تھا کہ تمہارے مجرم کو پکڑ کر لاؤں گا تو گلے میں ہار ڈالو گے تم لوگ۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو تم؟“ آقا جان نے بلند آواز میں کہا۔

”کہنا کچھ نہیں چاہتا، خود ہی دیکھ لو۔ تمہارا سیکیورٹی انچارج، تمہارا سب سے بڑا محافظ...... سب سے بڑا چور نکلا ہے۔ مال بھی تقریباً سارا برآمد ہو گیا ہے اور یہ خود بھی موجود ہے۔“

آقا جان بھی ہکا بکا نظر آنے لگا۔ میں نے کیچڑ سے لتھڑی ہوئی جیپ میں جھانکا، قادر خان جیپ کے فرش پر پہلو کے بل چپ پڑا تھا اور اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں قادر خان کو اس حالت میں دیکھ رہا ہوں۔

آقا جان چند قدم چل کر آگے آیا اور اس نے بھی جیپ میں جھانکا۔ قادر خان کو دیکھ کر اس کی ناک کا بل کچھ اور موٹا ہو گیا۔ کچھ دیر تک تذبذب میں رہنے کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں کو ہاتھ سے اشارہ کیا کہ وہ اپنی رائفلیں نیچے کر لیں۔

ان لوگوں نے یکے بعد دیگرے رائفلیں جھکا لیں تو ”کیچڑ آلود جیپ“ کے آس پاس کھڑے سجاول کے ساتھیوں نے بھی ہتھیار نیچے کر لیے۔ میں نے بھی رائفل ایک جانب رکھ دی۔ انیق نے بھی خود کو چھڑایا اور لپک کر ہمارے پاس پہنچ گیا۔ جس بند گاڑی کی نشست کو میں نے آگ لگائی تھی اس کے اندر سے اب بھی دھواں اٹھ رہا تھا۔ بہرحال آگ صرف نشست کے ایک حصے تک ہی محدود رہی تھی۔ اسے مٹی وغیرہ ڈال کر بجھا دیا گیا تھا۔ جس گارڈ کے پیٹ میں میری چلائی ہوئی گولی لگی تھی وہ سڑک پر لوٹ پوٹ

رہا تھا۔ اس کے سوا باقی سب کی حالت تسلی بخش تھی۔ اسے سفید کار میں ڈالا گیا، ایک اور زخمی جس کے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی، کار میں سوار ہو گیا۔ کار انہیں لے کر تیزی کے ساتھ روانہ ہو گئی۔

"یہ سب کیا ڈراما ہے؟" آقا جان جھنجلا کر بولا۔

جواب دینے کے بجائے سجاول جیپ کی طرف بڑھا اور ریگ زین کے دو بڑے بیگ کھینچ کر باہر نکال لیے۔ یہ دونوں بیگ خاصے وزنی تھے۔ سجاول نے انہیں بے پروائی سے زمین پر پھینکا۔ پھر ایک بیگ کی زپ کھولی۔ وہ ملکی اور غیر ملکی کرنسی سے بھرا ہوا تھا۔ چند نہایت قیمتی ڈیکوریشن پیس اور ان پر لگے ہوئے ڈائمنڈ بھی ہیڈ لائٹس میں چمک رہے تھے۔ یقیناً دوسرے بیگ کا سامان بھی اسی نوع کا تھا۔ اندازاً دونوں بیگز کا وزن پینتیس چالیس کلو تو تھا۔

سجاول نے رائفل کا بیرل قادر خان کے سر سے لگایا اور زوردار جھٹکا دیتے ہوئے بولا۔ "اپنے منہ سے بک کہ کیا ہے یہ سب کچھ؟"

قادر خان بولا کچھ نہیں لیکن اس کے نہ بولنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس کے تاثرات چلا چلا کر یہ گواہی دے رہے تھے کہ سجاول غلط نہیں کہہ رہا۔ وہ اپنے نتھنے سے گاہے بگاہے رسنے والا خون پونچھتا رہا اور نگاہیں جھکائے رکھیں۔ انسان کے اتنے روپ ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ شکلیں دھوکا دیتی ہیں۔ قادر خان کو ہم کیا سمجھتے تھے اور وہ کیا نکلا تھا کہ وہ اس قماش کا بندہ ہے۔ ایک طرح سے وہ پاراہاؤس کا سب سے بڑا محافظ تھا اور اسی نے پاراہاؤس میں اتنی بڑی نقب لگائی تھی......

دوسری طرف سجاول تھا۔ پاراہاؤس والوں کا سارا شک...... اسی کی طرف جا رہا تھا۔ شکیل، داراب اور اتیق، سجاول کو ایک ڈکیت کی حیثیت سے بھی جانتے تھے اور انہیں سو فیصد یقین تھا کہ یہ بڑی واردات سجاول نے ہی کی ہے۔ وہ دو تجوریاں خالی کر کے بھاگا ہے اور سیکیورٹی انچارج اپنے فرض کو لبیک کہتے ہوئے اس کے پیچھے گیا ہے مگر جو کچھ سامنے آیا وہ برعکس تھا۔

سجاول نے اپنی رائفل کا بیرل قادر خان کے زخمی ساتھی کے سر پر رسید کیا اور کڑک کر پوچھا۔ "بولو...... ہم نے کہاں سے پکڑا ہے تمہیں؟"

اس نے سجاول کی بڑی بڑی سرخ آنکھوں میں دیکھا اور ہکلا کر بولا۔ "دریا پار کالے کیکروں والے علاقے سے۔"

سجاول نے کروڑوں کے مال مسروقہ اور نقدی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ اپنی والدہ کا جہیز کہاں سے اٹھایا ہے تم نے؟"

"اندر...... اندر والی...... دو الماریوں (تجوریوں) سے۔" اس نے نظریں جھکا کر کہا۔

اگلے دس منٹ میں ساری صورتِ حال کھل کر سامنے آگئی۔ سجاول نے جو روداد سنائی وہ کچھ اس طرح تھی۔ قادر خان غالباً ایک عرصے سے کسی اچھے موقع کی تلاش میں تھا۔ سیکیورٹی انچارج کی حیثیت سے وہ ہر جگہ آجا سکتا تھا اور اہم تالوں کی چابیوں تک بھی اس کی رسائی تھی۔ پرسوں شب اس نے اپنے دیرینہ منصوبے کو عملی جامہ پہنایا۔ ایک ایمبولینس اور "تشویشناک" حالت والا ایک مریض وہ پہلے ہی تیار کر چکا تھا۔ ایمبولینس پاراہاؤس میں ایک ایسی جگہ کھڑی تھی جہاں اسے اصولی طور پر نہیں ہونا چاہیے تھا۔ رات کے اندھیرے میں اس کے اردگرد سجاول کو کچھ مشکوک سرگرمی بھی نظر آئی۔ آخر وہ وقت آگیا جب قادر خان دو تجوریاں خالی کر کے سامان ایمبولینس میں پہنچا چکا تھا اور جانے کی تیاری میں تھا۔ سجاول اب پوری طرح ٹھٹک چکا تھا۔ اس کا دل گواہی دینے لگا تھا کہ دال میں بہت کچھ کالا ہے۔ وہ باہر نکلا اور سیکیورٹی کے کیمروں سے بچتا ہوا ایمبولینس کے قریب پہنچ گیا۔ ایمبولینس کو ایسی جگہ کھڑا کیا گیا تھا جہاں سی سی ٹی وی کیمرا خراب تھا...... یا خراب کر دیا گیا تھا۔ چند منٹ بعد جب ایمبولینس حرکت میں آئی تو سجاول اس کے نیچے موجود تھا۔ اس نے رسک لیا تھا اور خود کو اس کے پیندے کے نیچے چپکا لیا تھا۔ اس کام کے لیے اس نے ایک چرمی بیلٹ کا سہارا بھی لیا تھا۔

پاراہاؤس سے باہر نکلنے کے بعد ایمبولینس کسی نامعلوم مقام کی طرف روانہ ہو گئی۔ سجاول تادیر اس طرح ایمبولینس کے نیچے چپکا نہیں رہ سکتا تھا۔ سڑک سے اس کے جسم کی دوری بھی زیادہ نہیں تھی۔ کسی اسپیڈ بریکر یا کھڈے میں اچھلنے کی صورت میں سجاول زخمی ہو سکتا تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ عقب میں کچھ فاصلے پر کوئی اور گاڑی بھی آرہی ہے۔ نہر کے ایک تنگ پل پر سے گزرتے ہوئے جب ایمبولینس کی رفتار بہت دھیمی ہوئی تو سجاول نے خود کو ایمبولینس سے علیحدہ کر لیا۔ اسے معمولی خراشیں آئیں۔ اب اس کی نگاہ پیچھے آنے والی گاڑی پر تھی۔ پیچھے آنے والی گاڑی ایک پرانے ماڈل کی ایف ایکس کار تھی۔ سجاول نے سڑک کے درمیان...... کھڑے ہو کر اسے روکا۔ اسے ایک

جواں سال شخص چلا رہا تھا۔ سجاول نے اسے ذرا چمکار کر بھگا دیا اور خود ایف ایکس کار پر سوار ہو کر ایمبولینس کا پیچھا جاری رکھا۔ جلد ہی ایمبولینس والوں کو شک ہو گیا کہ ایف ایکس کار مسلسل پیچھے آ رہی ہے۔ اس امر کی تصدیق کے لیے انہوں نے ایمبولینس کو سڑک سے کچے میں اتار دیا اور درختوں کے درمیان ناہموار راستے پر آگے بڑھنے لگے۔ سجاول نے بھی ایف ایکس کچے راستے پر ڈال دی۔ جب اسے اندازہ ہوا کہ تیز رفتار ایمبولینس اسے جل دے کر نکل سکتی ہے تو اس نے اپنے پستول سے اس کا ٹائر برسٹ کرنا چاہا۔ اس نے قریباً 50 میٹر کے فاصلے سے ایمبولینس پر تین فائر کیے۔ جواب میں ایمبولینس کی طرف سے بھی اس پر فائر آیا۔ تعاقب میں شدت آ گئی۔ ایمبولینس میں قادر خان وغیرہ کو علم نہیں تھا کہ صرف ایک اکیلا شخص ان کا تعاقب کر رہا ہے۔ اندھیرے میں انہیں کار کی صرف ہیڈ لائٹس دکھائی دے رہی تھیں اور وہ خوف زدہ ہو چکے تھے۔ آگے ایک نالا تھا جس میں پانی چل رہا تھا۔ قادر خان وغیرہ نے ایمبولینس نالے میں ڈال دی۔ سجاول کو بھی کار نالے میں اتارنا پڑی۔ ایمبولینس تو جیسے تیسے نکل گئی مگر سجاول والی کار چھوٹی ہونے کی وجہ سے نالے کے بیچ میں بند ہو گئی۔ سجاول نے کار چھوڑ دی اور کمر کمر پانی سے گزر کر کنارے پر پہنچا، وہ ہر صورت ایمبولینس کا پیچھا جاری رکھنا چاہتا تھا۔ آگے راستہ بے حد دشوار گزار تھا، جگہ جگہ بلند سرکنڈے تھے اور دلدلی زمین تھی۔ سجاول کا اندازہ درست نکلا۔ قریباً ایک گھنٹے بعد اس نے ایمبولینس کو گھنے سرکنڈوں میں کھڑے دیکھ لیا۔ ایمبولینس بالکل خالی تھی۔ ارد گرد موجود ٹائروں کے نشانات سے واضح ہوتا تھا کہ ایک فور وہیل جیپ موقع پر پہنچی تھی اور قادر خان اپنے دونوں ساتھیوں اور مسروقہ سامان سمیت اس میں سوار ہو کر نکل گیا تھا۔

نالا پار کرتے ہوئے سجاول کا سیل فون بھیگ کر بیکار ہو گیا تھا، تاہم اس کے بیکار ہونے سے ذرا پہلے سجاول نے اس پر ایک چھوٹی سی کال کر لی تھی۔ یہ کال اس کے ایک مقامی دوست کالے خان کے لیے تھی۔ اس کال نے کام دکھایا اور قریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد کالے خان اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ ایک جیپ پر وہاں پہنچ گیا۔ ان لوگوں نے مل کر جنگل میں قادر خان کو ڈھونڈا اور آج رات دس بجے کے لگ بھگ کامیاب ہو گئے۔ دراصل قادر خان اور اس کے تین ساتھی معاملہ ٹھنڈا ہونے تک کے لیے جنگل میں ہی چھپ گئے تھے۔ ٹائروں کے نشانات نے ان کی نشاندہی کی۔

سجاول اور کالے خان وغیرہ نے اپنی جیپ چھوڑ دی اور پیدل ہی آگے بڑھے۔ ایک جگہ سجاول کو جھاڑیوں میں سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ وہ پیٹ کے بل رینگتا ہوا موقع پر پہنچا۔ چاندنی رات میں اس نے قادر خان کو جھاڑیوں میں بیٹھے دیکھا۔ وہ پیشاب کی حاجت کے لیے وہاں موجود تھا۔ اس کی رائفل ایک جانب درخت سے ٹکی ہوئی تھی۔ جونہی وہ اٹھا، سجاول نے رائفل کی نال اس کے سر سے لگا دی۔ اس نے بدحواسی میں سجاول پر حملہ کر دیا۔ چند سیکنڈ تک دونوں میں مارا ماری ہوئی۔ اسے سجاول کے مکے کی طاقت کا اندازہ نہیں تھا۔ جونہی سجاول کو موقع ملا اس نے قادر کو نیم بے ہوش کر کے زمین پر ڈال دیا۔

اس اثنا میں سجاول کے ساتھیوں کالے خان وغیرہ نے تیزی سے کارروائی کی اور قادر کے ساتھیوں کو ڈھونڈ لیا۔ انہوں نے شاخوں وغیرہ سے ایک عارضی سائبان بنا رکھا تھا اور چائے تیار کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک تو بھاگنے میں کامیاب ہو گیا لیکن ایک کو سارے مسروقہ سامان سمیت پکڑ لیا گیا۔ (تیسرا شاید لکڑیاں وغیرہ اکٹھی کرنے نکلا ہوا تھا، وہ ہاتھ نہیں آیا)

سجاول کی روداد سننے کے بعد ہر بات روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی۔ آغا جان اور اس کے ساتھیوں کے چہرے اب اترے ہوئے نظر آتے تھے۔ آغا جان کی ناک کا بل جو آدھ پون گھنٹا پہلے کوئی آدھ انچ ابھر آیا تھا اب ''ڈاؤن'' دکھائی دے رہا تھا۔ اب اس نے خود پر مصنوعی غصہ طاری کر رکھا تھا۔ وہ تیز آکر جیپ کی طرف بڑھا، اور پہلے سے زخمی قادر خان پر جھپٹ پڑا۔ اس نے قادر خان کو کئی تھپڑ رسید کیے اور اس کے بال کھینچتے ہوئے بولا۔ ''نمک حرام...... غدار...... تجھے کیا سمجھتے تھے ہم اور تو کیا نکلا۔ تیری تو کھال میں بھس بھروا کر نہ رکھ دیا تو آغا جان نام نہیں میرا۔ تیرے جیسے آستین کے سانپ ہی ہوتے ہیں جن کے سر جوتے سے کچلنے پڑتے ہیں......''

سجاول نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہو آغا صاحب۔ آستین کے سانپوں کے ساتھ اور دوسرے سانپوں کے ساتھ تو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ لیکن جو آپ کے وفادار خدمت گار ہیں، ان کے ساتھ بھی یہاں کچھ اچھا سلوک نہیں ہو رہا۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو تم؟'' آغا جان کی ناک کا بل پھر موٹا ہونے لگا۔

''میرا خیال ہے آپ سمجھ رہے ہیں۔ یہ سب کیا تھا جو

یہاں میرے آنے سے پہلے ہو رہا تھا؟"

"میں اس کا جواب یہاں نہیں، پارا ہاؤس میں جا کر دوں گا اور ان دونوں کو بھی جواب دینا پڑے گا۔" آقا جان نے تلخ انداز میں ہماری طرف اشارہ کیا۔ پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ "ان کی وجہ سے تین بندے زخمی ہوئے ہیں اور جس کے پیٹ میں گولی لگی ہے وہ شدید زخمی ہے۔ پتا نہیں کہ بچتا بھی ہے یا نہیں۔"

"لیکن جو کچھ ہوا ہے دونوں طرف سے ہوا ہے۔ مجھے پتا چلنا چاہیے کہ وجہ کیا تھی؟" سجاول بھی ڈٹ گیا۔

اس کے تاثرات دیکھ کر آقا جان ذرا دھیما پڑا۔ کہنے لگا۔ "میں نے اپنی طرف سے ان دونوں کا بھلا کیا...... جب تمہیں ساری صورتِ حال کا پتا چلے گا تو تمہیں خود بھی ان کی حرکت پر افسوس ہوگا۔"

"لیکن آقا جان صاحب! میں ابھی جاننا چاہتا ہوں۔" سجاول نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ اس کا سینہ تنا ہوا تھا اور رائفل پر اس کی گرفت بتا رہی تھی کہ وہ کسی بھی وقت اسے پھر سے تان سکتا ہے۔

آقا جان تاڑ گیا کہ یہ معاملہ ایسے نہیں ٹلے گا۔ اگلے تین چار منٹ میں اس نے جو کہانی گھڑی اور سنائی وہ کچھ یوں تھی، اس نے کہا کہ ان دونوں نے ہمیں ہمارے بھلے کے لیے پارا ہاؤس سے نکالا تھا اور ایک دو دن کے لیے کہیں اور رکھنا چاہ رہا تھا۔ اس "بھلے" کی وضاحت کرتے ہوئے اس نے سجاول کی طرف اشارہ کیا اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "تم کہہ رہے ہو کہ تم اس نمک حرام قادر خان کے پیچھے گئے تھے لیکن پارا ہاؤس میں یہی سمجھا گیا کہ جو کچھ ہوا ہے تم نے کیا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ تمہارے ساتھ ساتھ تمہارے ان دونوں ساتھیوں کے بارے میں بھی بہت باتیں بنائی گئی ہیں۔ پارا ہاؤس والوں میں سے کچھ لوگ ان دونوں کے بارے میں بہت زیادہ تپے ہوئے تھے۔ مجھے ڈر پیدا ہوا کہ کہیں ان کو کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کی جائے۔ کچھ اور نہ بھی ہوتا تو اس چوری کے بعد ان سے زبردست مار پیٹ تو ہو سکتی تھی۔ میں خاموشی کے ساتھ انہیں وہاں سے نکال لایا، لیکن راستے میں انہوں نے دوسرا ہی تماشا کر دیا۔ تم نے گاڑی کو لگی ہوئی آگ دیکھی ہی ہوگی۔ یہ انہوں نے خود لگائی اور ہمیں دروازہ کھولنے پر مجبور کیا۔ اس کے بعد یہاں جو کچھ ہوا ہے، وہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ دعا کرو کہ زخمی کی جان بچ جائے ورنہ بات دور تک جائے گی۔"

آقا جان سراسر جھوٹ بول رہا تھا۔ اس نے تارچر ہونے کے بعد حلمی کے ساتھ جو گفتگو کی تھی وہ ساری کی ساری انیق کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ لیکن انیق نے وہ گفتگو نہ بھی سنی ہوتی تو بھی یہ بات ہرگز ماننے جانے کے قابل نہیں تھی کہ آقا جان جیسے مکار لومڑ نے ہماری حفاظت کی خاطر ہمیں وہاں سے نکالا تھا۔ بند گاڑی میں ہمیں سوار کرتے ہوئے جس طرح ہم پر رائفلیں تانی گئی تھیں، وہ نقشہ ہی آئندہ کی صورتِ حال سمجھانے کے لیے کافی تھا۔ وڈے صاحب اور اہلِ خانہ میں سے بھی کوئی ایسا نہیں تھا جس کی طرف سے ہمیں خطرہ ہوتا۔

بہرحال میں نے اس موقع پر بات کو طول دینا مناسب نہیں سمجھا۔ ہم سرِ راہ ایک سڑک کے کنارے کھڑے تھے۔ رات کے تین بجے کا عمل تھا۔ اگر کسی پولیس کی کوئی پارٹی اس طرف آ نکلتی تو مسئلہ پیدا ہو سکتا تھا۔ سڑک کے کنارے کچی زمین پر ابھی تک ان خون کے دھبے موجود تھے جو میری گولی لگنے والے گارڈ کے جسم سے نکلا تھا۔ میں نے سجاول کو اشارہ کیا کہ فی الحال یہاں سے نکلا جائے۔ باقی باتیں پارا ہاؤس چل کر کریں گے۔ مال مسروقہ سے بھرے ہوئے دونوں بیگ آقا جان نے اپنی تحویل میں لے لیے تھے۔ میں نے سرگوشی میں سجاول سے کہہ دیا کہ وہ اسی گاڑی میں سوار ہو جس میں دونوں بیگ رکھے جائیں۔ مقصد یہی تھا کہ بیگ جوں کے توں پارا ہاؤس تک پہنچ جائیں۔ آقا جان کے ساتھی گارڈز خونی نظروں سے مجھے اور انیق کو دیکھ رہے تھے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ کم از کم مجھے تو ضرور چھلنی کر دیتے۔

دونوں بیگ اسی بند گاڑی میں رکھے گئے جس میں ہمیں ٹارچر سیل لے جایا جا رہا تھا۔ سجاول اور آقا جان بھی اس گاڑی میں بیٹھے۔ میں اور انیق کیچڑ آلود جیپ میں کالے خان وغیرہ کے ساتھ سوار ہوئے۔ دونوں گاڑیاں اور تینوں ہیوی موٹر بائیکس برق رفتاری سے پارا ہاؤس کی طرف محوِ سفر ہو گئیں۔

☆☆☆

ہم پارا ہاؤس پہنچ گئے۔ اگلے پانچ گھنٹے میں وہ سب کچھ حرف بہ حرف درست ثابت ہو گیا جو سجاول نے بتایا تھا۔ میں نے سجاول کو اس گفتگو سے آگاہ کر دیا جو ہم نے آقا جان اور حلمی کے درمیان راستے میں سنی تھی۔ سجاول یہ جان کر ششدر ہوا کہ بات یہاں تک پہنچ چکی تھی، اس کے غائب ہو جانے کی وجہ سے ہمیں ٹارچر سیل میں پہنچایا جا رہا

تھا۔ سجاول کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ لیکن یہ بات بتانے سے پہلے ہی میں اس سے وعدہ لے چکا تھا کہ وہ کسی سخت ردِعمل کا اظہار نہیں کرے گا...... اور یہ بات صرف اور صرف اپنے تک محدود رکھے گا۔ میں حالات میں بگاڑ پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ آقا جان کے پاس اپنے دفاع کے ایک سو ایک طریقے تھے۔ آخر میں نقصان پھر ہمارا ہی ہونا تھا۔

اصل صورتِ حال سامنے آنے کے بعد سجاول کے مخالفین کے منہ کو تالا لگ گیا تھا۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ سجاول کی شان میں مزید اضافہ ہوا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ ہماری حیثیت بھی بڑھی تھی۔ وڈے صاحب اور بڑی بیگم نے سجاول کو رہائشی حصے میں طلب کیا تھا اور مترجم کے ذریعے اس سے پوری روداد سننے کے بعد اس کے مشکور ہوئے تھے۔ قادر خان کے دو مفرور ساتھیوں کی تلاش شروع کردی گئی تھی اور قادر خان کو اس کے ساتھی سمیت تہ خانے میں ڈال دیا گیا تھا۔ بے شک یہ ایک بڑی واردات تھی۔ مال مسروقہ کی قیمت کروڑوں میں تھی۔ سامان کا معائنہ کیا جارہا تھا اور دیکھا جارہا تھا کہ اس میں کیا کمی بیشی ہے۔

میرے فائر سے شدید زخمی ہونے والے گارڈ کی حالت اب خطرے سے باہر تھی اور یہ بھی ایک اچھا شگون تھا۔ اس جھڑپ کی ساری تفصیل سے سجاول نے میری موجودگی میں وڈے صاحب کو آگاہ کیا تھا۔ اس نے اپنے وعدے کے مطابق واضح طور پر تو نہیں بتایا کہ آقا جان ہم دونوں کو اپنے کسی ٹارچر سیل کی طرف لے جارہا تھا۔ بہرحال اشارتاً یہ سوال ضرور اٹھایا کہ رات گئے مجھے اور انیق کو کہیں لے جانے کی کیا ضرورت تھی جبکہ وڈے صاحب کو اس کارروائی کی اطلاع بھی نہیں دی گئی؟ میں نے وڈے صاحب کے تاثرات دیکھے اور دل نے گواہی دی کہ وڈا صاحب اگر بات کی تہ تک نہیں پہنچا تو بالکل بے خبر بھی نہیں رہا۔ وہ سمجھ گیا ہے کہ آقا جان کے ارادے کچھ اور تھے۔ بہرحال کبھی کبھی یہ صاف نظر آتا تھا کہ وہ آقا جان کی من مانیوں کو نظرانداز کرنے پر مجبور ہے۔ یہ کوئی گہرا بھید تھا۔

وڈے صاحب سے میری اور سجاول کی اس ملاقات میں وہ دوسرا اہم ترین موضوع بھی ڈسکس ہوا جس کا تذکرہ شکیل داراب چوری والی واردات سے پہلے کر چکا تھا۔ وہاں بردناتی کے نزدیک کسی ملکیتی جزیرے میں کوئی سنگین قسم کی کشمکش چل رہی تھی۔ ثاقب اور حارث کی موت کے بعد اس جزیرے پر شدید ردِعمل ہوا تھا اور وڈے صاحب کے مخالفین نے کوئی بڑی کارروائی کر کے وڈے صاحب کے برادر نسبتی کو موت کے گھاٹ اتار ڈالا تھا۔ وڈے صاحب کا اب بردناتی پہنچنا ضروری ہوگیا تھا۔ وڈے صاحب کی گفتگو سننے کے بعد سجاول نے کہا۔ ”اگر ہم اس سلسلے میں آپ کے کسی کام آسکیں تو یہ ہماری بڑی خوش قسمتی ہوگی۔ اس سلسلے میں شکیل صاحب سے ہماری کچھ بات ہوئی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ اس بارے میں مزید بات کریں گے، لیکن پھر یہ چوری والی واردات ہوگئی۔

وڈے صاحب نے سگار کا گہرا کش لینے کے بعد مترجم کے ذریعے کہا۔ ”پچھلے چند مہینوں سے مجھے ہر طرف سے مایوس کن خبریں ہی ملی ہیں۔ اگر کچھ اچھا ہوا ہے تو وہ یہ کہ تم جیسے باہمت اور معاون بندوں سے ملاقات ہوگئی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔“

اسی دوران میں حلمی نے آکر وڈے صاحب کو اطلاع دی کہ شکیل داراب صاحب تشریف لارہے ہیں۔

وڈے صاحب نے کہا۔ ”اللہ اس کی عمر دراز کرے۔ ہماری پریشانیوں کو اپنی پریشانیاں سمجھ رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آج ہم اکٹھے بیٹھ کر بردناتی روانگی کے بارے میں کچھ فیصلہ کرلیتے ہیں۔“

اطلاع دے کر حلمی مؤدب انداز میں واپس مڑ گیا۔ دیکھنے میں وہ بہت شائستہ اور راست گو نظر آتا تھا۔ لیکن وہی مثال کہ کوا کب ہیں کچھ نظر آتے ہیں کچھ...... حلمی کے ساتھ آقا جان کی گفتگو سننے کے بعد ہم پر ثابت ہوگیا تھا کہ کسی خفیہ مقام پر لے جا کر ہماری چمڑی ادھیڑنے کے پروگرام میں حلمی بھی آقا جان کے ساتھ برابر کا شریک تھا۔ آقا جان نے پاراہاؤس پر گرفت مضبوط رکھنے کے لیے حلمی کو ہر طرح اپنے ساتھ ملا رکھا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد شکیل داراب اپنے پورے کروفر کے ساتھ نمودار ہوگیا۔ اس نے آتے ساتھ ہی سجاول کو گرم جوشی سے گلے لگایا اور قادر خان وغیرہ کو پکڑنے کے سلسلے میں اسے ”ولی“ مبارک باد دی۔ ساتھ ہی معذرت کا اظہار بھی کیا کہ سجاول کے اچانک غائب ہوجانے سے کئی طرح کی افواہیں پھیلیں اور غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔

☆☆☆

اس اہم ملاقات میں واقعی روانگی کے سلسلے میں فیصلہ ہوگیا۔ مجھے، سجاول اور انیق کو وڈے صاحب کے ساتھ ہی تین روز بعد بردناتی جانا تھا۔ حیرت انگیز طور پر پچھلے چند روز میں ہمارے سفری کاغذات مع ویزا وغیرہ تیار ہوچکے تھے۔

شکیل دار اب یہاں انتخابی سیاست میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ بہرحال اس کو بھی ایک ہفتے کے اندر برونائی کا وزٹ کرنا تھا۔ آقا جان چند گھنٹے پہلے پارا ہاؤس کے قریباً بیس ماہر ترین شوٹرز کے ساتھ برونائی پرواز کر چکا تھا۔ کچھ مزید تربیت یافتہ افراد بھی اگلے پانچ چھ گھنٹے میں روانہ ہو رہے تھے۔ پتا چلا کہ کچھ لوگ ملائیشیا سے بھی برونائی پہنچ رہے ہیں۔

انیق اس سفر کے سلسلے میں بہت پُرجوش تھا۔ اسے یقین تھا کہ نت نئے ہنگامے دیکھنے کو ملیں گے۔ درحقیقت داؤد بھاؤ جیسے گینگسٹر کے ساتھ رہ کر اس کے اندر بھی ہنگامے اور ایکشن کی بھوک پیدا ہو چکی تھی۔ وہ ہر وقت کسی بھی چھوٹی بڑی مہم جوئی کے لیے بالکل تیار رہتا تھا۔ وہ انہی لوگوں میں سے تھا جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کو ایک کھیل سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔

میں دو دن پہلے تک سجاول کے معاملے کی وجہ سے بے حد پریشان تھا لیکن اب یہ معاملہ کچھ اس طرح سے حل ہوا تھا کہ پارا ہاؤس میں سجاول کی پوزیشن روزِ روشن کی طرح صاف ہو گئی تھی اور اس کے قد کاٹھ میں بھی قابلِ قدر اضافہ ہوا تھا۔ اب یہ بات بھی یقینی تھی کہ وہ برونائی کے سفر میں ہمارے ساتھ ہوگا۔ لیکن اس سب کے باوجود میرے دل و دماغ میں ایک گہری مایوسی سی اتری ہوئی تھی۔ یہ مایوسی اور اداسی کسی اور حوالے سے تھی۔ یہ دل فگار کیفیت کسی اور سے نسبت رکھتی تھی، وہی جو سرسبز کھیت میں کھڑی مجھے پکارا کرتی تھی اور جسے میں نے پا کر کھو دیا تھا۔ میں پاکستان چھوڑ کر جا رہا تھا، پتا نہیں کہ باہر کیا حالات پیش آنے والے تھے۔ زندگی تو پانی کا بلبلا ہے اور بلبلا اگر تیز ہواؤں میں ہو تو اور بھی ناپائیدار ہوتا ہے۔ زندگی کی شام کب اور کس گلی میں ہو جائے کوئی نہیں جانتا۔ پتا نہیں کیوں پچھلے تین چار روز سے وہ بے طرح یاد آ رہی تھی۔ میرے دل میں عجیب سی خواہش پیدا ہو رہی تھی۔ میں پاکستان چھوڑنے سے پہلے ایک بار ایک نظر تاجور کو دیکھنا چاہتا تھا۔ دور ہی سے ایک بار اس کے چہرے کا طواف کر کے اپنی آنکھیں بند کر لینا چاہتا تھا اور اس کے تصور کو تادیر محفوظ کرنے کی خواہش رکھتا تھا۔ وہ کہاں ہوگی، کیا کر رہی ہوگی؟ کیسی لگتی ہوگی؟ ان گنت سوالات سینے میں کچوکے لگاتے رہتے تھے۔ ہر کچھ دیر کے بعد میں اپنے سیل فون کی خالی اسکرین دیکھتا تھا اور سینے میں ایک اور خنجر اتر جاتا تھا۔

میرے پاس ابھی قریباً ڈیڑھ دن تھا۔ میں صبح سویرے یہاں سے نکل جاتا تو رات تک لالہ موسیٰ کے اس دور افتادہ گاؤں سے ہو کر واپس آ سکتا تھا جہاں اس جانِ جاں کا بسیرا تھا، جہاں اس کے قدم پڑتے تھے، جہاں اس کی آواز جلترنگ بجاتی تھی۔

میں نے انیق اور سجاول کو ایک ذاتی کام کا بتایا۔ سجاول نے کام کی نوعیت پوچھنے کی بہت کوشش کی مگر میں نے اس سے کہا کہ اپنے نجی معاملے کو اپنی ذات تک محدود رکھنے کا میں حق رکھتا ہوں۔ سجاول اور انیق تاڑ تو گئے مگر انہوں نے مجھے زیادہ کریدا نہیں۔ سجاول نے وڈے صاحب سے مجھے جانے کی اجازت دلا دی بلکہ ایک سوزوکی مارگلہ کار بھی مجھے آنے جانے کے لیے مہیا کر دی گئی۔ مجھے کار کی ایسی ضرورت تو نہیں تھی لیکن میرے پیشِ نظر ایک اور مقصد بھی تھا۔ رضوان اب تک میرے کمرے میں ہی پوشیدہ تھا۔ میں برونائی جانے سے پہلے اسے بحفاظت پارا ہاؤس سے نکالنا چاہتا تھا...... رضوان کے مسئلے کے سلسلے میں لاہور میں داؤد بھاؤ کو پہلے ہی مطلع کر چکا تھا۔ رضوان کے مسئلے کو حل کرنا داؤد بھاؤ جیسے آدمی کے لیے ایسا ہی تھا جیسے فرش پر چلتی کسی چیونٹی کو مسل دینا۔ تاہم داؤد بھاؤ نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ رضوان کے برادر نسبتی کے ساتھ کوئی سختی نہیں کرے گا، بلکہ حکمت اور دباؤ کے ذریعے اسے مجبور کر دے گا کہ وہ اپنے گھر کے معاملات درست کرے اور اپنی بیوی سے اچھا سلوک کرے۔ رضوان کو ایک خوف یہ بھی تھا کہ کہیں ڈاکٹر ارم کے قتل کا الزام کلی طور پر اس کے سر نہ تھوپ دیا جائے۔ اس حوالے سے میں نے رضوان کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ ابھی منظرِ عام پر نہیں آئے گا۔ داؤد بھاؤ نے اس کے لیے لاہور ہی کی ایک رہائشی سوسائٹی میں ایک محفوظ ٹھکانے کا انتظام کر دیا تھا۔

پروگرام کے مطابق رات پچھلے پہر میں نے انیق کے ساتھ مل کر رضوان کو سوزوکی مارگلہ کی مختصر ڈکی میں پیک کر دیا۔ اس کام کو آسان بنانے کے لیے سجاول نے پورچ کی طرف موجود دو گارڈز کو بہانے سے اپنے پاس طلب کر لیا تھا۔ اس مقام کا سی سی ٹی وی کیمرا تب سے خراب تھا جب قادر خان نقدی اور زیورات وغیرہ سے بھرے ہوئے تھیلے لے کر نکلا تھا اور انہیں ایمبولینس میں رکھا تھا۔

علی الصباح میں پارا ہاؤس کی سخت ترین سیکیورٹی سے گزر کر اس دور افتادہ بستی کی طرف روانہ ہو گیا جہاں کچھ عرصہ پہلے تاجور کو چھوڑا تھا۔ ایک دن پہلے ہی چاند گڑھی میں پہلوان حشمت سے میرا ٹیلی فونک رابطہ ہو گیا تھا۔ میں

نے پہلوان کو سمجھا دیا تھا کہ اس نے کہاں اور کب پہنچنا ہے، اور اپنے ساتھ کیا لے کر آنا ہے۔ سوزوکی کار پر میں نے خیریت کے ساتھ چناب کے پل تک کا سفر طے کیا پھر ایک سنسان جگہ پر گاڑی کھڑی کی اور مڑے تڑے ہوئے رضوان کو ڈکی میں سے نکال دیا۔ اس کے گال حدت اور خون کے دباؤ سے سرخ ہورہے تھے۔ وہ مضبوط لیکن لچک دار جسم کا مالک تھا ورنہ اتنی مختصر ڈکی میں سفر کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ وقتِ رخصت اس کی آنکھوں میں نمی آگئی۔ بولا۔ ''شاہ زیب صاحب! اگر آپ کی مدد نہ ہوتی تو میں اس شکنجے سے کبھی نہ نکل سکتا۔ میں کس منہ سے آپ تینوں کا شکریہ ادا کروں۔''

میں نے کہا۔ ''شکریہ بالکل ادا نہ کرو۔ لیکن اتنی سی بات ضرور مانو کہ آنکھوں میں اس طرح پانی نہ لاؤ۔ مرد روتے نہیں...... اور میں دیکھ رہا ہوں کہ اب تم مرد بن رہے ہو۔ ڈاکٹر کے مرنے کے بعد تم نے جس طرح خود کو حملہ آوروں سے بچایا اور پھر بعد میں شکیل کی پناہ حاصل کی، وہ اس بات کی دلیل ہے کہ اب تم کو حالات کا مقابلہ کرنا آرہا ہے۔ قدرت نے تمہیں ڈاکٹر ارم کے جال سے نکال دیا ہے۔ اب بہت جلد تم اونچی اڑان بھرو گے...... مجھے یقین ہے۔''

اسے ہر طرح سے تسلی اور ضروری ہدایات دے کر میں نے روانہ کردیا۔ بس اڈا قریب ہی تھا، اسے وہاں سے سیدھا لاہور روانہ ہوجانا تھا۔ کسی بھی مشکل کے سلسلے میں وہ داؤد بھاؤ سے براہِ راست رابطہ کرسکتا تھا۔ داؤد بھاؤ سے میرا ابھی ٹیلی فونک رابطہ ہوتا رہتا تھا۔ میں چاچا حفیظ اور ولید کی خیر خیریت کے حوالے سے بھی داؤد بھاؤ سے مدد لے رہا تھا۔ (ولید ابھی تک جیل میں تھا۔ شکیل داراب کے وعدے کے مطابق وہ ابھی تک کسی سنگین کیس میں ملوث نہیں ہوا تھا)

اب میرا آگے کا سفر شروع ہوا۔ میں لیہ سے آگے شور کوٹ روڈ تک تو پہنچ ہی چکا تھا۔ اب میرا رخ فیصل آباد کی طرف ہوا۔ فیصل آباد کے بارونق شہر کے قریب سے گزرتا ہوا میں حافظ آباد پہنچا۔ تب تک صبح کے نو بج چکے تھے۔ میں نے ایک ہوٹل سے واجبی سا ناشتا کیا اور پھر اپنا رخ لالہ موسیٰ کی طرف کرلیا۔ ڈنگہ کے مقام پر میرا اور پہلوان حشمت کا میل ہونا تھا۔ میں مقررہ وقت سے آدھ گھنٹا پہلے ہی پہنچ گیا تھا اس لیے خدشہ تھا کہ شاید پہلوان ابھی پہنچا نہ ہو...... مگر دودھ دہی کی ایک دکان کے پاس میں نے دور ہی سے نیلا اسکوٹر دیکھ لیا اور اس کے پاس ہی پہلوان حشمت کا بھاری تن و توش بھی دکھائی دے گیا۔ وہ حسبِ معمول شلوار قمیص اور ڈبل وار سوئیٹر میں تھا۔ اس نے بھی مجھے دور ہی سے دیکھ لیا تھا اور اپنی باچھیں پھیلالی تھیں۔

میں نے گاڑی روکی۔ ہم بغلگیر ہوئے اور گاڑی کے اندر ہی بیٹھ گئے۔ باہر کافی سرد ہوا چل رہی تھی اور سورج بھی گاہے بگاہے بادلوں کے پیچھے منہ چھپالیتا تھا۔ یہ کرائے کا اسکوٹر تھا۔ اس کے ساتھ ہیلمٹ بھی موجود تھا۔ پہلوان نے ان دونوں چیزوں کا انتظام کل رات ہی کرلیا تھا۔ اب وہ چاند گڑھی سے قریباً بیس کلومیٹر کا سفر اسکوٹر پر طے کرکے یہاں پہنچا تھا اور سردی سے کانپ رہا تھا۔ میں نے اسے حقیقتِ حال سے آگاہ نہیں کیا تھا اس لیے اس کی آنکھوں میں سوال ہی سوال تھے۔ کہنے لگا۔ ''شاہ زیب! اگر کوئی ڈر خطرے والا معاملہ ہے تو میں ساتھ چلتا ہوں۔ وہ کیا کہوت ہیں کہ ایک ایک اور دو دو گیارہ۔'' اس نے چھوٹتے ہی ایک محاورے کی مٹی پلید کی۔

میں نے کہا۔ ''ایسی بات بالکل نہیں پہلوان جی۔ اور اگر ہوئی بھی تو اللہ نے چاہا تو میں اکیلا نمٹ سکتا ہوں۔''

پہلوان نے اپنا تربوز سا سر اثبات میں ہلایا۔ ''اس میں تو کوئی شبہ ناہیں۔ میں اپنی گناہ گار آنکھوں سے سجاول کے ڈیرے پر سجاول سے تمہاری ہتھ جوڑی دیکھ چکا ہوں۔ دو چار بندوں کی ہڈی پسلی تو تم ''بات سے کھیڈے'' میں توڑ سکتے ہو۔ لیکن وہ کہت ہیں نا کہ گھر کا بھیدی سری لنکا ڈھاوت ہے۔ سامنے والے دشمن سے چھپا ہوا دشمن کہیں زیادہ خطرناک ہووت ہے۔''

میں نے کہا۔ ''یہاں دشمنی والا کوئی چکر ہی نہیں ہے۔ آپ سمجھیں کہ کسی دوست سے ضروری ملاقات کرنی ہے۔ راستہ ایسا ہے کہ گاڑی کے بجائے موٹر سائیکل، اسکوٹر کا سفر ٹھیک ہے۔''

اس نے بھی کھوجی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ شاید اس کے ذہن میں بھی شک پیدا ہوا تھا کہ میں کہیں تاجور سے ملنے یا اس کی ٹوہ لگانے تو نہیں جارہا۔ بہرحال اپنی گفتگو کے ذریعے میں نے اس کا یہ شک بڑی حد تک ختم کردیا۔ میں نے آخر میں اس سے کہا۔ ''پہلوان جی، سردی کافی ہے، آپ گاڑی بند کرکے آرام سے بیٹھیں اور جو انڈے میرے لیے ابال کر لائے ہیں وہ خود نوش جان فرمائیں۔ میں ابھی حافظ آباد سے بڑا تگڑا ناشتا کرکے نکلا ہوں۔''

وہ بولا۔ ''شاہ زیب! ایک بہت ہی خاص خبر ہے

تمہارے لیے۔ میں تمہیں ٹیلی فون پر ہی بتانا چاہتا تھا لیکن پھر سوچا کہ آمنے سامنے سنانے میں جو مزہ آوے گا وہ ویسے ناہیں آوے گا۔" اس کا چہرہ جوش سے تمتما رہا تھا اور اصل سائز سے کافی بڑا نظر آنے لگا تھا۔

"کیسی خبر؟" میں نے کہا۔ ویسے میں کچھ کچھ سمجھ گیا تھا۔

اس نے جیسے میرے سر پر بم پھوڑا۔ "تاجور کا منگیتر ساقا مارا گیا۔"

یہ سب کچھ مجھے پہلے سے معلوم ہو چکا تھا تاہم پہلوان کا دل رکھنے کے لیے میں نے اپنے چہرے پر شدید حیرانی پیدا کی اور "ششدر" آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

پہلوان نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "منگل کے دن ہوا ہے یہ سب کچھ، وہ خبیث عالمگیر بھی بس بال بال بچا ہے۔ کوئی مخالف پارٹی تھی ان لوگوں کی..... پر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ وہی اسلام آباد کے اسپتال سے زینب کے غائب ہونے والا معاملہ ہو......"

پہلوان نے خوب مرچ مسالا لگا کر یہ ساری روداد میرے گوش گزار کی اور میں پہلوان کی منشا کے مطابق کہیں زیادہ اور کہیں بہت زیادہ حیران ہوتا رہا۔ پہلوان نے محسوس کر لیا تھا کہ مجھے جانے کی جلدی ہے۔ آخر میں اس نے کہا۔ "باتیں تو تم سے بہت سی کرنی ہیں..... اور ایک خاص بات تم سے پوچھنا بھی چاہتا ہوں۔ لیکن پہلے تم اپنے کام سے ہو کر واپس آجاؤ۔ بس آنے سے آدھ گھنٹا پہلے میرے فون کی بیل کھڑکا دینا۔ میں تمہارے لیے مرغی کا کھوئے والا قورما اور روغنی نان وغیرہ تیار رکھوں گا..... پھر گاڑی میں بیٹھ کر کھائیں گے۔"

میں نے اسکوٹر کا تیل پانی چیک کیا۔ ہیلمٹ سر پر رکھا اور پہلوان سے رخصت ہو کر روانہ ہو گیا۔ ہیلمٹ سر کی حفاظت کے لیے ہے لیکن کبھی کبھی یہ اپنی شناخت چھپانے کا بھی زبردست کام دیتا ہے۔ میں اس سے پہلے بھی اسے اسی مقصد کے لیے استعمال کر چکا تھا۔ میرا رخ اب اسی سکھیرا نامی گاؤں کی طرف تھا جہاں میں نے تاجور کو اس کے والد بزرگوار دین محمد صاحب کے حوالے کیا تھا۔ میرا گزر اسی پیٹرول پمپ کے قریب سے ہوا جہاں پچھلی دفعہ سجاول کے ایک یونس نامی ساتھی نے ہمیں پارکنگ کی سہولت فراہم کی تھی اور مجھے موٹر سائیکل وغیرہ مہیا کی تھی۔ یہ خالص دیہاتی علاقے کا سفر تھا۔ سرسبز کھیتوں کے درمیان تار کول کی پتلی سڑکیں..... ان کے درمیان کہیں کہیں کھیت مزدوروں کی جھلکیاں، ٹریکٹر، ٹیوب ویل اور ٹریکٹر ٹرالیاں وغیرہ۔ پنجاب کے دیہات کا یہ سنہری ماحول دور تک میرے ذہن میں کھب جاتا تھا۔ سورج اب کافی اوپر آگیا تھا اور دھند چھٹ چکی تھی۔ پچھلی مرتبہ اس سفر میں تاجور میرے ساتھ تھی اور موٹر سائیکل پر میرے عقب میں موجود تھی، خاموش و دل گرفتہ..... جدائی کا وہ سفر ہمیشہ کے لیے میرے ذہن پر نقش ہو چکا تھا۔ یہ قریباً بیس کلومیٹر کا سفر تھا جو میں نے آدھ پون گھنٹے میں طے کر لیا۔ آخر مجھے سکھیرا کے شاداب گاؤں کی مسجد کے بلند مینار نظر آنے لگے اور کھجور کے وہ تین عدد درخت بھی جن کے پاس ہی میں نے تاجور کو وداع کیا تھا۔ آج میں اس مقام پر رکا نہیں بلکہ آگے بڑھتا چلا گیا اور سکھیرا گاؤں میں داخل ہو گیا۔

یہ کوئی گیارہ بجے کا عمل تھا۔ گلی کوچوں میں سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ گاؤں کے مویشی قطار اندر قطار چراگاہوں کی طرف جا رہے تھے۔ چھوٹے بچے سردی کی پروا کیے بغیر کھلی جگہوں پر گلی ڈنڈا، اسٹاپو اور کانچ وغیرہ کھیل رہے تھے جن جگہوں پر دھوپ موجود تھی وہاں گاؤں کے بڑے بوڑھے بیٹھے حقہ پی رہے تھے اور گپیں ہانک رہے تھے۔ ایک گدھے پر بہت سا سبز چارا لدا ہوا تھا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا سا ایک تنگ گلی میں داخل ہو رہا تھا۔ اسی گلی میں سے نکل کر ایک دیہاتی عورت ان دھلے کپڑوں کا انبار اٹھائے شاید ٹیوب ویل کی طرف جا رہی تھی۔ میں شلوار قمیص میں تھا، اسکوٹر بھی بالکل دیہاتی طرز کا تھا، مجھ پر کسی نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ دین محمد صاحب کے گھر کا پتا کس سے اور کیسے پوچھوں کہ مجھے اپنی مشکل آسان ہوتی نظر آئی۔ میں نے تاجور کے چھوٹے بھائی کم سن اسفند کو دیکھا۔ وہ پرچون کی ایک چھوٹی سی دکان سے کچھ لے رہا تھا۔ گورا چٹا معصوم چہرہ..... یہی اسفند تھا جسے میں نے چاند گڑھی میں سجاول کے حملے کے دوران میں بچایا تھا۔ وہ ایک کنوئیں میں گر گیا تھا اور میں نے اسے نکالا تھا۔ اپنی اس "کارکردگی" کی وجہ سے مجھے تاجور کے قریب آنے کا موقع ملا تھا۔ وہ سارے مناظر جیسے ہمیشہ کے لیے میرے ذہن میں نقش ہو چکے تھے۔

میں نے اسکوٹر کچھ آگے جا کر کھڑا کر دیا اور اسفند کا انتظار کرنے لگا۔ وہ ہاتھ میں ایک چھوٹی سی پڑیا لیے اٹھکیلیاں کرتا میرے قریب سے گزرا..... بالکل پاس سے۔ اس نے مجھ پر بالکل توجہ نہیں دی۔ شاید اس کے گمان میں بھی نہ ہوگا

کہ وہ "گونگے بھائی جان" جن سے لپٹ کر وہ سوتا تھا اور جن کو راتوں میں اٹھ اٹھ کر پکارتا تھا اس کے بالکل پاس موجود ہیں۔ وہ آگے بڑھ گیا تو میں آہستہ آہستہ اسکوٹر پر اس کے پیچھے جانے لگا۔ ہیلمٹ بدستور میرے سر پر موجود تھا۔ ہاں اس کی سفید شیلڈ میں نے اوپر اٹھالی تھی۔ دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ اسفند اپنے گھر کی طرف جا رہا ہے لیکن اس وقت یہ اندازہ بالکل غلط ثابت ہو گیا جب اسفند اچھلتا کودتا کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ کچھ ہی فاصلے پر چھ سات فٹ اونچی ایک کچی چار دیواری نظر آرہی تھی۔ اس وسیع و عریض چار دیواری کے اندر پھل دار پودوں کے درخت دور ہی سے دکھائی دیتے تھے۔ کینوں اور مالٹوں کا موسم اختتام پر تھا تاہم اب بھی کسی کسی درخت پر کوئی کینو ٹنگا نظر آرہا تھا۔ اسفند ایک کھلے ہوئے پھاٹک سے اندر داخل ہو گیا۔ مجھے مایوسی ہوئی۔ مجھے لگا کہ اب مجھے تھوڑی دیر اور انتظار کرنا پڑے گا۔ گھر کا پتا چل جانے کے باوجود تاجور کی جھلک دیکھنا اتنا سہل نہیں تھا۔

گاؤں کے لوگ آجا رہے تھے۔ ایک دو کے سوا کسی نے مجھ پر خاص توجہ نہیں دی۔ میں ایک چکر کاٹ کر چار دیواری کی دوسری جانب چلا گیا۔ یہاں سناٹا سناٹا تھا۔ دور تک کھیت ہی دکھائی دیتے تھے۔ ایک تنگ سا کچا راستہ تھا۔ میں نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر چار دیواری کے اندر جھانکا...... لڑکیوں اور عورتوں کے رنگ برنگے کپڑے دکھائی دیے۔ چھوٹی عمر کے بچے بچیاں بھی دکھائی دے رہے تھے۔ دفعتاً میری ساری حسیات سمٹ کر میری آنکھوں میں آگئیں۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ میری قسمت اس طرح یاوری کرے گی۔ میں نے کچھ ہی فاصلے پر تاجور کو دیکھا۔ وہ ایک گرے ہوئے درخت کے تنے پر بیٹھی تھی۔ گلابی شال کندھوں پر تھی۔ گھنے بالوں نے نصف چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ سنہری چپل میں پاؤں، گلاب کے دو سفید پھول تھے جو سبز گھاس پر دھرے تھے۔ پیشانی کی وہی ملکوتی چمک، وہی جمال وہی کشش وہی ایک مقناطیسی ہالہ جو اسے سرتاپا اپنے گھیرے میں رکھتا تھا۔ اسحاق عرف ساقا کہاں تھا اس کے قابل؟ شکر تھا کہ وہ مر گیا اور...... مجھ جیسا جرائم زدہ بھی کہاں تھا اس کے لائق، بہتر تھا کہ اس سے دور ہو گیا۔ سینے سے ایک ہوک سی اٹھی اور میں اسے دیکھتا رہ گیا پھر یکایک خیال آیا کہ اردگرد کا دھیان بھی رکھنا چاہیے۔ اسکوٹر ابھی تک اسٹارٹ تھا۔ میں نے بٹن دبا کر اسے بند کیا اور نیچے جھک کر اس کے انجن کا "کور" اتار دیا۔ دور سے کوئی دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ اسکوٹر خراب ہو گیا ہے۔ مزید احتیاط کے طور پر میں نے پلگ کا تار بھی اتار دیا۔

میرے دل میں خیال ابھرا...... یہ عشق بھی کیا چیز ہے۔ میں دنیا کی بہترین رنگینیاں اور خوب صورتیاں حاصل کرنے کے قابل تھا لیکن آج...... کسی نیم دیہاتی علاقے کے کالچھنٹ لڑکے کی طرح ایک کھٹارا اسکوٹر پر بیٹھ کر یہاں کسی کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے موجود تھا۔ یہ کیسی شوریدہ سر کیفیت ہے، یہ کیسا دیوانہ جذبہ ہے۔ یہ بندے کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔ مجھے خود اپنے آپ پر بھی حیرانی ہوئی مگر یہ جو کچھ بھی تھا میرے لیے بے حد...... بے حد اہم تھا۔

لڑکیوں کے ہنسنے کھیلنے اور چلانے کی آوازیں آرہی تھیں، میں نے ایک بار پھر پنجوں پر کھڑے ہو کر چار دیواری میں جھانکا۔ کئی لڑکیاں رسی پھلانگنے میں مصروف تھیں۔ انہوں نے دوپٹے اپنی کمروں سے باندھ رکھے تھے اور اپنے حال میں مست تھیں۔ کچھ لڑکیاں ایک قریبی درخت پر چڑھ کر بچے کھچے کینو اتار رہی تھیں۔ نیچے کھڑے بچے یہ کینو ایک تھال میں جمع کر رہے تھے۔ وہ پڑیا بھی تھال میں رکھی تھی جو اسفند لایا تھا۔ غالباً اس میں نمک مسالا وغیرہ تھا۔

میں نے دیکھا تاجور کچھ خاموش سی ہے...... ایک ہم عمر لڑکی نے اسے دبوچا اور گدگدی کر کے ہنسانے کی کوشش کی۔ تاجور ذرا سا مسکرائی اور اس کے ہاتھ پکڑ کر اسے پیچھے کر دیا۔ ایک اور لڑکی بھنا کر اس کی طرف بڑھی اور بے تکلفی سے بولی۔ "اگر ایسے ہی بت بن کر بیٹھنا ہے تو پھر گھر چلی جا۔ کوئی لوڑ شوڑ نہیں تیری پھر یہاں۔"

ایک جواں سال عورت بولی اور اس کی آواز بالکل صاف میرے کانوں تک پہنچی۔ "نی ابھی تو تجھ کو ناڑا ہی ہے ناں...... ڈولی میں تو نہیں بٹھا لیا۔ ابھی سے کیوں گلیڈو (آنسو) لے کر بیٹھ گئی ہے۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے تاجور پر چڑھائی کر دی۔ پہلے اسے گدگدایا پھر کھینچ کر اٹھایا اور کھیل کود والی جگہ پر لے آئی۔

میں نے اپنا سر نیچے کر لیا۔ یہاں درختوں کی شاخیں تھیں پھر بھی دیکھے جانے کا خطرہ تو موجود تھا۔ جواں سال عورت نے جو الفاظ کہے تھے وہ بہت واضح نہیں تھے۔ لب و لہجہ بھی کچھ اجنبی تھا مگر اتنا اندازہ تو مجھے ہو گیا کہ شاید تاجور کی منگنی وغیرہ کی بات کی گئی ہے۔ اگر ایسا تھا بھی تو یہ کوئی انہونی نہیں تھی۔ میرے دل کی گواہی بھی یہی تھی کہ اب تاجور کے "بڑے" جلد از جلد اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر کریں گے لیکن خبر تو پھر خبر ہی ہوتی ہے۔ سینے میں دھواں سا

بھرنے لگا۔

میں نے دوبارہ سر اٹھا کر دیکھا۔ لڑکیوں نے تاجور اور ایک فربہ اندام عورت کو رسی پھاندنے پر مجبور کر دیا تھا۔ دو لڑکیاں طویل رسی کو گول گول گھما رہی تھیں اور تاجور، فربہ اندام عورت کے ساتھ پھلانگ رہی تھی پھر دو اور چنچل لڑکیاں بھی اس رسی کو پھاندنے لگیں۔ ان کے لچک دار جسم پھول دار شاخوں کی طرح متحرک تھے اور ان میں خوش نما ترین شاخ وہی تھی جس سے میرے دل کے ہزار ہا دھاگے بندھے ہوئے تھے۔ بالوں کی دو لٹیں چہرے پر جھول رہی تھیں۔ رنگ لال گلابی ہو رہا تھا۔ لڑکیاں رسی پھلانگتے پھلانگتے کبھی بیٹھ جاتی تھیں، کبھی جھک کر تالی بجاتی تھیں، کبھی گول گھومتی تھیں...... اور وہ بھی اس ساری اٹھک بیٹھک میں شریک تھی۔ پھر وہ ایک دم رسی کے ''لوپ'' میں سے نکل گئی اور دوبارہ جا کر تنے پر بیٹھ گئی۔ دو سہیلیوں نے اسے پھر اٹھانے کی کوشش کی مگر اس مرتبہ وہ نہیں اٹھی۔

میں نے دیکھے جانے کے خوف سے سر پھر نیچے کر لیا۔ دل و دماغ کی کچھ عجیب کیفیت تھی۔ کسی وقت دل چاہتا تھا کہ فوراً یہاں سے نکل جاؤں، کسی وقت خواہش جاگتی کہ جتنی دیر تک اسے دیکھ سکتا ہوں دیکھتا رہوں۔ اردگرد کا جائزہ لینے کے بعد میں نے ایک بار پھر اپنے آپ کو پنجوں پر اٹھایا۔ وہ تنے پر بیٹھی تھی اور دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے ڈھیلے بالوں کو باندھ رہی تھی۔ رسی پھلانگنے کی مشقت کے سبب سینہ پھول پچک رہا تھا۔ میری نگاہ اس کے بائیں ہاتھ پر پڑی۔ یوں لگا کہ ان فقروں کی تصدیق ہو گئی ہے جو میں نے چند منٹ پہلے سنے تھے۔ تاجور کے ہاتھ کی دوسری انگلی میں انگوٹھی چمک رہی تھی۔

میں نے ایک بار پھر جلدی سے سر نیچے کر لیا۔ کیونکہ مجھے بعین یہی لگا تھا جیسے تاجور گردن گھما کر چار دیواری کے اس حصے کی طرف دیکھ رہی ہے جہاں میں موجود تھا۔

تاجور نے تو مجھے نہیں دیکھا تھا لیکن کسی اور نے دیکھ لیا تھا۔ کھیت کی دوسری جانب دو نوجوان مجھے تاڑ رہے تھے۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

معاملے کو سنبھالنے کے لیے میں بیٹھ گیا اور اسکوٹر کے پلگ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ لیکن اگر میرا یہ خیال تھا کہ بات ٹل جائے گی تو ایسا نہیں ہوا۔ دونوں نوجوان لمبے ڈگ بھرتے ہوئے میرے پاس آ گئے۔

''کون ہو بھئی؟'' ایک نے کھردرے لہجے میں کہا۔

''یہاں کا ہی ہوں...... یہ اسکوٹر ذرا خراب ہو گیا ہے۔'' میں نے نارمل رہنے کی کوشش کی۔

''ذرا یہ ہیلمٹ شریف تو اتارو۔'' دوسرے نے ہیلمٹ کو ٹھوکا دیا۔

میں نے ہیلمٹ اتار دیا۔ دونوں نے گردنیں ٹیڑھی کر کے مجھے بغور دیکھا۔ ''یہاں کے تو نہیں لگتے ہو۔ کہاں تشریف لے جا رہے ہو؟''

''وارث پور۔'' میں نے ایک قریبی گاؤں کا نام لیا۔

''وارث پور تو سسرال ہے میرا۔ وہاں کس کے گھر جانا ہے جناب نے؟''

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا دو مزید بندے پگڈنڈیاں پھلانگتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک لاچے کرتے میں اور دوسرا شلوار قمیص میں تھا۔ شلوار قمیص والے نے گرج دار آواز میں پوچھا۔ ''کیا بات ہے بشارت؟''

بشارت وہی تھا جس نے مجھے ہیلمٹ اتارنے کو کہا تھا۔ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''یہ رانجھا صاحب یہاں بھونڈی کر رہے تھے۔ اسکوٹر کھڑا کر کے باغ میں جھاتکیاں مار رہے تھے، ہم نے خود دیکھا ہے۔''

ٹک ٹک شلوار قمیص والا نوجوان خاصے کسرتی جسم کا مالک تھا، اس کا رنگ سرخ و سپید اور بال ذرا لمبے تھے۔ کڑی نظروں سے مجھے گھور کر بولا۔ ''اسکوٹر خراب ہے یا جان بوجھ کر خراب کیا ہوا ہے سرکار نے؟'' اس کے ساتھ ہی اس نے اطمینان سے ہاتھ بڑھا کر اسکوٹر کی چابی نکال لی۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' میرا پارا بھی چڑھ گیا۔

''کیا بدتمیزی ہے اور کیسی ہے؟ یہ بھی بتا دیتے ہیں جناب کو۔'' شلوار قمیص والا بولا۔ ''ذرا تشریف لے کر آئیں ہمارے ساتھ۔'' اس نے خطرناک لہجے میں کہا۔

میں نے بھی یہ مناسب سمجھا کہ یہاں سے آگے بڑھا جائے۔ یہاں اگر کوئی گڑبڑ ہوتی تو لڑکیوں کو فوراً خبر ہوتی اور میں یہ کیسے چاہ سکتا تھا۔ میں نے اسکوٹر کا ٹاپا دوبارہ اس کی جگہ پر لگایا اور ان لوگوں کے ساتھ چل دیا۔ وہ اسے میرے خوف پر محمول کر رہے تھے۔ باغ سے قریباً نصف فرلانگ آگے آ کر انہوں نے مجھے ایک چار دیواری میں چلنے کو کہا۔ یہ چھ فٹ اونچی پختہ چار دیواری تھی۔ اندر بس تعمیر کا تھوڑا بہت سامان پڑا تھا۔ باقی جگہ خالی تھی۔ میں اندر چلا گیا۔ ایک بندے نے لکڑی کا پھاٹک بند کر دیا۔ شلوار قمیص والے نے مجھے سرتاپا گھورتے ہوئے کہا۔ ''شکل سے تو تم ایسے نہیں لگتے کہ جنہیں کڑیاں جوتے شوتے مارتی ہیں، پھر ایسے کام کیوں کر رہے ہو؟''

میں چاہ رہا تھا کہ بات نہ بڑھے۔ میں نے معافی تلافی کی کوشش کی لیکن وہ نہیں مانے پھر ایک دم ان میں سے ایک مجھ پر پل پڑا۔ اب میرے لیے دفاع ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے پہلے اسے روکا۔ پھر دو چار ہاتھ لگائے۔ ایک ہاتھ ذرا سخت پڑ گیا۔ وہ لڑکھڑا کر اوندھے منہ گرا اور اس کی ناک سے خون جاری ہو گیا۔ یہ منظر دیکھ کر شلوار قمیص والا لمبا تڑنگا نوجوان ہم دونوں کے بیچ میں آ گیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ زخمی میری طرف پلٹا لیکن شلوار قمیص والے نے اسے روک دیا۔ ”نہیں بشارت، اس کی مستی میں خود اتارتا ہوں۔“

وہ چند لمحے کے لیے اینٹوں کے انبار کے پیچھے گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی قمیص کے نیچے کوئی ہتھیار موجود تھا جسے وہ وہاں رکھ آیا ہے۔ پھر اس نے اپنی سفید قمیص اور گھڑی بھی اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ اس کے ورزشی بازوؤں پر ”ٹیٹو“ بنے ہوئے تھے۔ وہ پھنکار کر بولا۔ ”تیرے جیسوں کو ہاتھ نہیں لگاتا، صرف پاؤں سے مارتا ہوں۔“ ایک دم وہ مجھ پر پل پڑا۔ وہ لڑائی بھڑائی جانتا تھا اور غیر معمولی طور پر پھرتیلا بھی تھا...... جیسا کہ مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہ سکھیرا اگاؤں کے ایک بڑے زمیندار کا بیٹا تھا اور کبڈی کے کھیل میں اس کی شہرت تھی۔ لیکن یہاں اس کا سامنا ایک عام شخص سے نہیں ہوا تھا۔ میں نے اسے روئی کی طرح دھنک ڈالا لیکن کوئی ایسی مہلک ضرب نہیں لگائی جس سے کوئی بڑی چوٹ لگتی یا ہڈی وغیرہ ٹوٹ جاتی۔

دوسرے لڑکوں نے اپنے لیڈر کو پٹتے دیکھا تو وہ بھی مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ اس پختہ چار دیواری میں ریت مٹی اور اینٹوں کے درمیان ٹھیک ٹھاک مار اماری ہوئی۔ ان چاروں کو ہینڈل کرنا میرے لیے بہت زیادہ مشکل نہیں تھا۔ شروع میں شلوار قمیص والے نے کہا تھا کہ وہ مجھے ہاتھ نہیں لگائے گا بلکہ صرف ٹھڈوں (ٹھوکروں) سے مارے گا۔ لیکن اب وہ ہاتھ بھی لگا رہا تھا اور باقی ہر حربہ بھی استعمال کر رہا تھا۔ ان میں سے ایک نے عقب سے میرے سر پر اینٹ کا وار کرنے کی کوشش کی، میں نے اس کے پیٹ میں ٹانگ کی شدید ضرب لگائی اور وہ گر کر تڑپنے لگا۔ صورتِ حال کو ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر ایک شخص نے قمیص کے نیچے سے پستول نکال لیا۔ یہی موقع تھا جب شلوار قمیص والا میرے اور پستول بردار کے درمیان آ گیا۔ ”نہیں اوئے اکی! گولی نہیں چلانی۔“ وہ چلا کر بولا اور پستول اکی کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔

دوسرے لڑکے کے ہاتھ میں ڈبل اینٹ نظر آ رہی تھی۔ شلوار قمیص والے نے اسے بھی پیچھے ہٹا دیا۔ ”پیچھے ہٹ جا سیفی۔“ اینٹ بردار ہانپتی ہوئی آواز میں گرجا۔

مگر شلوار قمیص والے نے اینٹ اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ وہ اب لڑائی رکوانے کے موڈ میں تھا اس لیے میں بھی پیچھے ہٹ گیا۔ میرا گریبان پھٹ گیا تھا لیکن جسم پر خراش تک نہیں آئی تھی۔ دوسری طرف بشارت اور اکی نامی لڑکوں کے ناک منہ سے خون جاری تھا۔ لیڈر کا نام سیف تھا اور اس کے چہرے پر بھی چوٹیں آئی تھیں۔ وہ ہانپا ہوا تھا اور اپنے بائیں ہاتھ کی کلائی کو بار بار مسل رہا تھا۔ وہ گاہے بگاہے عجیب نظروں سے مجھے دیکھ بھی لیتا تھا۔

پھر اسے پتا نہیں کیا ہوا اس نے اپنے تینوں ساتھیوں سے کچھ کھسر پھسر کی اور وہ باہر چلے گئے۔ سیف کی طرح وہ تینوں بھی خاصے حیران نظر آ رہے تھے۔ ان کے جانے کے بعد سیف نے ”فائبر“ کی دو کرسیاں دھوپ میں کھینچیں اور مجھے بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں کسی طرح کے انٹرویو کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ ”اگر اب تم لوگوں کی عقل نے کام کرنا شروع کر دیا ہے...... تو تمہاری بہت مہربانی۔ مجھے جانے دو۔“

”لیکن...... تم ہو کون؟ میں جاننا چاہتا ہوں۔“ وہ جیسے کھوئے کھوئے سے انداز میں بولا۔

”تمہارے جیسا ہی ایک بندہ ہوں......“

”نہیں، تم ہمارے جیسے نہیں ہو۔ تم خاص بندے ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ تم نے یہ لڑائی بھڑائی کہیں بڑے اونچے لیول پر سیکھی ہوئی ہے۔ میرا ایک جاننے والا بڑے اونچے درجے کا باکسر ہے۔ کہیں تم بھی تو کوئی باکسر شاکسر نہیں ہو...... جسم تو تمہارا بھی بالکل کھلاڑیوں جیسا ہی ہے بلکہ...... کھلاڑیوں سے بھی آگے کی چیز ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں، محمد علی باکسر میرا شاگرد رہا ہے۔ اب مجھے جانے کی اجازت دو۔“ میں نے اسکوٹر کی چابی کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

وہ ٹس سے مس نہیں ہوا اور ٹکٹکی باندھ کر میری طرف دیکھتا رہا۔ اس کی نوکیلی مونچھوں کے نیچے میرے گھونسے نے ایک نیل بنا دیا تھا اور اس نیلے رخسار کے نیچے اس کی خوب صورت تھوڑی پر کسی پرانے زخم کا نشان دوپہر کی سنہری دھوپ میں نمایاں نظر آتا تھا۔ ”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”تم نے پہلی نظر کے عشق کے بارے میں کچھ سنا ہوا ہے؟“

”کیا مطلب؟“

”اگر میں یہ کہوں کہ مجھے پہلی نظر میں تم سے عشق ہو گیا ہے تو پھر؟“

"تو پھر اللہ تمہارے حال پر رحم کرے۔"

"میرے ساتھی تو بہت سے ہیں، لیکن دوست صرف ایک دو ہی ہیں۔ میں صرف دلیر اور ذمّے دار دوست بناتا ہوں اور مجھے لگتا ہے کہ میرے دوستوں میں ایک بہت اچھے دوست کا اضافہ ہوسکتا ہے۔"

"لیکن مجھے نہیں لگتا۔"

"تو پھر مجھے اپنی شاگردی میں لے لو۔ میں تمہارے اندر ایک بڑا فنکار دیکھ رہا ہوں اور میرا دل چاہتا ہے کہ تم سے کچھ سیکھوں۔"

"میں کوئی ستار نہیں بجاتا یا سرکس نہیں کرتا کہ تم مجھ سے کچھ سیکھو گے۔"

"لیکن...... لیکن پھر بھی میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم کوئی معمولی چیز نہیں ہو۔ منہ پر تعریف کرنا اچھا تو نہیں ہوتا لیکن مجھے کرنا پڑ رہی ہے......"

وہ بالکل سریش ہو کر چپک گیا تھا۔ اس سے جان چھڑانے میں مجھے واقعی پسینا آ گیا۔ اس نے مجھ سے میرا موبائل نمبر لیا اور ایڈریس بھی (جو میں نے غلط بتایا) میرے بے حد منع کرنے کے باوجود اس نے مجھے ایک شاندار دیہاتی لنچ کرایا، جس میں مکئی کی روٹی، دیسی مرغ کا سالن اور ساگ شامل تھا۔ ساتھ میں گنے کے تازہ رس سے لبالب بھرے ہوئے بڑے گلاس۔ اس کے ساتھیوں نے اس کے کہنے پر مجھ سے دست بستہ معافی مانگی، میں نے بھی اپنا کہا سنا معاف کرایا۔ یقیناً ان لوگوں کے ذہن میں اب بھی یہ سوال موجود تھا کہ میں ان کے علاقے میں کیا کر رہا تھا اور میری تاکا جھانکی کا مقصد کیا تھا لیکن وہ سب اور خاص طور سے سیف مجھ سے اتنا متاثر ہو چکا تھا کہ کسی نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔

سہ پہر کے تین بجے تھے۔ سردیوں کی شام کے سائے لمبے ہونا شروع ہو گئے تھے جب میں ہیلمٹ پہن کر اور اسکوٹر پر سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ جوں جوں سکھیرا گاؤں اور اس کے باسی مجھ سے دور ہوتے چلے گئے، دل و دماغ کو ایک عجیب سی اداسی گھیرتی چلی گئی۔ وہ لہراتی ہوئی لٹیں...... انگلی میں دمکتی ہوئی انگوٹھی، باغ میں جلترنگ بجاتی ہوئی ہنسی، رسّی پر اچھلتا ہوا ایک بے مثل پیکر، اور پھر درخت کے گرے ہوئے تنے پر رکی ہوئی ایک بے نام خاموشی۔ سب مناظر نگاہوں میں گڈمڈ ہونے لگے۔

☆☆☆

پہلوان حشمت حسبِ وعدہ وارادہ "ڈنگہ" کی اس مین سڑک پر گاڑی کے اندر میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے پہنچنے سے ایک گھنٹا پہلے اسے فون کر دیا تھا۔ لہٰذا ایک پر تکلف کھانا تیار تھا جو پہلوان کی خصوصی ہدایات پر ایک قریبی ہوٹل میں دیسی گھی سے تیار کیا گیا تھا۔ کھانے کے ساتھ ساتھ پہلوان مجھ سے باتیں بھی کرتا رہا۔ وہ تاڑ گیا تھا کہ میں اسے اپنے پچھلے چند گھنٹے کی مصروفیت کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا لہٰذا اس نے زیادہ استفسار بھی نہیں کیا، اس نے مجھ سے انیق اور سجاول وغیرہ کا حال احوال پوچھا۔ ساتھ ساتھ چاند گڑھی کے ابتر حالات پر بھی تبصرہ کرتا رہا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ چاند گڑھی اب رہنے والی جگہ نہیں رہی۔

ٹنڈے گوشت کا سالن باکمال تھا۔ میں نے تعریف کی تو وہ بولا۔ "یہ یہاں کے مشہور باورچی نے تیار کیا ہے۔ گوجرانوالہ کے استاد اللہ دواد کا شاگرد ہے یہ...... دراصل استاد کے بغیر کوئی ہنر بھی ٹھیک سے بندے کے ہاتھ نہیں آتا ہے۔ اب تم خود کو ہی دیکھو۔ تمہارے اندر اوپر والے نے بڑا ٹیلنٹ (ٹیلنٹ) چھپایا ہے۔ اگر تمہاری تھوڑی سی تربیت کی جاوے تو تم بہت آگے جا سکتے ہو۔ بلکہ لاہور میں جا کر مقابلوں میں حصہ لے سکتے ہو۔" پھر اس نے اس حوالے سے اپنے دو لنگڑے لولے شعر سنائے۔

بے شک صلاحیت تو نوجوانوں میں ہے بلا کی
بس کمی تھوڑی سی ہے جور و جفا کی
سن لے او کاکا، سن لے او کاکی
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

میں نے شعر کی "خوف صورتی" پر زور شور سے سر ہلایا اور خیال کی تائید کی۔ پہلوان نے اگلے دس منٹ اس موضوع پر صرف کیے کہ فائٹ کے دوران میں مجھ سے کیا کیا غلطیاں ہوتی ہیں اور اگر میں انہیں ٹھیک کر لوں تو کتنا آگے جا سکتا ہوں۔ جناب نے کار کے اندر ہی کچھ داؤ پیچ کا عملی مظاہرہ کرنے کی کوشش کی لیکن جب خطرہ پیدا ہوا کہ ٹنڈے گوشت کے سالن اور فرنی وغیرہ کا آپس میں غیر فطری ملاپ ہو جائے گا تو اس کوشش کو ترک کر دیا۔ خلاصۂ کلام کے طور پر انہوں نے کہا۔ "چاند گڑھی سے میرا دل اچاٹ ہو گیا ہے، بیوی کو بچوں سمیت میں نے اس کے میکے بھجوا دیا ہے۔ اگر کچھ عرصہ میں تمہارے ساتھ رہ سکوں اور تمہاری "ٹریننگ" کر سکوں تو یقین کرو تم بڑوں بڑوں کو آگے لگا لو گے۔"

میں جان گیا تھا کہ گفتگو کس رخ پر جا رہی ہے۔ غالباً پہلوان کی خواہش تھی کہ میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں۔ انیق کے ساتھ اس کی گہری دوستی تھی اور اب میرے ساتھ بھی بے تکلفی پیدا ہو چکی تھی۔ بے شک پہلوان ایک دلچسپ کردار

تھا اور بوقتِ ضرورت کسی طرح سے کام بھی آسکتا تھا لیکن آئندہ جس طرح کے حالات درپیش تھے ان میں پہلوان کو گھسیٹنے کا سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا۔

میں نے باتوں باتوں میں پہلوان کو سمجھا دیا کہ فی الحال میرے لیے ایسا ممکن نہیں ہے۔ لیکن اس کی دل شکنی بھی نہیں ہونے دی اور اسے بتایا کہ میں اس سے کچھ سیکھ کر اور اس کی شاگردی میں آکر فخر محسوس کروں گا۔ پہلوان کو ایک بڑا اعتراض یہ بھی تھا کہ میں اس کا فون اٹینڈ نہیں کرتا اور کبھی کبھی اس کی بات درمیان میں ہی ہوتی ہے کہ میں فون کاٹ دیتا ہوں۔

میں نے فوراً...... محسوس کیا کہ یہ میری زیادتی ہے...... اور خلوصِ دل سے پہلوان کو یقین دلایا کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ پہلوان نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کرو کہ ہفتے میں کم از کم ایک بار فون پر بات ضرور کیا کرو گے۔“

میرے ذہن میں فوراً بروناٸی کا خیال آیا۔ اگر ہم وہاں چلے جاتے تو پتا نہیں کہ آسانی سے رابطہ ہو سکتا یا نہیں۔ بہرحال میں نے وعدہ کیا کہ میں ہر ممکن کوشش کروں گا اور ان سے چاند گڑھی کے حالات دریافت کرتا رہوں گا۔

پہلوان کو اسکوٹر دے کر اور گاڑی لے کر میں واپس براستہ فیصل آباد، لیہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ نگاہیں سڑک پر مرکوز تھیں، لیکن ذہن وہیں سنکھیرا گاؤں کے باغ میں الجھا ہوا تھا اور اس انگوٹھی میں الجھا ہوا تھا جو دوپہر کی سنہری دھوپ میں لشکارا مارتی تھی۔ کیا یہ انگوٹھی پہننے سے پہلے، اس نے مجھے یاد کیا ہوگا؟ چند سیکنڈ کے لیے میرے بارے میں سوچا ہوگا؟ شاید نہیں۔ وہ مجھے بھول چکی تھی۔ اگر کچھ یادیں تھیں بھی تو اس نے انہیں کھرچ ڈالا ہوگا۔ مجھے یقین تھا کہ دین محمد صاحب نے اور ان کی بیوی نے تاجور کے لیے کوئی اچھا بر ڈھونڈا ہوگا۔ ان ہی کی طرح کا کوئی کھاتا پیتا زمیندار یا پھر کوئی زراعت پیشہ۔

سوچوں نے بے طرح میرے ذہن کو جکڑا ہوا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مجھ سے ایک غلطی ہوئی۔ ایسی غلطی مجھ جیسے شخص سے ہونی نہیں چاہیے تھی۔ میں نے اپنی زندگی کے کئی سال یورپ میں، ٹیکساری گینگ کے غنڈوں سے لڑتے ہوئے گزارے تھے۔ جب ایسی دشمنیاں پڑ جاتی ہیں تو پھر بندے کو ہر وقت چوکنا رہنا پڑتا ہے۔ اپنے سائے سے بھی ہوشیار رہنا ہوتا ہے۔ پھر میں اپنے پیچھے چلنے والے ایک سائے سے ہوشیار کیوں نہ رہ سکا؟ شاید اس کی وجہ یہی تھی کہ ڈنگہ سے فیصل آباد اور پھر فیصل آباد سے لیہ کے نواح تک کے طویل سفر میں میرا ذہن مسلسل تاجور میں الجھا رہا تھا۔ میں پارا ہاؤس کی سخت سیکیورٹی سے گزر کر اندر پہنچ گیا۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے، سجاول سو چکا تھا لیکن انیق اپنے دوست خانساماں از میر طیب کے پاس بیٹھا گپیں ہانک رہا تھا اور میرا انتظار کر رہا تھا۔

ابھی میں نے انیق اور از میر سے سلام دعا ہی کی تھی کہ سیکنڈ انچارج رفاقت علی نے انٹرکام پر مجھ سے رابطہ کیا۔ ”شاہ زیب صاحب! ہم نے ایک بندے کو پکڑا ہے۔ ہمیں شک ہے کہ وہ آپ کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں آیا ہے۔“

”میرا پیچھا کرتے ہوئے؟ کون ہے؟“

”یہ تو وہی بتا سکتا ہے جی...... یا پھر آپ بتا سکتے ہیں۔ ایک سفید مہران کار پر ہے۔ مقامی لگتا ہے۔ چہرے پر چوٹوں کے نشان ہیں۔ اس کے پاس سے اعشاریہ 25 کا پستول اور تیس بائیس راؤنڈ بھی برآمد ہوئے ہیں۔

میں حیران تھا۔ ”اسے لاؤ یہاں میرے پاس۔“ میں نے کہا۔

قریباً دس منٹ بعد میں نے اس شخص کو دیکھا اور میری حیرت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ وہ سنکھیرا گاؤں کا وہی سیف تھا۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ وہ اتنی دور سے اتنی کامیابی کے ساتھ میرا تعاقب کر کے یہاں پہنچ گیا ہے۔

”یہ کیا تماشا کیا ہے تم نے؟“ میں نے حیرت آمیز طیش سے کہا۔

وہ اپنی نیکلی سی مونچھوں کے نیچے مسکرایا اور لمبے بالوں کو انگلیوں سے سنوار کر بولا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا نا کہ مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ تم نہیں مانے تو مجھے یہ رسک لینا پڑا۔“

میرا جی چاہا اسے تھپڑ رسید کر دوں۔ مگر پھر ضبط کیا۔ انیق بھی تعجب سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ایک طرف جا کر رفاقت علی اور اس کے ساتھ آنے والے گارڈز کو بتایا کہ اس کے ساتھ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے، ویسے یہ بہت حد تک بے ضرر بندہ ہے۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔ تم لوگ سمجھو کہ یہ میری ذمے داری پر یہاں ہے۔“

رفاقت سیکیورٹی کے حوالے سے متذبذب میں نظر آتا تھا۔ اس نے کہا۔ ”میرے لیے ضروری ہے کہ مالکوں کو اس بارے میں بتاؤں۔ ان سے بات کر کے ہی میں کچھ کہہ سکوں گا۔“

اس کے جانے کے بعد میں سیف کو دوسرے کمرے میں لے گیا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے میں پھنکارا۔ ”میں تمہیں اتنا احمق نہیں سمجھتا تھا۔ پتا ہے تم نے میرے پیچھے آکر

کتنا خطرناک کام کیا ہے۔"

وہ بے پروائی سے بولا۔ "میرے بھائی، عشق و محبت میں خطرے تو مول لینے ہی پڑتے ہیں اور یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میں تم جیسے پہنچے ہوئے فنکار کے ساتھ رہنے اور اس سے کچھ سیکھنے کے لیے، کچھ بھی کرسکتا ہوں۔"

"اگر کچھ بھی کرسکتے ہو تو سب سے پہلا کام تو یہ کرو کہ یہاں سے دفع ہو جاؤ اور دوبارہ ادھر کا رخ نہ کرنا ورنہ بہت بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔"

"میں ہر مصیبت کے لیے تیار ہوں۔" وہ بڑی ڈھٹائی سے مسکرایا۔

اس کی آنکھوں میں بلا کی ذہانت تھی اور وہ جیسے خاموشی کی زبان میں مجھ سے کہہ رہا تھا...... میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم کوئی اعلیٰ پائے کی چیز ہو۔ خود کو چھپا رہے ہو مگر تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔

دلچسپ بات تھی۔ ابھی چند گھنٹے پہلے پہلوان سے بات ہوئی تھی۔ وہ اس لیے میرے ساتھ رہنا چاہتا تھا کہ اپنی پہلوانی کے کچھ نایاب داؤ پیچ مجھے سکھا سکے اور یہ بندہ اس لیے میرے پیچھے پڑ گیا تھا تاکہ سیکھ سکے۔ میں نے اس کے تن و توش کو جانچنے والی نظروں سے دیکھا۔ وہ ایک پیدائشی مہم جو اور فائٹر دکھائی دیتا تھا۔ برونائی میں جہاں ہم جا رہے تھے وہاں بھی اچھے فائٹر اور اسلحہ شناس لوگوں کی ضرورت تھی۔ اس حوالے سے سیف عرف سیفی کی بات پر غور کیا جاسکتا تھا لیکن اتنی جلدی فیصلہ ممکن نہیں تھا۔ وہ ایک خوش شکل گبرو نوجوان تھا۔ ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ کھیلنے کھانے کے دن تھے۔ میری وجہ سے وہ کسی خطرناک سچویشن میں پھنس جاتا تو یہ بہت غلط ہوتا۔ وہ پنجاب کے سوہنے شکل کبڈی کا کھلاڑی تھا۔ قمیص کے نیچے پستول لگا کر پھرنا اور چھوٹی موٹی لڑائیاں لڑ لینا اور بات ہے، کسی خطرناک مہم کا حصہ بن کر خود کو آگ اور بارود میں گھسا دینا اور چیز۔

پارا ہاؤس میں سجاول کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا۔ اور تو اور آقا جان کا رویہ بھی اس کے ساتھ کافی نرم ہو گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا دل بھی اندر سے خوش تھا۔ میرے دل و دماغ نے بدترین حالات میں بھی یہی گواہی دی تھی کہ سجاول کم از کم مجھے دھوکا نہیں دے گا اور یہ گواہی درست ثابت ہوئی تھی۔ کم از کم اب تک تو یہ درست ہی تھی اور شاید اس کی بنیاد وہی ہتھ جوڑی والا معاملہ تھا جس میں، میں نے سجاول کے سیکڑوں ساتھیوں کے سامنے اس کا بھرم رکھا تھا۔

رو رو کر بڑی بیگم کی آنکھیں سوج چکی تھیں۔ بھائی کی ناگہانی موت کا انہوں نے گہرا اثر لیا تھا۔ وڈا صاحب بھی اپنی ساری عیش و عشرت بھولا ہوا تھا۔ کم از کم آٹھ حسینائیں یعنی خواصیں ہر وقت یہاں اس کے تصرف میں تھیں۔ لیکن آج کل وہ اپنے بیڈ روم میں تنہا ہوتا تھا اور تو اور چنچل و خوبرو سنبل کے لیے بھی وہ کسی طرح کی رغبت محسوس نہیں کر رہا تھا۔ پارا ہاؤس میں روانگی کی تیاریاں جاری تھیں۔ جنہوں نے ساتھ جانا تھا ان کے کاغذات تیز رفتاری سے تیار ہو رہے تھے۔ روپے میں طاقت ہوتی ہے اور یہ طاقت اپنا کام دکھا رہی تھی۔ ہفتوں کا کام گھنٹوں میں ہو رہا تھا۔

انیق نے کہا۔ "میں آپ کو ایک خبر سناؤں، آپ کا دل باغ باغ ہو جائے گا۔"

"کیسی خبر؟" میں نے پوچھا۔ ہم مہمان خانے کے عقب میں ایک باغیچے میں پتھریلے بینچ پر بیٹھے تھے۔

"جاناں بھی ہمارے ساتھ جا رہی ہے۔ میرے خیال میں وہ میڈم لورین کی ضرورت بن چکی ہے۔ وہ اسے ہر صورت ساتھ لے جانا چاہ رہی ہے۔ فرمائیے، ہو گیا نا ں دل باغ باغ۔"

"اتنی پیاری صبح میں کتنی منحوس خبر سنائی ہے تم نے۔" میں نے بُرا سا منہ بنایا۔

وہ بولا۔ "آپ کی بات سن کر پہلوان حشمت کی ایک بات یاد آ گئی ہے۔ وہ فرماتے ہیں یہ لفظ "باغ باغ" نہیں ہوتا بلکہ "بھاگ بھاگ" ہوتا ہے اور پریشانی کے موقع پر بولا جاتا ہے۔ جیسے اگر کسی کی بیوی سسرال سے جلدی واپس آ جائے تو ہم کہیں گے...... بیوی کے آنے کی خبر سن کر اس کا دل بھاگ بھاگ ہو گیا۔"

"اپنی یہ بکواس بھی پہلوان کے کھاتے میں ڈال دیا کرو۔"

"بالکل نہیں جی۔ اگر میں نے اس موقع پر کچھ کہنا ہوتا تو یہ کہتا...... جانے سے جاناں کے آئے بہار...... آنے سے جاناں کے جائے بہار...... بڑی مرجانی ہے میری محبوبہ......"

میں نے ٹانگ چلائی جو اس کے منہ پر پڑی۔ وہ گیند کی طرح لڑھک کر باڑ کے پیچھے ایک چھوٹے سے گڑھے میں جا گرا۔ وہیں سے کراہتے ہوئے بولا۔ "ویسے آپ کی ٹانگ اپنا بھتیجن سے لمبائی میں تھوڑی ہی کم ہے اور اپنا بھتیجن کے حوالے سے تو یہ لطیفہ خاصا مشہور ہوا تھا اس کی پیدائش کے وقت دایہ نے کہا تھا...... دھنوال ہو ہری وانش صاحب آپ کے گھر میں ٹانگیں پیدا ہوئی ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ان

پر ایک پتلا سا منہ بھی لگا ہوا ہے۔"

"اچھا...... تماشے مت لگاؤ، ادھر آؤ۔"

وہ بولا۔ "ادھر کیسے آؤں۔ میں تو کھڈے میں گرا ہوا ہوں۔ آپ مجھے نکالیں، بلکہ مدد کے لیے اس امریش پوری کو بھی بلالیں۔"

اتنے میں سجاول بھی لمبے ڈگ بھرتا ہوا موقع پر پہنچ گیا۔ باڑ کی دوسری طرف اسے انیق نظر نہیں آیا مگر اس کی آواز وہ یقیناً سن چکا تھا، بولا۔ "یہ کون گر گیا ہے کھڈے میں؟"

"انیق۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"تو سوچتے کیا ہو، ڈالو مٹی...... کام ختم کرو۔" سجاول بولا۔

اتنے میں انیق بھی کپڑے جھاڑتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر کھسیانی سی ہنسی تھی۔ سجاول اپنی بھاری بھرکم آواز میں بولا۔ "اور یہ امریش پوری کون ہے؟"

انیق کا رنگ اڑ گیا، پھر ذرا سنبھل کر بولا۔ "وہ...... وہ...... میرا ایک چاچا ہے انڈیا میں۔ دراصل......"

سجاول نے ایک بڑی سی ڈکار لی اور کہا۔ "تمہارے والد کا بھائی ہوا ناں، مجھے پہلے ہی شک تھا کہ تم کسی بگڑے ہوئے ہندو کی اولاد ہو۔"

سجاول کے تیز تیکھے فقروں پر انیق کے چہرے کا رنگ بدل جایا کرتا تھا لیکن اس دفعہ کوئی خاص ردِعمل نہیں ہوا۔ وہ مسکرا کر بات کو دوسری طرف لے گیا اور وضاحت پیش کی کہ وہ ایک منہ بولے چاچا کی بات کر رہا ہے۔

جب سے سجاول پر چوری کی واردات والا شک غلط ثابت ہوا تھا اور اس نے اصل مجرم قادر خان کو پکڑا تھا، اس کے بہت سے مخالفین نے اپنی زبانوں کو لگام دے لی تھی اور ان میں سے ایک انیق بھی تھا۔ وہ اب اس کے بارے میں قدرے محتاط ہو کر بات کرتا تھا۔ موقع دیکھ کر انیق وہاں سے کھسک گیا تو سجاول نے بینچ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تمہارے لیے ایک بالکل تازہ بہ تازہ خبر ہے شاہی، زینب کے بارے میں ہے۔ اندازہ لگاؤ کیا ہو سکتی ہے؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" میں نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "کل رات...... ابراہیم اور زینب کا نکاح ہو گیا ہے۔"

میں تھرا کر رہ گیا۔ سماعت پر یقین نہیں آیا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو؟ مذاق کر رہے ہو؟"

"تمہیں پتا ہے میں مذاق نہیں کرتا۔ بالکل پکی اطلاع ہے۔ کل رات ہی زینب دلہن بن کر ابراہیم والے پورشن میں شفٹ ہو گئی تھی۔"

"اوہ گاڈ۔" میں نے سر تھام لیا۔ "اسے سب کچھ پتا تھا...... وہ سب کچھ جانتا تھا۔ وہ تو کہتا تھا......" بات ادھوری چھوڑ کر میں کھڑا ہو گیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" سجاول نے بھی کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ابراہیم سے بات کرنا چاہ رہا ہوں۔" میں نے سخت مضطرب لہجے میں کہا۔

"لیکن کوئی گڑبڑ والی بات نہ کرنا۔" اس نے مجھے کندھے سے تھام کر کہا۔ "تمہیں یہاں جو مقام ملا ہے، اسے گنوانا نہیں ہے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ کمرے میں آ کر کپڑے تبدیل کیے۔ فون پر ابراہیم سے آنے کی اجازت مانگی اور پیارا ہاؤس کے خاص رہائشی حصے کی طرف چل دیا۔ اب رہائشی حصے کی آرائش و زیبائش میں نمایاں کمی نظر آ رہی تھی۔ کئی جگہ پر سامان باندھ کر رکھ دیا گیا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ مکین کہیں روانہ ہونے کی تیاری میں ہیں۔ سخت حیرت تھی۔ اس طرح کے ہنگامی حالات میں ابراہیم نے اس طرح کا عمل کیوں کیا تھا؟ پھر میرے ذہن میں پرانے شاہی خاندانوں کا خیال آیا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ کسی بڑی اور خطرناک مہم سے پہلے یہ لوگ "ہنگامی جشن" مناتے تھے۔ عیش و عشرت کرتے تھے اور اپنی ناتمام خواہشوں کو آسودہ کرتے تھے۔ کہیں یہ بھی تو کوئی اسی طرح کی صورت حال نہیں تھی؟

سیکورٹی کے مرحلے سے گزر کر میں ابراہیم کے رہائشی پورشن کے قریب پہنچا تو ایک جواں سال خوبرو ملازمہ نظر آئی۔ وہ ایک دیدہ زیب گلدستہ لیے ابراہیم کے کمرے سے نکل رہی تھی۔ یقیناً وہ یہ پھول زینب کے کمرے میں لے کر جا رہی تھی۔ میں ایک دو دفعہ پہلے بھی اسے ایسے ہی گلدستے کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔

میں اجازت لے کر کمرے میں داخل ہوا تو ابراہیم خوشنما ریشمی لبادہ پہنے ایک آرام دہ دیوان پر نیم دراز تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھ کر آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ چہرے پر گوناگوں سکون کی کیفیت تھی۔ میرے کھنکھارنے پر وہ اٹھ بیٹھا۔ "آئیں شاہ زیب!" وہ ملائمت سے بولا۔

میں اس کے سامنے بیش قیمت اٹالین نشست پر بیٹھ گیا۔ وہ رسمی کلمات کے بعد بولا۔ "میرا خیال ہے کہ آپ تک

خبر پہنچ گئی ہے؟"

"جی ہاں۔ اور بے حد حیرت ہوئی ہے۔ ابھی تک یقین نہیں آرہا۔" میں نے انگلش میں کہا۔

"اب یقین کرلیں۔" اس نے اپنے مہندی لگے ہاتھوں سے اپنے ریشمی چغے کی سلوٹیں درست کرتے ہوئے کہا۔

چند سیکنڈ خاموشی رہی۔ تب میں نے گہری سانس لے کر گفتگو کا سلسلہ جوڑا۔ "ابراہیم اگر باقی ساری باتوں کو فی الحال ایک طرف رکھ دیا جائے تو بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایسے ہنگامی حالات میں...... اور اپنے ماموں کی موت کے چند دن بعد ہی آپ نے یہ نکاح کرلیا ہے۔"

"یہ ایک مجبوری تھی اور یہ جو کچھ ہوا ہے بالکل سادگی سے ہوا ہے۔ بس گھر کے چار پانچ قریبی افراد ہی اس نکاح میں شامل تھے۔"

"اور آپ سب کچھ جانتے بھی تھے۔ آپ خود کہتے تھے کہ میں اس کی زندگی برباد نہیں کرسکتا۔"

"لیکن...... کئی دفعہ حالات انسان کے بس میں نہیں رہتے۔" اس نے عجیب لہجے میں کہا۔ "میں اسے کھونا نہیں چاہتا تھا...... اور وہ بھی مجھے کھونا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے جو کچھ بھی کیا ہے اسے سب کچھ بتا کر کیا ہے۔ کچھ بھی اس سے چھپایا نہیں ہے اور سب کچھ اوپر والے پر چھوڑ دیا ہے۔"

"انسان کو عقل بھی اوپر والے نے ہی دی ہے ابراہیم...... اور بتایا ہے کہ آگ میں کودو گے تو جلو گے، پہاڑ سے چھلانگ لگاؤ گے تو مرو گے۔"

"آپ جس طرف اشارہ کررہے ہیں، میں سمجھ رہا ہوں۔ لیکن یہ صرف نکاح ہے، ازدواجی رشتہ نہیں ہے۔ میں نے خود سے عہد کیا ہے شاہ زیب کہ اس وقت تک زینب کے قریب نہیں جاؤں گا جب تک اسے میری ذات سے ہلکے سے ہلکا خطرہ بھی لاحق ہوگا۔ شاید میں ابھی نکاح بھی نہ کرتا لیکن مجبوری یہ تھی کہ میں اسے یہاں چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا۔ اسے اپنے ساتھ برونائی لے جانے کا واحد راستہ یہی تھا کہ ہم ایک ہوجائیں۔"

میں نے نوخیز ابراہیم کی طرف دیکھا۔ یہ خطرناک ترین جوانی کی عمر تھی اور وہ زینب کو ٹوٹ کر چاہ رہا تھا۔ اب وہ منکوحہ بیوی کی حیثیت سے اس کے ساتھ تھی اور وہ اپنے اور اس کے درمیان بند باندھنے کی بات کررہا تھا۔ یہ آگ اور پیٹرول کا کھیل تھا۔

میں نے کہا۔ "کل رات زینب آپ کے ساتھ آپ کے کمرے میں رہی ہے۔ آپ اس سے دور رہے ہوں گے مگر یہ دوری کب تک قائم رہ سکتی ہے؟"

"میں نے خود سے اور اپنے اللہ سے وعدہ کیا ہے شاہ زیب صاحب اور میں اس پر قائم رہوں گا۔ رات کو بھی وہ میرے کمرے میں نہیں ساتھ والے کمرے میں تھی...... اور آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ یہاں تک کہ قدرت کو ہم پر رحم آجائے اور ہمارے لیے کوئی راستہ نکل آئے۔"

میں نے ذرا توقف سے کہا۔ "کیا وہ آپ کے ساتھ برونائی جانے کو تیار ہے؟"

"ایک سو ایک فیصد۔" وہ پورے یقین سے بولا۔ "وہ خود بھی یہ کہتی ہے کہ اب...... اپنے ماضی کی طرف پلٹنا نہیں چاہتی۔"

ہماری گفتگو کو ایک بار پھر بڑی بیگم کی وجہ سے بریک لگ گئے۔ ایک ملازمہ نے آکر ابراہیم کو اطلاع دی کہ بڑی بیگم کی طبیعت ناساز ہے اور وہ آپ کو بلا رہی ہیں۔ ابراہیم اٹھ کر روانہ ہوگیا۔ میں بھی باہر نکل آیا۔ ابراہیم کا فقرہ کانوں میں گونج رہا تھا...... وہ ایک سو ایک فیصد تیار ہے۔ وہ خود بھی اپنے ماضی کی طرف پلٹنا نہیں چاہتی۔ میں سوچنے لگا شاید ساری مشرقی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ ان کے سینوں میں درد اور جدائی کے لیے بے پناہ جگہ ہوتی ہے۔ وہ خود کو بدلتے ہوئے حالات میں ڈھالتی ہیں اور ایسا کرتے ہوئے ہزار ہا دکھ خاموشی سے جھیل جاتی ہیں۔ پھر وہ ان سے پیار کرنے لگتی ہیں جن سے انہیں منسوب کردیا جاتا ہے۔ تاجور بھی تو ایسی ہی تھی۔ اس نے اپنی اور اپنے ماں باپ کی بھلائی کے لیے سب کچھ فراموش کردیا تھا۔ اب ماں باپ کی پسند سے اس کی سگائی ہوگئی تھی...... اور کیا پتا کہ اب وہ خود بھی اسی کو پسند کرنے لگی ہو جس نے اس کے جسم و جاں کا مالک بننا تھا۔ یقیناً یہ مشرقی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔

میں ایک راہداری سے گزرا تو چونک گیا۔ میں نے دیکھا کہ ملازمین ایک جگہ کچھ تھیلے جمع کررہے تھے۔ یہ سفید کینوس کے تکیہ نما تھیلے تھے جن کے منہ بند کیے گئے تھے۔ ان کی تعداد جو مجھے دکھائی دی دس کے قریب تھی، ہر تھیلے پر MT لکھا ہوا تھا۔ میں نے ایک مقامی ملازم سے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

"پتا نہیں صاحب! یہ شاید برونائی جارہے ہیں...... دوسرے سامان کے ساتھ۔"

میں ان تھیلوں کو چھو کر دیکھنا چاہتا تھا مگر وہاں کئی گارڈز بھی موجود تھے۔ میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ لیکن پتا نہیں

کیوں میرے دل نے گواہی دی کہ ان تھیلوں میں جو کچھ بھی ہے، ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے ہے جو وہاں جزیرے پر درپیش ہیں۔ MT سے مراد کوئی بھی قانونی چیز ہو سکتی تھی۔ (غیر قانونی ہوتی تو اس طرح عام ملازم اس کی نقل و حرکت نہ کر رہے ہوتے) پتا نہیں کہ وہاں کیا صورتِ حال تھی؟

پارا ہاؤس کے برآمدوں سے گزرتے ہوئے میں نے دل ہی دل میں خود سے یہ سوال پوچھا۔ شاہ زیب! تم وڈے صاب کے ساتھ بروناٹی کیوں جا رہے ہو؟ اس کا اہم ترین جواب یہی سامنے آیا کہ وہاں کے حالات کے حوالے سے میرے اندر بہت تجسس پیدا ہو چکا ہے، اور اس سے زیادہ اہم یہ کہ میں مولوی فدا صاحب کی یتیم بچی کو غیر یقینی حالات میں بے آسرا چھوڑنا نہیں چاہتا...... باقی دیگر باتوں کی اہمیت تو تھی مگر بہت زیادہ نہیں۔

میں سجاول کے پاس واپس پہنچا تو اس کے سامنے ایک خاکی لفافہ رکھا تھا۔ "یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہم تینوں کے پاسپورٹ، ویزے اور ٹکٹ...... شکیل داراب کی پاور کا ثبوت۔"

وہ درست کہہ رہا تھا۔ ابھی میں کاغذات دیکھ ہی رہا تھا کہ سجاول کے فون کا میوزک بجنے لگا۔ اس نے کال ریسیو نہیں کی اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے تیزی سے بولا۔ "یہ ڈیرے سے ماؤ جی کا فون ہے۔ تم سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ شاید مائی بھی کرے گی۔ ان سے جو کہنا ہے، وہ میں نے تمہیں بتا دیا تھا۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے کال ریسیو کی اور ایک دو فقرے بولنے کے بعد سیل فون میری طرف بڑھا دیا۔ "ہیلو شاہ زیب پتر! کہاں ہو تم؟" ماؤ کی پاٹ دار آواز ابھری۔

"ہیلو ماؤ جی، میں یہاں ہوں سجاول بھائی کے ساتھ۔ بالکل ٹھیک ٹھاک۔ آپ تو ٹھیک ہیں ناں؟"

ماؤ جی نے بھوں بھوں رونا شروع کر دیا۔ "اپنی ماؤ کو مار کر پوچھ رہے ہو کہ ٹھیک تو ہو۔ میرے بگڑے! تیرے بغیر جینا کوئی جینا نہیں...... اور مجھ سے بھی بُرا حال تیری اس ہونے والی کا ہے۔ سچ کہتی ہوں سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے۔ کئی کئی دن کچھ کھاندی پیندی نہیں ہے۔ اب تم لوگ واپسی کی تاریخ کچھ اور آگے ڈال رہے ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا بنے گا......" ماؤ نے شکوے شکایتوں کے انبار لگائے اور پھر فون مائی کو تھما دیا۔

وہ آفت کی پرکالہ اپنے مخصوص انداز میں بولی اور اس نے بھی شکووں کی بوچھاڑ کی پھر کہنے لگی۔ "شاہ زیب! تمہاری وجہ سے دادی ماؤ کو کچھ ہوا ناں تو پھر...... یاد رکھنا میں بھی اپنے ساتھ کچھ کر جاؤں گی۔ واپسی پر تمہیں ایک نہیں دو لاشیں ملیں گی۔ پورا ایک چھٹانک نیلا تھوتھا منگوا کر رکھ لیا ہے میں نے بھی۔"

لگتا تھا کہ اب ماؤ اس کے قریب موجود نہیں اس لیے وہ کھل کر بول رہی ہے۔ اس کے پوچھنے پر میں نے اسے بتایا کہ سجاول بھائی کے ساتھ اندرونِ سندھ جا رہا ہوں۔ وہاں کسی وڈیرے کا کوئی ضروری مسئلہ حل کرنا ہے۔ دو تین ہفتے لگ جانے ہیں۔ میں نے وڈیرے کا نام بھی بتایا (سجاول نے مجھے یہی کچھ بتانے کو کہا تھا) مہناز عرف مائی یوں بول رہی تھی جیسے میں اس کا "منکوحہ" بن چکا ہوں۔ باتوں کے دوران میں اس نے دو تین چھوٹی چھوٹی ڈکاریں بھی لیں جس سے یہ جھوٹ کھل گیا کہ وہ کھا پی نہیں رہی۔ فی الوقت بھی اس نے گلے تک ٹھونسا ہوا تھا۔

آفتِ جاں مائی سے بات ختم ہوئی تو میں نے ایک طویل ٹھنڈی سانس لی۔ اچانک مجھے اس سیلانی روح کا خیال آیا جو کل سکھیرا گاؤں میں مجھ سے چمٹی تھی اور میرے پیچھے پیچھے یہاں پارا ہاؤس پہنچ گئی تھی۔ میرا مطلب سیف عرف سیفی سے تھا۔ میں اپنے بیڈ روم کے ساتھ والے کمرے میں پہنچا، وہ پھیل کر سویا پڑا تھا۔ کلف دار شلوار قمیص چُرمُر ہو چکی تھی۔ لمبا تڑنگا مضبوط جسم، کسانوں والے ہاتھ پاؤں، چہرے پر کھل والی چھوٹوں کے دو تین نشان۔ وہ یوں بے فکر پڑا تھا جیسے خالہ جی کے گھر میں ہو۔ پتا نہیں یہ کیا شے تھی؟ ہیڈ خانساماں اور میر طیب کی باندی یا لونڈی بھی بند کھڑکی میں سے اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

اچانک میری نگاہ ایک بٹوے پر پڑی۔ یہ اس کے کرتے کی بغلی جیب سے پھسل کر بیڈ پر آ گیا تھا۔ میں نے ہولے سے بٹوا اٹھا لیا۔ اس میں سے ایک تصویر جھانک رہی تھی۔ یہ ایک تنومند بندے کی تصویر تھی۔ اس کے چہرے پر بال پوائنٹ سے کراس کا نشان لگا دیا گیا تھا۔ میں اس تصویر کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ میں اسے بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ یقین نہیں آیا کہ میں یہ تصویر یہاں پارا ہاؤس میں دیکھ رہا ہوں۔

خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آیندہ ماہ پڑھیے

دوسرا طریقہ

عکس فاطمہ

کہتے ہیں کہ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی... دولت مندوں کے لیے ان کی دولت کسی امتحان اور مصیبت سے کم نہیں ہوتی... دو بوڑھی عورتوں کا ماجرا... جو نہ صرف دولت مند تھیں بلکہ آپس میں بہنیں بھی تھیں... ایک مشرق تھی تو دوسری مغرب... دونوں متضاد فطرت و شوق رکھتی تھیں... اختلافات اور چپقلش میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوششوں میں اپنی جان کو ہلاکت میں ڈال بیٹھیں۔

ایک مجرم کے انوکھے طریقۂ واردات کا قصہ

مسز کرینی کی پالتو جانوروں کی دکان کی گھنٹی بجی اور ایلری کوئن اپنی ناک سکیڑتا ہوا اندر آ گیا۔ اس چھوٹی سی دکان میں پھیلی ہوئی بُو نیویارک کے چڑیا گھر کو بھی مات کر رہی تھی جبکہ وہاں صرف چھوٹے جانور ہی رکھے ہوئے تھے۔ وہ ان کی بھانت بھانت کی آوازیں سن کر بہت محظوظ ہو رہا تھا۔ ان سب کی اپنی اپنی بولیاں تھیں۔ جن میں چیخنا، بھونکنا، غرانا، کرخت آواز نکالنا، ناراض ہونا، تیز نکیلی آواز، میاؤں، میاؤں، ٹراہٹ، چنگھاڑ، چہچہاہٹ، پھنکار اور

غراہٹ بھی کچھ شامل تھا اور وہ یہ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ دکان کی چھت ابھی تک کیوں نہیں گری۔

"گڈ آفٹر نون۔" ایک کراری آواز سنائی دی۔

"میرا نام مس کریتی ہے۔ میں تمہاری کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

ایلری کوئن اس کی شوخ آنکھوں کے سحر میں کھو گیا حالانکہ اس کی شخصیت کے اور بھی پہلو توجہ طلب تھے۔ وہ دبلی پتلی جوان عورت تھی۔ خوب صورت بال، متناسب جسم اور گالوں میں پڑنے والے ڈمپل نے اسے مزید جاذب نظر بنا دیا تھا لیکن فی الوقت مس کریتی کی آنکھیں ہی اس کی توجہ کا مرکز تھیں۔ مس کریتی اس کا یہ انداز دیکھ کر شرما گئی اور اس نے اپنا سوال دہرایا۔

"معافی چاہتا ہوں۔" ایلری نے کہا۔ "کیا کُتّے سے مشابہ کوئی ایسا جانور مل سکتا ہے جو نسبتاً کم شور مچائے، بھورے بال، تیز کان اور زخم دار ٹانگیں ہوں۔"

"امید ہے کہ تمہارا مطلوبہ جانور مل جائے گا۔" مس کریتی نے پیشہ ورانہ انداز میں کہا۔ "میں کل تک معلوم کر کے تمہیں بتا دوں گی۔ اگر مناسب سمجھو تو اپنا نام اور پتا ایک کاغذ پر لکھ دو۔"

جب مس کریتی نے وہ کاغذ پڑھا تو اس کے چہرے پر سے کاروباری نقاب اتر گیا اور وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ "تم مسٹر ایلری کوئن ہو۔ میں نے تمہارے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے اور تم غالباً ستاسی ویں اسٹریٹ کے کونے پر رہتے ہو۔ یہ واقعی ہیجان خیز ہے۔ مجھے امید نہیں تھی کہ کبھی تم سے ملاقات ہو سکے گی۔"

"اور نہ ہی مجھے۔" ایلری کوئن بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

مس کریتی ایک بار پھر شرما گئی اور بے اختیار اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ "میرے بہترین گاہکوں میں سے ایک تمہارے گھر کے سامنے سڑک کے دوسری طرف رہتی ہے۔ شاید تم اسے جانتے ہو۔ مس شِنگل۔ مارتھا شنگل۔ اس کا اپارٹمنٹ کافی بڑا ہے۔"

"مجھے کبھی یہ اعزاز حاصل نہیں ہوا۔" کوئن بے دھیانی سے بولا۔ "کیا اس میں کوئی غیر معمولی بات ہے؟"

"وہ بے چاری بوڑھی عورت اپاہج اور مفلوج ہو چکی ہے اور دیکھنے میں بہت عجیب لگتی ہے۔ دبلی پتلی، کمزور اور روز بروز موت سے قریب ہوتی ہوئی۔ وہ تقریباً پاگل ہے۔"

"یقیناً وہ کسی کی نانی یا دادی ہوگی۔" کوئن نے سرگوشی میں کہا۔ "کیا اُسے بلّیاں پسند ہیں؟"

"کیوں؟ یہ اندازہ تم نے کیسے لگایا؟"

"اس عمر میں ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"مجھے یقین ہے کہ تم اس میں دلچسپی لو گے۔" مس کریتی نے پُرشوق انداز میں کہا۔

"میں ہی کیوں ڈیانا؟"

"میرا نام میری ہے۔" مس کریتی نے شرماتے ہوئے کہا۔ "وہ بہت ہی عجیب ہے مسٹر کوئن اور میں سمجھتی ہوں کہ تم عجیب لوگوں میں دلچسپی لیتے ہو۔"

"فی الحال تو بے کاری کے مزے لے رہا ہوں۔" ایلری کوئن نے چھڑی پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

"کیا تم جانتے ہو کہ آج کل مس مارتھا کیا پاگل پن کر رہی ہے؟"

"میں کوئی نجومی نہیں ہوں۔"

"وہ کئی دنوں سے ہر ہفتے مجھ سے ایک بلی خرید رہی ہے۔"

مجھے اس میں شک کرنے کی کوئی خاص وجہ نظر نہیں آتی۔ ایک بوڑھی اور اپاہج عورت جسے بلیوں کا شوق ہو وہ ایسا کر سکتی ہے۔ میری ایک آنٹی بھی ایسی ہی تھیں۔"

"اس میں عجیب بات یہ ہے کہ اسے بلّیاں پسند نہیں ہیں۔"

مسٹر کوئن نے دو مرتبہ پلکیں جھپکائیں اور مس کریتی کے خوب صورت چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم یہ کیسے جانتی ہو؟"

مس کریتی چہکتے ہوئے بولی۔ "اس کی بہن نے مجھے بتایا تھا۔ مس مارتھا مکمل طور پر معذور و مفلوج ہے۔ اس کی بہن سارہ این ہی گھر سنبھالتی ہے۔ ان دونوں کی عمر میں زیادہ فرق نہیں ہے اور وہ تقریباً ایک جیسی لگتی ہیں۔ ایک سال پہلے سارہ این میری دکان پر آئی اور ایک سیاہ رنگ کا بلا خریدا۔ اس کے پاس زیادہ پیسے نہیں تھے۔ اس نے کہا کہ وہ کوئی قیمتی بلی نہیں خرید سکتی لہٰذا وہ ایک سیاہ بلا ہی لے کر چلی گئی۔"

"کیا اس نے سیاہ رنگ کا بلا مانگا تھا؟" مسٹر کوئن نے پوچھا۔

"نہیں، اسے صرف ایک بلی چاہیے تھی، چاہے وہ کیسی بھی ہو۔ چند روز بعد وہ واپس آئی اور جاننا چاہ رہی تھی

کہ کیا میں بلی واپس لے سکتی ہوں کیونکہ اس کی بہن کو بلیوں سے نفرت ہے اور وہ نہیں چاہتی کہ یہ بلی گھر میں رہے کیونکہ وہ خود مارتھا کے رحم و کرم پر تھی۔ اس لیے اس کی اپنی کوئی مرضی نہیں تھی۔ مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا، اور میں نے بلی واپس لینے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ بعد میں اس کا ارادہ بدل گیا اور وہ بلی واپس کرنے نہیں آئی۔ بہرحال اس طرح مجھے معلوم ہو گیا کہ مس مارتھا کو بلیاں پسند نہیں۔"

"بڑی عجیب بات ہے۔" مسٹر کوئن نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "اسے بلیوں سے نفرت ہے اور تم یہ بھی کہہ رہی ہو کہ پچھلے کچھ دنوں سے وہ ہر ہفتے ایک بلی خرید رہی ہے۔ یہ کس قسم کی بلیاں ہیں مس کریبی؟"

مس کریبی ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولی۔ "اس نے بہت زیادہ اچھی بلیاں نہیں خریدیں۔ اس کی بہن نے بتایا تھا کہ وہ کافی دولت مند ہے۔ اس لیے میں نے اسے اعلیٰ نسل کی بلیاں دکھائیں لیکن اسے عام سی بلیاں چاہیے تھیں۔ بالکل جیسے اس کی بہن کو فروخت کی تھی۔ سبز آنکھوں والا کالا بلا۔ وہ سب ایک ہی جسامت کے تھے۔ مجھے یہ بہت عجیب لگا۔"

"واقعی بہت عجیب بات ہے۔" ایلری کوئن نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "اور یہ سلسلہ کب سے چل رہا ہے؟"

"مجھے معلوم تھا کہ تم اس معاملے میں ضرور دلچسپی لو گے۔" مس کریبی نے چہکتے ہوئے کہا۔ "پانچ ہفتے ہو گئے ہیں۔ میں نے چند روز پہلے ہی چھٹا بلا خود اسے پہنچایا ہے۔"

"تم نے؟ کیا وہ مکمل طور پر معذور ہے؟"

"ہاں، وہ بستر سے بھی نہیں اتر سکتی اور نہ ہی ایک قدم چل سکتی ہے۔ دس سال سے وہ اسی حالت میں ہے۔ فالج ہونے سے پہلے وہ اور سارہ ایک ساتھ نہیں رہتی تھیں لیکن اب وہ ہر کام کے لیے اپنی بہن کی محتاج ہے۔"

"پھر کیا وجہ ہے کہ اس نے بلیاں خریدنے کے لیے اپنی بہن کو نہیں بھیجا؟" ایلری نے پوچھا۔

"میں نہیں جانتی۔" مس کریبی نے آہستہ سے کہا۔ "بعض اوقات میں بھی کانپنے لگتی ہوں۔ وہ ہمیشہ مجھے ٹیلی فون کرتی ہے۔ اس کے سرہانے فون رکھا ہوا ہے اور وہ... بہ آسانی اپنا بازو وہاں تک لے جا سکتی ہے۔ وہ ہمیشہ ایک ہی طرح کا آرڈر دیتی ہے۔ سیاہ بلا، سبز آنکھوں والا، ایک ہی جسامت اور ممکنہ حد تک سستا۔ مجھے تو وہ مول تول کرنے والی لگتی ہے۔"

"بہت ہی انوکھی بات ہے۔" ایلری نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ جب تم بلیاں لے کر جاتی تھیں تو اس کی بہن کا کیا ردعمل ہوتا تھا؟"

"اس بارے میں کچھ نہیں بتا سکتی کیونکہ اس وقت وہ گھر پر نہیں ہوتی تھی۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا۔ تم تو کہہ رہی تھیں کہ مارتھا بالکل معذور ہے؟"

"ہاں، وہ تو ہے لیکن سارہ ہر روز سہ پہر میں گھر سے باہر چلی جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ فلم دیکھنے یا ہوا خوری کے لیے جاتی ہو اور اس کی بہن چند گھنٹوں کے لیے گھر میں اکیلی ہوتی ہے اور میرا خیال ہے کہ ایسے ہی وقت وہ مجھے فون کرتی تھی۔ اس نے مجھے انہی اوقات میں آنے کی تاکید کر رکھی تھی۔ جب بھی بلیاں دینے گئی تو میں نے سارہ کو بھی گھر پر نہیں دیکھا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس نے بلیوں کی خریداری کو سارہ سے خفیہ رکھنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ سارہ باہر جاتے وقت دروازہ مقفل نہیں کرتی تھی۔ اس لیے مجھے اندر جانے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ مارتھا نے کئی بار مجھ سے کہا کہ ان بلیوں کے بارے میں کسی سے کوئی بات نہ کروں۔"

"اس نے یہ کیسے سوچ لیا کہ سارہ کو ان بلیوں کے بارے میں پتا نہیں چلے گا۔ کیا وہ اندھی ہے؟"

"بالکل نہیں بلکہ دونوں بہنوں کی نظر بالکل ٹھیک ہے۔"

"میں مذاق کر رہا تھا لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی مس کریبی۔"

"اچھا۔" مس کریبی شوخی سے بولی۔ "اس طرح... کم از کم تمہیں سوچنے کے لیے ایک موضوع مل گیا...... جیسے ہی مجھے تمہارے مطلوبہ جانور کے بارے میں معلوم ہوا، تمہیں فون کر دوں گی۔"

ایلری کوئن نے چشمہ آنکھوں پر لگایا اور دوبارہ اپنی چھتری پکڑتے ہوئے بولا۔ "مس کریبی، مجھے دوسروں کے معاملات میں دخل دینے کا مرض ہے۔ تم ان پُراسرار بہنوں کے سلسلے میں میری کیا مدد کر سکتی ہو؟"

"مجھے تمہاری مدد کر کے خوشی ہو گی۔ یہ بتاؤ کہ کیا کرنا ہے؟"

"فرض کرو کہ تم مجھے مارتھا کے گھر لے جاؤ اور میرا تعارف ایک گاہک کے طور پر کراؤ اور اس سے کہو کہ تم نے چند روز قبل جو بلی اسے دی... وہ پہلے مجھے دینے کا وعدہ کیا تھا

کیونکہ مجھے وہی بلی پسند ہے۔ اس لیے کوئی دوسری لینے پر تیار نہیں ہوں۔ تم وہ بلی واپس لینے اور اس کی جگہ دوسری دینے کو تیار ہو۔ تم کوئی بھی ایسی بات کر سکتی ہو جس کے ذریعے مجھے اُسے دیکھنے اور باتیں کرنے کا موقع مل جائے۔ یہ سہ پہر کا وقت ہے اور سارہ این بھی شاید فلم دیکھنے گئی ہو۔ بولو کیا کہتی ہو؟''

مس کرینی نے ایک دلآویز مسکراہٹ اس کی جانب پھینکی اور بولی۔ ''ایک منٹ۔ میں کسی دوسرے شخص کو دکان پر بٹھاتی ہوں کیونکہ یہاں کسی کا ہونا ضروری ہے۔''

دس منٹ بعد وہ دونوں فائیو سی اپارٹمنٹ کے دروازے پر کھڑے ہوئے تھے۔ یہ ایک پرانے طرز کی عمارت تھی اور وہاں اس وقت مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ راہداری کے فرش پر دودھ کی دو بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ مس کرینی کچھ پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ ایلری کوئن نے جھک کر فرش پر رکھی ہوئی بوتلوں کو دیکھا اور وہ بھی پریشان نظر آنے لگا۔

''یہ کل اور آج کی بوتلیں ہیں۔'' وہ بڑبڑایا پھر اس نے اپنا ہاتھ دروازے کی ناب پر رکھا۔ وہ مقفل تھا۔ اس نے کہا۔ ''تم نے بتایا تھا کہ اس کی بہن باہر جاتے وقت دروازے کو تالا نہیں لگاتی؟''

''شاید وہ بھی اندر ہی ہو۔'' مس کرینی نے بے یقینی سے کہا۔ ''اور اگر وہ باہر گئی ہوئی ہے تو شاید دروازے کو غیر مقفل کرنا بھول گئی۔''

ایلری نے دو مرتبہ گھنٹی بجائی لیکن کوئی جواب نہیں ملا پھر اس نے بہ آواز بلند کہا۔ ''مس ایٹکل! کیا تم اندر ہو؟''

''میری سمجھ میں نہیں آرہا۔'' مس کرینی نے مضطرب ہوتے ہوئے کہا۔ ''اسے تمہاری آواز سن لینی چاہیے۔ یہ صرف تین کمروں کا اپارٹمنٹ ہے۔ دونوں بیڈ روم اور لیونگ روم کے دروازے ڈیوڑھی میں کھلتے ہیں۔''

ایلری نے دوبارہ آواز دی پھر دروازے سے کان لگا دیے۔ مس کرینی کی خوب صورت آنکھوں میں خوف کی پرچھیاں لرزنے لگیں۔ وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''اوہ، مسٹر کوئن، لگتا ہے کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے۔''

''ہمیں سپرنٹنڈنٹ کو تلاش کرنا چاہیے۔'' ایلری نے آہستہ سے کہا۔

انہیں گراؤنڈ فلور پر ہی ایک دروازے پر سپرنٹنڈنٹ کے نام کی تختی نظر آ گئی۔ ایلری نے گھنٹی بجائی تو ایک پستہ قد عورت نے دروازہ کھولا۔ اس نے اپنے ہاتھ ایپرن سے صاف کیے اور چہرے پر سے بالوں کی لٹ ہٹاتے ہوئے بولی۔ ''کیا بات ہے؟''

''تم مسز پوٹر ہو؟''

''ہاں لیکن ہمارے پاس کوئی اپارٹمنٹ خالی نہیں ہے۔ تمہیں چوکیدار نے نہیں بتایا؟''

ایلری نے جلدی سے کہا۔ ''ہم کوئی اپارٹمنٹ نہیں ڈھونڈ رہے مسز پوٹر۔ کیا سپرنٹنڈنٹ موجود ہے؟''

''نہیں۔'' اس عورت نے شک کے انداز میں کہا۔ ''وہ لانگ آئی لینڈ سٹی کی ایک کیمیکل فیکٹری میں جز وقتی ملازمت کرتا ہے۔ اس کی واپسی تین بجے سے پہلے نہیں ہو گی۔ اس سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟''

''مجھے یقین ہے کہ تم ہماری مدد کر سکو گی۔ ہم مس ایٹکل سے ملنے آئے تھے لیکن بار بار گھنٹی بجانے اور آوازیں دینے کے باوجود کوئی جواب نہیں مل رہا ہے۔''

موٹی عورت ناراض ہوتے ہوئے بولی۔ ''کیا دروازہ کھلا ہوا نہیں ہے؟ عام طور پر اس وقت ایک بہن گھر سے باہر جاتی ہے اور دوسری مفلوج ہے۔''

''دروازہ مقفل ہے مسز پوٹر اور گھنٹی بجانے یا آوازیں دینے پر بھی کوئی جواب نہیں ملا۔''

''یہ واقعی حیرت انگیز بات ہے۔'' موٹی عورت مس کرینی کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''مس مارتھا معذور ہے۔ وہ کبھی باہر نہیں جاتی۔''

''تم نے آخری بار مس سارہ این کو کب دیکھا تھا؟''

''دو دن پہلے اور اب مجھے خیال آرہا ہے کہ میں نے دو دن سے ہی اس معذور عورت کو بھی نہیں دیکھا۔''

مس کرینی سوچنے لگی کہ دو دن سے ہی دودھ کی بوتلیں بھی دروازے کے باہر رکھی ہوئی ہیں۔ تبھی ایلری نے پوچھا۔

''کیا تم مس مارتھا سے ملتی رہتی ہو؟''

''ہاں۔'' مسز پوٹر بولی۔ ''جب کبھی اس کی بہن گھر سے باہر ہو تو وہ مجھے فون کر کے بلاتی ہے کہ کچرا جلانے کی بھٹی میں پھینک دوں یا اس کا کوئی اور کام ہو تو وہ بھی کر دوں، کچھ دن پہلے اس نے مجھے ایک خط پوسٹ کرنے کے لیے دیا تھا لیکن دو دن سے اس نے مجھے نہیں بلایا۔''

ایلری نے اپنی جیب سے کوئی چیز نکالی اور اسے اپنی ہتھیلی پر رکھ کر مسز پوٹر کے سامنے کر دیا۔ ''مسز پوٹر!'' اس نے سختی سے کہا۔ ''میں اس اپارٹمنٹ میں جانا چاہتا ہوں۔ مجھے کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے۔ ماسٹر کی دے دو۔''

”پو...... پولیس۔“ وہ ہکلاتے ہوئے بولی پھر فوراً ہی اندر گئی اور واپس آکر چابی ایلری کو دے دی۔ ”کاش مسٹر پوٹر گھر پر ہوتے۔“ وہ رونی صورت بناتے ہوئے بولی۔

”کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں مسز پوٹر۔“

انہوں نے موٹی عورت کو سراسیمگی کے عالم میں وہیں چھوڑا اور لفٹ کے ذریعے پانچویں منزل پر پہنچ گئے۔ مس کرینی کا چہرہ خوف سے سفید ہو رہا تھا اور وہ بیمار نظر آرہی تھی۔

ایلری نے اس کی کیفیت محسوس کر لی اور دروازے میں چابی لگاتے ہوئے کہا۔ ”شاید یہ بہتر ہوتا کہ تم میرے ساتھ نہیں آتیں۔ ممکن ہے کہ کوئی ناخوشگوار صورتِ حال ہو۔ میں......“ وہ بولتے بولتے اچانک رک گیا۔

دروازے کے دوسری جانب کوئی موجود تھا۔ دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی اور یوں لگا جیسے کوئی چیز گھسیٹی جا رہی ہو۔ ایلری نے چابی گھمائی۔ لیکن دروازہ صرف آدھا انچ ہی حرکت کر سکا۔ ایلری پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔

”دروازے کے ساتھ کوئی رکاوٹ لگائی گئی ہے۔ تم پیچھے ہی رہنا۔“ یہ کہہ کر اس نے دروازے کو زور سے کندھا مارا۔ کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی اور دروازہ اندر کی طرف کھلتا چلا گیا۔ وہاں ایک ٹوٹی ہوئی کرسی زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ ”بہت دیر ہو گئی۔“

”آتش دان کی طرف دیکھو۔“ مس کرینی چلاتے ہوئے بولی۔ ”بائیں طرف والے بیڈ روم میں۔“

وہ ایک بڑے کمرے میں داخل ہوا جس میں دو بستر لگے ہوئے تھے اور کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ لیکن اسے آتش دان کی طرف کوئی نظر نہیں آیا۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ایک گول زینہ اوپر کی جانب جا رہا تھا۔

”وہ جو کوئی بھی تھا چھت کے راستے باہر نکل گیا ہے۔“ پھر اس نے اپنا سر اندر کیا اور ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ ”ایک نظر کمرے پر بھی ڈال لو۔ یہاں کوئی خون ریزی نظر نہیں آرہی۔ تم نے کوئی غیر معمولی بات دیکھی؟“

مس کرینی نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ...... وہ اس کا بستر کافی بے ترتیب حالت میں ہے لیکن وہ خود کہاں ہے؟“

دوسرا بستر صاف ستھرا تھا اور اس کی چادر پر بھی کوئی شکن نہیں تھی لیکن مارتھا کا بستر افراتفری کا شکار لگ رہا تھا۔ اس کی چادر پھٹی ہوئی اور گدا کٹا ہوا تھا۔ اس کا کچھ کپڑا زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اسی طرح تکیہ بھی کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔

ایلری دم بخود کھڑا بستر کو دیکھ رہا تھا پھر اس نے کمرے کا چکر لگا کر الماریاں دیکھیں۔ دروازے کھول کر باہر جھانکا اور انہیں دوبارہ بند کر دیا۔ مس کرینی بھی اس کی تقلید کر رہی تھی۔ ایلری نے لیونگ روم، کچن اور باتھ روم بھی دیکھ لیا لیکن اسے اپارٹمنٹ میں کوئی نظر نہیں آیا اور مارتھا کے بیڈ کے علاوہ بظاہر کوئی خلل نہیں تھا۔ لیکن وہ جگہ بڑی دہشت ناک لگ رہی تھی۔ جیسے وہاں کوئی پُرتشدد کارروائی ہوئی ہو۔ بستر کے نیچے ایک ٹرے پڑی ہوئی تھی جس میں کھانے کے برتن، کٹلری اور بچا ہوا کھانا رکھا ہوا تھا۔

مس کرینی کپکپاتے ہوئے بولی۔ ”مس مارتھا اور اس کی بہن کہاں ہیں اور وہ کون تھا جس نے دروازے کے ساتھ رکاوٹ کھڑی کر دی تھی؟“

”اس کے علاوہ ایک اور قابلِ غور نکتہ بھی ہے۔“ ایلری بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ”وہ سات بلّے کہاں ہیں؟“

”شاید وہ کھڑکی سے باہر کود گئے ہوں جب وہ آدمی......“ مس کرینی نے کہا۔

”شاید، لیکن ہم نہیں جانتے کہ وہ مرد تھا یا عورت......“ ایلری نے کہا۔ ”اگر وہ بلّے......“ وہ کہتے کہتے رک گیا اور چلاتے ہوئے بولا۔ ”کون ہے؟“

”یہ میں ہوں۔“ ایک سہمی ہوئی آواز آئی اور مسز پوٹر ڈیوڑھی میں نمودار ہوئی۔ اس کی آنکھوں سے خوف اور تجسس جھلک رہا تھا۔ ”وہ کہاں ہیں؟“

”وہ چلی گئیں۔“ ایلری نے اس عورت کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”تم یقین سے کہہ سکتی ہو کہ تم نے آج ان دونوں بہنوں کو نہیں دیکھا؟“

”آج ہی نہیں بلکہ کل بھی۔“

”اس علاقے میں گزشتہ دو دنوں کے دوران کوئی ایمبولینس بھی نہیں آئی؟“

مسز پوٹر کا چہرہ سفید پڑ گیا وہ بولی۔ ”میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ وہ کیسے باہر جا سکتی ہے۔ اس سے تو ایک قدم بھی نہیں چلا جاتا۔ اگر اسے کہیں لے جایا جاتا تو کم از کم چوکیدار ضرور دیکھتا۔ میں نے ابھی ابھی اس سے پوچھا ہے لیکن اس نے ان دونوں بہنوں میں سے کسی کو عمارت سے

باہر جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔"

"کیا یہ ممکن ہے کہ تمہارے شوہر نے اُن میں سے کسی ایک یا دونوں کو گزشتہ دو دنوں کے دوران دیکھا ہو؟"

"نہیں، اس نے بھی انہیں دو دن پہلے دیکھا تھا۔ وہ آمدنی میں اضافہ کرنے کے لیے لوگوں کے چھوٹے موٹے کام کرتا رہتا ہے۔ مس مارتھا اپنے اپارٹمنٹ میں کچھ لکڑی اور سجاوٹ کا کام کروانا چاہتی تھی لیکن مالک مکان نے اس کے مطالبے پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اس نے ہیری سے کہا کہ اگر وہ یہ کام کردے تو اس کا مناسب معاوضہ ادا کرے گی۔ چنانچہ وہ فارغ وقت یعنی سہ پہر اور رات میں اس کا کام کررہا تھا اور اس کا بیشتر حصہ ختم ہو چکا تھا۔ اس لیے اس نے دو روز قبل مس مارتھا کو بل دے دیا تھا۔"

وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی۔ "مجھے ابھی ابھی یہ خیال آیا کہ اگر مس مارتھا کے ساتھ کچھ ہو گیا تو ہمیں معاوضے کی رقم نہیں ملے گی۔"

"ہاں۔" ایلری بے صبری سے بولا۔ "کیا اس مکان میں چوہے ہیں؟"

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی۔ ڈیوڑھی میں کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کوئی دروازہ کھول رہا تھا۔

"اندر آجاؤ۔" ایلری نے کہا اور آگے کی جانب بڑھا لیکن ایک اجنبی چہرے کو آتا دیکھ کر رک گیا۔

"معافی چاہتا ہوں۔" نووارد نے ایلری اور دونوں خواتین کو دیکھ کر گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ "شاید میں غلط جگہ آگیا ہوں۔ کیا مس مارتھا یہیں رہتی ہے؟"

وہ ایک طویل قامت دبلا پتلا نوجوان شخص تھا۔ اس نے پرانے فیشن کا بوسیدہ سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا دستی بیگ تھا۔

"ہاں، یہیں رہتی ہے۔" ایلری نے دوستانہ مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے کہا۔ "اندر آجاؤ، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم کون ہو؟"

نوجوان نے پلکیں جھپکائیں اور بولا۔ "لیکن آنٹی مارتھا کہاں ہیں؟ میں ایلیس مارٹن جونیئر ہوں۔ کیا وہ موجود نہیں ہیں؟"

"تم نے کہا آنٹی مارتھا، تمہارا اس سے کیا رشتہ ہے؟"

"میں اُن کا بھانجا ہوں اور ایک دوسرے شہر البانی سے آیا ہوں، جہاں..."

ایلری بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "تمہاری آمد غیر متوقع لگتی ہے، مسٹر مارٹن۔"

نوجوان نے دوبارہ پلکیں جھپکائیں۔ اس نے ابھی تک ہاتھ میں بیگ پکڑا ہوا تھا پھر اس نے وہ فرش پر رکھ دیا اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک مڑا تڑا کاغذ نکالا۔ "یہ خط مجھے چند روز قبل ہی ملا تھا۔ میں پہلے آجاتا لیکن ڈیڈی کہیں چلے گئے تھے۔ میں اسے سمجھ نہیں سکا۔"

ایلری نے اس کے ہاتھ سے خط لے لیا۔ یہ ایک عام سا بھورے رنگ کا کاغذ تھا اور اس پر پنسل سے شکستہ تحریر درج تھی۔ "پیارے ایلیس کئی سالوں سے تمہاری کوئی خبر نہیں ملی لیکن اب مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ تم میرے واحد خونی رشتے دار ہو جس سے میں اپنے دل کی بات کہہ سکتی ہوں۔ میں شدید خطرے سے دوچار ہوں اور تمہیں اپنی معذور، بے یارو مددگار آنٹی کی مدد کرنا ہوگی۔ تم فوراً آجاؤ۔ اپنے باپ یا کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ براہِ کرم مجھے مایوس نہ کرنا۔ پلیز میری مدد کرو۔ تمہاری چاہنے والی آنٹی مارتھا۔"

"یہ غیر معمولی خط ہے۔" ایلری نے کہا۔ "اور دباؤ کے تحت لکھا گیا ہے۔ کسی کو بھی، کسی کو اس کے بارے میں مت بتانا۔" پھر وہ مارٹن سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "مجھے اندیشہ ہے کہ تمہیں آنے میں دیر ہوگئی۔"

مارٹن کے چہرے کا رنگ سفید پڑ گیا۔ وہ پریشان ہوتے ہوئے بولا۔ "میں اس کی وجہ بتا سکتا ہوں۔ میں تو فوراً ہی آنا چاہ رہا تھا لیکن ڈیڈی اچانک ہی کہیں چلے گئے اور مجھے ان کی واپسی کا انتظار کرنا پڑا۔"

"یہ تمہاری آنٹی کی تحریر ہے؟"

"ہاں۔"

"تم اس کے بھانجے ہو۔ گویا تمہارے باپ سے مارتھا کا کوئی رشتہ نہیں؟"

"نہیں، میں آنٹی کی بہن کا بیٹا ہوں۔ خدا اُن کی حفاظت کرے۔" پھر وہ کرسی کا سہارا لیتے ہوئے بولا۔ "کیا آنٹی مارتھا کا انتقال ہوگیا ہے اور آنٹی سارہ کہاں ہیں؟"

"وہ دونوں جا چکی ہیں۔" ایلری نے کہا۔ "میں غیر سرکاری طور پر اس معاملے کی تحقیقات کررہا ہوں۔ تم اپنی دونوں خالاؤں کے بارے میں جو کچھ جانتے ہو، وہ بتا دو۔"

"میں کچھ زیادہ نہیں جانتا۔" مارٹن منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "گزشتہ پندرہ سال سے انہیں نہیں

دیکھا۔ اس وقت میں بچہ تھا۔ اس دوران صرف ایک مرتبہ آنٹی سارہ اور دو مرتبہ آنٹی مارتھا سے بات ہوئی۔ مجھے آنٹی سارہ کے خط سے معلوم ہوا کہ فالج کے حملے کے بعد وہ کچھ عجیب ہوگئی تھیں۔ ان کے پاس کچھ دولت تھی جو نانا ان کے لیے چھوڑ گئے تھے۔ آنٹی سارہ کا کہنا تھا کہ وہ ان پیسوں کو انتہائی کنجوسی سے خرچ کررہی تھیں۔ آنٹی سارہ کے پاس کچھ نہیں تھا۔ وہ آنٹی مارتھا کے ساتھ رہنے اور ان کا خیال رکھنے پر مجبور تھیں۔ آنٹی مارتھا کو بینکوں پر بھی بھروسا نہیں تھا اور انہوں نے یہ دولت کہیں چھپا کر رکھی ہوئی تھی۔ آنٹی سارہ کو اس بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ آنٹی مارتھا اتنی کنجوس تھیں کہ انہوں نے فالج کے بعد اپنا علاج بھی نہیں کروایا۔ دونوں خالاؤں میں کبھی نہیں بنی۔ وہ دونوں ہمیشہ لڑتی رہتی تھیں۔ آنٹی سارہ نے مجھے خط لکھا کہ مارتھا آنٹی ہمیشہ ان پر پیسے چوری کرنے کی کوشش کا الزام لگاتی رہتی ہیں اور وہ نہیں جانتیں کہ انہیں کس طرح سمجھائیں۔ بس میں ان دونوں کے بارے میں اتنا ہی جانتا ہوں۔"

"بے چاری عورتیں۔" مس کریبی نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"مسٹر مارٹن، یہ بتاؤ۔" ایلری نے کہا۔ "کیا یہ سچ ہے کہ تمہاری آنٹی مارتھا بلیوں سے نفرت کرتی تھی؟"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟ ہاں، انہیں بلیوں سے نفرت ہے۔ آنٹی سارہ نے یہ بات مجھے کئی دفعہ لکھی۔ اس سے انہیں بہت تکلیف ہوتی تھی کیونکہ وہ بلیوں کی اتنی دیوانی ہیں کہ بچوں کی طرح انہیں پیار کرتی ہیں اور یہ بات آنٹی مارتھا کو پسند نہیں تھی اور اسی پر دونوں کی لڑائی ہوتی رہتی تھی۔"

"مجھے اپنی بات کہنے میں دشواری پیش آرہی ہے۔" ایلری بولا۔ "بہرحال مسٹر مارٹن! ہمیں کوئی ایسا ثبوت نہیں ملا جس سے معلوم ہوتا کہ تمہاری خالائیں چھٹیوں پر یا کسی سے ملنے گئی ہیں۔" پھر اچانک ہی اس کی آنکھوں میں ایک چمک ابھری۔ "تم کسی قریبی ہوٹل میں قیام کیوں نہیں کرلیتے۔ میں تمہیں ان کی تلاش کے سلسلے میں ہونے والی پیش رفت سے مطلع کرتا رہوں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک کاغذ پر ہوٹل کا نام اور پتا لکھا اور اسے مارٹن کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے بولا۔ "پریشان مت ہونا۔ میں تم سے رابطے میں رہوں گا۔"

اس کے جانے کے بعد ایلری باتھ روم کی طرف بھاگا۔ مس کریبی بھی اس کے پیچھے گئی۔ "یہ کیا ہے؟" اس نے ایلری کو تیزی سے کہتے ہوئے سنا۔ "مسز پوٹر، باہر آؤ۔"

"اب کیا ہوا؟" مس کریبی نے چلاتے ہوئے کہا اور اس کے پیچھے پیچھے باتھ روم کی طرف لپکی۔ مسز پوٹر کی آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا اور وہ منہ کھولے ٹب کی جانب دیکھ رہی تھی پھر اس نے کچھ ناقابل فہم آوازیں نکالیں۔ آنکھیں اس طرح گھمائیں جیسے خبردار کرنا چاہ رہی ہو پھر تیزی سے اپارٹمنٹ سے باہر چلی گئی۔

"اوہ خدا.....!" مسز کریبی اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ "یہ اتنی خوف زدہ کیوں لگ رہی ہے؟"

"جب میں پہلے یہاں آیا تو اسے نہیں دیکھا تھا۔" ایلری نے ٹب پر جھکتے ہوئے کہا۔ اب وہ سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ بلکہ دونوں ہی خاموش تھے اور ان کے سامنے ایک لاش پڑی ہوئی تھی۔ وہ ایک سیاہ بلا تھا جو خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ اس کا سر کچلا ہوا تھا اور جسم کئی ٹکڑوں میں ٹوٹ گیا تھا۔ اس کے خون کے چھینٹے ٹب کی سفید دیواروں پر بھی لگے ہوئے تھے۔ اسے ایک بھاری دستے والے ہاتھ برش سے مارا گیا تھا جو اس کے برابر میں ہی پڑا ہوا تھا۔

"اس طرح سات میں سے ایک بلے کے غائب ہونے کا معما تو حل ہوگیا۔" ایلری نے اسے سیدھا کرتے ہوئے کہا۔ "اسے مرے ہوئے ایک دن سے زائد نہیں ہوا۔ مس کریبی، ہم ایک دردناک معاملے میں مصروف ہو گئے ہیں۔"

مس کریبی چلاتے ہوئے بولی۔ "جس کسی نے بھی اس بیدردی سے قتل کیا ہے۔ وہ کوئی عفریت ہی ہوسکتا ہے۔" اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ وہ بے اختیار بولی۔ "یہ اسی وحشت زدہ بڑھیا کی کارستانی ہے۔"

"مت بھولو۔" ایلری ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔ "وہ چل نہیں سکتی۔"

مس کریبی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔ ایلری نے کچھ دیر توقف کرنے کے بعد اپنی جیب سے ایک کٹ نکالی اور بولا۔ "اب یہ مزید حیران کن ہوتا جارہا ہے۔ کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ میں نے یہاں کیا دیکھا ہے؟"

وہ بیڈروم میں واپس آئے اور بیڈ ٹرے پر جھک گئے۔ جسے ایلری نے نرس سے اٹھا کر دونوں بہنوں کے بستروں کے درمیان والی میز پر رکھ دیا تھا۔ مس کریبی کو یاد آیا کہ اس سے پہلے وہ جب بھی یہاں آئی تو اس نے ہمیشہ یہ ٹرے مس مارتھا کے بیڈ یا برابر والی میز پر دیکھی کیونکہ جب سے سارہ کے ساتھ اس کے اختلافات ہوئے تھے۔

اس نے اکیلے ہی کھانا شروع کر دیا تھا۔

"میں نے تمہیں اس ٹرے پر کوئی پاؤڈر چھڑکتے دیکھا تھا۔"

"میں انگلیوں کے نشانات تلاش کر رہا تھا۔" ایلری نے ٹرے میں بے ترتیب پڑے ہوئے چھری کانٹوں اور چمچوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "کبھی کبھی میری کٹ ان معاملات میں بڑی کارآمد ہوتی ہے۔ تم نے مجھے ان چیزوں کو ٹیسٹ کرتے ہوئے دیکھا اور کہہ سکتی ہو کہ مس مارتھا نے آخری بار کھانے کے دوران یہ سامان استعمال کیا ہوگا۔"

"بالکل۔" مس کرینی نے کہا۔ "تم دیکھ سکتے ہو کہ کچھ کھانا اب بھی چھری کانٹے پر لگا ہوا ہے۔"

"درست، ان چھری کانٹوں اور چمچوں کے دستوں پر کوئی نقش و نگار نہیں بنے ہوئے بلکہ یہ بالکل سادہ ہیں اور ان پر انگلیوں کے نشانات موجود ہونے چاہئیں لیکن ایسا نہیں ہے۔" وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا مسٹر کوئن۔" وہ حیرت سے بولی۔ "یہ کیسے ممکن ہے؟"

"میرا مطلب ہے کہ اس کٹلری پر سے انگلیوں کے نشانات صاف کر دیے گئے ہیں۔" وہ ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ "بہرحال یہ مس مارتھا کی بیڈ ٹرے اور اس میں رکھا ہوا کھانا، برتن اور کٹلری سب اسی کی ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ وہ اپنے بستر پر ہی کھانا کھاتی ہے لیکن اگر صرف وہی یہ چیزیں استعمال کرتی ہے تو ان پر سے انگلیوں کے نشانات کس نے صاف کیے۔ کیا خود اس نے؟ لیکن وہ ایسا کیوں کرے گی یا پھر کوئی اور...... لیکن وہ مس مارتھا کی انگلیوں کے نشانات کیوں صاف کرے گا۔ اس کی انگلیوں کے نشانات لازماً ان چیزوں پر ہونے چاہئیں اور اگر کسی اور نے یہ کٹلری استعمال کی ہے تو اس کی انگلیوں کے نشانات بھی ان پر ہونے چاہئیں لیکن وہ بھی نہیں ہیں۔"

وہ بولتے بولتے رک گیا پھر مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

"کیا تم میرا ایک کام کر سکتی ہو؟"

مس کرینی نے اثبات میں سر ہلایا تو ایلری نے ٹرے میں بچا ہوا کھانا ایک تھیلی میں ڈالا اور بولا۔ "یہ سیمپل ڈاکٹر سیموئل پروٹی کے پاس لے جاؤ۔ میں تمہیں اس کا پتا دے رہا ہوں۔ اس سے کہنا کہ اس کا تجزیہ کرے۔ اس دوران تمہیں وہیں رک کر رپورٹ کا انتظار کرنا ہوگا۔ وہ لے کر واپس آجاؤ۔ کوشش کرنا کہ تمہیں جہاں آتے ہوئے کوئی نہ دیکھے۔"

"یہ کھانا؟" وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ "کیا تم سوچ رہے ہو کہ اس میں......"

ایلری نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "سوچنے کا وقت گزر گیا مس کرینی۔ اب رپورٹ آنے کے بعد ہی کوئی بات ہو سکے گی۔"

جب مس کرینی چلی گئی تو اس نے ایک بار پھر گرد و پیش پر نظر ڈالی۔ یہاں تک کہ کچھ خالی کپ بورڈز بھی دیکھ ڈالے پھر اس نے بیرونی دروازہ مقفل کیا۔ مسز پوٹر کی دی ہوئی ماسٹر کی جیب میں ڈالی اور لفٹ کے ذریعے گراؤنڈ فلور پر آنے کے بعد پوٹر کے اپارٹمنٹ کی گھنٹی بجائی۔ ایک پستہ قد بھاری بھرکم شخص نے دروازہ کھولا۔ اس کا ہیٹ پیچھے کی جانب سر پر رکھا ہوا تھا۔ ایلری نے اس کے عقب میں مسز پوٹر کی آواز سنی۔

"ہیری، یہ پولیس والا ہے۔ اس سے بات مت کرنا۔"

"اوہ، تو تم وہ سراغ رساں ہو۔" بھاری بھرکم شخص غراتے ہوئے بولا۔ "میں اس عمارت کا سپرنٹنڈنٹ ہوں ہیری پوٹر۔ ابھی فیکٹری سے واپس آیا تو میری بیوی نے بتایا کہ مس مارتھا کے فلیٹ میں کچھ گڑبڑ ہے۔ خدا کے واسطے کچھ مجھے بھی بتاؤ۔"

"اس دہشت کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی پوٹر۔" ایلری نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "تمہیں گھر پر دیکھ کر خوشی ہوئی۔ مجھے ان معلومات کی اشد ضرورت ہے جو تم ممکنہ طور پر دے سکتے ہو۔ کیا تم دونوں میں سے کسی نے حال ہی میں اس جگہ مردہ بلیاں دیکھی ہیں؟"

پوٹر کے جبڑے بھنچ گئے اور اس کی بیوی حیرت سے غرغرانے لگی۔ پوٹر بولا۔ "ہاں، ہم نے دیکھا ہے۔ ان میں سے ایک تو ابھی میری بیوی فائیو سی میں دیکھ کر آئی ہے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ یہ دو بوڑھی عورتیں......"

"تم نے وہ مردہ بلیاں کہاں دیکھیں اور وہ کتنی تھیں؟" ایلری نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"پیچھے تہ خانے میں جو جلانے کی بھٹی ہے۔"

ایلری نے اپنی ران پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "بالکل، میں بھی کتنا بے وقوف ہوں۔ اب میں سمجھ گیا۔ وہاں چھ بلیاں ہونی چاہئیں۔"

مسز پوٹر حیران ہوتے ہوئے بولی۔ "تم یہ کیسے جانتے ہو؟"

"بھٹی۔" ایلری بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "ہڈیاں اور شاید کھوپڑی بھی۔"

"بالکل ٹھیک۔" پوٹر جلاتے ہوئے بولا۔ "میں نے خود انہیں دیکھا ہے۔ ہر روز صبح بھٹی سے راکھ نکالی جاتی ہے۔ چھ بلیوں کی کھوپڑیاں اور تباہ شدہ چھوٹی چھوٹی ہڈیاں۔ میں نے سبھی کرایے داروں سے پوچھ لیا کہ کس نے یہ مردہ بلیاں وہاں پھینکی تھیں لیکن کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ یہ بلیاں ایک ہی وقت میں وہاں نہیں پھینکی گئی تھیں بلکہ یہ سلسلہ چار پانچ ہفتوں سے چل رہا تھا۔ تقریباً ہر ہفتے ایک مردہ بلی وہاں ملتی تھی۔"

"تمہیں یقین ہے کہ چھ بلیاں ہی دیکھی تھیں؟"

"ہاں۔"

"اور تمہیں کوئی مشتبہ بات نظر نہیں آئی؟"

"نہیں۔"

"شکریہ۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں مزید تکلیف نہیں دوں گا۔ تم بھی سب کچھ بھول جاؤ۔" یہ کہہ کر ایلری نے اس کے ہاتھ پر ایک نوٹ رکھا اور ٹہلتا ہوا لابی سے باہر چلا گیا۔ لیکن وہ زیادہ دور نہیں گیا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ پوٹر اور اس کی بیوی اپنے اپارٹمنٹ میں جا چکے ہیں تو وہ بھی چپکے سے لفٹ کے ذریعے دوبارہ اپارٹمنٹ فائیو سی میں آ گیا۔

جب مس کرینی واپس آئی تو اپارٹمنٹ کا دروازہ مقفل تھا۔ اسے اندر سے ایلری کے بولنے کی آواز سنائی دی اور چند لمحوں بعد یوں لگا جیسے کسی نے ٹیلی فون کا ریسیور کریڈل پر رکھا ہو۔ مس کرینی نے گھنٹی بجائی تو وہ فوراً ہی دروازے پر آ گیا اور اسے اندر کھینچ کر آہستگی سے دروازہ بند کر دیا اور اسے لے کر بیڈ روم میں آ گیا۔ مس کرینی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے خوب صورت چہرے پر ہلکی سی مایوسی چھائی ہوئی تھی۔

"لگتا ہے جیسے محاذ سے واپس آئی ہو۔" وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ "بہر حال کیا خبر ہے؟"

"مجھے افسوس ہے کہ تمہاری زیادہ مدد نہ کر سکی۔"

"ڈاکٹر پروٹی نے کیا کہا؟"

"کوئی حوصلہ افزا بات نہیں کی۔ میں اسے پسند ضرور کرتی ہوں لیکن یہ نہیں کہہ سکتی کہ اس کی رپورٹوں کی بھی شوقین ہوں۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کھانے میں کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔ البتہ رکھے رکھے سڑ گیا ہے ورنہ یہ بالکل خالص ہے۔"

"یہ اتنی بری بات بھی نہیں ہے۔" ایلری نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ "یہ ایک بہترین خبر ہے جو تم میرے لیے لا سکتی تھیں۔"

"بہترین خبر۔" وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

ایلری نے ایک کرسی گھسیٹی اور اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔ "بائی داوے۔ کسی نے تمہیں اپارٹمنٹ میں داخل ہوتے تو نہیں دیکھا؟"

"میں تہ خانے میں گھس گئی تھی۔ وہاں سے لفٹ کے ذریعے اوپر آئی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ کسی نے نہیں دیکھا لیکن میں نہیں سمجھتی......"

"قابلِ تعریف کارکردگی۔" ایلری مسکراتے ہوئے بولا۔ "مجھے یقین ہے کہ ہمارے پاس تفصیل سے بات کرنے کے لیے کچھ وقت ہے۔ میں نے یہاں اکیلے بیٹھ کر تقریباً ایک گھنٹا سوچا اور اس سے کافی مطمئن ہوں۔" پھر وہ ایک سگریٹ جلاتے ہوئے بولا۔ "تم کافی سمجھ دار ہو اور عورتوں کی سمجھ کا بھی تمہیں اندازہ ہے۔ یہ بتاؤ کہ ایک دولت مند بوڑھی عورت جو پہلے ہی تقریباً مکمل طور پر مفلوج ہے۔ پانچ ہفتوں کے دوران چھ بلیاں کیوں خریدے گی؟"

مس کرینی کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ "میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ مجھے اس کی وجہ معلوم نہیں۔ یہ میرے لیے ایک معما ہے۔"

"یہ اتنا حیران کن بھی نہیں ہے، جتنا نظر آ رہا ہے۔ ٹھیک ہے، میں تمہیں ایک آئیڈیا دیتا ہوں۔ مثال کے طور پر مختصر عرصہ میں ایک معذور عورت کی جانب سے اتنی زیادہ بلیوں کی خریداری سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس کا تعلق زندہ جانداروں کی چیر پھاڑ سے ہے لیکن ان دونوں بہنوں نے کسی سائنس داں کی طرح ایسا کوئی عمل نہیں کیا لہٰذا یہ بھی خارج از امکان ہے۔"

مس کرینی پُرجوش انداز میں بولی۔ "اب میں تمہارا مطلب سمجھ گئی۔ مس مارتھا یہ بلیاں اپنے پاس رکھنے کے لیے نہیں خرید رہی تھی کیونکہ وہ تو بلیوں سے نفرت کرتی ہے۔"

"بالکل ٹھیک۔ اب ہم دوسری وجہ تلاش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر چوہوں کا خاتمہ کرنا لیکن مسز پوٹر کی رپورٹ کے مطابق اس عمارت میں چوہے نہیں ہیں۔ ایک اور وجہ نر اور مادہ کا ملاپ ہو سکتی ہے۔ سارہ این کی بلی زخمی ہے اور مارتھا نے بھی صرف بلے ہی خریدے۔ اس کے علاوہ

دونوں بہنوں میں لڑائی رہتی تھی۔ اس لیے وہ کیوں سارہ کے بِلّے کے لیے کسی بلی کا انتخاب کرتی۔"
"ممکن ہے کہ اس نے یہ بلیاں کسی کو تحفہ میں دینے کے لیے خریدی ہوں۔" مس کربی نے خیال ظاہر کیا۔
"ممکن تو ہے لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا۔" ایلری نے رکھائی سے کہا۔ "جبکہ تم حقائق جانتی ہو۔ پوٹر کا کہنا ہے کہ اس نے ان بلیوں کے ڈھانچے بھٹی میں پڑے ہوئے دیکھے جبکہ ایک بلا باتھ ٹب میں مردہ پایا گیا۔" مس کربی خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ایلری نے کہا۔ "ہم نے تقریباً سبھی قرین قیاس باتوں پر غور کرلیا، اس کے علاوہ تمہاری سمجھ میں کوئی اور بات آتی ہے؟"
"ایک اور وجہ بھی ہوسکتی ہے جو میرے خیال میں زیادہ معقول ہے۔" مسز کربی اچانک بولی۔ "نفرت، مارتھا کو بلیوں سے نفرت ہے۔ لہٰذا جب سے وہ مخبوط الحواس ہوئی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ صرف اس لیے بلیاں خریدتی تھی کہ انہیں مار کر خوشی حاصل کرسکے۔"
"لیکن سبھی ایک جیسی جسامت کے سیاہ رنگ اور سبز آنکھوں والے بلے ہی کیوں؟" ایلری نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "اس کے جنون کی کوئی غیر معمولی وجہ ہے کیونکہ وہ تو بلیوں سے اس وقت سے نفرت کررہی ہے جب سارہ این نے تمہارے یہاں سے وہ خاص بلا خریدا تھا۔ نہیں، اب صرف ایک ہی وجہ باقی رہ جاتی ہے، جو میں سوچ رہا ہوں مس کربی۔"
وہ اپنی کرسی سے اٹھا اور فرش پر ٹہلتے ہوئے بولا۔ "یہ صرف واحد امکان نہیں ہے بلکہ اس کی تصدیق کئی باتوں سے ہوتی ہے اور وہ وجہ ہے تحفظ۔"
"تحفظ۔" مس کربی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ بولی۔ "یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ لوگ اپنی حفاظت کے لیے کتے خریدتے ہیں۔ بلیاں نہیں۔"
"میں اس قسم کی حفاظت کی بات نہیں کررہا۔" ایلری نے جلدی سے کہا۔ "مارتھا خوف زدہ تھی۔ اسے ڈر تھا کہ پیسوں کی خاطر وہ قتل نہ کردی جائے۔ اس خط سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے جو اس نے اپنے بھانجے مارٹن کو لکھا تھا جس سے اس کی کنجوسی، بینکوں پر عدم اعتماد اور اپنی ہی بہن سے ناپسندیدگی ظاہر ہورہی تھی۔ اس صورت حال میں ایک بلی اسے کس طرح قاتل سے بچاسکتی تھی؟"
"زہر؟" مس کربی چلّاتے ہوئے بولی۔
"بالکل۔ ان بلیوں کو استعمال کیا گیا اور اس کی تصدیق کئی باتوں سے ہوتی ہے۔ مارتھا کچھ عرصے سے تنہا کھانا کھارہی تھی۔ اس دوران وہ کوئی بھی خفیہ حرکت کرسکتی تھی۔ پھر اس نے مختصر عرصے کے دوران پانچ مرتبہ بلیوں کی خریداری کا آرڈر دیا، کیوں؟ اس لیے کہ ہر بار اس نے تم سے خریدی ہوئی بلی کو اپنا کھانا چکھایا اور وہ مرگئی۔ کیونکہ جو کھانا مارتھا کو دیا گیا۔ اس میں زہر ملا ہوا تھا چنانچہ اسے بار بار بلی منگوانا پڑی اور اس کی تصدیق یوں بھی ہوتی ہے کہ ان چھ بلیوں کے ڈھانچے بھٹی میں پڑے ہوئے ہیں۔"
"لیکن وہ تو چل بھی نہیں سکتی۔" مس کربی نے اعتراض کیا۔ "پھر وہ کس طرح ان مردہ بلیوں کو وہاں پھینک سکتی تھی؟"
"میرا خیال ہے کہ یہ کام مسز پوٹر نے اس کے لیے کیا ہوگا۔ تم یاد کرو کہ مسز پوٹر نے کیا کہا تھا کہ سارہ این کی غیر موجودگی میں مس مارتھا اکثر اسے کوڑا کرکٹ پھینکنے کے لیے بلایا کرتی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوڑا کرکٹ سے مراد مردہ بلیاں ہی ہیں۔"
"لیکن وہ سب ایک ہی جسامت کے سبز آنکھوں والے سیاہ بلے ہی کیوں تھے؟"
"ظاہر ہے کہ سارہ این کو بے وقوف بنانے کے لیے کیونکہ اس کے پاس اسی جسامت کا سبز آنکھوں والا بلا تھا۔ اسی لیے وہ اس جیسے بلے خریدتی رہی تاکہ سارہ این کو شک نہ ہو کہ اس کا بلا مرچکا ہے کیونکہ پہلی مرتبہ وہی زہر آلود خوراک کا نشانہ بنا تھا جب وہ مرگیا تو مارتھا نے سارہ کے علم میں لائے بغیر اس کی جگہ تم سے دوسرا بلا خرید لیا۔"
"مارتھا کو یہ شبہ کیسے ہوا کہ اسے زہر دیا جاسکتا ہے؟"
"یہ محض اتفاق ہوسکتا ہے۔ ویسے بھی اس طرح کی نیم پاگل بوڑھی عورتیں بہت زیادہ وہمی ہوتی ہیں۔ ممکن ہے کہ نفسیاتی طور پر اس کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی ہو کہ کوئی دولت کی خاطر اس کی جان لے سکتا ہے۔"
"لیکن اگر وہ بلیوں کے بارے میں سارہ این کو بے وقوف بنارہی تھی۔" مس کربی نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "تو کیا اس کا شبہ...؟"
"بالکل ٹھیک۔ اسے اپنی بہن پر شک تھا کہ وہ اسے زہر دینے کی کوشش کررہی ہے۔"
مس کربی اپنا ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔ "میں نے زندگی میں پہلی بار ایسی خوفناک بات سنی ہے۔ دو بوڑھی عورتیں جو آپس میں سگی بہنیں بھی ہیں اور ان کا دنیا میں کوئی

نہیں اور وہ ایک دوسرے پر ہی انحصار کرتی ہیں۔ ایک معذور ہے تو دوسری مفلس۔ جو معذور ہے وہ تو حملہ ہونے پر اپنا بچاؤ بھی نہیں کر سکتی۔'' اس نے ایک جھرجھری لی اور بولی۔ ''ان بے چاری عورتوں کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا ہے مسٹر کوئن؟''

''مارتھا غائب ہے۔ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ اسے کم از کم چھ مرتبہ زہر دینے کی کوشش کی گئی جو ناکام رہی۔ یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ ساتویں کوشش بھی ہوئی ہوگی اور کیونکہ مارتھا پُراسرار طور پر غائب ہو گئی ہے۔ اس لیے ساتویں کوشش کامیاب رہی۔''

''لیکن تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ مر چکی ہے؟''

''پھر وہ کہاں ہے؟'' ایلری نے روکھے پن سے کہا۔ ''صرف ایک ہی امکان ہے کہ وہ کہیں چلی گئی لیکن وہ معذور ہے۔ چل نہیں سکتی۔ کسی کی مدد کے بغیر بستر سے نہیں اتر سکتی۔ اس کی مدد کون کر سکتا ہے۔ صرف سارہ این جس پر وہ پہلے ہی زہر دینے کا شبہ کر رہی تھی۔ اس نے اپنے بھانجے کو جو خط لکھا۔ اس سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سارہ پر بھروسا نہیں کرتی۔ لہٰذا اس کی گمشدگی سے یہی مطلب لیا جا سکتا ہے کہ وہ مر چکی ہے۔ اب آگے بڑھتے ہیں۔ مارتھا جانتی تھی کہ اسے کھانے میں زہر دینے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اس کے لیے وہ حفاظتی تدبیریں بھی اختیار کر رہی تھی پھر زہر دینے والا اپنی کوشش میں کیسے کامیاب ہو گیا۔ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ مارتھا نے ساتویں بلی کو بھی وہ کھانا چکھایا ہوگا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ڈاکٹر پروڈی کی رپورٹ کے مطابق وہ کھانا زہر آلود نہیں تھا اور وہ بلا اس کے کھانے سے نہیں مرا بلکہ اسے کسی چیز سے ضرب لگا کر مارا گیا لیکن اگر وہ بلا زہر آلود کھانے سے نہیں مرا، نہ ہی مارتھا تو پھر اس کا ایک ہی جواب ہے کہ مارتھا کھانے سے نہیں بلکہ کھانا کھانے سے مر گئی۔''

''میں کچھ سمجھی نہیں۔'' مس کریبی نے کہا۔

''کٹلری!'' ایلری بے اختیار چلاتے ہوئے بولا۔

''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ چھری کانٹوں اور چمچوں کو مارتھا کے علاوہ کسی اور نے بھی استعمال کیا ہے۔ کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ زہر دینے والے نے ساتویں کوشش میں کھانے میں زہر ملانے کے بجائے کٹلری کو زہر آلود کر دیا۔ مثال کے طور پر اگر کانٹے پر کوئی بے رنگ اور بے بو زہر لگا دیا گیا تو مارتھا کو پتا بھی نہیں چلا ہوگا۔ کوئی بھی بلیوں کو کھلانے کے لیے کٹلری استعمال نہیں کرتا۔ اس لیے بلا کھانے کے بعد بھی زندہ رہا لیکن مارتھا زہر آلود کٹلری استعمال کرنے کے بعد مر گئی۔ لگتا یہی ہے کہ قاتل نے چھ مرتبہ ناکام ہونے کے بعد یہ طریقہ اختیار کیا جو کامیاب رہا۔''

''لیکن اس کی لاش کہاں ہے؟''

ایلری کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ خاموشی سے دروازے کی طرف بڑھنے لگا پھر اس نے مس کریبی کا ہاتھ پکڑا اور اسے کپڑوں کی الماری میں دھکیل کر اس کا دروازہ بند کر دیا۔ الماری میں رکھے ہوئے کپڑوں کی ناگوار بُو سے مس کریبی کا دم گھٹنے لگا اور اس نے اپنا سانس روک لیا۔ اس نے بیرونی دروازے پر رگڑ کی آواز سنی۔ یہ یقیناً قاتل ہی ہوگا لیکن وہ واپس کیوں آ گیا۔ پھر اسے ایک بھرائی ہوئی کرخت آواز سنائی دی۔ جیسے دو آدمی لڑ رہے ہوں۔ مس کریبی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے الماری کے دروازے کو دھکا دیا اور باہر آ گئی۔

ایلری فرش پر پڑا ہوا تھا۔ پھر ایک چاقو والا ہاتھ فضا میں بلند ہوا۔ مس کریبی اپنی جگہ پر گھومی اور اس نے پوری قوت سے لات چلائی۔ کوئی چیز تیزی سے اس سے ٹکرائی اور وہ پیچھے کی جانب گر گئی۔ اس کے نتیجے میں حملہ آور کے ہاتھ سے چاقو گر گیا۔

''مس کریبی..... دروازہ!'' ایلری نے اپنے گھٹنے کو پوری قوت سے دباتے ہوئے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ خود بھی دروازے پر ہونے والی دستک سن چکی تھی۔ چنانچہ لڑکھڑاتے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھی۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اس نے صرف یہ دیکھا کہ نیلی وردی میں ملبوس پولیس والے ان دونوں حریفوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔

''اب سب کچھ ٹھیک ہے۔'' اس کے کانوں میں جیسے بہت دور سے کوئی آواز آئی۔ مس کریبی نے آنکھیں کھولیں تو ایلری کو اپنے اوپر جھکا ہوا پایا۔ وہ بالکل پُرسکون اور ٹھیک ٹھاک لگ رہا تھا۔ اس نے بدحواسی کے عالم میں سر اٹھا کر دیکھا۔ آتش دان، دیوار پر ٹنگی ہوئی تلواریں...... وہ کسی نئی جگہ پر تھی۔

''ڈرنے کی ضرورت نہیں میری۔'' ایلری مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں کسی نے اغوا نہیں کیا بلکہ ہم اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ کھیل ختم ہو گیا اور اب تم میرے اپارٹمنٹ میں آرام کر رہی ہو۔''

''اوہ۔'' مس کریبی بستر سے اٹھتے ہوئے بولی۔

''میں جاننا چاہتی ہوں کہ کیا ہوا تھا۔ تم نے یہ معما کیسے حل کیا۔ کیا تم جانتے تھے کہ وہ واپس آرہا ہے؟''

ایلری کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''اس کا امکان تھا۔ کسی نے مارتھا کو اس کی خفیہ دولت حاصل کرنے کے لیے زہر دیا۔ اس کا قتل یقیناً پرسوں ہوا ہوگا۔ کیونکہ ہمیں دروازے پر دودھ کی دو بوتلیں ملی ہیں۔ کیا قاتل کو اسے مارنے کے بعد پیسے مل گئے پھر وہ کون تھا جس نے سہ پہر میں دروازے کے پیچھے رکاوٹ کھڑی کی اور خود کھڑکی کے راستے فرار ہوگیا۔ اس کا یہی مطلب ہے کہ اسے جرم کرنے کے بعد چھپی ہوئی دولت تلاش کرنے کا وقت نہیں ملا۔ اسی لیے وہ دوبارہ آیا تھا لیکن ہماری اچانک آمد سے وہ گھبرا گیا اور شاید اس بار بھی اسے وہ دولت نہیں ملی۔ اسی لیے میں جانتا تھا کہ وہ ایک بار پھر آئے گا کیونکہ اس نے یہ قتل پیسوں کے لیے ہی کیا تھا لہٰذا جب تم ڈاکٹر پروٹی کے پاس گئی ہوئی تھیں تو میں نے پولیس کو فون کر دیا۔''

''کیا تم جانتے ہو کہ وہ کون تھا؟''

''ہاں، بہت سی باتیں اس جانب اشارہ کرتی ہیں۔ ایسا شخص جو کھانے میں بار بار زہر ملا رہا تھا۔ وہی ہو سکتا ہے جو مارتھا یا اس کی خوراک سے بہت قریب ہو۔ کم از کم اس وقت سے جب یہ کوشش شروع ہوئی یعنی پانچ ہفتے قبل۔ بظاہر اس کی بہن ہی مشتبہ بھی جا سکتی ہے کیونکہ سارہ این کے پاس قتل کرنے کا محرک تھا۔ وہ اپنی بہن سے نفرت کرتی تھی اور ممکنہ طور پر اس کے دل میں لالچ بھی ہو سکتا تھا۔ اس کے پاس اپنی بہن کو قتل کرنے کا موقع تھا کیونکہ وہی ان کے لیے کھانا بناتی تھی لیکن میں نے سارہ کا نام مشتبہ افراد کی فہرست سے انتہائی ٹھوس بنیاد پر خارج کر دیا۔

''اگر اس سوال پر غور کیا جائے کہ ساتویں بلّے کو کس نے اتنی بیدردی سے مارا تو ذہن فوراً مقتول یا قاتل کی طرف جائے گا۔ لیکن وہ مارتھا نہیں ہو سکتی کیونکہ بلّے کو باتھ روم میں مارا گیا جبکہ مارتھا مفلوج ہونے کی وجہ سے چل نہیں سکتی۔ اس کا مطلب ہے کہ قاتل نے ہی بلّے کو مارا ہوگا لیکن اگر سارہ این ہی مارتھا کی قاتل ہے تو کیا وہ بلّے کو ڈنڈے سے مار سکتی ہے۔ وہ جو بلیوں سے پیار کرتی ہے۔ یہ بالکل ناقابلِ یقین ہے لہٰذا سارہ این نے یہ قتل نہیں کیا۔''

''پھر؟'' مس کریئی کا تجسس اور بڑھ گیا۔

''میں جانتا ہوں کہ سارہ این کے ساتھ کیا ہوا؟'' ایلری منہ بگاڑتے ہوئے بولا۔ ''لگتا ہے کہ سارہ کا انجام بھی اس کی بہن اور بلّے جیسا ہی ہوا۔ یقیناً قاتل کا یہی منصوبہ تھا کہ مارتھا کو قتل کر دے اور اس کا الزام سارہ کے سر آ جائے کیونکہ بظاہر وہی مشتبہ بھی جاتی۔ ایسی صورت میں سارہ این کو اپارٹمنٹ میں موجود ہونا چاہیے تھا لیکن وہ غائب ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس نے یہ قتل ہوتے دیکھ لیا تھا اور اسے بھی قاتل نے ٹھکانے لگا دیا تا کہ جرم کا کوئی گواہ باقی نہ رہے ورنہ دوسری صورت میں وہ اسے قتل نہ کرتا۔''

''کیا تمہیں مارتھا کی چھپائی ہوئی دولت کا پتا چل گیا؟''

''ہاں۔ وہ پیسے بڑے بڑے نوٹوں کی شکل میں بائبل کے صفحات کے درمیان رکھے ہوئے تھے جسے وہ ہمیشہ اپنے سرہانے رکھا کرتی تھی۔''

''اور ان کی لاشیں۔۔۔؟'' مس کریئی جھرجھری لیتے ہوئے بولی۔

''یقیناً بھٹی میں پھینک دی گئی ہوں گی۔'' ایلری نے کہا۔ ''اس کے علاوہ کوئی اور ایسی جگہ نہیں جہاں لاشوں کو ٹھکانے لگایا جا سکے۔ آگ میں سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا ہوگا۔ اس کے بعد ہڈیوں کو بہ آسانی وہاں سے ہٹایا جا سکتا ہے۔''

''وہ بدمعاش کون تھا جس نے تم پر حملہ کیا۔ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ یقیناً وہ مسٹر مارٹن کا باپ تو نہیں ہو سکتا۔''

''بالکل نہیں۔ وہ بدمعاش ہی تھا مس کریئی؟''

''اس سے پہلے تم نے مجھے میری کہہ کر بلایا تھا۔'' مس کریئی مسکراتے ہوئے بولی۔

ایلری جلدی سے بولا۔ ''سارہ این اور مارتھا کے علاوہ اس اپارٹمنٹ میں کوئی اور نہیں رہتا تھا۔ تاہم قاتل کوئی ایسا شخص ہے جسے گزشتہ ایک ماہ سے اس معذور عورت کے کھانے تک رسائی تھی اور بظاہر اس پر کسی کو شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ ایسا شخص کون ہو سکتا ہے۔ وہی جو ایک ماہ سے بھی زیادہ عرصے سے سہ پہر سے ڈنر کے وقت تک اپارٹمنٹ میں کام کر رہا تھا۔ وہ شخص جو کیمیکل پلانٹ میں کام کرتا ہے اور اسے زہر کے بارے میں معلومات ہی نہیں بلکہ اس تک رسائی بھی ہے۔ وہ شخص جو بھٹی تک جا سکتا ہے اور اپنے آپ کو کسی خطرے میں ڈالے بغیر ان مقتولوں کی ہڈیوں کو ٹھکانے لگا سکتا ہے۔ وہ کوئی اور نہیں بلکہ عمارت کا سپرنٹنڈنٹ ہیری پوٹر ہے۔''

○○○

سُپرمین

سرور اکرام

اتفاقات حسین ہوتے ہیں... دلفریب بھی اور پُر فریب بھی... ایک اتفاقیہ ملاقات سے شروع ہونے والی دلچسپ کتھا... قدرت نے ان کو یکجا کرنے کے مواقع فراہم کیے تھے... مگر اچانک ہی چاہنے والوں کے درمیان امتحان کی کڑی شرط آگئی...

ہار کے بھی جیت جانے والے متوالوں کا دل گداز ماجرا

دونوں کی ملاقات ریلوے اسٹیشن پر ہوئی تھی۔

سہیل کراچی سے لاہور جارہا تھا اور وہ بھی لاہور جارہی تھی۔ پلیٹ فارم پر آئینہ کے گھر والے اسے الوداع کہنے آئے تھے۔

دنیا بھر کی نصیحتیں کی جارہی تھیں۔ "دیکھو، راستے میں کچھ لے کر مت کھانا۔ نہ جانے کیسی کیسی چیزیں کھلا دیتے ہیں اور ہاں، کوئی اسٹیشن آئے تو ایڈونچر کے شوق میں اتر مت جانا۔ تمہارے پاس پانی کی بوتلیں ہیں۔ ان ہی سے کام

چلاتا...... اور......"

"ہاں، ہاں... میں اب بچی بھی نہیں ہوں۔" آئینہ جھلا کر بولی۔ "میں اپنا خیال رکھ سکتی ہوں۔"

سہیل اس خاندان کے قریب ہی کھڑا ہوا اُن کی باتیں سن رہا تھا۔ اسے لڑکی کی جھلاہٹ پر ہنسی آرہی تھی۔ وہ شاید پہلی بار اکیلے سفر کر رہی تھی۔

"اور ہاں، عالیہ اور فیصل وقت پر اسٹیشن پہنچ جائیں گے۔" اس مرد نے کہا جو شاید اس لڑکی کا باپ تھا۔

سہیل کے خیال کی تصدیق بھی ہوگئی۔ لڑکی نے کہا تھا۔ "ہاں، پاپا، میں نے سب سن لیا ہے جب تک وہ لوگ نہ آجائیں میں اسٹیشن سے باہر نہیں جاؤں گی۔ راستے میں کہیں نہیں اتروں گی۔"

"آئینہ۔" اس عورت نے اسے مخاطب کیا جو شاید اس کی ماں تھی۔

سہیل کو اس کا نام بھی معلوم ہوگیا۔ آئینہ، اچھا نام تھا اور وہ خود بھی آئینے ہی کی طرح صاف شفاف تھی۔ زیادہ سے زیادہ انیس بیس برس کی۔ خوب صورت قد، خوب صورت آنکھیں، خوب صورت چہرہ، ایسی خوب صورتی کے لیے ہر سفر خطرناک ہوتا ہے۔

سہیل نے اپنے دل میں یہ ارادہ کرلیا کہ وہ لاہور تک اچھی طرح اس کی دیکھ بھال اور حفاظت کرتا ہوا چلے گا کہ اس لڑکی کو اس کا احساس نہ ہو۔

ٹرین تیار تھی اور کچھ ہی دیر میں چلنے والی تھی۔

آئینہ کے گھر والوں نے اس کو الوداع کہا۔ سب گلے ملے، پیار کیا۔ اس کے بعد وہ اپنا سوٹ کیس اٹھا کر اپنے کمپارٹمنٹ کی طرف چلی گئی۔ اس کے پاس بس ایک ہی سوٹ کیس تھا۔

سہیل کو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اس لڑکی کا لیڈیز کمپارٹمنٹ اس کے کمپارٹمنٹ کے بالکل ساتھ ہی تھا۔ یعنی وہ اپنے ڈبے سے اتر کر اس لڑکی کو جا کر دیکھ سکتا تھا۔ اپنی موجودگی کا احساس دلائے بغیر۔

سہیل کے لیے یہ سفر انجانا نہیں تھا۔ اسے سال میں... کم از کم چار پانچ بار کراچی سے لاہور ضرور جانا پڑتا تھا۔

وہ ایک بڑی فرم میں ملازم تھا۔ اس فرم کا ایک آفس لاہور میں تھا۔ سہیل کا کام ایسا تھا کہ اسے کچھ دنوں تک لاہور آفس کی بھی دیکھ بھال کرنی ہوتی تھی۔

وہ ایک تنہا انسان تھا۔ اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ اس کے باوجود اس نے اپنی سرگرمیاں بہت مثبت رکھی تھیں۔ باقاعدگی سے ورزش کیا کرتا۔ اس کے علاوہ اس نے مارشل آرٹ کی ٹریننگ بھی لے رکھی تھی۔ مطالعے کا بھی شوقین تھا۔

زندگی کو قریب سے دیکھنا چاہتا تھا اس لیے ریل میں سفر کیا کرتا۔ اس کی فرم اگرچہ اسے بائے ایئر بھیجنا چاہتی تھی لیکن اس کے خیال میں ہوائی جہاز کا سفر ایسا ہی ہے جیسے کمرے میں بیٹھ کر پاکستان کا نقشہ دیکھ کر یہ کہنا شروع کر دیں کہ ہم نے پاکستان کی سیر کرلی۔

جبکہ ریل میں یا بس کے سفر میں زندگی کے مختلف رنگ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اپنی زمین، اپنے کھیتوں، اپنے درختوں اور اپنے لوگوں سے آگاہی ہوتی جاتی ہے۔

کیسے کیسے تجربات ہوتے ہیں۔ بہت کچھ سیکھنے کو مل جاتا ہے۔

☆☆☆

اس پلیٹ فارم کے ایک کونے میں چار آدمی بیٹھے پلاننگ کر رہے تھے۔ یہ چاروں اپنے حلیے ہی سے مشکوک دکھائی دیتے تھے۔ ان میں سے ایک ان کا سرغنہ معلوم ہوتا تھا جبکہ باقی تینوں اس کے ماتحت جیسے تھے۔

"دیکھو، ہمیں حیدرآباد کراس کرنے کے بعد اپنی کارروائی کرنی ہے۔" سرغنہ نے کہا۔ "اس سے پہلے اپنے ڈبے میں رہنا ہے۔"

"ہاں استاد، ایسا ہی ہوگا تم بے فکر رہو۔" ان تینوں میں سے ایک نے کہا۔

"اور ہاں، زیادہ ہاتھ پاؤں مارنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس لیڈیز ڈبے میں داخل ہونا ہے اور جو کچھ ہاتھ لگے اسے نیچے پھینکتے جانا ہے۔ کاچھو اور ملنگی نیچے کھڑے ہوں گے۔ اس کے بعد زنجیر کھینچ کر خود جمپ لگا دینی ہے اور نیچے میں اتر جانا ہے لیکن ایک بات کا سختی سے دھیان رکھنا ہے۔"

"وہ کیا ہے استاد؟"

"ہم عورتوں کے ڈبے میں تو جا رہے ہیں۔ لیکن خبردار ہم میں سے کوئی کسی عورت یا لڑکی سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرے گا۔ کوئی بدتمیزی نہیں ہوگی۔ یہ ہماری لائن نہیں ہے۔"

"استاد، تم تو ہر پروگرام سے پہلے ہمیں لیکچر دیتے ہو۔" کاکی نے منہ بنا کر کہا۔ وہ کچھ باغی قسم کا اکھڑ نوجوان دکھائی دیتا تھا۔

"یہ لیکچر اس لیے دیتا ہوں کہ تم لوگ ہوشیار رہو۔"

ٹرین کی سیٹی سنائی دی۔ سجاد کھڑا ہو گیا۔ "تیاری پکڑ

لو استاد، ٹرین چلنے والی ہے۔‘‘

بختاور کے ساتھ کامی، رشید اور قربان بھی کھڑے ہو گئے۔

ٹرین چلنے میں صرف دو منٹ رہ گئے تھے۔ ان سب کے پاس ٹکٹ تھے لیکن انہیں آخری اسٹیشن تک نہیں جانا تھا۔ اس سے بہت پہلے اپنی کارروائی پوری کر کے اتر جانا تھا۔

ان کا کام بہت ٹائمنگ کا تھا۔ کس وقت گاڑی میں سوار ہونا ہے، کس وقت عورتوں کے ڈبے میں جانا ہے۔ کس وقت عورتوں سے سامان چھین کر ڈبے سے باہر پھینکتے جانا ہے۔

سامان چھیننے کا وقت اندھیرے میں ہوتا۔ تاکہ دوسرے ڈبے والوں کو کچھ دکھائی نہ دے۔ انہیں معلوم ہوتا تھا کہ اتنے بج کر اتنے منٹ پر ان کے دوسرے ساتھی پٹریوں کے ساتھ کھڑے ہوئے ہوں گے اور اتنے بج کر اتنے منٹ پر انہیں زنجیر کھینچ کر اتر جانا ہے۔

استاد پلاننگ کا بادشاہ کہلاتا تھا۔

اس کی ٹائمنگ بہت غضب کی ہوتی تھی اس لیے وہ لوگ آج تک پکڑے نہیں گئے تھے۔ ویسے بھی ان کی وارداتیں تسلسل سے نہیں ہوا کرتی تھیں۔ کبھی ایک مہینے کے بعد، کبھی دو مہینوں کے بعد۔ اس کے علاوہ وہ اسٹیشن بھی بدلتے رہتے تھے۔

ڈبے میں داخل ہوتے ہی ان میں سے ایک خطرے کی زنجیر کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا تھا جبکہ دوسرے لوٹ مار میں مصروف ہو جاتے۔

زنجیر یہ لوگ خود کھینچتے اور ریل کے آہستہ ہوتے ہی باہر کود جاتے جس کی انہیں پریکٹس ہو چکی تھی۔

عورتوں کے ڈبے میں داخل ہونے کا طریقہ بھی بہت مختلف تھا۔ چلتی ٹرین میں انہیں ایک ڈبے سے دوسرے ڈبے تک جانے کی عادت ہو چکی تھی۔

استاد پہلے ریل کی ڈائننگ بوگی میں کام کیا کرتا تھا۔ اس کا کام ہی یہی تھا کہ کھانے کی ٹرے لے کر ایک ڈبے سے دوسرے میں جائے۔

ڈبوں کو ایک دوسرے سے منسلک تو پچھلے دو چار برسوں میں کیا گیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے کھانا لے جانے کا یہی طریقہ تھا۔ استاد نے یہ ٹریننگ دوسروں کو بھی دے رکھی تھی۔

☆☆☆

سہیل کو وہ آدمی کچھ عجیب سا محسوس ہوا تھا۔

وہ آدمی ان کے ڈبے میں داخل ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا تھا۔ اندازے کے مطابق اس کی عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان ہوگی۔ بہت گٹھا ہوا جسم تھا۔ چہرے پر عجیب انداز کی سختی تھی اور آنکھیں بہت چمک دار تھیں۔

سہیل کو ڈبے میں اس کی موجودگی نہ جانے کیوں کھل رہی تھی۔ اس کی چھٹی حس یہ بتا رہی تھی کہ یہ آدمی کچھ مشکوک سا ہے۔ اس کے پاس سامان نام کی بھی کوئی چیز نہیں تھی جبکہ ہر مسافر کے پاس کچھ نہ کچھ ضرور رہتا۔

شاید کسی نے محسوس کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن سہیل نے دیکھ لیا تھا کہ اس آدمی نے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے ایک آدمی کو آنکھ سے کوئی اشارہ بھی کیا تھا۔

یہ بہت ہی ہلکا سا اشارہ تھا۔ شاید کسی قسم کا سگنل دیا گیا تھا۔ اس آدمی نے بھی ایسا ہی اشارہ کیا تھا۔ اب مغرب ہو چکی تھی۔

ٹرین کے باہر اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ گاڑی اب کراچی کو بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ اس نے اپنی مخصوص رفتار پکڑ لی تھی۔ ٹرین کی کھڑکیوں سے باہر......... سے آتی ہوئی روشنیوں کے دھبے پڑ رہے تھے۔ یہ بھی ایک دلچسپ منظر ہوتا ہے۔ سیاہی اور اجالا۔ اجالا اور سیاہی۔ دونوں ذرا سی دیر کے لیے۔

سہیل جب چھوٹا سا تھا اور اپنے گھر والوں کے ساتھ ٹرین میں سفر کرتا تو کھڑکی سے اس منظر کو بہت دلچسپی سے دیکھا کرتا تھا۔

حیدرآباد آ گیا۔

وہ ڈبے سے باہر پلیٹ فارم پر آ گیا۔ اس وقت اس نے ایک عورت کو دیکھا جو عورتوں کے ڈبے کی طرف جا رہی تھی۔

خیر یہ تو کوئی ایسی اَن ہونی بات نہیں تھی لیکن بات یہ تھی کہ سہیل نے اس مشکوک شخص کو اس عورت کو اشارہ کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

اس عورت نے بھی گردن کی خفیف سی جنبش سے اس کا جواب دیا تھا۔ وہ جنبش سہیل کی نگاہوں سے چھپ نہیں سکی تھی۔ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور تھی۔

وہ عورت عورتوں والے ڈبے میں داخل ہو گئی۔ سہیل اس ڈبے کی طرف بڑھ آیا۔ آئینہ نام کی وہ لڑکی کھڑکی کے پاس والی سیٹ پر تھی۔

اس وقت اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ وہ کبھی نہیں

کرتا تھا اور وہ بھی کسی غیر لڑکی کے ساتھ۔ سہیل نے کھڑکی کے پاس جا کر اسے مخاطب کیا۔ اس وقت وہ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ ”دیکھیں محترمہ! پلیز میری بات سن لیں۔ مجھے غلط مت سمجھیں۔“

”جی۔“ وہ حیران رہ گئی۔ ”کیا بات ہے؟“

”دیکھیں، مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے آپ کے ڈبے میں کوئی گڑبڑ ہونے والی ہے۔“

”کیسی گڑبڑ؟“ اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

”یہ میں خود نہیں جانتا کہ کیسی گڑبڑ۔“ سہیل نے کہا۔ ”لیکن مجھے اس کا احساس ہو گیا ہے۔ میں آپ کو اس کی تفصیل نہیں بتا سکتا بس آپ اتنا کریں کہ ابھی اس اسٹیشن سے ایک عورت ڈبے میں داخل ہوئی ہے جس کے ہاتھ میں ایک ٹوکری ہے۔ بس اس پر نظر رکھیں۔ مجھے وہ مشکوک معلوم ہوئی ہے۔“

”کیا آپ کا تعلق کسی خفیہ ایجنسی سے ہے؟“

”دیکھیں، یہ وقت اس طرح طنز کرنے کا نہیں ہے۔“ سہیل نے کہا۔ ”ٹرین چلنے والی ہے۔ آپ بس ایک کام کریں۔ میرا موبائل نمبر لے لیں۔ میں برابر کے ڈبے میں ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ حیدرآباد سے نکلتے ہی یہ لوگ اپنی کارروائی شروع کر دیں گے اور وہ عورت دروازہ کھول دے گی۔ جیسے ہی وہ دروازے کی طرف بڑھے۔ پلیز آپ مجھے فون کر دیجیے گا۔“

”کیا آپ کوئی سپرمین ہیں جو چلتی ٹرین سے اٹھا کر اس عورت کو باہر پھینک دیں گے۔“

”میں ایسا کبھی نہیں کروں گا۔“ سہیل نے کہا۔ ”میرے ڈبے میں اس عورت کے ساتھی بیٹھے ہیں۔ میں ان پر کسی طرح قابو پا کر ٹرین رکوا لوں گا۔ اس کے بعد انہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا پھر ان کی ساری پلاننگ سامنے آجائے گی۔“

پہلی بار وہ لڑکی کچھ سنجیدہ ہونے لگی۔ ”مسٹر آپ تو مجھے ڈرا رہے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”نہیں آئینہ میں تمہیں ڈرا نہیں رہا۔“ سہیل نے کہا۔ ”آنے والے خطرے سے آگاہ کر رہا ہوں۔“

”کیا، آ...... آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟“

ٹرین نے اس وقت سیٹی بجا دی۔ اس کے پہیے حرکت کرنے لگے۔ سہیل اسے جواب دیے بغیر اپنے ڈبے کی طرف آ گیا۔

وہ مشکوک شخص اور اس کا ساتھی اب تک اپنی اپنی جگہ بیٹھے تھے لیکن ان کے انداز یہ بتا رہے تھے کہ وہ خود کو ذہنی طور پر کسی کارروائی کے لیے تیار کر رہے ہیں۔

سہیل کو اس بات کا افسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس لڑکی کو اپنا موبائل نمبر نہیں دے پایا تھا۔ ٹرین حیدرآباد سے بہت آگے نکل آئی تھی۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ ڈبے میں موجود لوگ ایک دوسرے سے بیزار سے بیٹھے تھے۔

اچانک مشکوک شخص اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کی طرف آیا اور دروازہ کھول کر باہر نکل کر کچھ دیکھنے لگا۔

ڈبے میں بیٹھے ایک شخص نے اسے مخاطب کیا۔ ”ارے بھائی کیا کر رہے ہو، گر جاؤ گے۔“

اس سے پہلے کہ وہ مشکوک شخص کوئی جواب دے سکتا، سہیل بجلی کی سی تیزی سے اٹھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اس مشکوک شخص کو اندر کی طرف کھینچ لیا۔

مشکوک شخص نے سہیل کی گرفت سے خود کو چھڑانا چاہا لیکن یہ اس کے لیے ناممکن تھا۔ مشکوک شخص کے ساتھی نے سہیل پر حملہ کر دیا۔

سہیل اس کی طرف سے بھی غافل نہیں تھا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے اس کے ساتھی کو بھی سنبھال لیا تھا۔ ڈبے میں گڑبڑ دیکھ کر ایک شخص نے زنجیر کھینچ دی تھی۔

ٹرین آہستہ آہستہ رک گئی۔

بہت سے لوگ اپنے اپنے ڈبے سے اتر کر سہیل کے ڈبے کی طرف آنے لگے تھے۔ ان میں دو پولیس والے بھی تھے۔

صورت حال ابھی تک کسی کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ سہیل نے ایسا کیوں کیا تھا۔

وہ مشکوک شخص اور اس کا ساتھی سہیل کی گرفت سے نکلنے کے لیے زور لگا رہے تھے اور اسے گالیاں بھی دیتے جا رہے تھے۔

پولیس والوں نے سہیل کو گھیر لیا۔ سہیل نے کہا۔ ”میں سب کچھ بتاؤں گا۔ پہلے عورتوں کے ڈبے سے ان کی ساتھی عورت کو پکڑو۔“

اس دوران میں آئینہ بول پڑی۔ ”وہ عورت تو گاڑی کے رکتے ہی دوسری طرف اندھیرے میں کود گئی ہے۔“ آئینہ خود بھی ڈبے سے اتر آئی تھی۔

”اب تو بات سمجھ میں آ گئی ہو گی۔“ سہیل نے پولیس والوں سے کہا۔ ”یہ لوگ عورتوں کے ڈبے میں کسی واردات کی پلاننگ کر رہے تھے۔“

پولیس والوں نے اب ان دونوں کو سنبھال لیا۔ لوگ

بہت حیرت اور ستائشی نگاہوں سے سہیل کو دیکھ رہے تھے۔ اس نے بتایا کہ جس وقت یہ دونوں ڈبے میں داخل ہوئے تھے وہ اسی وقت اسے ان دونوں پر شک ہو گیا تھا۔

آئینہ اس کے پاس آ گئی۔ ''مسٹر سپر مین، تم نے تو واقعی کمال کر دیا۔''

سہیل مسکرا دیا۔

ریل نے سیٹی بجا دی۔ پولیس والے ان دونوں کو اپنے ساتھ لے جا چکے تھے۔ مسافر دوبارہ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ چکے تھے۔ سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا اور اس بار لاہور تک کچھ نہیں ہوا۔

☆☆☆

سہیل پورے سفر کے دوران میں سوچتا رہا کہ آخر یہ سب کیوں ہوا؟ کیا جواز تھا ان باتوں کا۔

کیا ضروری تھا کہ آئینہ جیسی لڑکی پلیٹ فارم پر دکھائی دے جاتی۔ کیا ضروری تھا کہ وہ اس میں دلچسپی لینے لگتا اور یہ بھی کیا ضروری تھا کہ وہ دونوں مجرم اس کے ڈبے میں آ کر بیٹھ جاتے اور وہ ان کو بھانپ لیتا۔

بہت سارے اتفاقات ایک ساتھ ہو گئے تھے۔ شاید ان ہی اتفاقات کے یکجا ہونے پر کسی نے کہا تھا بن جاتی ہے شاید یہ کسی کہانی کی ابتدا۔

قدرت نے بڑی پلاننگ کے ذریعے ایسے اتفاقات پیدا کروا دیے تھے۔

لاہور آ گیا۔

اس دوران میں پھر کوئی بات نہیں ہوئی۔ لاہور کے وسیع و عریض پلیٹ فارم پر وہ اپنے سامان کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کو ریسیو کرنے والے شاید ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔

سہیل اپنا مختصر سا سامان اٹھائے اس کے پاس آ گیا۔

آئینہ اسے دیکھ کر مسکرا دی۔ ''ہیلو مسٹر سپر مین، خدا حافظ۔''

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم دوبارہ بھی مل سکیں؟'' سہیل نے کہا۔

''کوئی ضروری تو نہیں ہے۔ ویسے مل بھی سکتے ہیں۔''

سہیل کے لیے یہ ایک مثبت اشارہ تھا۔ ''او کے، تو پھر تم میرا یہ کارڈ رکھ لو، اس میں میرے سیل فون کا نمبر ہے۔'' سہیل نے اپنا کارڈ اس کی طرف بڑھا دیا۔

آئینہ نے وہ کارڈ رکھ لیا۔

کچھ لوگ ان ہی کی طرف آتے ہوئے دکھائی دیے۔

سہیل نے کہا۔ ''شاید تمہارے گھر والے آ رہے ہیں۔''

''ہاں وہی ہیں۔'' آئینہ نے کہا۔ ''لیکن تم ابھی جانا نہیں، میں اُن سے تمہارا تعارف کرواؤں گی۔''

دو مرد اور دو خواتین تھیں۔ وہ سب آئینہ سے ملنے لگے پھر انہوں نے سہیل کی طرف دیکھا۔

''باجی، یہ مسٹر سپر مین ہیں۔'' آئینہ نے ایک عورت کو بتایا۔ ''اگر یہ نہیں ہوتے تو شاید میں خالی ہاتھ آتی۔ یا خدا جانے کیا ہو چکا ہوتا۔''

''آئینہ کیا بات ہو گئی تھی؟''

''میں بتاتا ہوں جناب۔'' سہیل نے کہا۔ ''چلتی ٹرین میں کچھ ڈاکو گھس آئے تھے۔ ان محترمہ کے ڈبے میں ان کی ایک ساتھی عورت پہلے داخل ہو چکی تھی اور دو میرے ڈبے میں تھے۔ مجھے ان لوگوں پر شک ہو گیا تھا۔''

''ارے ہاں۔'' دوسرا مرد بول پڑا۔ ''ٹی وی پر ٹکر تو چل رہا تھا کہ چلتی ٹرین میں ڈاکے کی کوشش ناکام۔ ایک عورت بھی پکڑی گئی اور دو ڈاکو بھی دھر لیے گئے۔ تو وہ واقعہ آپ ہی لوگوں کے ساتھ ہوا تھا؟''

''کمال ہے، ہم سے پہلے یہ خبر پہنچ گئی۔''

''آج کل تو ایسا ہی ہوتا ہے۔'' آئینہ کے بہنوئی نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ ''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ میں آئینہ کا بہنوئی ہوں اور یہ میری وائف ہیں۔ آئینہ کی بڑی بہن اور یہ میری سسٹر ہیں۔''

اس نے ایک سانس میں پورے خاندان کا تعارف کروا دیا تھا۔

''مجھے سہیل کہتے ہیں۔'' سہیل نے اپنا تعارف کروایا۔ ''میں اپنی فرم کی طرف سے کچھ دنوں کے لیے لاہور آیا ہوں۔ ویسے میرا لاہور آنا جانا لگا رہتا ہے۔''

''اور قیام کہاں ہوتا ہے آپ کا؟''

''کسی ہوٹل میں، فرم کی طرف سے۔'' سہیل نے جواب دیا۔

''سہیل صاحب، کبھی ہمارے یہاں بھی آئیں۔'' آئینہ کے بہنوئی نے کہا۔ ''ویسے میں نے شاید ابھی تک نہیں بتایا، مجھے عمیر کہتے ہیں۔''

''ہاں سہیل صاحب ضرور آیئے گا۔'' آئینہ نے بھی کہا۔

عمیر نے اپنا کارڈ سہیل کی طرف بڑھا دیا۔ ''یہ میرا کارڈ ہے۔ اس میں مکمل ایڈریس ہے۔ آپ فون کر کے جب جی چاہے تشریف لا سکتے ہیں، بہت خوشی ہوگی۔''

"ضرور آؤں گا۔" سہیل نے اس کا کارڈ لے لیا تھا۔
"اب مجھے اجازت دیں، آپ لوگوں کو بھی دیر ہو رہی ہو گی۔"

☆☆☆

اس نے گلبرگ ہوٹل میں قیام کیا تھا۔
لاہور کے گلبرگ علاقے کی خوب صورت لوکیشن پر یہ ایک صاف ستھرا ہوٹل تھا۔ اس کا جب بھی لاہور آنا ہوتا تو وہ اسی ہوٹل میں قیام کرتا تھا۔
اس ہوٹل کی سروس بھی اچھی تھی اور صفائی ستھرائی کا انتظام بھی بہت بہتر تھا۔
آج کا دن اسے آرام کرنا تھا۔ کام کی ابتدا دوسرے دن سے ہونی تھی۔ میں دن بھر آرام کرتا رہا۔ اس دن کوئی کام نہیں تھا، جب بور ہونے لگتا تو لاؤنج میں آکر بیٹھ جاتا۔
اب تک سب کچھ عام سا تھا اور سادہ سی کہانی تھی۔
سہیل کراچی سے لاہور تک کا سفر کرتا ہے۔ راستے میں کچھ ڈاکو مل جاتے ہیں۔ وہ اپنی جرأت اور ہمت سے کام لیتے ہوئے ان ڈاکوؤں کو پکڑوا دیتا ہے۔ آئینہ نام کی ایک لڑکی اس سے متاثر ہو جاتی ہے۔ وہ ایک خوب صورت لڑکی ہے۔
بس یہی سب کچھ ہوا تھا۔
اب تک اس کہانی میں کوئی ایسا موڑ نہیں آیا تھا کہ سہیل کو پابند کر رکھ دیتا۔ دو دن گزر چکے تھے۔ اس لڑکی نے اب تک اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد لاہور میں سہیل کا کام ختم ہو جاتا پھر کون کس کو یاد رکھتا ہے۔
لیکن ایسا نہیں ہوا۔
تیسری شام کو آئینہ کا فون آ گیا۔ وہ اس سے ملنا چاہتی تھی۔ اس کی آواز میں وہی کھنک تھی۔ وہی زندگی سے بھرپور لہجہ۔ "مسٹر سپر مین، میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔" اس نے کہا۔
"زہے نصیب، میں تو تمہارے فون کا انتظار ہی کر رہا تھا۔"
"تو پھر ریس کورس پارک آ جاؤ، فواروں کے پاس۔" آئینہ نے کہا۔ "شام چھ بجے تک۔ میں بھی آ جاؤں گی۔"
"او کے، سر کے بل آؤں گا۔"
"سر کے بل نہیں، پیروں کے بل آنا۔" آئینہ ہنس کر بولی۔ "سر کے بل تو کبھی نہیں پہنچ سکو گے۔"
سہیل دوسری شام کو ریس کورس پارک پہنچ گیا۔ آئینہ پہلے سے اس کے انتظار میں تھی۔ وہی خوب صورت چہرہ ایک بار پھر اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔

"مجھے یقین نہیں تھا کہ تم مجھے یاد کرو گی۔" سہیل نے کہا۔
"ایسا کیوں سمجھ لیا مسٹر سپر مین؟" آئینہ مسکرا دی۔ "کیا میں اتنی بے مروت اور بے وفا دکھائی دیتی ہوں۔"
"بظاہر تو نہیں ہے۔"
"چلیں، کہیں آرام سے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔" آئینہ نے کہا۔
دونوں ایک پُرسکون گوشے میں آکر بیٹھ گئے۔ آئینہ کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن کہہ نہیں پا رہی۔ سہیل نے اس کی جھجک محسوس کر لی تھی۔
"میرا خیال ہے کہ تم شاید کچھ بتانا یا کہنا چاہتی ہو۔" سہیل نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔
"ہاں۔" آئینہ نے ایک گہری سانس لی۔ "ایسا ہی معاملہ ہے۔ حالانکہ ہمارے درمیان کوئی ایسا تعلق نہیں ہے۔ ایک ہی بار ملاقات ہوئی تھی لیکن اسی وقت احساس ہو گیا تھا کہ تم ایک بہادر اور ساتھ دینے والے انسان ہو تم پر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔"
"بہت شکریہ اس بھروسے کا۔ اب بتاؤ کیا بات ہے۔"
"تم یہ بتاؤ، تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو؟" اس نے پوچھا۔
"جو تم کہو۔" سہیل نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
"ایک آدمی میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔" اس نے بتایا۔ "میں اس سے چھٹکارا چاہتی ہوں۔"
"کیا چاہتی ہو؟ کون ہے وہ؟"
"میرے بہنوئی کا بھائی۔" اس نے بتایا۔ "عام سا انسان ہے۔ لاہور ہی میں رہتا ہے۔ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن میں اسے پسند نہیں کرتی۔ اس نے میری زندگی عذاب کر رکھی ہے۔"
"کیا وہ کوئی بدمعاش یا غنڈا قسم کا انسان ہے؟"
"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے کہ بظاہر ایسا نہیں ہے۔ تم اسے سفید کالر غنڈا بھی کہہ سکتے ہو۔ اس کے بہت سوں سے تعلقات ہیں۔ اس نے براہِ راست مجھے کسی قسم کی دھمکی تو نہیں دی ہے لیکن اس کے تیور یہ بتاتے ہیں کہ اگر میں نے اس کی بات نہیں مانی تو پھر شاید وہ کچھ کر بیٹھے۔"
"اوہ۔" سہیل نے ایک گہری سانس لی۔ "تم نے ایک بہادر کو تو کہہ دیا ہے لیکن وہ ماننے کو تیار

نہیں ہے۔“

”کیا بہانہ؟“

”میں نے اس سے کہا ہے کہ میں کسی سے محبت کرتی ہوں اور ہم نے ایک دوسرے سے شادی کا وعدہ کرلیا ہے۔“

”اور وہ خوش نصیب کون ہے؟“

”وہ تم ہو۔“ آئینہ نے کہا۔

”میں۔“ سہیل چونک اٹھا۔”میں، میں کیسے ہوسکتا ہوں، میرا مطلب ہے ہمارے درمیان ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی ہے۔“

”مسٹر سپرمین تم اتنی سی بات نہیں سمجھ سکے۔“ اس نے کہا۔”میں تمہیں یہی ظاہر کروں گی کہ وہ محبت کرنے والے تم ہو اور میں نے تم سے ہی شادی کا فیصلہ کیا ہے۔“

”یعنی میں ایک ڈمی کردار ادا کروں گا؟“

”ہاں، ایک ڈمی رول۔ جس طرح فلموں میں ہوتا ہے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ یہ جان لینے کے بعد تمہارا پیچھا چھوڑ دے گا؟“ سہیل نے پوچھا۔

”کیوں نہیں۔ وہ ایسا کوئی برا آدمی بھی نہیں ہے۔ بس مجھ سے وابستہ رہنا چاہتا ہے اور یہی بات مجھے پسند نہیں ہے۔“

”اوکے، اب یہ بتاؤ کیا کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ میرا یہ ڈمی کیریکٹر ڈمی نہ رہے اور رئیل ہوجائے۔“

”کیا مطلب؟“ وہ چونک گئی۔ پھر بات کا مطلب سمجھ کر جلدی سے بولی۔”مسٹر سپرمین، تم مردوں میں یہی تو خرابی ہوتی ہے کہ فوراً موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ چلو رہنے دو، میں خود ہی کسی طرح اس سے نمٹ لوں گی۔“

”اچھا اچھا ناراض نہ ہو۔ اس سے میری ملاقات کروا دینا۔ میں اسے اطمینان دلا دوں گا۔“

یہ ایک مشکل ٹاسک تھا۔

مشکل اس لحاظ سے کہ اس کا محبوب بننا تو بہت خوش گوار تھا۔ چاہے جھوٹ ہی سہی۔ لیکن اس کے بعد۔ اس کے بعد کیا ہونے والا تھا۔ ظاہر ہے جب اس کا کام ہوجاتا وہ شخص اس کا پیچھا چھوڑ دیتا تو اس کے بعد سہیل کا اس سے کیا تعلق رہ جاتا؟ کچھ بھی تو نہیں، وہ کراچی واپس چلی جاتی۔ وہ بھی چلا جاتا اور زندگی کی مصروفیات میں دونوں مگن ہوکر رہ جاتے۔

پھر کون کس کو یاد رکھتا ہے؟

بہرحال دو چار دن تو تھے سہیل کے پاس۔ اسے اس سے فائدہ اٹھا کر اس کا قرب حاصل کرنا تھا۔

”دیکھو، اب میں تم سے ایک بات کہتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”کون سی بات؟“

”اس سے پہلے کہ تم میری اس سے ملاقات کرواؤ۔ تمہیں کچھ وقت میرے ساتھ گزارنا ہوگا۔“

”کیا مطلب؟“ وہ بھڑک اٹھی۔

”مجھے غلط مت سمجھو۔“ اس نے کہا۔”صرف مجھ سے ملنا ہوگا، ہم پارکوں میں ملیں گے۔ کسی ریستوران میں ملیں گے، ایک ساتھ بیٹھ کر کوئی مووی دیکھیں گے، بس۔“

”اوہ تم مجھے بلیک میل کر رہے ہو؟“ اس نے کہا۔

”نہیں، تم غلط سمجھ رہی ہو بلکہ میں تمہارے محبوب کے کردار میں ڈوب کر اداکاری کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”پھر یہ چند دنوں کی تو بات ہے۔ اس کے بعد تم کہاں اور میں کہاں۔“

”ہوں۔“ وہ سوچنے لگی۔ پھر کسی فیصلے تک پہنچ گئی۔

”ٹھیک ہے مسٹر سپرمین، اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو میں تیار ہوں۔ ہماری آج کی ملاقات تو ہوچکی، اب ہم کل ملیں گے۔“ سہیل نے کہا۔”اور کل ہی میں عظیم کو لیتی آؤں گی۔“

”کون عظیم؟“

”وہی شخص، اس کا نام عظیم ہے۔“ اس نے بتایا۔

”نہیں، اتنی جلدی نہیں۔“ سہیل بولا۔”یہ کیا کہ تم نے آج پلان بنایا اور کل ہی اس کو لے کر آجاؤ گی۔ دو چار دن تو میں تمہارے ساتھ گزار لوں، اس کے بعد میرا کام بھی ختم ہوجائے گا۔ میں کراچی واپس چلا جاؤں گا۔“

”مسٹر سپرمین، تم پھیلتے جا رہے ہو۔“ اس نے کہا۔

”لیکن چلو، یہ بھی منظور ہے۔“

آنے والے دو چار دن اس کے لیے بہت خوشگوار ہونے والے تھے۔ اس وقت ساحر کی ایک نظم کی ایک لائن یاد آ رہی تھی۔”میں جانتا ہوں کہ تو غیر ہے مگر پھر بھی... کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے۔“ شاید یہ دو چار دن اسے قریب لے آتے۔ وہ پسند آئی تھی۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی پسند بھی آئے اور اس کے ساتھ زندگی گزارنے کی خواہش بھی شدید ہوجائے۔

دو چار دن سہیل کے لیے بہت خوش گوار ثابت ہو رہے تھے۔

آئینہ اس کے پاس آجاتی اور وہ پورے لاہور کی سیر کرتے پھرتے۔ کسی محبوب اور محبوبہ کی طرح۔ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، قہقہے لگاتے، ایک دوسرے سے چھیڑ خانیاں کرتے

ہوئے۔ انہیں اس دوران ایک دوسرے کی پسند اور ناپسند کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ ایک دوسرے کے خاندان اور گھریلو پس منظر سے بھی آگاہ ہو چکے تھے۔

سہیل کے ہونٹوں پر بس یہی دعا رہتی۔ کاش، کاش یہ لمحے طویل ہو جائیں، کاش یہ دو چار دن کبھی ختم نہ ہوں۔

لیکن ایسا کب ہوا ہے۔ وقت کا کام گزر جانا ہوتا ہے اور وہ گزر گیا۔ سہیل کو اس وقت کے گزرنے کا احساس اس وقت ہوا جب ایک ریستوران میں ڈنر کرتے ہوئے آئینہ نے اس سے کہا۔ ''مسٹر ٹیپر مین! میں کل عظیم کو تم سے ملوانے لارہی ہوں۔''

''اتنی جلدی۔'' سہیل شپٹا گیا۔

''جلدی کہاں، ہمارے اس ڈرامے کو پورا ایک ہفتہ ہو رہا ہے۔'' آئینہ نے کہا۔ ''اب یہ کھیل ختم ہی ہو جائے تو بہت بہتر ہے۔''

''اچھا اب ایک بات بتاؤ۔ فرض کرو، تمہارا اُس سے پیچھا چھوٹ گیا تو اس کے بعد تمہارا اگلا قدم کیا ہوگا؟''

''اگلے قدم سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''کیا میں یہ امید رکھوں کہ تم شاید کبھی میرے بارے میں سوچو۔'' اس نے بڑی آسانی سے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

''اب تم میرے ایک سوال کا جواب دو۔''

''وہ کیا؟''

''فرض کرو کہ ہم ایک دوسرے سے بہت قریب ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد کوئی درمیان میں آجاتا ہے تو تم کیا کروگے؟''

''میں کبھی برداشت نہیں کروں گا۔'' سہیل نے کہا۔

''میں اپنے عشق میں سچا ہوں اور یہ کہتا ہوں میری رگوں میں بہت زور ہے رقابت کا۔''

''اوہ، مسٹر ٹیپر مین، بہت خطرناک ارادے ہیں تمہارے۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''تم سے تو ڈر لگنے لگا ہے۔ بہر حال فی الحال تو عظیم سے ملاقات کرلو اور ہاں، میں اس کو دکھانے کے لیے اور اس پر ظاہر کرنے کے لیے تم سے بے تکلف رہوں گی۔ تم کہیں اس کا غلط مطلب مت لے لینا۔''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ تمہارا اس طرح پیچھا چھوڑ دے گا؟''

''کچھ کہہ نہیں سکتی۔ بہت ہی ڈھیٹ قسم کا انسان ہے۔ چلو یہ ترکیب ناکام ہوئی تو کچھ اور سوچ لیں گے۔''

آئینہ دوسری شام کو عظیم کو ملوانے لے آئی تھی۔

سہیل اسے دیکھ کر ہی اپنی مسکراہٹ پر قابو نہیں رکھ سکا۔ کہاں آئینہ جیسی خوش شکل، اسمارٹ اور ذہین لڑکی۔ اور کہاں وہ منحنی سا آدمی۔

اس نے نگاہ کی عینک لگا رکھی تھی۔ اس کا قد بھی بہت کم تھا۔ کم از کم آئینہ سے تو چھوٹا تھا۔ عینک کے عقب سے اس کی گول گول آنکھیں کچھ عجیب سی دکھائی دے رہی تھیں۔ اس موقع پر کئی محاورے یاد آنے لگے تھے۔ جیسے یہ منہ اور مسور کی دال وغیرہ۔

''عظیم یہ ہیں سہیل۔'' آئینہ نے تعارف کروایا۔ ''یہ وہی ہیں جن کے بارے میں بتا چکی ہوں۔''

''ہاں، ہاں، ہاں۔'' وہ بے وقوفوں کی طرح اپنی گردن کو اوپر نیچے کرنے لگا۔ ''سہیل صاحب، آئینہ نے مجھے آپ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔''

آئینہ نے اس وقت ایک عجیب حرکت کی۔ اس نے اپنا ایک بازو سہیل کے بازو میں ڈال دیا اور اس کے قریب بہت قریب ہو کر کھڑی ہو گئی۔

اس وقت عظیم کی صورت دیکھنے کے قابل تھی۔ اس بے چارے کے چہرے پر ہوائیاں سی اُڑنے لگی تھیں۔ وہ بہت کھسیانا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

''عظیم صاحب۔'' آئینہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے سہیل کو اپنا جیون ساتھی بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ بتائیں آپ کو میری پسند کیسی لگی؟''

''بہت اچھی۔'' عظیم افسردہ ہو کر بولا۔ ''مبارک ہو آپ دونوں کو۔ میں تو یہ سمجھا تھا کہ شاید آئینہ یوں ہی کہہ رہی ہے۔''

''واہ، یوں ہی کیوں کہنے لگی۔'' آئینہ جلدی سے بولی۔ ''آپ کو تو معلوم ہی نہیں ہے کہ ہم دونوں نے ایک ساتھ کیسے خوشگوار لمحات گزارے ہیں۔ سہیل ذرا عظیم صاحب کو بتانا کہ ہماری دوستی کتنی گہری ہے۔ میں جب تک سامنے والی دکان سے پاؤڈر لے کر آتی ہوں۔''

وہ چلی گئی۔ وہ اس بات کا اشارہ دے گئی تھی کہ وہ جتنا جھوٹ بول سکتا ہے، بول جائے۔ یہ ظاہر کرے کہ ان دونوں کے درمیان بہت پرانے تعلقات ہیں۔ بے چارہ عظیم۔

آئینہ ایک اشارہ دے کر چلی گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد سہیل نے عظیم کی طرف دیکھا۔ وہ عجیب سی صورت بنائے سہیل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا پھر اس نے کچھ سوچنے کے بعد پوچھا۔ ''سہیل صاحب، ایک بات بتائیں، کیا آپ آئینہ سے بہت محبت کرتے ہیں۔''

''جی ہاں، اس میں تو کوئی شک ہی نہیں ہے۔'' سہیل

نے کہا۔

"اور آئینہ بھی آپ کو پسند کرتی ہے۔"

"وہ تو آپ نے دیکھ ہی لیا کہ وہ میرے ساتھ کتنی خوش ہے۔ کیا آپ جیلس ہو رہے ہیں، میرا مطلب ہے کیا آپ کو برا لگ رہا ہے۔"

"نہیں، بلکہ اس کے برعکس مجھے خوشی ہو رہی ہے۔" اس نے ایک عجیب بات کہہ دی۔ "سکون مل رہا ہے مجھے۔"

"کیا کہہ رہے ہو بھائی؟" سہیل نے حیران ہو کر بے تکلفی سے مخاطب کیا۔ "اس میں کس بات کی خوشی؟"

"دیکھیں سہیل صاحب، میرے اور آپ کے سوچنے میں یہی فرق ہے۔ آپ شاید ہر حال میں آئینہ کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔"

"جی ہاں، اس میں کوئی شک نہیں ہے۔"

"لیکن میرا مقصد اسے حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ اس کی خوشی ہے۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ ہے۔ اس کی آنکھوں کی چمک ہے اور اس کا سکون ہے۔"

"عظیم صاحب، یہ تو بالکل نئی بات کر دی تم نے۔"

"نئی نہیں، بہت پرانی بات ہے۔ اگر آپ کسی سے محبت کرتے ہیں تو آپ کا مقصد اپنے محبوب کی خوشی ہونی چاہیے۔ وہ جہاں رہے، جس کے ساتھ رہے، بس خوش رہے۔ ایک پیار کرنے والا یہی دیکھ دیکھ کر خود بھی خوش ہوتا رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آج کے دور میں یہ کوئی احمقانہ بات ہو لیکن کیا کروں، میں ذرا پرانے خیالات کا ہوں۔ میری منزل آئینہ کا حصول نہیں ہے۔ اس کی خوشیاں ہیں۔ اگر وہ آپ کے ساتھ خوش ہے تو میرے لیے اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔"

اس عام سے آدمی نے ذرا سی دیر میں حقیقی محبت کا مفہوم سمجھا دیا تھا۔ اس نے بتا دیا تھا کہ محبت دراصل ہوتی کیا ہے۔ محبوب کی خوشی۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور اس کی آنکھوں کی چمک، ان کے سوا اور کچھ نہیں۔

"دوست، تم ایک بڑے انسان ہو۔" سہیل نے فرطِ جذبات سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "تم نے مجھے محبت کے معنی سمجھا دیے ہیں۔ آئینہ تمہاری ہے۔ اگر وہ تمہیں قبول کر سکتی ہے تو پھر میرے لیے یہ خوشی کی بات ہوگی۔"

"نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔" عظیم جلدی سے بولا۔ "سہیل صاحب، پلیز آپ میرے لیے اس قسم کی کوئی حرکت نہیں کریں گے۔"

"کیوں نہیں کر سکتا، کیا محبت کے لیے ایسا جذبہ رکھنے والا صرف آپ کو حاصل ہے۔ کیا کوئی دوسرا اپنے محبوب کو خوش دیکھنے کے لیے اس حد تک نہیں جا سکتا کہ وہ کسی اور کے ساتھ اپنے محبوب کو برداشت کرے؟ میں بھی یہی چاہتا ہوں جو آپ چاہتے ہیں۔"

"لیکن اب ایک بات اور بھی ہے سہیل صاحب، جو آپ بھول رہے ہیں۔" اس نے کہا۔

"وہ کیا ہے؟"

"آئینہ آپ سے بے تکلف ہے۔ وہ آپ کو پسند کرتی ہے۔ فرض کریں اگر وہ کسی مجبوری کے تحت مجھے حاصل بھی ہو گئی تو بھی اس کا مطلب یہی ہوگا کہ میں زبردستی اس کی زندگی میں شامل ہو گیا ہوں۔ محبت میں جبر کی گنجائش نہیں ہوتی سہیل۔ اس میں پوری خوش دلی کے ساتھ کسی کو قبول کرنا ہوتا ہے۔ وہ آ رہی ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ اس کو بتا دیجیے گا کہ عظیم اب بھی اس کے راستے میں نہیں آئے گا۔"

آئینہ سامنے سے آتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ عظیم اٹھ کر چلا گیا۔ آئینہ پاؤڈر کا ڈبا لیے واپس آ گئی تھی۔ "ارے یہ عظیم صاحب کہاں چلے گئے؟" اس نے پوچھا۔

"آئینہ، عظیم صاحب تو چلے گئے۔" سہیل نے کہا۔ "لیکن اب میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں کہو۔" وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"آئینہ، تم عظیم کو اپنا لو۔ وہ شخص تم سے واقعی بہت محبت کرتا ہے۔" سہیل نے کہا۔ "ایسی محبت بہت کم دیکھنے اور سننے میں آتی ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" وہ حیران ہو گئی۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ مجھ میں اور اس میں فرق یہ ہے کہ میں تمہارے وصال سے خوش ہوں گا۔ اور اس دیوانے کو تمہارا فراق بھی قبول ہے۔ بشرطیکہ تم کو خوشیاں مل سکیں۔ جس کو صرف اپنے محبوب کی خوشیوں سے واسطہ ہو، اس سے بڑھ کر محبت کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے۔"

"مسٹر سپرمین، اب میں اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتی ہوں کہ تم نے ایک بار پھر سپرمین ہونے کا ثبوت دے دیا ہے۔"

"اب تم دونوں آپس میں بیٹھ کر ایک دوسرے سے اپنے اپنے دل کا حال کہہ سکتے ہو۔" سہیل نے کہا۔ "میں تم سے اجازت لوں گا، خدا حافظ۔"

سہیل اس کو وہیں چھوڑ کر ریستوران سے باہر نکل گیا۔

سپرمین ایک بار پھر ہار گیا تھا یا شاید جیت گیا تھا۔ کون جانے ان دونوں میں سے کون سپرمین تھا۔ عظیم یا سہیل۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

آوارہ گرد

قسط:30

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکو بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگارنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہوگئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرِ نگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہوگئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ ایک دن اچانک سرمد بابا کو اس کی بہو عارفہ اور سے لے کر اپنے گھر چلی گئی۔ شہزی کو اپنے اس بوڑھے دوست کے یوں چلے جانے پر بے حد دکھ ہوا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگا۔ شہزی نے اپنے چند ساتھیوں سمیت اطفال گھر سے فرار ہونے کی کوشش کی مگر ناکام رہا جس کے نتیجے میں دلشاد خان المعروف گگل خان اور اس کے حواری نے ان پر خوب تشدد کیا، اشرف اور بلال ان کے ساتھی شہزی گروپ کے دشمن بن گئے۔ گگل خان اپنے کسی دشمن گروپ کے ایک اہم آدمی اول خیر کو اطفال گھر میں یرغمال بنالیتا ہے، شہزی اس کی مدد کرتا ہے اور وہ اس کا دوست بن جاتا ہے۔ شہزی کا دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون مختاری بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کھیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازعہ عرصے سے چل رہا تھا۔ زہرہ بانو، شہزی کو دیکھ کر بے ہوش ہو جاتی ہے۔ کھیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، لیئق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ "اسپیکٹرم" کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض باجوہ ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہو جاتی ہے، بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہو جاتے ہیں، ایک چھوٹی سی غلطی کی صورت میں پاور کو معطل ڈراپ کردیا جاتا ہے۔ عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولووش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمپنی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر فیک شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولووش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولووش اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ ایک نو دولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولووش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہوجاتا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو تلاش کرلیتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطنِ عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیو ٹلسی کا ایک افسر کرنل سی جی بجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیو ٹلسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کرلیتے ہیں۔ شہزی، کھیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کھیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہوجاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر فیک کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر فیک کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولووش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کو ہارا، شہزی کو ٹائیگر فیک سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنالیتا ہے وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، ہشام چھنگلری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب اسپیکٹرم کو واقعی ایک بین الاقوامی معتبر ادارے کی حیثیت حاصل تھی، اور مسٹر ڈی کارلو اس کے چیف ڈائریکٹر اور لولووش ان کا نائب تھا، جو ایک جرائم پیشہ شخص تھا، وہ اسپیکٹرم جیسی معتبر تنظیم کو اپنے مجرمانہ مقاصد کے لیے اسے ہائی جیک کر کے خود اس کا سربراہ بن جاتا ہے۔ ہشام اسے پاکستان میں موہن جو دڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نورہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے۔ جو چوری ہو چکا ہے اور دشمن ممالک بلڈی کی طرح اس ہیرے کی آڑ میں شہزی عالمی جنگ چھڑوانا چاہتے ہیں۔ جسے انہوں نے ورلڈ بک بینک کا

نام دے رکھا ہے۔ لولوش اور سی جی بھوانی کے ایک مشترکہ مجاہدے کے تحت سے جی کوبارا کی نوٹ میں بلیوتھسی کے چندر ناتھ، شیام اور کورشیلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیوتھسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیوتھسی کے چیف سی جی بھوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محب وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندرداس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوبارا اور اس کے ساتھی بھونک کو بے بس کر دیتا ہے، سوشیلا اس کی ساتھی بن جاتی ہے۔ سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے اور طلسم نور ہیرا حاصل کرنے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ وہ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد ایک ساحل پر جا پہنچتے ہیں۔ وہاں ایک بوڑھا جوگی بابا ان کو اپنی جھونپڑی میں لے جاتا ہے۔ شہزی کی حالت بے حد خراب ہو چکی تھی۔ جوگی بابا اس کا علاج کرتا ہے وہیں پتا چلتا ہے کہ یہ بوڑھا جونکوں کے ذریعے لوگوں کا خون نچوڑتا تھا۔ شہزی کے دشمن مسلسل تعاقب کرتے ہوئے اس جھونپڑی تک آپہنچتے ہیں مگر شہزی اس بوڑھے سمیت جھونپڑی کو آگ لگا دیتا ہے اور سوشیلا کے ہمراہ ایک ڈاکٹر کے پاس جا پہنچتا ہے۔ دگرگوں حالات کے باعث شہزی کی حالت اور خراب ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر اسے سرائے میں لے جاتا ہے۔ ڈاکٹر مہارانی اور جوگی کے بارے میں حیرت انگیز انکشافات کرتا ہے۔ شہزی کو ایک منی کلینک سے مہارانی کے کارندے زبردستی اپنی حویلی لے جاتے ہیں۔ مہارانی ان کو قید میں ڈال دیتی ہے۔ اس اثنا میں پولیس کے ہمراہ شہزی کے دشمن حویلی پر دھاوا بول دیتے ہیں۔ ان کی گرفت میں آنے سے پہلے ہی شہزی سوشیلا کے ہمراہ فرار ہو جاتا ہے...... اور بھٹکتے بھٹکتے ایک بستی میں جا پہنچتا ہے۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی...... مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُرفریبوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوبارا اور چندر ناتھ حملہ کر دیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ یہی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک ریتا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ ریتا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں ریتا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی بیٹی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہو گیا تھا۔ ابھی شہزی اس انکشاف کے زیر اثر تھا کہ ریتا کا سیل فون بج اٹھتا ہے۔ کال سنتے ہی ریتا خوف زدہ نگاہوں سے شہزی کی طرف دیکھتی ہے اور قریب کھڑے بلراج سنگھ سے چلا کر کہتی ہے، یہ پاکستانی دہشت گرد ہے۔ پھر جیسے پل کے پل کایا کلپ ہو جاتی ہے۔ مگر شہزی چالاکی سے بلراج کو قابو کر لیتا ہے اور ریتا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ریتا اس کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیوتھسی تک پہنچ جاتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھوانی، شہزی کی گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کپل داوا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی انڈیمان پہنچا دیے گئے تھے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

عقل تو موقع اور حالات کے مطابق استعمال ہوتی ہے، لیکن عقلِ سلیم کا معاملہ ذرا اور ہوتا ہے، وہ کسی بھی رونما ہونے والے واقعے کی پہلے ہی سے تصویر کشی کر ڈالتی ہے اور اسی کے مطابق انسان عملی قدم اٹھاتا ہے۔ یہ عقل زیادہ تر قیاس آرائی اور محتاط اندازوں کے بل پر ہوتی ہے۔

کچھ یہی سبب تھا کہ جیسے ہی میں نے دروازے کو ٹوٹ کر گرتے اور اس کے عقب سے پستول بہ دست بلراج سنگھ کی جھلک دیکھی تو میں نہ صرف چونک گیا تھا بلکہ محتاط بھی ہو گیا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ مجھے شہزی کی صورت میں اتنی جلد نہیں پہچان سکتا تھا، لیکن یہ احساس ضرور تھا کہ اپنی دوسری "شکار" سوشیلا کو وہاں موجود پا کر اسے گولی مار سکتا تھا، لیکن ہوا اس کے برعکس، جانے کیا سوچ کر اس نے اپنے پستول کی نال کا رخ میری جانب کرتے ہی گولی چلا دی تھی۔

میں اس سے پہلے ہی اس کی خطرناک جنبش کو محسوس کرتے ہی، اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا...... محض ناگوں کے بل پر بروقت جسم کو جھکائی دی مگر اس کے باوجود خبیث بلراج سنگھ کی چلائی ہوئی گولی میرے دائیں بازو کو چھیدتی ہوئی نکل گئی۔

بلراج سنگھ کے مجھے پہچاننے یا نہ پہچاننے کی ایک اور وجہ بھی ذہن میں آئی تھی اور یہ مجھے ٹھوس وجہ لگی تھی۔ سوشیلا نے لاؤنج کی لائٹ گل کر رکھی تھی، اس کی جگہ البتہ زیرو پاور کا بلب جلتا چھوڑ دیا تھا، اس کی مقدور بھر روشنی میں، اس نے میرے قد کاٹھ کے "خاکے" کا اندازہ اور لامحالہ بھی

تصور کرتے ہوئے کہ ایک عورت (سوشیلا) اور دوسرا "مرد" میرے سوا اور کون ہوسکتا تھا، یہی سمجھ کر ہی اس نے مجھے پہلے نشانہ بنانا چاہا تھا۔

مجھے اپنے بازو میں گرم سلاخ سی کھبتی ہوئی محسوس ہوئی تھی، جس کے باعث میرے منہ سے تیز سی سسکاری خارج ہوگئی تھی۔

مقصد صرف خود کو بلراج سنگھ کی گولی سے بچانا ہی نہیں تھا میرا، اسی لیے اسے "بلینک پوائنٹ" کا جھانسا دیتے ہی، میں نے زمین پر گرتے ہی پیراٹروپنگ کے انداز میں ایک اور جست بھری تھی۔

میری توقع کے عین مطابق وہ دوسری گولی چلانے کے لیے پر تول رہا تھا اور اسی وقت جب اس کے پستول کی سیاہ نال میرے تعاقب میں حرکت پذیر ہو رہی تھی، میں بلراج سنگھ کے بائیں پہلو پر آتے ہی اسپرنگ کی طرح چپک گیا اور اپنی دائیں ٹانگ سوئپ کر ڈالی، میری نصف سرکل میں گھومتی ہوئی ٹانگ بڑے زور سے بلراج سنگھ کی دونوں ٹانگوں سے ٹکرائی تھی اور وہ فضا میں اُچھل کر گرا تو میں نے اس کا ہاتھ سے چھوٹا پستول بڑی چابک دستی کے ساتھ دبوچ لیا اور تلے اُوپر دو فائر اس کے ساتھیوں پر جھونک مارے، جو چند ثانیوں کے لیے اس "گنمن فیری" کو دیکھ کر ایک سکتے کی سی کیفیات میں آگئے تھے اور اب تک شاید یہی سوچتے رہ گئے تھے، کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں......؟

کچھ نشانہ اور کافی حد تک اندازے کی بنیاد پر میری ان پر چلائی ہوئی دو عدد گولیوں میں سے ایک تو بلراج کے ساتھی کے سینے میں لگی اور دوسرے کے گن والے ہاتھ پر۔ نتیجے میں سینے پر کھانے والا ساتھی، اپنے حلق سے ایک بھیانک چیخ خارج کرتا ہوا گرتا چلا گیا جبکہ دوسرا کراہ کے بدکا، گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گری۔

اِدھر میرے رگِ جاں میں جیسے پل کے پل پارا دوڑ گیا تھا۔ بلراج سنگھ نے اُٹھنے کی کوشش کی تھی، لیکن میری لات کی دوسری ضرب اس کے پیٹ پر پڑی اور وہ ایک بار پھر اُچھل کر پرے، بلکہ جس دروازے سے اندر گرا تھا، اس سے بھی باہر جا پڑا۔ اس کے زخمی ساتھی نے اپنے حلق سے ایک بھیڑیے جیسی چیخ خارج کی اور اپنی گن اٹھانے کے بجائے سیدھا مجھ پر آرہا۔ میں اسے آسانی سے اپنے پستول کی گولی سے نشانہ بنا سکتا تھا، مگر میں نے ایسا نہیں کیا اور جیسے ہی وہ والہانہ وار مجھ پر پڑا، میں نے پستول کے ٹھوس آہنی دستے کا وار اس کی کنپٹی پر کر ڈالا۔

"دوچ" کی آواز ابھری اور وہ اپنے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ خارج کرتا ہوا چپٹ سے گرا اور بے حس و حرکت ہوگیا۔

"تم کمرے میں جا کر بی جی کو دیکھو...... جلدی......"

میں نے ہک دک کھڑی سوشیلا سے تقریباً چلا کر کہا، جو بلراج کی وجہ سے ہنوز ایک سراسیمگی کی سی کیفیات میں مبتلا تھی، میری آواز سن کر وہ جیسے یکدم ہوش میں آگئی اور مذکورہ کمرے کی جانب لپک گئی، جبکہ میں بلراج کو چھاپنے کے لیے دروازے کی طرف لپکا، وہ اُٹھ کر سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا، مگر یہ دیکھ کر میں چونک پڑا کہ وہاں وہی "مخبر" کھڑا تھا اور اس کے ہمراہ کمپلیکس کے چند دیگر رہائشی بھی حیرت اور پھٹی پھٹی نگاہوں کے ساتھ قریب کھڑے گویا یہ تماشا دیکھنے میں محو تھے۔ وہ شاید اس "بوڑھے" کی ڈھنڈیا میں پڑے ہوئے تھے جس نے اپنے کاندھے پر کسی شرابی کو (سی جی بھجوانی) کو ڈالے رکھا تھا، جو ظاہر ہے مجھ سے مطمئن نہیں ہوا تھا اور کسی طرح چند اور کو بھی اپنی مخبرانہ مہم میں شامل کر چکا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے یہاں......؟ کون ہو تم لوگ؟" وہی مخبر تیز آواز میں مجھ سے بولا۔

"سی ی...... یہ پاکستانی دہشت گرد ہے، فوراً پولیس کو فون کرو...... چیخ چیخ کر لوگوں کو اکٹھا کرو، اسے پکڑیں...... میں بھارتی آرمی سے تعلق رکھتا ہوں۔"

مکار اور شاطر بلراج سنگھ نے کایا پلٹتے ہی اپنی عبرتناک شکست کا اس طرح بدلہ لینے کی ٹھانی تو میں نے نفرت خیز انداز میں اپنے دانت کوستے ہوئے اس کے بھاری جبڑے پر ایک گھونسا رسید کر دیا اور ساتھ ہی ایک ہوائی فائر جھونک دیا۔

میرے بدلے ہوئے بہروپ کے باوجود بلراج سنگھ مجھے آئی ڈینٹی فکیشن سے پہچان چکا تھا شاید۔

مخبر اور اس کے "محلاتی" ساتھی فائر کی آواز سنتے ہی ایک دم بدک کر وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ لیکن میں جانتا تھا کہ وہ یہاں سے بھاگ کر کیا گل کھلا سکتے تھے، اسی لیے پل کے پل میں نے ایک فیصلہ کیا اور پستول کی نال کا رخ بلراج سنگھ کی طرف کیا۔ تب تک وہ خبیث بھی کافی حد تک سنبھل چکا تھا، اس نے نیچے پڑے پڑے اپنی لات چلائی اور میرے ہاتھ سے پستول نکل کر ڈپلیکس کی سیڑھیوں پر نیچے کہیں گرتا چلا گیا۔ دوسری لات اس نے میری ٹانگوں پر چلائی تھی تا کہ مجھے بھی نیچے لڑھکا سکے، لیکن میں تب تک سنبھل چکا تھا اور میں اچھلا، اس کا "سوئپ" خالی چلی گئی، تو

میں نے ایک زوردار لات اس کے سینے پر جڑ دی۔ اس کی حالت پہلے ہی پتلی ہو رہی تھی۔ وہ لات لگتے ہی آنکھیں موندے اکھڑی اکھڑی سانسیں خارج کرنے لگا۔

یہاں کا معاملہ خراب ہو چکا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ بلراج سنگھ کو ہماری یہاں کی بھنک کیسے پڑی تھی، تاہم ایک دشمن کے لیے یہ کچھ اتنا مشکل کام بھی نہ تھا، شاید اس نے اپنے گروگھنٹال کے ایل ایڈوانی کی بے بی ڈول پوتی رینا کی ریکی کی ہوگی، حالانکہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ رینا بھی مجھ سے خارجی طور پر سہی، بددل ہو گئی تھی، لہٰذا مکار صفت بلراج سنگھ نے پھر بھی میرے حوالے سے رینا پر شک کی نگاہ رکھی ہوگی۔

میں اندر پلٹا اور کمرے میں پہنچا۔ سوشیت کی گاڑی کی چابیاں ہنوز میرے قبضے میں تھیں۔ تازہ کار حالات کا ادراک کرتے ہوئے میں نے میز کی دراز سے گھوترا جی (جو اب ایک دم میرے لیے اہمیت اختیار کر چکا تھا) کا دیا ہوا کارڈ اٹھا لیا۔ اگرچہ میں نے سوشیت سے اس کا فون نمبر بھی احتیاطاً لے لیا تھا۔ بلراج سے چھینا ہوا پستول کو سیڑھیوں میں جا گرا تھا۔ میں نے احتیاط کے پیش نظر اس کے ایک جہنم واصل ساتھی کی تلاشی لے کر اس کی اندرونی جیب سے پستول نکال کر اپنی پینٹ کی بیلٹ میں اڑس لیا۔

ادھر سی جی بھجوانی بھی اس تازہ صورت حال سے بری طرح گڑبڑایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اس کے ہونٹوں پہ اسکاچ ٹیپ چپکا دی۔ اسے اپنے کاندھے پر ڈالا اور قریب کھڑی حیران پریشان سوشیلا سے ہانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

''اب ہمارا یہاں زیادہ دیر تکنا خطرے سے خالی نہیں...... باہر گاڑی موجود ہے، فوراً نکل چلو......''

یہ کہتے ہی میں سی جی کے بھاری بھرکم وجود کو اٹھائے دروازے کی طرف لپکا، وہاں بلراج سنگھ سنبھالا لینے کی کوشش میں تھا، میرے کاندھے پر کسی وجود کو دیکھ کر اس کے ستے ہوئے چہرے پہ کچھ حیرت آمیز تاثرات ابھرے تھے، مجھے اسے ٹاپ کر کے آگے سیڑھیوں کی طرف بڑھنا تھا مگر خدشہ تھا کہ کہیں وہ مجھے درمیان میں اڑنگا لگانے کی کوشش نہ کرے، اسی لیے میں نے اس کے چہرے پہ بھی اپنے بوٹ کی ٹھوکر رسید کر ڈالی۔ اس کے حلق سے اوغ کی آواز خارج ہوئی، مگر دوسرے ہی لمحے سوشیلا نے ایک عجیب اور جنونی حرکت کر ڈالی۔ اس نے میرا پستول اچک لیا جو میں نے اپنی پینٹ کی بیلٹ میں اڑس رکھا تھا، پھر پستول کا رخ بلراج سنگھ کی طرف کرتے ہوئے ہسٹریائی انداز میں چیخ کر اسے للکارتے ہوئے بولی۔

''ذلیل درندے تم نے ہی ایڈوانی کے کہنے پر میری بہن اور اس کے معصوم بچوں کے گھر کو آگ لگا کر ختم کیا تھا ناں...... آج میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی......'' میں نے سوشیلا کا یہ روپ دیکھا تو ایک لمحے کو دنگ سا رہ گیا۔ اس کا چہرہ آتش انتقام کی سرخی سے لال بھبوکا ہو رہا تھا اور پستول والے ہاتھ میں واضح طور پر لرزش ہوتی دکھائی دے رہی تھی، نال کا رخ بلراج سنگھ کی پیشانی کی طرف تھا۔ اس نے ٹریگر دبا دیا۔ ڈز...... گولی چلی اور بلراج کی کریہہ انگیز چیخ ابھری، گولی کنپٹی کو چھیدتی اور اس کا دایاں کان اڑاتی ہوئی نکل گئی، خون کا فوارہ وہاں سے ابل پڑا اور بلراج سنگھ بری طرح تڑپنے لگا۔

''سوشی! اس خبیث نے یہاں ہمارے لیے مشکل کھڑی کر دی ہے، وقت ضائع مت کرو نکل چلو، ابھی اصل شکار باقی ہے۔'' میرا اشارہ کے ایل ایڈوانی کی طرف تھا۔ یہ کہتے ہی میں تیزی سے زینے اترنے لگا۔

گولیوں کی آوازوں سے وہاں خاصی بھگدڑ اور بے چینی پھیل گئی تھی۔ بلوے کی صورت میں کون قریب آنے کی جرأت کرتا ہے، یوں بھی رات کے آخری پہر کا وقت تھا، البتہ باہر تعینات چوکیدار سے مجھے ٹکراؤ کا خدشہ تھا، تاہم میں اور سوشیلا، ڈپلیکس کی پارکنگ وے سے گزرتے ہوئے، گیٹ کی طرف لپکے، ڈنڈابردار چوکیدار ایک طرف کھڑا فون پر کسی سے باتیں کر رہا تھا، وہ شاید پولیس کو مطلع کرنے میں مصروف تھا، میں نے اس کی طرف ایک فائر جھونک مارا، وہ بدکا اور ڈنڈا اپنے سیل فون سمیت پھینک کر ایک طرف کو دوڑ گیا۔

میں اور سوشیلا سوشیت کی کار میں سوار ہو گئے اور سی جی کو عقبی سیٹ پر ڈال دیا۔ وہ ہنوز رسن بستہ حالت میں تھا۔ میں نے کار اسٹارٹ کی اور ذرا ہی دیر بعد میں ڈپلیکس کی اس عمارت کا گیٹ توڑتا ہوا باہر نکلتا چلا گیا اور ایک طرف ویران اور تاریک سڑک پر کار کو طوفانی رفتار سے دوڑا دیا۔

☆☆☆

ایک بار پھر میں اور سوشیلا اس شہر خرابہ اور زنگاراں کی سڑکوں پہ بے یار و مددگار کسی نامعلوم منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ اس بار ہمارے ساتھ ایک اہم دشمن سی جی بھجوانی بھی تھا۔ ہماری کوئی منزل نہ تھی۔

مجھے سی جی بھجوانی سے ابھی مزید چند اہم سوالوں کے

جواب درکار تھے، مگر بلراج سنگھ کے اچانک شب خون مارنے نے سے پوچھنے سے رہ گئے تھے۔ بالخصوص ''کلی منجارو'' کے سلسلے میں اس سے دریافت کرنا تھا کہ یہ کیا معاملہ تھا؟ کیونکہ جہاں تک میری محدود معلومات تھی اس کے مطابق کلی منجارو افریقہ کے ایک معروف اور دشوار گزار پہاڑی سلسلے اور وہاں آباد وحشی وآدم خور قبیلے کو کہا جاتا تھا، اس سے متعلق کئی ایڈونچرز اور تھلر زبار مو ویز اور دستاویزی فلمیں بھی میں نے دیکھ رکھی تھیں، اگرچہ ان میں ''فینٹیسی'' کا عمل دخل زیادہ تھا۔ تاہم کچھ باتیں حقیقت پر بھی مبنی تھیں۔ لیکن دریافت طلب امر یہ تھا کہ آخر جزائر انڈیمان میں اس مقام اور قبیلے کا کیا ذکر؟

مجھے اپنے تینوں اہم ساتھیوں، اول خیر، شکیلہ اور کپیل دادا کی طرف سے فکر ہو رہی تھی۔ بجوانی کا کوریلا سے رابطہ کرنا اور کلی منجارو کا اس قدر خوف زدہ ہو کر ذکر کرنا، مجھے تشویش آمیز اُلجھن میں مبتلا کیے دے رہا تھا۔

''اب کہاں جا رہے ہیں ہم؟'' بالآخر عقبی سیٹ پر سی جی بجوانی پر نگاہ رکھے ہوئے براجمان سوشیلا نے مجھ سے وہی سوال کر ڈالا، جس کا جواب میں خود بھی ہنوز تلاش کر رہا تھا۔

''تم دونوں کو یہاں کہیں بھی ٹھکانا نہیں ملے گا...... بہتر یہی ہے کہ ہمارے ساتھ مفاہمت کی راہ پر چلو...... تو کچھ بچت کے آثار پیدا ہو سکتے ہیں۔'' میرے جواب دینے سے پہلے ہی بجوانی نے کہا۔ مجھے اس کے لہجے سے مکاری اور فریب کی بُو آتی محسوس ہو رہی تھی۔ میرے کہنے پر سوشیلا نے سی جی کے منہ سے اسکاچ ٹیپ ہٹا دی تھی۔ میں نے اس کی بکواس کو صرف نظر کرتے ہوئے سوشیلا سے کہا۔

''موہن کب کام آئے گا؟ ہمیں اس سے رابطہ کرنا چاہیے۔''

''ہاں! مگر اس کے لیے ہمیں ممبئی کی طرف کا سفر کرنا پڑے گا۔'' اس نے جواب دیا۔

میرا بھی یہی خیال تھا۔ جس پر صاد کرتے ہی سوشیلا نے مجھے بتایا کہ ہم ممبئی جانے والی مین روڈ پر ہی محوِ سفر ہیں۔ میں نے کار کی رفتار بڑھا دی۔

بلیو ٹلسی کے ہیڈکوارٹر میں تباہی مچانے اور اس کے سربراہ کرنل سی جی بجوانی کو اپنی گرفت میں لینے کے بعد اگر میں یہ سوچ رہا تھا کہ خطرہ کچھ کم ہو گیا تھا تو یہ ایسا کچھ غلط بھی نہ تھا، لیکن بہرحال میری یہاں ڈھنڈیا پڑی ہوئی تھی اور کوئی بعید نہ تھا کہ دیگر بھارتی انٹیلی جنس بہ شمول ''را'' والے میرے پیچھے لگ چکے ہوں گے، یہ الگ بات تھی کہ اب میرے سلسلے میں تازہ کار رہنمائی کا حصول ان کے لیے مشکل تھا۔

سی جی بجوانی نے مجھے سوشیلا کی موسی کے بارے میں بتایا تو تھا کہ اُسے ضروری تفتیش کے بعد چھوڑ دیا گیا تھا۔ تاہم ابھی یہ بات کنفرم نہیں ہوئی تھی، ایک اندازے کے مطابق یہ ممکن تھا کہ وہ سچ ہی کہہ رہا ہو، کیونکہ موسی سے ابھی ہم ملے ہی کب تھے؟

''جن لوگوں نے تمہارے فلیٹ پر حملہ کیا تھا، یہ کون لوگ تھے؟''

ہماری منزل کا تعین ہوتے اور ممبئی کی طرف گامزن ہونے کے بعد سی جی نے سوال کیا۔

''تم اپنی چونچ بند رکھو...... اور مجھے بتاؤ کہ یہ کلی منجارو والا کیا معاملہ تھا؟ تمہاری ساتھی کوریلا نے تمہیں میرے ساتھیوں کے متعلق کیا بتایا تھا؟'' میں نے اسے جھڑکتے ہوئے اُلٹا سوال کر ڈالا۔ وہ میرے سوال پر ایک بار پھر متفکر نظر آنے لگا مگر کوئی جواب نہ دے پایا۔ مجھے فکر آمیز پریشانی نے آن گھیرا تھا۔

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے کہا۔ ''وہاں غیر متوقع طور پر ایک گڑبڑ ہو گئی ہے۔''

''کیسی گڑبڑ؟ اور...... کہاں ہوئی ہے؟''

''جزائر انڈیمان میں......'' وہ جواباً سنجیدگی سے بولا۔ ''جہاں تمہارے تینوں ساتھیوں کو ہم نے قیدی اور یرغمال بنا رکھا تھا۔ وہاں ایک وحشی قبیلے نے حملہ کر دیا تھا، جو خود کو افریقی نسل کے قبیلے...... کلی منجارو سے تعلق بتاتا ہے...... لیکن......'' وہ کچھ بتاتے ہوئے خاموش ہو گیا۔

''لیکن کیا......؟'' میں نے بھویں سکیڑ کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف گھورا۔

''میں مزید کچھ نہیں بتا سکتا...... تمہارے ساتھی اب ہمارے قبضے میں نہیں رہے، اس صورتِ حال میں اب تم میرے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟''

''کتے والا سلوک کروں گا......'' میں نے دانت پیس کر کہا۔ ''مکاری میں تمہارا کوئی ثانی نہیں اور میں تمہارے کسی جھانسے میں نہیں آؤں گا۔ اس لیے مطلب کی بات کرو اور معاملہ صاف رکھو۔''

''اب تمہیں میری بات کا یقین نہیں آ رہا ہے تو میں کیا کروں؟'' وہ بظاہر بے پروا انداز میں بولا۔

''ٹھیک ہے......'' میں نے اس نازک صورتِ حال

میں کچھ معاملہ فہمی سے کام لینے کی کوشش کی اور بولا۔ ''تو پھر تمہارے خیال میں اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ کیونکہ میرے تینوں ساتھی تمہاری قید میں اور تمہاری ذمے داری میں تھے۔ اگر ان کا ذرا بھی بال بیکا ہوا تو میں تمہارا بہت برا حشر کروں گا، زندوں میں موت سے بدتر کردوں گا تمہاری حالت......'' میں نے پُرغیظ لہجے میں کہا تو وہ حلق سے ایک گہری ہنکاری خارج کرتے ہوئے بولا۔

''اس سلسلے میں ایک ہی شخص ہماری مدد کرسکتا ہے۔''

''کون ہے وہ......؟''

''ممبئی کی زیرِ زمین دنیا کا ایک بڑا ڈان ہے وہ...... داؤد ابراہیم کا نام تو سنا ہوگا تم نے؟ یوں سمجھو، وہ اسی کا آدمی ہے...... بھولا ناتھ نام ہے اس کا۔''

''شٹ اپ......!'' معاً سوشیلا نے مداخلت کرتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ ''تم پیچھے آجاؤ اور اسٹیئرنگ میرے حوالے کردو۔''

میں نے اس کی بات کا مطلب سمجھ کر کار کو بریک لگا دیے۔ سیٹ تبدیل کرتے ہی سوشیلا نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ میں اب بی جی کے ساتھ آرام سے بات کرسکتا تھا۔

''تو اس کا مطلب ہے، تم لوگوں کے بھارت کے انڈر ورلڈ بدمعاشوں سے بھی تعلقات ہوتے ہیں۔'' میرے لہجے میں طنز کی زہریلی کاٹ تھی۔ ''تاکہ جب چاہے تم لوگ اپنے ذاتی مفادات کے لیے ماورائے قانون کچھ بھی کرسکو، بھارت کی جتنی بھی مسلم دشمن، ہندو انتہا پسند تنظیمیں ہیں، تم ہی لوگ ان کی سپورٹ بھی کرتے ہو...... کیوں؟ غلط کہا میں نے؟''

''میرا خیال ہے، گفتگو کا سلسلہ مطلب کی بات پر رہے تو زیادہ بہتر ہوگا۔'' بھجوانی بے تاثر لہجے میں بولا۔ اس کے لہجے سے مجھے فطری ہٹ دھرمی اور بے حسی محسوس ہوئی۔

''یہ بتاؤ، بھولا ناتھ ہماری کیوں اور کیسے مدد کرسکتا ہے؟'' بالآخر میں مستفسر ہوا۔

''تم شاید بھول گئے، میں نے تمہیں بتایا تھا کہ جزائر انڈیمان کے کچھ علاقوں میں داؤد ابراہیم اور حاجی مستان جیسے دو بڑے ڈان کا قبضہ ہے۔ جن کی باگ بھولا ناتھ اور عبدالشکور عرف نانا شکور نے سنبھالے رکھی ہے۔''

''یہ نانا شکور...... کوئی نئی بلا ہے؟''

''یہ حاجی مستان کا آدمی ہے اور بھولا ناتھ کا سخت حریف ہے، آج بھی انڈیمان میں زمین پر قبضے کے تنازعات کے باعث ان دونوں گروپوں کے درمیان لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں، لیکن آج کل شاید ایک خاموش معاہدے کے تحت ان کے درمیان جنگ بندی ہوچکی ہے، اور یہ اپنے اپنے علاقوں تک محدود ہیں۔''

اس کی بات پر میں دفعتاً ہی اندر سے کھٹکا۔ عقلِ سلیم کے گھوڑے دوڑائے تو مجھے بہت سی باتوں کا ازخود اندازہ ہونے لگا۔ صاف ظاہر تھا کہ بھولا ناتھ گروپ، بھجوانی کا حلیف (دوست) تھا جبکہ نانا شکور حریف (دشمن) اور اس خبیث کے بھولا ناتھ سے خفیہ بلکہ ''مجرمانہ'' نوعیت کے تعلقات تھے اور کوئی بعید نہ تھا کہ بھجوانی نے بھولا ناتھ گروپ کے ساتھ مل کر ہی اول خیر وغیرہ کو قابو کیا ہو اور اسی کی قید میں رکھا ہو۔

''ہوں......'' میں نے ایک پُرسوچ ہنکاری خارج کی۔ ''تو تم نے بھولا ناتھ کی مدد سے ہی میرے تینوں ساتھیوں کو یرغمال بنایا تھا۔''

''کیا کہتے ہو پھر؟ بھولا ناتھ سے رابطے کی اجازت دیتے ہو مجھے؟'' وہ حسبِ توقع متعلقہ گفتگو تک محدود رہتے ہوئے بڑی مکاری کے ساتھ مجھ سے مستفسر ہوا۔

''ٹھکانے پر پہنچ کر کچھ فیصلہ کرتے ہیں۔'' میں نے کسی برہمی کا اظہار کیے بغیر نیم رضامندی کا سا لہجہ اپناتے ہوئے کہا اور سیٹ کی پشت گاہ سے سر ٹکا دیا۔

''تمہارے ساتھیوں کے سلسلے میں اب بھولا ناتھ ہی مدد کرسکتا ہے، کیونکہ اس کے کئی مجاور قبیلے سے اچھے تعلقات ہیں......'' وہ نہیں رکا، مجھے جھانسے میں آتا محسوس کرکے بولا۔

''سوشی! ہماری منزل کتنی دور ہے اب؟'' میں نے دانستہ اس کی بات پر توجہ دیے بغیر سوشیلا کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''زیادہ دور تو نہیں ہے، لیکن میں نے اصل راستے سے ہٹ کر جو متبادل راستہ اختیار کیا ہے وہ ذرا طویل ثابت ہوسکتا ہے۔''

''رائٹ، یہ سہی ہے، احتیاط کے سلسلے میں کوئی کمپرومائز نہیں ہونا چاہیے۔''

پو پھٹنے لگی تھی، صبح کاذب کی نیلگوں سی روشنی میں ممبئی کی سڑکیں اُجلی اُجلی سی نظر آرہی تھیں، ٹریفک کم ہی تھی، لوکل مسافر بسیں بھی اِکا دُکا ہی سڑک پر دکھائی دے رہی تھیں۔ ہم آبادی میں داخل ہوچکے تھے اور میں دیکھ رہا تھا کہ سوشیلا بڑے دھیان بھری نگاہوں سے اطراف کا جائزہ

لیتی ہوئی کار کو خاصی رفتار سے دوڑائے جا رہی تھی۔ جلد ہی وہ ایک ایسے علاقے میں داخل ہو گئی، جہاں دور دور یہ بنگلے اور کوٹھیاں نظر آ رہی تھیں، یہ مجھے متمول علاقہ نظر آتا تھا۔ کار سوشی نے ایک نیلے اور سفید رنگ کے بنگلے کے گیٹ کے سامنے روک دی۔ صبح سویرے کا وقت تھا، اسی لیے ہمیں اُمید تھی کہ موہن گھر پر ہی ہوگا۔

وہ ایک بار ہارن دیے گئے تو بغلی گیٹ سے کوئی عمر رسیدہ سا مگر ساٹھا پاٹھا شخص برآمد ہوا۔

''گیٹ پر انٹرکام لگا ہوا ہے۔'' میں نے کسی خیال کے تحت فوراً سوشیلا سے کہا تھا۔

''مجھے معلوم ہے۔'' اس نے مختصر جواب دیا اور میں خاموش رہا۔ ذرا دیر میں وہ شخص قریب آیا تو سوشیلا دروازہ کھول کر باہر اتر آئی۔ اس شخص سے کچھ کہا اور وہ شخص فوراً اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے انٹرکام کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں اس نے ایک بٹن دبا کر اندر کسی سے بات کی پھر سوشیلا کو قریب آ کر بات کرنے کا کہا۔ اس نے بات کی اور فوراً پلٹی، وہ شخص بھی بغلی دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ جب تک سوشیلا نے دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی، گیٹ کھل چکا تھا، سوشیلا نے کار آگے بڑھا دی۔

کار گیٹ سے اندر داخل ہوئی اور ایک نیم بل کھاتی کنکریٹ کی پختہ روش پر رینگتی ہوئی آگے بڑھنے لگی، میری نظریں دونوں طرف گردش کر رہی تھیں۔ روش کے بائیں جانب بڑا سا لان تھا، جہاں سیلون کے ناریل بھرے درخت اور کٹاؤ دار مخروطی تنوں والے خوبصورت لانبے پیڑ ایستادہ تھے۔ لان کے وسط میں نیٹ لگا ہوا تھا، یہاں شاید بیڈمنٹن کھیلا جاتا تھا۔ کار پورچ میں دو گاڑیاں کھڑی تھیں، ان کے قریب سوشیلا نے اپنی کار لے جا کر روک دی۔ اُوپر نفیس ریلنگ والی بالکونی نظر آتی تھی۔ اس کے عین نیچے دیدہ زیب اور بیش قیمت لکڑی کا محرابی دروازہ تھا۔ ہم کار سے اُتر کر اسی طرف، اس شخص کی راہنمائی میں بڑھے، ہمارے ساتھ ایک رسن بستہ آدمی کو دیکھ کر وہ چونکا ضرور تھا، مگر کوئی سوال ہم سے نہیں کیا تھا۔ سی جی بجوانی کو یہاں لانے کی میری مجبوری تھی، اگر میرے ساتھیوں کا معاملہ نہ ہوتا تو میں اسے کب کا واصل جہنم کر چکا ہوتا، مگر کم بخت نے میرے لیے ایک مشکل کھڑی کر دی تھی۔

ہم اندر داخل ہو گئے۔ ایک پرتعیش اور سجے سنورے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر وہ آدمی چلا گیا۔ ہم صوفوں پر براجمان ہو گئے، سی جی بجوانی کو میں نے فرش پر نیچے قالین پر ڈال دیا تھا۔ اس کے چہرے سے خاصے ذلت آمیز تاثرات ابھر آئے تھے۔ میں نے اس کی مطلق پروانہ کی، ہمارے صوفوں پر براجمان ہوتے ہی ایک میری ہم عمر کا نوجوان سا لڑکا برآمد ہوا تھا، میں اُسے دیکھ حیران سا رہ گیا۔ اتنی سی عمر میں اس نے بہت ترقی کر لی تھی یا پھر شاید یہ سب اسے ترکے میں ملا ہو۔

وہ جسم کا موٹا تھا اور شاید اسی وجہ سے اپنی عمر سے تھوڑا بڑا ہی نظر آتا تھا۔ قد درمیانہ تھا۔ چہرہ پھولا ہوا اور آنکھوں کے نیچے ابھرے ہوئے پپوٹے یا تو اس کی کم خوابی کے غماز تھے یا پھر کثرت شراب نوشی اس کی وجہ تھی۔

وہ بڑے پرتپاک انداز میں ہم سے ملا اور ایک نظر قالین پر بندھے پڑے بجوانی کو دیکھا تو سوشیلا سے فوراً اس کے بارے میں پوچھا جبکہ وہ میرا تعارف پہلے ہی کروا چکی تھی۔

''اے مسٹر! میں انڈین خفیہ ایجنسی کا چیف ہوں، ان لوگوں نے مجھے اغوا کر کے یہاں لا کر تمہیں ایک بڑی مصیبت میں ڈال دیا ہے، کرنل سی جی بجوانی نام ہے میرا......''

ہم سے پہلے ہی وہ چلا کر موہن کی طرف دیکھ کر بولا تو وہ بے چارہ بوکھلا سا رہ گیا۔

''سی جی...... یہ صحیح کہہ رہا ہے، سوشی؟'' وہ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''ہاں!'' سوشیلا نے کہا جبکہ مجھے سی جی کے اچانک گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے اور اس کی مکاری پر بے تحاشا طیش آیا، وہ یقیناً اپنے مرتبے کا فائدہ اُٹھا کر موہن کو خوف زدہ کر کے ہم سے بدظن کرنا چاہتا تھا۔

''یہ شہزاد نامی شخص ایک دیش دروہی اور پاکستانی ایجنٹ ہے......'' وہ اپنی عیارانہ ہرزہ سرائی جاری رکھتے ہوئے موہن سے بولا۔

میرے جی میں تو آئی کہ اس رذیل صفت شخص کے منہ پر بوٹ کی ایک ٹھوکر رسید کر ڈالوں، مگر اس وقت کی نازک صورت حال مکمل طور پر سوشیلا کے ہاتھ میں تھی اور وہی موہن کو قائل کر سکتی تھی، لہٰذا اُس نے یہی کیا۔

اس نے سی جی بجوانی کی اصلیت نیز اس کے درندہ صفت اہلکاروں کے تین بے گناہ ائیر ہوسٹس لڑکیوں کے ساتھ زیادتی اور بعد میں ان کے بہیمانہ قتل کے بارے میں بتاتے ہوئے، یہ بھی بتایا کہ یہ خود ایک انڈین خفیہ ایجنسی کے سربراہ ہونے کی آڑ میں یہاں بھی کیا گل کھلاتا

پھر رہا تھا۔ کے ایل ایڈوانی کی زندہ مگر انسانیت سوز درندگی کی مثال اس کے سامنے تھی جو اس نے موہن کے بھائی اور اس کے معصوم بیوی بچوں کے ساتھ کی تھی۔

میں نے دیکھا موہن اور سوشیلا کے درمیان اچھی خاصی انڈر اسٹینڈنگ تھی جبکہ میرے بارے میں بھی سوشیلا نے موہن کو اعتماد میں لیتے ہوئے اسے قائل کرلیا تھا کہ میرا یہاں ایسا کوئی مقصد نہیں ہے، جس سے یہاں کسی بھی بھارتی شہری کی جان و مال یا ملک کو کوئی نقصان ہو۔ اس کی ضمانت سوشیلا نے پورے مستحکم انداز میں موہن کو دی تھی اور یہاں (انڈیا میں) میری موجودگی کو کسی تخریب کاری کی کارروائی کے بجائے، اپنے ساتھیوں کی رہائی اور کے ایل ایڈوانی سے انتقام سمیت، اس سے وہ ہیرا حاصل کرنے کی مہم تک میری کارگزاری کو محدود رکھا تھا۔ یوں اب موہن میری طرف سے خاصا مطمئن نظر آنے لگا۔ سی جی بھجوانی کے کانوں میں، میں نے کار سے اُترتے وقت "ایئر ڈالس" ٹھسیڑ دیے تھے، وہ ہماری کوئی بات نہیں سن سکتا تھا۔ اب میں نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر اسکاچ ٹیپ بھی چپکا دی تھی۔

"پہلے اس کا کوئی بندوبست کرو تب ہی ہم آرام سے بیٹھ کر کوئی آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دے سکتے ہیں۔" موہن نے قالین پر قابل رحم حالت میں پڑے ہوئے بھجوانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ لہٰذا جب موہن کے اشارے پر میں بھجوانی کو ٹانگ سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا، ایک طرف نظر آنے والے متصل کمرے کی طرف لے کر بڑھنے لگا تو وہ بڑی خونخوار آنکھوں سے موہن کو گھورنے لگا، وہ اندر ہی اندر اپنی اس ہتک آمیز گدائی اور تذلیل پر طیش کے مارے بپھرا ہوا نظر آرہا تھا۔

بہرکیف اسے ایک کمرے میں بند کرنے کے بعد ہم تینوں کے درمیان چند رسمی گفتگو ہوئی اور پھر کچھ کھانے پینے کا بندوبست کیا گیا، چائے پینے کے دور تک ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو خاصی آگے تک جا چکی تھی۔

"بلراج سنگھ کی زیرک دماغی کی وجہ سے صورتِ حال اب خاصی بگڑی ہوئی نظر آتی ہے، حالانکہ رینا کا تمہاری مدد میں شامل ہونا بہت اہمیت کا حامل تھا۔" موہن نے چائے کا کپ خالی کرتے ہوئے ایک سگریٹ سلگا لیا اور مجھے بھی اشارے سے پیشکش کی، جسے میں نے بھی اشارے سے ہی تھینکس کہتے ہوئے رد کردیا، اگرچہ میں بھی کبھی کبھار سگریٹ نوشی کرلیا کرتا تھا مگر اس وقت میرا جی نہیں چاہا تھا۔

موہن نے سگریٹ کا ایک کش لگاتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ "اس پر مستزاد اب مسٹر شہزی کو بھی دوہری تہری مہمات کا سامنا ہے اور اس کے دشمنوں کی بھی کمی نہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ......"

"آپ اس بات سے پریشان نہ ہوں موہن کمار صاحب!" میں نے پہلی بار مداخلت کرتے ہوئے اس سے متانت بھرے انداز میں کہا۔ "میری ذاتی مہمات اپنی جگہ، مگر تقدیر اب بھی میرا ساتھ دے رہی ہے، میرا ایک بھی خواہ ناکام ہوتا ہے، یا ہاتھ سے جاتا ہے تو دوسرا تیار ہوتا ہے۔ صورتِ حال کچھ مخدوش ضرور ہو چکی ہے، لیکن میں ناامید نہیں ہوں، اب بھی ترپ کے کئی پتے میرے ہاتھ میں موجود ہیں۔ آپ کا تھوڑا ساتھ درکار ہے......"

"اس کی تم چنتا مت کرو......" وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا کر بولا۔ "میں ہر طرح سے تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔ تم مجھے بتاؤ کہ میں فوری طور پر تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں؟"

"میں ابھی بھجوانی کے ساتھ ایک معاہدے کے عمل سے گزر رہا ہوں، جو شاید آج ہی کسی نتیجے تک تو پہنچ جائے گا، لیکن اس کے علاوہ مجھے ایک اور شخص سے بھی آج ہی ملاقات کرنی ہے، اس کے علاوہ میں نے کچھ بیرون ملک ٹیلی فونک رابطے بھی کرنا ہیں اگر ممکن ہو تو......؟ یہاں کسی سیکیورٹی یا ٹیلی فونک کال ٹریسنگ کا کوئی ایشو تو نہ ہوگا؟"

"بالکل نہیں، تم بلاجھجک یہاں سے کہیں بھی فون کر سکتے ہو۔" اس نے کہا اور پھر اپنا سیل فون میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "اسے یوز کرسکتے ہو ایزی لی۔" میں نے فون لے کر ڈائریکٹ زہرہ بانو کے سیل فون پر اس سے رابطہ کیا، دوسری طرف بیل ٹون جا رہی تھی۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

"ہیلو......" دوسری جانب سے شناسا آواز سنتے ہی میں نے وقت ضائع کیے بغیر کہا۔

"ہاں......ہیلو، زہرہ......! یہ میں ہوں شہزی!"

"او...... مائی گاڈ! شکر ہے خدا کا، تمہاری آواز تو سنی...... تت...... تم کہاں ہو؟ کک...... کیسے ہو؟ ابھی تک رابطہ کیوں نہیں کیا۔" وہ لرزتی کپکپاتی آواز میں بولتی چلی گئی تو میں نے اپنے لہجے کو قدرے پُرسکون رکھتے ہوئے کہا۔

"زہرہ! میں بالکل ٹھیک ہوں اور میرے پاس وقت کم ہے، مجھے جب بھی موقع ملتا ہے میں تم سے بات کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ سب سے پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تم نے

اول خیر سمیت، شکیلہ اور کبیل دادا کو میری تلاش یا کسی مدد کے لیے انڈیا روانہ کیا تھا؟"

میرے اس اہم سوال پر دوسری جانب یکلخت خاموشی سی چھا گئی اور اس لمحاتی خاموشی پر میرے اندر بے چینی کا ایک غبار سا اُٹھا۔ پھر فوراً ہی دوسری جانب سے زہرہ بانو کی خائف زدہ سی آواز ابھری۔

"ہاں! لل...... لیکن وہ تینوں ہی شاید کسی مصیبت کا شکار ہو گئے ہیں، اُن سے رابطہ نہیں ہو پا رہا......"

"لیکن میں نے منع کیا تھا میرے مشورے کے بغیر ابھی ایسا کوئی قدم نہیں اُٹھایا جائے گا۔"

"تم سے کوئی رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ ہم یہاں سب تمہاری طرف سے فکر میں مبتلا تھے، اول خیر تو اکیلا ہی انڈیا جانے کا قصد کیے بیٹھا تھا۔ شکیلہ بھی تیار تھی اس کے ساتھ جانے کے لیے اور کبیل دادا...... پر مجھے بھی حیرت ہوئی تھی۔ جب اول خیر اور شکیلہ نے تمہاری تلاش میں انڈیا جانے کی پوری تیاری باندھ لی تھی تو کبیل دادا پہلے ہی سے ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ میں بھی یہی چاہتی تھی، اور ہم کیا کرتے شہزی؟"

وہ آخر میں روہانسی سی ہو گئی۔ میں نے بھی اس سلسلے میں مزید کچھ نہیں کہا۔ بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ یہ لوگ میرے بہت کچھ لگتے تھے۔ بھلا اس طرح کیسے اور کب تک ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھ رہتے۔ لہٰذا میں نے فوراً موضوع بدل کر پوچھا۔

"ان تینوں کی روانگی کے بعد کب آپ کا ان سے آخری بار رابطہ ہوا تھا؟"

"انڈیا پہنچتے ہی کبیل دادا نے میری ہدایت کے مطابق مجھ سے رابطہ کیا تھا اور اپنے خیر خیریت سے وہاں پہنچنے کی تسلی بھی کروائی تھی، مگر اس کے دو روز بعد سے آج تک کوئی رابطہ نہ ہوا۔"

"آپ فکر نہ کریں...... میں نے یہاں ان کا کھوج لگا لیا ہے اور انشاء اللہ بہت جلد ان تینوں تک پہنچ جاؤں گا۔ اماں جان اور ابا جی کیسے ہیں؟"

"وہ بالکل ٹھیک ہیں، تمہاری طرف سے اماں جان فکر مند ہیں، میں نے انہیں ٹال رکھا ہے مگر کب تک، خیر...... یہ بتاؤ، کیا واقعی تم نے......"

"ہاں زہرہ! میرا یقین کرو اور بے فکر رہو، مگر محتاط بھی رہنا...... میں بہت جلد اول خیر وغیرہ سے جا ملوں گا...... اب فون بند کرتا ہوں، اور اب تم سے مستقل رابطے کا بھی کوئی بندوبست کرنے کی کوشش کرتا ہوں، اوکے پھر......؟" میں نے آخر میں اختتامی انداز میں کہا۔ زہرہ کا مجھے خدا حافظ کہنے کو جی نہ چاہا تو میں نے ہی اس سے تسلی تشفی کے چند الفاظ کہنے کے بعد خود ہی رابطہ منقطع کر دیا۔

"مجھے ذرا پرائیوی میں بھی ایک اور کال کرنی ہے اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو......" زہرہ بانو سے گفتگو کرنے کے بعد میں نے موہن کی طرف دیکھا۔

"شیور...... شیور...... آپ وہاں جا کر بات کر سکتے ہیں......" اس نے کھلے دل سے ایک طرف اشارہ کیا، میں اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کونے کی طرف چلا گیا اور وہاں کھڑے ہو کر دھڑکتے دل سے آنسہ خالدہ کا نمبر ملانے لگا، مگر پیہم کوشش کے باوصف دوسری جانب سے ایک ریکارڈ شدہ انگریزی میں یہی میسج ملا کہ وہ کہیں بزی ہے اور میرا کال میسج ملتے ہی وہ مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کرے گی، مگر میں نے اُسے وائس میسج دے دیا کہ میں خود ہی رابطہ کروں گا وہ نہ کرے، کیونکہ یہ میرا اپنا سیل فون نہیں ہے، وغیرہ۔

اس کے بعد میں نے موہن کے سیل فون کے لاگ ہسٹری سے زہرہ بانو اور آنسہ خالدہ کے نمبرز ڈیلیٹ کر دیے اور واپس ان کے درمیان صوفوں پہ آ کر بیٹھ گیا۔

ہم تینوں کے درمیان تھوڑی دیر تک ضروری اُمور پر گفتگو ہوتی رہی، اس کے بعد موہن نے کہا کہ وہ باہر جا رہا ہے اور جلد ہی لوٹنے کی کوشش کرے گا۔ گھر میں اس ادھیڑ عمر چوکیدار اور اس کی بیوی کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ موہن غیر شادی شدہ تھا۔ وہ سوشیلا کو مزید کچھ باتیں کہنے کے بعد تیاری کر کے رخصت ہو گیا۔

اب میں اور سوشیلا وہاں تنہا تھے۔ دونوں ملازم میاں بیوی قابل بھروسا تھے، جس کے بارے میں موہن نے بتایا تھا، لیکن باوجود اس کے جہاں تک میں ان سے رازداری برت سکتا تھا وہ برتنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نیز سوشیلا کے ذریعے میں نے انہیں کہلوا کر اپنی جگہ محدود کر دیا تھا۔

اس کے بعد میں ایک بار پھر سی جی بھوانی کی کلاس لینے اس کمرے میں آ گیا جہاں اسے رکھا ہوا تھا۔ اس کے "جل بھوجن" کے لیے میں ناشتے کی ٹیبل سے مکھن توس اور چائے کا ایک مگ اٹھا لایا تھا۔ وہ اسے "چکھانے" کے بعد میں اور سوشیلا قریب بچھی کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔

"تم چاہتے ہو کہ اس سلسلے میں بھولا ناتھ سے مدد لی جائے جو تمہارا حلیف ہے؟" میں نے اس کے چہرے پہ

اپنی نظریں جماتے ہوئے کہا۔
''اس کے سوا اور کوئی چارہ ہے تو تم بتا دو؟'' وہ بھی مکاری سے بولا۔ جبکہ میں اس کی شاطرانہ چال سمجھ رہا تھا۔
''بھولا ناتھ کو میں تمہارے بارے میں کیا بتاؤں گا؟ یہی کہ میں نے تمہیں یرغمال بنا رکھا ہے اور تم میرے ساتھیوں کی رہائی کے سلسلے میں میری مدد کرو؟''
''اس کے لیے تمہیں دوستانہ بنیادوں پر یہ معاملہ طے کرنا ہوگا۔''
''مثلاً؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
''ہم اپنی دشمنی بھول جاتے ہیں اور دوست بن کر ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔''
میں نے اس کی پُرفریب گفتگو میں آئے بغیر طنزیہ حیرت سے کہا۔ ''اچھا...... ابڑے سادھو ست بن رہے ہو بھوانی! میں تو اپنی دشمنی بھول جاؤں مگر تم نہیں بھولو گے اور میرے چنگل سے نکلتے ہی، سب سے پہلے میری ہی قبر کھودنے کی کوشش کرو گے۔ میرے ساتھیوں کی رہائی تو دور کی بات ہے۔ لیکن بہرحال ایک بات تو میں صاف گوئی سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر میرے ساتھیوں کی بہ خیریت رہائی کے سلسلے میں بھولا ناتھ میری مدد کر سکتا ہے تو میں تمہارے ریفرنس کے ذریعے اس سے ضرور ملوں گا۔ تم مجھے اس کا اتا پتا بتاؤ، اس سے کیسے ملا جائے؟'' میری بات پر وہ خبیثانہ انداز میں ہنسا اور بولا۔
''اس کے لیے تمہیں مجھے آزاد کرنا ہوگا اور ہم دونوں اس کے پاس چلیں گے۔''
اچانک کمرے میں ایک زوردار چٹاخ کی آواز گونجی اور ساتھ ہی بھوانی کی کراہ ابھری۔ میرے بھاری ہاتھ کا تھپڑ بڑے زور سے اس کے چہرے پر پڑا تھا۔
''ذلیل انسان! بھول جاؤ کہ میں تمہیں آزاد کروں گا...... میں تمہیں کُتے کی موت مارنے کا عزم لے کر ہی پاکستان سے چلا تھا۔ یاد رکھو! اگر میرے تینوں ساتھیوں میں سے کسی ایک کا بھی ذرا بال بیکا ہوا تو میں تمہارا وہ حشر کروں گا کہ بلیو تمسی سمیت را والے بھی کانپ جائیں گے۔ میرے ساتھیوں کی رہائی اب تمہارے ذمے ہے۔ لہٰذا تم خود کو کُتے جیسی موت مرنے سے بچانے کے لیے میرے ساتھیوں کی رہائی کے بارے میں میری مدد کرو۔''
ایک زوردار تھپڑ کھا کے اس کا چہرہ مارے ذلت اور طیش کے سرخ ہو رہا تھا مگر پھر دوسرے ہی لمحے اس پر وہی نسائی کا دورہ پڑا، وہ ہنسنے لگا۔ شاید اس نے اپنے ہی گھر میں میرے ہاتھوں اس ذلت آمیز شکست کو قبول نہیں کیا تھا، یہی سبب تھا کہ وہ ذہنی طور پر پاگل اور جنونی ہو رہا تھا، بولا۔
''تم جیت کر بھی ہارو گے شہزی! تم مجھے جان سے مارو گے اور اُدھر تمہارے تینوں ساتھیوں کو آدم خور وحشی قبیلہ والے بھون کر کھا لیں گے۔ میرے لیے یہ مہنگا سودا نہ ہوگا۔''
''میرے لیے بھی یہ مہنگا سودا نہ ہوگا بھوانی کُتے!'' میں نے وحشت ناک لہجے میں کہا۔ ''کیونکہ میں تمہیں پھر بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں اپنے سر سے کفن باندھ کر پاکستان سے یہاں تمہیں تباہ و برباد کرنے آیا تھا تو جزیرہ انڈیمان بھی میں جا سکتا ہوں...... کیا تم اب بھی اس خوش فہمی میں ہو کہ میں اپنے ساتھیوں کو چھڑانے کی سکت نہیں رکھتا؟ میں نے تو تم سے ایک سودا کرنا چاہا تھا، غیر مشروط...... میں اب زیادہ وقت ضائع نہیں کروں گا۔'' یہ کہتے ہوئے میں فیصلہ کن انداز میں اٹھا اور سوشیلا سے مخاطب ہو کر بولا۔
''سوشی...... ایک موٹا تکیہ لے کر آؤ......'' اس نے فوراً میری ہدایت پر عمل کیا اور ایک تکیہ لے آئی۔ وہ میں نے تھاما اور دوسرے ہاتھ سے پستول نکال لیا اور اس کی نال تکیے سے لگا کر بھوانی کے قریب آ گیا۔ میری آنکھوں اور چہرے پہ خونخواری اور سفاکیت عروج پہ پہنچی ہوئی تھی جسے محسوس کر کے بھوانی کا چہرہ سفید پڑنے لگا۔
''م...... مجھے مت مارو...... میں تمہاری مدد کے لیے تیار ہوں۔''
''ہرگز نہیں...... تم اب مجھ پر بوجھ بن چکے ہو، میں نے تمہارے ساتھ بہت وقت برباد کر لیا۔'' کہتے ہوئے میں نے پستول کی نال لگا تکیہ اس کی کنپٹی کے ساتھ لگا لیا۔ سوشیلا نے پھیلی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اپنے دونوں کانوں پہ ہاتھ رکھ لیے اور چہرہ بھی اس میں چھپا لیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ بھوانی کو خوف زدہ کرنے کے لیے اداکاری نہیں کر رہی تھی۔ لیکن بھوانی پر اس کا خاطر خواہ نفسیاتی اثر پڑا۔ وہ گھگیاتے ہوئے دوبارہ رحم طلب لہجے میں مجھ سے بولا۔
''د...... دیکھو...... م...... میری وجہ سے تمہارا کام بلاتاخیر ہو جائے گا...... مجھے ابھی فون دو...... میں بھولا ناتھ کو فون کرتا ہوں...... تم اس سے جا کر ملو...... وہ تمہیں فل سپورٹ کرے گا میری وجہ سے......''
پستول کے ٹریگر پر میری انگلی رک گئی۔ میں بھی چاہتا تھا وہ میری وحشت تلے زیر ہو گیا تھا اور وہی کچھ

کرنے پر مجبور ہو گیا تھا جو میں اصل میں چاہتا تھا۔

یقینی موت کو آنکھوں کے سامنے دیکھ کر اچھے اچھوں کا پانی پتا ہو جاتا ہے۔ اگرچہ میرے ہاتھوں اپنی ذلت آمیز اور عبرت ناک شکست کو دیکھ کر مکار بھوانی نے ابتدا میں مجھے یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ وہ پاگل اور جنونی ہو کر اپنی موت سے بے پروا ہو گیا ہے اور یوں میں اپنے ساتھیوں کے اس کے ہاتھوں یرغمال ہونے پر اسے زندہ چھوڑنے پر مجبور ہو جاؤں گا، لیکن جب اس نے محسوس کیا کہ میں چالاک ہے (اگرچہ اس میں حالات کا ڈرامائی رخ بدلنے کا بھی دخل تھا) اس سے بہت کچھ اگلوانے میں کامیاب ہو گیا ہوں اور اب میں نے بھی اس کی چنداں پروا نہ کی ہے اور از خود اپنے ساتھیوں کو تلاشنے کا پختہ عزم کیے ہوئے ہوں تو وہ سمجھ گیا کہ اب مجھ سے معاملہ داری کے سوا کوئی چارہ نہیں، اس طرح کم از کم اس کی موت کچھ گھڑیوں یا کچھ دنوں کے لیے ٹل تو جائے گی، یوں وہ مجبور ہو گیا تھا کہ اپنی کوئی بات منوائے بغیر میری مانتا جائے۔

میں نے فوراً سوشیلا کو اشارہ کیا۔ وہ کارڈلیس فون لے آئی۔ میں نے بھوانی سے کہا۔ ”میں فون تمہارے کان سے لگا رہا ہوں، لیکن یاد رکھنا! کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش بھی نہ کرنا، نہ ہی کوئی اضافی یا معنی خیز جملہ بولو گے، یوں بات کرو گے، جیسے تم کسی کی قید میں نہیں بلکہ اپنے ہیڈ کوارٹر کی پرتعیش نشست گاہ میں بیٹھے ہو، سمجھ گئے؟“

وہ اپنے خشک پڑتے ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ ”اس کے لیے بہتر ہو گا کہ تم از کم میرے دونوں ہاتھوں کو آزاد کر دو، اس طرح میں پورے اعتماد سے بات کر سکوں گا اور بھولا ناتھ کو شبہ تک نہ ہو گا کہ میں کسی کی قید میں یا دباؤ میں بات کر رہا ہوں۔“

میں نے ہونٹ بھینچ کر غور کرنے کے انداز میں اس کے مکروہ چہرے کی طرف دیکھا اور پھر سوشیلا کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھی اور بھوانی کے دونوں ہاتھوں کو آزاد کر دیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو سہلایا اور پنجے کھول بند کر کے انگلیوں کی ورزش کی، اس کے بعد میری طرف دیکھ کر بولا۔

”لاؤ..... فون مجھے دو۔“

میں نے کارڈلیس اس کی طرف بڑھانے سے پہلے اس کا اسپیکر آن کر دیا تھا، تا کہ دوسری جانب سے بھولا ناتھ کی جوابی گفتگو میں بھی سن سکوں۔ وہ نمبر پنچ کرنے لگا، میں بغور اس کی ایک ایک حرکت کو جانچ رہا تھا۔ نمبر ملانے کے بعد اس نے ریسیور اپنے کان سے لگا لیا۔

”ہیلو.....“ دوسری جانب سے ایک گمبھیر سی آواز ابھری۔ میں نے اپنی بھویں سکیڑ لیں اور تمام حسیات مع سماعت اس طرف مرکوز کر دیں۔ بھوانی کی ذرا سی بھی غلطی بھارت کے ایک بڑے زیر زمین ”ڈان“ کو میرے پیچھے لگا سکتی تھی، جبکہ میں یہاں پہلے ہی کئی شکاری اور خونخوار کتوں سے بچتا پھر رہا تھا۔

”ہیلو..... بھوانی اسپیکنگ! کیسے ہو دادا؟“ رابطہ ہوتے ہی بھوانی نے کہا۔ لہجہ اور انداز نارمل تھا۔

”آخاہ..... بھوانی صاحب! نمستے..... زہے نصیب! بڑے دنوں بعد یاد کیا اس غلام کو..... کہیے کیسے مزاج ہیں صاحب سرکار کے.....! پہلی بار ایک اجنبی نمبر سے غلام کو یاد کیا، خیریت تو ہے ناں جناب.....؟“

مجھے بھولا ناتھ کا لب و لہجہ کسی تیسرے درجے کے اسٹریٹ لوئر کلاس بدمعاش کا سا محسوس ہوا تھا۔ ایک بڑے ڈان کا جو رعب اور دبدبہ ہوتا ہے وہ اس میں عنقا تھا یا پھر شاید وہ..... بھارتی ایجنسی کے ایک بڑے سربراہ کرنل سی جی بھوانی سے مخاطب تھا اور خود کو اسی لیے اس نے ذرا ”نیما“ رکھ کر گفتگو کرنے کا انداز دانستہ اختیار کر رکھا تھا لیکن اس کا آخر میں نمبر کے بارے میں استفسار کرنا مجھے کچھ بے چین سا کر گیا تھا، تاہم اس سلسلے میں بھی میں نے بھوانی کو خاص ہدایت کر رکھی تھی کہ اس نے کیا کہنا تھا۔

”ہاں، دادا! بس ایک فوری مجبوری کے تحت دوسرا نمبر استعمال کرنا پڑا، میں دوبارہ اس نمبر پر نہیں ملوں گا۔ ویسے سب خیریت ہی ہے، تم سے ایک کام آن پڑا ہے دادا.....!“ بھوانی نے اس سے کہا۔

”حکم حکم صاحب سرکار.....! کیسا کام آن پڑا ہے اس غلام سے.....؟“

میں نے بھوانی کو فون دینے سے پہلے سمجھا دیا تھا کہ اس نے اول خیر وغیرہ کی رہائی کے سلسلے میں کس طرح اور کیا گفتگو کرنا تھی۔

”ایک آدمی بھیج رہا ہوں تمہارے پاس..... اسے تمہاری مدد کے ساتھ فل سپورٹ بھی چاہیے، باقی کام کیا ہے، یہ وہ خود ہی وہاں آ کر تمہیں بتائے گا۔“

دوسری جانب سے دھڑکتی خاموشی چھائی رہی، میری بے چین اور تکتی ہوئی منتظر سماعتوں کو بھولا ناتھ کی یہ لمحاتی خاموشی بری طرح کھلنے لگی، جلد ہی وہ بولا۔

”بھیج دو اسے..... میرے پاس.....“

اس بار جانے کیوں مجھے بھولا ناتھ کے لہجے میں وہ

فدویانہ پن محسوس نہیں ہوا، جس نے میری چھٹی حس کو کھٹکا دیا۔ تاہم میں تیزی سے سوچتے ذہن رسا میں اس گروش خیال کو نہ نکال پایا تھا کہ یہ معاملہ اتنا آسان نہیں ہے، جتنا کہ میں اس کی اُمید رکھے ہوئے تھا۔

''اوکے وادا! ابھی بھیج رہا ہوں...... ذرا خیال رکھنا......'' کہہ کر بجوانی نے رابطہ منقطع کر دیا اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے کارڈلیس ریسیور میری جانب بڑھا دیا۔ مجھے اس کی مسکراہٹ میں کسی شاطرانہ چال کی بو آتی محسوس ہوئی تھی، یا پھر میں کچھ ضرورت سے زیادہ ہی احتیاط پسند تھا۔

''بھولا ناتھ سے ملنے کے لیے مجھے کہاں جانا ہوگا؟'' میں نے اندر ہی اندر کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے اس سے پوچھا۔ اس نے مجھے ممبئی کے کسی ہوڑا کلب نامی جگہ کا پتا بتایا۔ اس کے بعد سوشیلا نے میرے اشارے پر اس کے دوبارہ ہاتھ جکڑ بند کر دیے۔

''تم واقعی بہت جینئس ہو شہزی! بڑے سپر طریقے سے آگے بڑھ رہے ہو......''

دوسرے کمرے میں آتے ہی سوشیلا نے شوخ لہجے میں مجھ سے کہا۔ جبکہ میرے چہرے پر اتھاہ خاموشی کا راج تھا۔ تاہم میں نے اس کے سامنے والا صوفہ سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا خیال ہے...... غلط ہے سوشی......!''

''واٹ؟'' وہ چونک کر میری جانب سوالیہ آمیز اُلجھی نگاہوں سے تکنے لگی۔

''میرے دشمن مجھ سے زیادہ مکار اور چالاک ہیں، اگر میرا خدشہ درست ہے، تو ہم سے ایک فاش غلطی ہو چکی ہے اور شاید ہم اس مکار بجوانی کی چال میں آ گئے ہیں۔''

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا اور یکلخت سوشیلا کا کھلا کھلا چہرہ بجھ سا گیا، اس کی کشادہ اور حسین آنکھیں متوحش انداز میں پھیلی رہ گئیں۔ پھر اس کے منہ سے نکلا۔ ''کک...... کیا مطلب......؟''

''مطلب یہ کہ مشتری ہوشیار باش! خدا کرے میرا خدشہ باطل ہو، مگر میں اپنی چھٹی حس اور اپنے اندر کی اچانک بیدار ہونے والی کھٹک کو رد نہیں کر سکتا۔ آؤ میرے ساتھ...... اور غور کرتی رہو کہ میں نے اچانک کس خطرے کی بو سونگھ لی ہے......''

میں نے صوفہ چھوڑ دیا۔ سوشیلا متوحش سی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میرے پاس جو پستول تھا، اس میں فقط چار گولیاں تھیں۔

سوشیلا ابھی تک کچھ نہیں سمجھ پائی تھی۔ جبکہ میرے ذہن طباع میں ہنوز بجوانی کا یہ جملہ بار بار گردش کر رہا تھا جب بھولا ناتھ نے حیران ہو کر یہ کہا تھا۔

''...... پہلی بار ایک اجنبی نمبر سے غلام کو یاد کیا، خیریت تو ہے ناں جناب......؟''

تو جواب میں بجوانی نے کہا تھا۔

''ہاں، وادا! بس ایک فوری مجبوری کے تحت دوسرا نمبر استعمال کرنا پڑا، میں دوبارہ اس نمبر پر تمہیں ملوں گا۔ ویسے سب خیریت ہی ہے، تم سے ایک کام آن پڑا ہے وادا......!''

لیکن سب سے زیادہ کھٹک مجھے تب ہوئی تھی، جب آخر میں مجھے بھیجنے کے سلسلے میں بھولا ناتھ کا جوابی انداز ایک دم بدل گیا تھا اور اس نے یہ کہتے ہوئے ''بھیج دو اسے'' فوراً رابطہ بھی منقطع کر دیا تھا۔

ان باتوں سے قطع نظر ایک بات اور بھی اچانک میرے ذہن میں کسی جھٹکے ہوئے خیال کی طرح ''کلک'' ہوئی تھی کہ بجوانی نے چونکہ یہاں کے نمبر بلکہ لینڈ لائن نمبر سے بھولا ناتھ سے بات کی تھی اور ممکن تھا کہ بھولا ناتھ جیسا بڑا ڈان اس ''اجنبی'' نمبر سے کھٹکا ضرور ہوگا۔ کوئی بعید نہیں کہ وہ پہلے اس نمبر والے ٹھکانے کی اپنے طور پر تصدیق کرنے کی بھی کوشش کرتا۔

یہ بھی ممکن تھا کہ ایسا سرے سے ہی کچھ نہ ہوتا اور یہ ساری ''کھٹک'' محض میرے اپنے ذہن کی اختراع یا حد سے زیادہ احتیاط پسندی کا شاخسانہ ہوتی، لیکن جانے کیا بات تھی کہ میری چھٹی حس خطرے کی گھنٹی بجا رہی تھی کہ کہیں کچھ گڑبڑ ضرور ہو گئی تھی۔

سوشیلا ابھی تک کچھ نہیں سمجھ پائی تھی، اور سمجھ بھی نہیں سکتی تھی، کیونکہ وہ ایسے حالات سے نہیں گزری تھی، میں نے البتہ اُسے اپنے اس کھٹک آمیز شبہے سے آگاہ ضرور کر دیا تھا۔

میں سوشیلا کو لیے بنگلے کی چھت پر آ گیا اور اس کے چہار اطراف میں کسی مشکوک آدمی یا کسی اور قسم کی نقل و حرکت پر خود نظر آئے بغیر نگاہ دوڑاتے رہنے کی تاکید کی، اس کے بعد میں نے اُسے خود سے علیحدہ کر دیا۔

اب وہ بنگلے کے عقب اور دائیں بائیں نگاہ رکھے ہوئے تھی اور میں بنگلے کے بیرونی گیٹ اور اس سے باہر کی سڑک پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

جلد ہی مجھے سوشیلا کی سرگوشی نما آواز سنائی دی۔

''شہزی! ذرا اِدھر آؤ......'' میں تیزی سے جھکا جھکا اس کی طرف کو لپکا اور اس کے اشارے پر منڈیر کے دوسری طرف جھانکا اور میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ ایک کار پچھواڑے آن کھڑی ہوئی تھی اور اس کے اندر سے تین کسرتی جسم کے افراد برآمد ہوئے تھے۔ ان کے انداز و اطوار خاصے جارحانہ تھے، اور صورت سے ہی چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آتے تھے۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے دو نے عقبی دیوار سے اندر نقب لگائی...... ان کے پاس نقب زنی کا جدید اور خودکار مگر مختصر ترین سامان دیکھ کر میں بھی ششدر سا رہ گیا تھا۔ اپنے انداز و اطوار سے بھی یہ لوگ ٹاپ کیٹگری کے پروفیشنل دکھائی دیتے تھے۔ میرے بدترین خدشات کی تصدیق ہوچکی تھی۔

تیسرے آدمی کو میں نے مین گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ اس کا انداز البتہ اپنے دو ساتھیوں کی طرح چوروں جیسا نہ تھا، لیکن میں اس قبیل کے لوگوں کے کام کرنے کے انداز سے اچھی طرح واقف تھا۔

میں نے سوشیلا کو عقبی دیوار سے پھاند کر اندر دآنے والوں پر نگاہ رکھنے کی تاکید کی اور خود تیزی سے نیچے آیا اور گیٹ کی طرف بڑھا۔ وہاں وہی ادھیڑ عمر چوکیدار، اندرونی کیبن میں موجود تھا۔ میں لپک کر وہاں تک جا پہنچا، وہ مجھے اس طرح اندر داخل ہوتے دیکھ کر چونکا بھی اور پریشان بھی ہوگیا۔

''اِدھر ہی جمے رہو، دشمن یہاں پہنچ گئے ہیں۔'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر سرسراتی ہوئی سرگوشی کی۔

''وہ...... دشمن؟ کس کے دشمن؟'' وہ ہکلایا۔

''اس وقت وہ سب کے دشمن ہیں۔'' میں نے کیبن کے کھلے دروازے سے گیٹ کی طرف ایک نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ ''تمہارے پاس کوئی گن شن ہے؟''

''یہ ڈنڈا ہے۔'' اس نے پائپ والے ہیٹر سے لگائے ہوئے ایک موٹے سے ڈنڈے کی طرف اشارہ کیا۔

''تم اس ڈنڈے کے ساتھ اِدھر ہی رہو...... میں سب سنبھال لوں گا۔'' میں نے کہا اور گیٹ کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اندر کال بیل کی آواز سنائی دی۔ میں نے چوکیدار کو اشارہ کیا۔ وہ بغلی گیٹ کھولنے کے لیے آگے بڑھا اور میں اس کے دائیں جانب بڑے گیٹ کی آڑ لے کر کھڑا ہوگیا۔ پستول میں نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ پھر میری ہدایت کے مطابق چوکیدار نے بغلی گیٹ کھولنے سے پہلے آواز لگائی۔

''کون ہے؟''

''میں گیس کمپنی سے آیا ہوں، کنکشن چیک کرنا ہے، آپ کے پڑوسی نے شکایت کی ہے کہ آپ کی گیس باہر سے لیک کررہی ہے۔'' باہر سے جواب آیا۔ میں نے اشارہ کیا۔ چوکیدار نے جیسے ہی دروازہ کھولا۔ اچانک کسی نے اس کی کنپٹی کے ساتھ پستول کی نال لگا دی اور محتاط انداز میں اندر قدم رکھا، میں پہلے ہی تاک میں تھا، اس کی جھلک دیکھتے ہی میں نے اپنے پستول کی نال اس کی کنپٹی سے لگا دی۔

''خبردار...... میری اُنگلی ٹریگر پر ہے، کوئی غلط حرکت مت کرنا۔'' میں نے غراتی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔

وفعتاً اندر چیخ کی آواز ابھری، یہ نسوانی چیخ تھی، اسی وقت گولی چلی۔ میرا دھیان لمحے بھر کو بھٹکا۔ پھر ایک اور گولی چلی، میرے منہ پر خون کے چھینٹے پڑے، خطرہ محسوس کرتے ہی میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ جھکائی دی، اسی وقت کسی کا بے سدھ وجود مجھ پر گرا، یہ اس بدنصیب چوکیدار کا تھا، جسے وہ بے رحم اپنے پستول کی گولی اس کے سر میں اتار کر ہلاک کر چکا تھا۔ میں نے اسی کے وجود کے سہارے اس قسائی کو دھکا مارا، وہ مجھ پر بھی گولی چلانے والا تھا، اندر لگتا تھا، اس کے دونوں ساتھیوں نے اپنی ''کارروائی'' کا آغاز کر دیا تھا۔ اگرچہ نسوانی چیخ پر میرا خدشہ سوشیلا کی طرف گیا تھا، مگر وہ نسوانی چیخ میرے لیے اجنبی تھی۔

دھکا اس کے لیے بھی غیر متوقع تھا، اسی لیے وہ سنبھل نہ سکا اور لڑکھڑا گیا، مگر اس نے اپنے پستول کو ہاتھ سے گرنے نہیں دیا تھا اور لڑکھڑانے کے دوران ہی اس نے مجھ پر گولی چلانے کی کوشش کی تھی، میں اب اسے دوسری بار گولی چلانے کا موقع کہاں دینے والا تھا، اس سے پہلے ہی میرے پستول کی نال نے دھاکے سے شعلہ اُگلا، وہ آواز نکالے بغیر ڈھیر ہوگیا، میری گولی اس کی پیشانی میں پیوست ہوگئی تھی، میں طوفانی بگولے کی طرح پلٹا اور مرکزی دروازے کی طرف لپکا ہی تھا کہ بری طرح ٹھٹکا، ایک درانداز، جس کے ہاتھ میں پستول تھا، میرا نشانہ لینے کی کوشش میں تھا، میرے پاس پلٹنے یا رک کر کہیں پیچھے ہٹنے کا نہ وقت تھا نہ موقع، تاہم میں نے اسی طرح دوڑتے ہوئے، ایک ''اسکائی جمپ'' لیا، گولی چلی، مگر نشانہ خطا گیا۔ چھوڑا اسے میں نے بھی نہیں تھا اور...... دوران جمپ ہی اس پر فائر جھونک مارا...... ورنہ میرے زمین پر آتے آتے یہ

دوسرا فائر کر کے مجھے جاں بہ حق کر سکتا تھا۔ اُدھر میری چلائی ہوئی گولی اس کے سینے میں پیوست ہوئی اُدھر میں اس کے بالکل قریب جا پڑا۔ پھر اس کی لاش "ٹاپ" کر پھلانگ لاؤنج پر اپنے جوتوں کے پھسلواں سولز کے باعث گویا اسکیڈ کرتا ہوا، اندر نشست گاہ کے دروازے سے جا ٹکرایا، میری توقع کے عین مطابق وہ اندر سے کھلا ہوا تھا۔ وہاں میں نے تیسرے درانداز کو ایک عورت کی قالین پر پڑی لاش کے قریب کھڑے پایا، جس نے سوشیلا کو گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا، وہ اس سے شاید بھجوانی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

مجھے ان کی غیر معمولی خوداعتمادی پر حیرت ہوئی تھی کہ انہوں نے کس طرح محض ایک اندازے کی بنیاد پر یہاں دراندازانہ وار اور بے دریغ شب خون مارا تھا، یا پھر ان کا لائن آف ایکشن ہی ایسا تھا، ان کے سامنے بے گناہ انسانی جان کی کوئی وقعت نہ تھی، ماسوائے اپنے مذموم اور ناپاک مقاصد کی تکمیل کے...... کیا غلط تھا کہ اُدھر ان کا اندازہ درست ثابت ہوا اور اُدھر میری چھٹی حس نے مجھے بروقت کھٹکا دیا۔ بس احتیاط اندازی کی گھات اور مات کے درمیان تماشائے خوں رنگ کی ابتدا ہوگئی۔

تیسرے درانداز نے بری طرح چونک کر میری طرف دیکھا تھا اور اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا، شاید اُسے توقع نہیں تھی کہ میں اس طرح پستول بدست اس کے سامنے کسی طوفانی بگولے کی طرح آن پڑوں گا۔ ورنہ تو شاید وہ یہی سمجھے ہوئے تھا کہ اب تک اس کے دونوں "پروفیشنل" مار کا ساتھی مجھے ختم کر چکے ہوں گے۔

"پستول نیچے گرادو...... تمہارے دونوں ساتھی ختم ہو چکے ہیں۔" میں نے غراتی ہوئی آواز میں اس سے کہا۔ اُسے ابھی تک اپنے دونوں ساتھیوں کی ناکامی پر یقین نہیں آرہا تھا۔

اسی وقت گولی چلی، سوشیلا کے حلق سے غیر ارادی چیخ ابھری، اور ساتھ ہی اس آخری دشمن کی بھی، کیونکہ میری محتاط نظروں نے اس کے پستول کی لبلبی پر اس کی اُنگلی کو متحرک ہوتے محسوس کر لیا تھا اور میں نے گولی اس کے پستول والے ہاتھ پر ہی چلائی تھی۔ سوشیلا سلامت تھی۔ وہ محض خوف سے چلائی تھی۔

دشمن کے ہاتھ سے خون بھل بھل گرنے لگا۔ قالین پر پڑی لاش بدنصیب چوکیدار کی بیوی کی ہی تھی۔ دونوں ملازم ختم ہو چکے تھے۔

"کون ہو تم؟ اور اس طرح درانداز ہونے اور خون خرابا پھیلانے کا کیا مقصد تھا تمہارا؟" میں نے اس کی طرف گھورتے ہوئے پوچھا۔

"شہزی! یہاں سے اب فوراً نکلنے کی کرو...... پلیز! گولیوں کی آواز سن کر کسی نے پولیس کو فون کر دیا ہوگا۔" سوشیلا نے کہا۔ "یہ لوگ بھولا ناتھ ہی کے آدمی ہیں، یہ مجھ سے بھجوانی کے بارے میں ہی پوچھ رہا تھا۔"

اس کی بات ٹھیک تھی۔ اسی وقت اس درانداز نے دوڑ لگائی، میں نے اس پر آخری گولی چلا دی، جو اس کی ٹانگ میں لگی، وہ چیخ مار کر گرا، میں نے لپک کر اس کا گرا ہوا پستول اُٹھا لیا اور پھر اسے اسی طرح دبوچ کر گھسیٹتا ہوا، اسی کمرے میں لے آیا جہاں بھجوانی رسن بستہ حالت میں بندھا ہوا تھا۔ میں نے سوشیلا کو رسی کا بندوبست کرنے کا کہا۔

اُسے کوئی رسی تو نہیں ملی البتہ ایک مضبوط ریشمی ڈوری لے آئی، میں نے اسی سے اس کی بھی مشکیں کس ڈالیں۔

"ان دونوں کو لے چلنا ہے، جلدی...... تم کار اسٹارٹ کر کے دروازے کے قریب لے آؤ، چاہے قدرے پرے ہی کار کیوں نا چھوڑنا پڑ جائے۔"

سوشیلا نے ایسا ہی کیا۔ میں جب تک ان دونوں کی ایک ایک ٹانگ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا باہر تک لایا، سوشیلا کار مرکزی دروازے تک لا چکی تھی۔

میں نے دونوں کو عقبی سیٹوں پر پھینکا اور سوشیلا کے ساتھ والی سیٹ پر براجمان ہو گیا۔

اگلے ہی لمحے سوشیلا نے کار ریورس کی اور پھر گیئر بدل کر بڑا سا گیٹ توڑتی ہوئی باہر نکل آئی۔

کار ایک بار پھر فراٹے بھر رہی تھی۔

☆☆☆

کاشی رام کے بعد یہ ہماری دوسری "مددگار" پناہ گاہ تھی جو ہم سے اب چھوٹ گئی تھی۔ یعنی موہن...... ہم ایک بار پھر بے سروسامانی کے عالم میں تھے، جبکہ بھجوانی کے بعد اب ایک اور قیدی بھی ہماری گرفت میں آچکا تھا۔ سوشیلا کو میں نے کار کو سر دست مضافات کی طرف لے جانے کا کہا تو وہ ایک نگاہ ڈیش بورڈ کے فیول مانیٹر پر ڈالتے ہوئے بولی۔

"گاڑی میں پیٹرول کم ہے، ہمیں بھروانا پڑے گا۔"

"ہاہا...... ہا...... شہزی! تمہارے لیے یہاں کہیں بھی جائے پناہ نہیں، جہاں جاؤ گے، دھر لیے جاؤ گے، بہتر یہی ہے کہ میرے ساتھ معاملہ داری کر لو تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اچانک بھجوانی کی زہریلی آواز ابھری۔ میں پہلے ہی پریشانی کے سبب جھلایا ہوا تھا۔ اس کی بات نے گویا جلتی پرتیل کا کام کیا اور میں نے پُرغیظ انداز میں اپنے دانت بھینچ کر اس کے جبڑے پر ایک گھونسا جڑ دیا۔ اس کے حلق سے اوغ کی کریہہ ناک آواز خارج ہوئی اور منہ سے خون بہنے لگا۔ وہ بری طرح کھانسنے لگا۔ شاید خون اس کے حلق میں بھی اتر گیا تھا جو ٹھسکے کا باعث بنا تھا۔ کار میں پہلے ہی اچھا خاصا خون پھیل گیا تھا، کیونکہ بھولا ناتھ کا گرگا بھی زخمی تھا۔ اس نے بھی مجھے خطرناک نتائج کی دھمکی دی تھی، ایک گھونسا میں نے اس کے چہرے پر بھی جڑ دیا تھا، لیکن میں نے دیکھا بھجوانی کی حالت سنبھلنے میں نہیں آرہی تھی، اس کے جسم کو جھٹکے لگنا شروع ہو گئے تھے۔ میں سمجھ گیا وہ مکاری کر رہا ہے۔

''اسے سنبھالو...... اس کی حالت خراب ہو رہی ہے۔'' بھولا ناتھ کا گرگا مجھ سے خونخوار لہجے میں بولا۔

''جہنم میں جائے، یہ مکاری کر رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''تم نہیں جانتے یہ دادا کا محسن اور بہت قریبی دوست ہے۔ اسے کچھ ہو گیا تو اکھا (پورے) بھارت میں تمہیں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ دادا تمہارا جینا محال کر دے گا۔ تم پہلے ہی اس کے دو ساتھیوں کو ہلاک کر چکے ہو اور وہ اپنے ایک ساتھی کی ہلاکت پر دشمن کے پچاس آدمیوں کو موت کے گھاٹ...... اوغ......'' اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے میرا ایک زوردار پنچ اس کی ٹھوڑی پر پڑا تھا اور ایک بار پھر وہ خون تھوکنے لگا۔ وہ اپنے دادا (بھولا ناتھ) کے سلسلے میں کچھ زیادہ ہی رطب اللسان ہو رہا تھا۔

''وشش...... شہزی! بھجوانی کو دیکھو......'' اچانک ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان سوشیلا نے بیک ویو میں دیکھتے ہوئے مجھے مخاطب کیا اور میں نے بے سدھ سے پڑے بھجوانی کی طرف دیکھا تو اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ وہ رسن بستہ حالت میں ہونے کے باوجود گول مول سا ہو گیا تھا، اس کے منہ سے ابھی تک خون موٹی لکیر کی صورت میں بہہ رہا تھا۔

''کوئی ویران جگہ پر گاڑی روکو ذرا......'' میں نے کہا، میری آواز میں تشویش کی ہلکی سی رمق ابھر آئی تھی۔

ابھی ہم شہر سے ''ایگزٹ'' نہیں ہوئے تھے۔ تاہم ذرا دیر بعد سوشیلا نے کوئی ویران سا علاقہ دیکھ کر کار روک دی۔ یہ ریلوے یارڈ کا ایریا تھا، جہاں زیادہ تر شیڈس اور تھوڑے تھوڑے فاصلوں سے مال بردار بوگیاں کھڑی نظر آرہی تھیں۔

کار کے رکتے ہی میں نے بھجوانی کا جائزہ لیا۔ اس کی گردن پر اپنے ہاتھ کی چار انگلیوں کی پشت رکھ کر شہ رگ کو چیک کیا جو خاموش تھی، پھر دل پر ہاتھ رکھا اور اس کی ایک آنکھ کے پپوٹے کو اٹھا کر دیکھا اور پھر اپنے حلق سے ایک گہری سانس خارج کر کے بولا۔

''کرنل سی جی بھجوانی کا دیہانت ہو گیا ہے۔''

''کیا......؟ تت...... تم نے اسے ہلاک کر دیا؟'' گرگا پھر چلایا۔

''ہاں! مگر مجھے اس کی موت کا کوئی افسوس نہیں ہے، جلد یا بدیر میں نے اسے نرک میں پہنچانا ہی تھا۔ البتہ اس بات کا مجھے افسوس ہے کہ یہ پہلے مر گیا۔ خس کم جہاں پاک......'' میں نے اچانک بے پروا انداز میں کہا اور پھر بھجوانی کی لاش کو ٹانگ سے گھسیٹ کر اسی طرح رسن بستہ حالت میں کار سے باہر زمین پر پھینک دیا۔ یہ قابل نفرین شخص یوں بھی کسی طور پر رحم کے قابل نہ تھا۔ یہ وہ شخص تھا جو ایک طویل عرصے تک میرے باپ کو قید میں رکھ کر انسانیت سوز تشدد کا نشانہ بناتا رہا تھا۔ یہی وہ بڑا دشمن تھا جو میرے وطن کو دولخت کرنے والوں کی لابی سے تعلق بھی رکھتا تھا، ''را'' میں اس کا ایک بڑا عہدہ تھا، جسے بعد میں صرف پاکستان کے خلاف مذموم سازشوں کے لیے استعمال کرنے کے لیے الگ ونگ ''میلو تنبی'' کی بنیاد ڈال کر اس کا سربراہ بن گیا۔ نیز میرے ذریعے پاکستان اپنی قید اپنے ایک اہم ترین جاسوس سندر داس سکینہ کو رہائی دلوانے کا خواب بھی اس کے ساتھ ہی جہنم میں بھسم ہو گیا تھا۔

سامنے کچرے کا ڈھیر تھا، بھجوانی کی لاش کو میں نے اس طرف گھسیٹ کر ڈال دیا۔ وہ اسی قابل تھا۔ اس کے بعد دوبارہ کار کی طرف بڑھا۔ دور ''لوکو شیڈ'' کی طرف کسی انجن کی وسل ابھری۔ میں کار کا دروازہ کھول کر گرگے کے ساتھ بیٹھ گیا۔

''تت...... تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔'' وہ مضروب ہونے کے باوجود زہر اُگلنے سے باز نہ آیا۔

''اس میں تمہارے دادا بھولا ناتھ کا قصور ہے، نہ وہ یہ مہم جوئی دکھانے کی کوشش کرتا نہ اس کا یہ حال ہوتا۔'' میرا اشارہ بھجوانی کی طرف تھا۔

''تم نے اپنی موت پر دستخط کر دیے ہیں۔'' وہ بھناتے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے پستول نکال کر اس کی گدی پر رکھ دیا اور غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔ ''مجھے بھولا ناتھ کے ٹھکانے پر لے چلو گے یا تمہیں بھی ٹرک میں پہنچا کر یہاں کچرے میں تمہاری لاش پھینک دوں۔''

''او...... بڑے دل گردے والے ہو...... بجائے دادا سے بچنے کے تم اس کے پاس جانا چاہتے ہو......'' وہ طنزیہ حیرت سے بولا۔

''بھجوانی کو بھی یہی خوش فہمی تھی کہ وہ کوئی بڑی شے ہے......وہ دیکھو، اس کا حشر......'' میں نے زہرخند لہجے میں اس سے کہا اور کھڑکی سے باہر ذرا دور کچرے کے ڈھیر کے قریب پڑی بھجوانی کی لاش کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔

''ہوں ں...... کم تو تم بھی نہیں لگتے ہو...... چلو پھر، میں تمہیں دادا کے ٹھکانے کی طرف لیے چلتا ہوں۔'' وہ بولا۔

''مجھے صرف اس کا ٹھکانا بتاؤ وہ کہاں ملے گا؟''

اگرچہ بھجوانی نے مجھے بھولا ناتھ کے چند ایک ٹھکانوں کے متعلق غیر واضح انداز میں بتایا بھی تھا تاہم میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا۔

''کس ٹھکانے کا بتاؤں تمہیں؟'' وہ پُرغرور لہجے میں بولا۔ ''دادا کے یہاں ہزاروں ٹھکانے ہیں...... کسی پل وہ یہاں تو کسی پل وہ کہیں اور ہوتا ہے۔''

میں نے دوسرا ہاتھ آہستگی کے ساتھ اس کی بائیں پسلی کی ہڈی کی طرف بڑھایا اور اس کی رگِ حساس مسل ڈالی، وہ ایک جھٹکے سے بےحس و حرکت ہو گیا۔

میں نے اسے بھی اٹھا کر بھجوانی کے قریب لے جا کر ڈال دیا۔

''یہ بھی گیا......؟'' میرے کار میں سوار ہوتے ہی سوشیلا بولی۔

''پورا نہیں، نصف گیا۔ کار آگے بڑھاؤ...... دور پرے موجود لوگ اسی طرف متوجہ ہونے لگے ہیں۔'' میں نے گرد و پیش پر ایک طائرانہ سی نگاہ ڈالتے ہوئے سوشیلا سے کہا اور اس نے فوراً کار آگے بڑھا دی۔

میں اب اس کے برابر والی سیٹ پر ہی بیٹھ گیا تھا اور کچھ سوچ کر اپنی جیب سے سیل فون نکالا۔

''واٹ......؟ یہ...... یہ تمہارے پاس کہاں سے آ گیا......؟'' وہ میرے ہاتھ میں سیل فون دیکھ کر چونکی۔

''اسی گرگے کی جیب سے نکالا تھا میں نے۔''

''اب کس کو فون کرنے لگے ہو؟''

''سب سے پہلے تو موہن کو کرنا چاہیے، تاکہ وہ موجودہ خطرے سے نہ صرف آگاہ ہو سکے بلکہ محتاط بھی ہو جائے، کیونکہ وہ خود بھی خطرے میں گھر چکا ہے۔ یوں بھی اس کی رہائش گاہ میں لاشیں موجود ہیں اور اُسے اپنے لیے پہلے تو کچھ قانونی کارروائیوں سے گزرنا پڑے گا۔ اب پتا نہیں وہ پولیس کو ہمارے بارے میں کیا کچھ بتاتا ہے؟''

''تم اس کی چنتا مت کرو۔'' وہ بولی۔ ''کچھ بھی ہو جائے موہن ہرگز ہمارے خلاف پولیس کو کچھ نہیں بتائے گا، ہاں! یہ الگ بات ہے کہ ہماری وجہ سے وہ بھی ایک بڑی مصیبت کا شکار ہونے لگا ہے۔ لیکن خیر! وہ بزدل نہیں ہے اور اس کے باوجود وہ ہماری ہر ممکن مدد پر عمل درآمد کرتا رہے گا، بشرطیکہ ہم اس کے ساتھ رابطے میں رہیں، یہ تم نے اچھا کیا کہ سیل فون ہتھیا لیا۔ لیکن مجھے نہیں لگتا کہ یہ زیادہ دیر ہمارے کام آ سکے گا، بہت جلد اس کی سم سیٹ ڈیڈ کر دی جائے گی۔''

''ہاں! یہ تو تمہاری بات ٹھیک ہے، میں ذرا ایک نظر جلدی سے اس کے کونٹیکٹ نمبروں کا جائزہ لے لوں......'' یہ کہتے ہوئے میں نے نمبروں کی فہرست چیک کی۔ بھرمار تھی نمبروں کی، کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ میں نے سرچ میں جا کر دیکھا، بھولا ناتھ لکھا، کوئی نمبر نہ آیا......

''مجھے جلدی سے موہن کا سیل نمبر بتاؤ......''

''لاؤ مجھے دو، میں خود ہی اس سے بات کرتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے، کار روک دو اور تم میری سیٹ پر آ کر آرام سے بات کرو اور ہاں...... اسپیکر آن کر دینا، تاکہ میں بھی اس کی بات سن سکوں اور اس کے بارے میں کچھ اندازہ قائم کر سکوں کہ اس کی گفتگو سے کیا تاثرات ظاہر ہوتے ہیں؟''

چند سیکنڈوں کے بعد کار روک کر ہم سیٹ بدل چکے تھے اور سوشیلا موہن سے باتیں کر رہی تھی۔ اس نے اُسے مختصر لفظوں میں ساری پیش آمدہ صورتِ حال کے بارے میں صراحت سے آگاہ کر دیا۔ مجھے موہن کی جوابی گفتگو سے اندازہ تو ہوا تھا کہ وہ یہ ساری ''مہابھارت'' سننے کے بعد کچھ متفکر تو ہوا تھا، تاہم اس نے سوشیلا کو تسلی دی تھی کہ وہ اس کی بالکل فکر نہ کرے، وہ محتاط بھی رہے گا اور اس صورتِ حال سے نمٹ بھی لے گا۔ تاہم اس بھلے مانس انسان نے فوری طور پر ہمارے لیے ایک اور محفوظ ٹھکانے کا بندوبست کر دیا۔ اس نے سوشیلا کو ایک جگہ کا پتا بتایا جو میں نے بھی ذہن نشین کر لیا۔ وہ گاندھی برج کے قریب واقع ایک کالونی

تھی، وہیں ایک گودام نما مکان تھا۔ مکان خالی تھا، موہن نے بتایا تھا کہ وہاں کوئی نہیں رہتا، اس پر تالا پڑا ہوا ملے گا اور اسے توڑ کر ہی ہمیں اندر داخل ہونا پڑے گا۔ وہ اسی کی ملکیت تھا۔

میں اور سوشیلا سیدھے وہیں پہنچے۔ یہ کوئی متوسط کالونی تھی اور یہاں زیادہ تر مزدور ٹائپ ہی لوگ رہتے دکھائی دے رہے تھے۔ مکان سوشیلا نے ہی تلاش کیا تھا، اس پر تالا تھا، میں نے کار کے ٹول بکس سے پانا نکال کر تالا توڑ ڈالا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ مکان زیادہ بڑا نہیں تھا، ایک ہی کمرا تھا اور اس کی حالت سے پتا چلتا تھا کہ یہاں کافی عرصے سے کوئی نہیں آیا ہوگا۔ مکان میں گندگی بھی بکھری ہوئی تھی۔ میں اور سوشیلا نے جیسے تیسے اس کی صفائی کر کے اسے کچھ گھڑی بیٹھنے کے قابل بنایا۔ اس کے بعد میں نے سوشیت کے موبائل پر رابطہ کیا۔

شکر تھا کہ سیل فون ابھی تک کام کر رہا تھا...... شاید ابھی تک آج والی مہم جوئی کی اطلاع بھولا ناتھ تک نہیں پہنچی تھی۔ سوشیت سے رابطہ ہوتے ہی وہ میری آواز پہچان کر بولا۔

''شہزاد صاحب! آپ کہاں ہیں؟ خیریت سے تو ہیں ناں؟ آپ فوراً گھوتر اجی کے پاس پہنچیں، میں بھی وہیں آرہا ہوں، اور میری کار......''

''بے فکر رہو، وہ صحیح سلامت ہے اور یہ بتاؤ گھوتر اجی کو تم نے ساری حقیقت بتادی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''جج...... جی ہاں! اسی وقت بتادی تھی۔'' وہ بولا۔

''وہ تم سے ملنے کے لیے بے چین ہیں، اور اپنی اکلوتی بیٹی پریتا کے غم اور ان درندہ صفت اہلکاروں کی انسانیت سوز بربریت پر بری طرح طیش کھائے ہوئے ہیں۔ انہیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے، وہ مجھ سے بیسیوں بار تمہارے بارے میں پوچھ چکے ہیں۔ پلیز! تم ان سے رابطہ کرلو، وہ تمہارے بھی کسی کام آسکتے ہیں، بھارت کی بڑی بااثر شخصیت ہیں گھوتر اجی......''

میں نے اسے تسلی بخش جواب دے کر رابطہ منقطع کر دیا اور سوچنے لگا کہ گھوتر اجی ان حالات میں میرے کیا کام آسکتا تھا؟ آیا اب بھجوانی جی کی ہلاکت کے بعد اس سے راہ و رسم بڑھانا ضروری تھا یا نہیں۔ جب میں نے اس سلسلے میں سوشیلا سے مشورہ چاہا، وہ فوراً بولی۔

''شہزی! ہم نے اپنے مشن کے دوران بدقسمتی سے بہت سے نئے دشمنوں کو بھی اپنے پیچھے لگالیا ہے۔ ممبئی کے ڈان بڑے اجڑ ورسوخ والے اور دشمنی کے معاملے میں بڑے سفاک اور خطرناک ہوتے ہیں۔ تمہیں بھی شاید اس حقیقت کا اندازہ ہو کہ اس بدبخت بھجوانی نے مرتے مرتے بھی ہمارے لیے بھولا ناتھ کی صورت میں ایک مصیبت کو ہمارے پیچھے لگا دیا ہے۔ ہمارا یہاں سوائے اللہ کے کوئی مددگار نہیں ہے۔ (اس کے منہ سے دوسری بار آج بھگوان کے بجائے اللہ کا ذکر سن کر مجھے اچھا محسوس ہوا تھا) لیکن ہمیں زمینی ناخداؤں کی مدد کی بھی ضرورت بہرحال پڑتی رہے گی۔ کاشی رام ہمارے کسی کام نہ آسکا، موہن ایک کاروباری شخص ہے، اگرچہ اس کی نیت پر شبہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے لیکن بہرحال وہ جیسے تیسے ہماری مدد میں شامل ہے۔ کیونکہ وہ خود بھی میری طرح کے ایل ایڈوانی سے اپنے بھائی اور اس کی فیملی کے قتل کا انتقام لینا چاہتا ہے، لیکن میرا نہیں خیال کہ وہ بھولا ناتھ جیسے بدمعاشوں کی دشمنی افورڈ کر سکے گا۔ کے ایل ایڈوانی والا معاملہ اور بات تھی، مگر یہ ممبئی کے ڈان...... ایک الگ معاملہ ہے۔''

''تو تم کیا کہتی ہو پھر؟ کاشی رام کی طرح اب موہن کو بھی خیرآباد کہہ دینا چاہیے؟''

''نہیں، یہ اب ہماری خودغرضی ہوگی۔'' وہ بولی۔ ''کاشی رام کا معاملہ اور تھا، موہن کا اور ہے، وہ ہماری وجہ سے پھنس گیا ہے۔ پولیس وغیرہ سے اپنی جان جیسے تیسے چھڑا بھی لے گا تو بھولا ناتھ اُسے نہیں چھوڑے گا، ہم تک پہنچنے کے لیے وہ موہن کو تختہ مشق بنا سکتا ہے۔''

میں اس کی بات پر غور کرنے کے انداز میں خاموشی سے اس کا چہرہ تکنے لگا۔

مردود بھجوانی مرتے مرتے بھی واقعی ہمیں ایک مصیبت میں ڈال گیا تھا۔ ورنہ تو بھجوانی والی مہم نمٹانے کے بعد میں نے کے ایل ایڈوانی کے پیچھے پڑنا تھا۔ مگر اب تو بھولا ناتھ سے ٹکراؤ ناگزیر نہیں تو لازمی ضرور نظر آتا تھا۔ اپنے تینوں ساتھیوں کی جزائر انڈیمان کے وحشی قبیلے ''کلی منجارو'' سے بھی رہائی کا مرحلہ سر کرنا تھا۔ ایک کے بعد ایک مہم گلے پڑ رہی تھی اور میں خود کو یوں سمجھتا، جیسے میں ایک دائرے میں گردش کر رہا ہوں، یوں لگتا تھا جیسے گھوم پھر کر دوبارہ وہیں آجاتا تھا، جدھر سے چلتا تھا۔ تقدیر بھی اگرچہ میرا ساتھ دے رہی تھی۔ ایک ہمدرد چھوٹتا تو دوسرا راہ میں گویا فرشِ راہ ہوتا، عجیب بات تو یہ تھی تینوں ہی ایک سے بڑھ کر ایک حیثیت کے حامل ملے تھے۔ کاشی رام پھر موہن اور اب یہ گھوتر اجی۔

''اس کا مطلب ہے سوشیت کی بات غور طلب ہے تو پھر ہمیں گھوتراجی کی طرف کا رخ کرنا چاہیے؟ اب تک اس کی جتنی تعریفیں سنی ہیں، اس کے مطابق وہ بھی کسی سے کم نہیں ہے اور...... کوئی بعید نہیں کہ وہ کم از کم میرے تینوں ساتھیوں کے سلسلے میں بھی کوئی مدد کر سکے۔''

''ہمیں اپنی آئندہ کی مہمات کے سلسلے میں ممبئی یا بھارت میں قدم جمانے چاہئیں۔'' سوشیلا بولی۔ ''اس طرح بھاگا دوڑی ہمارے لیے نقصان کا باعث بھی بن سکتی ہے۔''

''میں ابھی گھوتراجی سے بات کر لیتا ہوں۔'' بالآخر میں نے فیصلہ کیا، وہ خاموشی سے میرا چہرہ تکتی رہی۔

گھوتراجی سے رابطہ ہوتے ہی دوسری جانب سے ایک آواز ابھری۔

''کون؟''

''گھوتراجی؟'' میں نے فون پر استفسار یہ کہا۔

''کیا کام ہے اُن سے؟ اور تم کون ہو؟'' میں سمجھ گیا کہ یہ شخص اس کا کوئی پی اے ٹائپ کا آدمی ہوگا۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر اس سے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔

''بلا تاخیر میری گھوتراجی سے بات کراؤ...... اُن کی بیٹی پرنیتا کے بارے میں بات کرنی ہے۔''

''تت...... تم کون ہو؟''

''اگر اب مزید کوئی فضول سوال کیا تو میں فون بند کر دوں گا، بے وقوف انسان!'' میں نے اس بار قدرے برہمی سے کہا اور اس نے فوراً رابطہ ملا دیا۔

''ہیلو! کون؟''

''گھوتراجی! آپ سے میں اسی وقت ملنا چاہتا ہوں، مگر رازداری کے ساتھ، سوشیت نے آپ کو میرے بارے میں بتایا ہوگا۔'' دوسری طرف سے گھوتراجی کی آواز پہچان کر میں نے کہا تو اگلے ہی لمحے دوسری جانب سے اس کی بوکھلائی ہوئی اور کچھ جوش میں ڈوبی آواز ابھری تھی۔

''ہاں...... ہاں! مم...... مجھے سوشیت نے تمہارے بارے میں بتایا تھا، وہ بھی پہنچ رہا ہے...... تت...... تم افوراً میرے پاس آجاؤ...... رازداری کی کوئی چنتا مت کرو، بس آجاؤ۔'' کہتے ہوئے اس نے اپنا ایڈریس بھی سمجھا دیا۔

میں اور سوشیلا اسی وقت وہاں پہنچے۔ اس کی رہائش گاہ سمندر کے کنارے واقع تھی، جو بے حد عالیشان تھی۔ یہاں زیادہ تر بھارتی فلم انڈسٹری سے متعلق لوگوں کی ہی رہائش گاہ تھی۔ اس علاقے میں کسی غیر متعلق افراد کے داخلے کی بھی ممانعت تھی۔ تاہم اگر کوئی ''وزیٹر'' آ بھی جاتا تو اسے شناخت کرنے کے بعد ہی داخلے کی اجازت ملتی۔

مگر یہ بہت اچھا ہوا کہ ہمیں ایسی کسی کارروائی سے گزرنا ہی نہ پڑا، ورنہ خاصی مشکل پیش آجاتی۔ کیونکہ گھوتراجی خود ہی ایک لمبی چوڑی گاڑی میں ہمیں لینے وہاں آن پہنچا تھا اور ہمیں اپنا ''مہمان'' بتا کر ساتھ لے گیا۔

گھوتراجی مجھے شہزاد کی حیثیت سے ابھی تک نہیں پہچان پایا تھا۔ البتہ سوشیلا کو وہ فوراً پہچان گیا تھا، تب ہی گھوتراجی کا منہ حیرت سے کھلا تھا کہ میں نے اشارے سے اسے خاموش رہنے کی تلقین کر ڈالی اور وہ بے اختیار ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔

مین انٹرنس سے لے کر اس کی محل نما رہائش گاہ تک خاموشی رہی تھی۔ میں اور سوشیلا اس کی لمبی چوڑی سیاہ کار کی عقبی سیٹوں پر براجمان تھے۔ سوشیلا شاید یہاں پہلی بار آئی تھی اور کھڑکی سے باہر بھارتی فلمی صنعت کے مشہور ایکٹرز کی عالیشان محل نما کوٹھیوں کو حیرت و اشتیاق سے تکے جا رہی تھی۔ میرے لیے اس میں کوئی کشش نہ تھی۔ یہ پوش ایریا، ''جوہو'' روڈ پر واقع تھا۔ یہاں ہر وقت ساحل سے آنے والی مست خرام و نرم خوشنک ہواؤں کی پنکھ پنکھولیاں چلتی رہتی تھیں۔ ان ہواؤں میں گل بوٹوں کی مہک بھی رچی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

میں بھی وقت گزاری کے لیے یونہی قطار اندر قطار واقع ان عالیشان کوٹھیوں کی طرف تکے جا رہا تھا، چند جانے پہچانے بھارتی ایکٹرز کی رہائش گاہوں کے گیٹ پر میں نے چمکتی ہوئی نیم پلیٹ دیکھی تھیں۔ ان میں مجھے اجے دیوگن، امیتابھ بچن، سلمان خان، شاہ رخ خان اور عامر خان کے علاوہ، مشہور بھارتی ایکٹریسز کی بھی کوٹھیاں نظر آئی تھیں۔

کوئی اور ہوتا تو اس علاقے میں آنے پر اپنی خوش قسمتی ہی تصور کرتا، مگر میرے لیے ان میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ یہ فلم نگری درحقیقت ایک خواب نگری تھی۔ ایک شہر نگاراں تھا، عروس البلاد کی ایک الگ دنیا تھی۔

گھوتراجی کی رہائش گاہ بھی ان میں سے ایک تھی۔ گیٹ کے قریب پہنچتے ہی، سیاہ رنگ کے دو دروازے خودکار انداز میں سلائیڈ ہو گئے اور کار اندر داخل ہو گئی۔ وہاں ایک گن مین موجود تھا۔

رنگین کنکریٹ کی ایک دیدہ زیب روش پر کار رینگتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ روش کے اطراف وسیع لان تھا۔ وہاں روشنی تھی۔ وہ اعلیٰ نسل کے بلڈ ہاؤنڈ کتے سرگشت

کرتے نظر آئے۔ کار کو دیکھتے ہی وہ ہولے سے بھونکتے ہوئے اس طرف آگئے۔ خوب صورت سی محرابی بالکونی کے نیچے بنی کار پورچ میں رکتے ہی گھوتراجی نیچے اترا اور میں نے بھی اپنی طرف کا دروازہ کھولا۔ سوشیلا خوفناک صورت کتوں سے ڈر کے اپنی طرف کا دروازہ کھولنے کے بجائے میرے ساتھ ہی اتر آئی اور میرے پیچھے کھڑی ہوگئی۔

دونوں کتوں کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور کھلے خوفناک جبڑوں سے نکیلے شکاری دانتوں کی جھلک انہیں خاصا خوں خوار بنا رہی تھی۔ دونوں کتے مجھے سونگھنے لگے، میں خاموشی سے کھڑا رہا۔

"ٹائیگر...... جیکی...... گو آوے...... گو آوے......"

گھوتراجی نے تیز سی آواز سے کتوں کو ہشکارا اور وہ ہلکی سی "چیخ" مار کے دوبارہ لان کی طرف بڑھ گئے۔

کار پورچ میں اور بھی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ بعد میں ہماری کار کو وہی گیٹ پر موجود گن مین لے آیا تھا اور اسے چھوڑ کر واپس چلا گیا تھا، اور جاتے ہوئے اس نے گھوتراجی سے ہولے سے کچھ کہا تھا جسے میں نہیں سن سکا۔

"سوشیت بھی آیا ہوا ہے اور میرے کچھ مہمان بھی اندر موجود ہیں۔" وہ مینشن کے بیش قیمت اور خاصے موٹے محرابی چوبی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے گھوتراجی نے ہم سے کہا۔ "تم لوگ یہاں آرام سے بیٹھو، میں مہمانوں کو فارغ کر کے آتا ہوں۔"

میں اور سوشیلا ایک بڑے سے آرام دہ صوفے پر بیٹھ گئے۔ گھوتراجی ایک دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اسے گئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک میری عمر کا نوجوان لڑکا اسی دروازے سے برآمد ہوا۔ یہ سوشیت تھا، وہ ایک کھلنڈرا سا نوجوان تھا، مگر اس وقت اس کا چہرہ لٹکا ہوا تھا، وجہ ظاہر تھی کہ اسے اپنی منگیتر پریتا کے اس طرح بہیمانہ قتل پر بے حد افسوس اور دکھ تھا، غم اس کی آنکھوں سے گویا آنسوؤں کی صورت بہہ رہا تھا۔ اس نے ایک نظر میرے ساتھ بیٹھی سوشیلا پر ڈالی تھی اس کے بعد میری طرف دیکھ کر بولا۔

"آپ نے بہت اچھا کیا جو یہاں آگئے، گھوتراجی کو بڑی بے چینی سے تمہارے یا تمہارے فون کا انتظار تھا۔"

"اِدھر آجاؤ، یہاں بیٹھو......" میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ مجھے خاصا حواس باختہ بھی دکھائی دے رہا تھا اور کافی زیادہ پریشان بھی...... اس کا دکھ اپنی جگہ، لیکن مجھے اس کے چہرے پر چھائے غم کی چادر تلے کچھ اور بھی دبا محسوس ہوا۔ وہ میرے قریب سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ خاموش تھا۔

"گھوتراجی کا تمہارے ساتھ رویہ کیسا رہا؟"

اس کے لیے میرا یہ سوال اچانک تھا، اسی سبب اس نے قدرے چونک کر میرے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ لیکن پھر فوراً ہی وہ میرے سوال کا مطلب سمجھ کر ایک تلخ سی مسکراہٹ سے بولا۔ "وہ مجھے بھی اپنی لاڈلی اور اکلوتی بیٹی کی موت کا ذمے دار سمجھتے ہیں اور مجھ سے سخت خفا ہیں......"

مجھے اس کا اندازہ تھا، میں نے اس کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے دوسرا سوال کیا۔ "تم جانتے ہو اس وقت اندر گھوتراجی کے کون سے مہمان آئے ہوئے ہیں؟"

اس نے حلق سے ایک گہری ہنکاری خارج کرتے ہوئے جواب دیا۔ "میرے دیگر مقتول دوستوں کے والدین آئے ہوئے تھے، یہ لوگ مل کر قانونی طور پر خفیہ ایجنسی کے ان اہلکاروں اور ان کے سربراہ کے خلاف کورٹ اینڈ میڈیا ٹرائل کا پروگرام بناتے ہوئے ہیں...... لیکن......" وہ اتنا کہہ کر رکا۔

"لیکن کیا......؟" میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"وہ لوگ جا چکے ہیں کب کے، اس وقت گھوتراجی کے پاس اندر...... نانا شکور بیٹھا ہے۔"

"نانا شکور......!؟" میں اس نام پر چونکا۔

"کیا آپ جانتے ہیں اسے؟" سوشیت یکدم میری طرف دیکھ کر مستفسر ہوا۔

"کچھ زیادہ نہیں......" میں نے جواباً کہا۔ "فقط اتنا کہ وہ ممبئی کی زیر زمین دنیا کا ایک بڑا ڈان ہے۔"

"ہاں! آپ نے ٹھیک سنا ہے۔" وہ بولا۔

نانا شکور کا ذکر میں نے جہنم واصل سی جی بھائی کی زبانی سنا تھا، یہ بھولا ناتھ کا سخت حریف گروپ تھا۔ تو اس کا مطلب تھا کہ گھوتراجی کے نانا شکور سے تعلقات تھے۔ یہ میرے لیے ایک اچھی اور کافی حوصلہ افزا خبر تھی، جس نے ایک دم میری نظروں میں گھوتراجی کی اہمیت بڑھا دی تھی۔

"نانا شکور کے گھوتراجی کے ساتھ بڑے پرانے اور گہرے دوستانہ مراسم ہیں۔" سوشیت آگے بتا رہا تھا۔ "صاف نظر آتا ہے کہ گھوتراجی اپنی بیٹی پریتا کا انتقام لینے پر تلے بیٹھے ہیں، شاید انہیں خدشہ ہے، یا پھر...... یہ اندازہ کہ قانون بھی ان درندہ صفت اہلکاروں کا کچھ نہیں بگاڑ پائے گا اور گھوتراجی کسی صورت میں اپنی بیٹی کے قاتلوں کو

معاف نہ کرنے کے کا تہیہ کر چکے ہیں۔''
ابھی اس نے اپنی بات ختم کی ہی تھی کہ دروازے سے گھوترا جی اندر داخل ہوا، میں نے دیکھا اندر آتے ہی اس نے بڑی کڑوی اور ناگوار نظروں سے سوشیت کی طرف دیکھا اور پھر سخت لہجے میں بولا۔ ''باہر تمہاری کار کھڑی ہے، تم جا سکتے ہو......''

وہ بے چارہ منہ لٹکائے اُٹھ کھڑا ہوا، مجھے سلام کیا اور خاموشی سے کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

''اس بے چارے کا کوئی قصور نہیں ہے۔'' میں نے گھوترا جی کے رویے کا نوٹس لینے کے انداز میں دھیمے لہجے میں کہا۔ ''جتنا آپ کو اپنی بیٹی پربتا کی اندوہناک موت کا دکھ ہے اتنا ہی اسے بھی اپنی منگیتر کی موت کا غم ہے، پربتا نے مجھے بتایا تھا کہ سوشیت اور وہ دونوں آپس میں شدید محبت کرتے تھے۔''

''کک...... کیا میری بچی پری (پربتا) سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی......؟'' وہ حیرت اور دکھ کے ملے جلے تاثرات سے میری طرف دیکھ کر بولا تو مجھے اس کی حیرت پر حیرت ہوئی، کیونکہ میرے خیال کے مطابق سوشیت نے اس سیاہ رات والے واقعے کے بارے میں تفصیلاً اسے آگاہ کیا ہوگا، یا پھر گھوترا جی نے اس کی بات کو اہمیت نہ دی ہو۔

''ہاں!'' میں نے جواباً اپنے سر کو اثبات میں جنبش دیتے ہوئے مختصراً کہا۔

''لل...... لیکن کیسے؟ تم وہاں کیا کر رہے تھے؟'' وہ اُلجھی ہوئی نظروں سے میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے ہولے سے کھنکھارتے ہوئے ذرا معذرت خواہانہ انداز میں اس سے کہا۔

''میں پہلے، واش روم جانا چاہوں گا، اپنے اصل چہرے اور حلیے میں آنا چاہتا ہوں میں۔''

''ہاں...... ہاں، ٹھیک ہے جاؤ......'' وہ گومگو کے انداز میں بولا۔

تھوڑی دیر بعد میں اپنے اصل روپ میں اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ اپنا جواب سننے کے لیے بہت بے چین نظر آرہا تھا۔

''تم مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو؟'' بالآخر وہ میری طرف شاکی نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔ میں اس کی بات سن کر بے تاثر سی مسکراہٹ سے بولا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے گھوترا جی! میں تو خود آپ کے پاس کچھ کہنے بلکہ بعض ایسی حقیقتوں سے پردہ اٹھانے آیا تھا، جن کا جاننا آپ کے لیے بے حد ضروری تھا اور کارآمد بھی...... لیکن گھوترا جی اس سے پہلے آپ کے اعتماد کی ضرورت ہے۔''

''میں تم پر پورا وشواش کرتا ہوں، نوجوان! اور تمہاری کسی بات پر مجھے کوئی شبہ نہ ہوگا۔'' وہ پورے استحکام بھرے لہجے میں بولا اور میں نے ایک نظر قریب بیٹھی سوشیلا کی طرف دیکھا اور پھر دھیرے دھیرے گھوترا جی کو اپنے بارے میں ساری اور اصل حقیقت بتا دی، جسے وہ بڑے دھیان اور انہماک سے سنتا رہا، اس دوران اس کے چہرے پر کئی حیرت اور تشویش بھرے اُتار چڑھاؤ بھی آتے رہے، مگر درمیان میں اس نے کہیں بھی میری بات نہیں کاٹی۔

ساری رام کتھا سننے کے بعد (جس میں، میں نے ایل ایڈوانی اور طلسم نورہیرے کا ذکر نہیں دانستہ حذف کر گیا تھا) اس نے متحیرانہ انداز میں اپنے ہونٹ سکیڑ کر عجیب سی آواز اپنے حلق سے خارج کی پھر اپنا سر جھٹک کر بولا۔

''یہ سب سیاسی چکر اور ذاتی مفادات کا کھیل ہے۔ ورنہ دونوں طرف کی عوام امن اور بھائی چارے کی فضا چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادھر تمہارے ملک پاکستان میں ہماری بھارتی فلموں کا بھی چرچا ہے تو اِدھر انڈیا میں پاکستان کے ٹیلی وژن ڈرامے بڑے مقبول عام ہیں...... اور دونوں ممالک کے عوام یہاں اور وہاں کے فنکاروں سے بے حد محبت کرتے ہیں، یہ دونوں طرف کے عوام بھی بھی ایک دوسرے سے نفرت نہیں کر سکتے، اس لیے کہ ان کے رشتے دار وہاں اور ان کے رشتے دار یہاں بھی رہتے ہیں، ان دونوں ملکوں نے ایک طرح سے ایک دوسرے کے عوام کو پناہ دے رکھی ہے۔ بات بس ایک دوسرے کو برداشت اور دل سے تسلیم کرنے کی ہے۔ لیکن شہزاد احمد خان......''

گھوترا جی ذرا رک کر بولا تو اس کی آواز میں سچائی اور دیانت داری مترشح تھی۔

''ایک حقیقت یہ بھی ہے، جسے بتاتے ہوئے مجھے شرمندگی کا بھی احساس ہوتا ہے کہ بھارت کی ایک مخصوص لابی پاکستان کے خلاف اب بھی اپنے اندر زہر چھپائے ہوئے ہے۔ تم نے اب تک جو کیا وہ بھارت کے عوام کے خلاف نہیں، بلکہ ان کے خلاف کیا جو پُرامن سرحدوں میں شر اور فساد کا بیج بوتے رہے ہیں۔ تم نے سی جی بھجوانی اور ان درندہ صفت اہلکاروں کو ہلاک کر کے برا نہیں کیا، جنہوں نے

میری معصوم بیٹی اور ان کے بے گناہ دوستوں کے ساتھ درندگی آمیز اور انسانیت سوز سلوک کیا، وہ سب کیفرِ کردار کو پہنچ چکے۔''

گھوتراجی نے وہی کچھ کہا تھا، جو کسی بھی ملک کے عام آدمی کی آواز ہوسکتی ہے، اور یہ حقیقت بھی تھی کہ میں جب سے بھارت کی سرزمین پر تھا، میں نے یہاں کے کسی بھی عام فرد کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا، بلکہ جہاں تک ممکن ہوا تھا میں نے ان کی مدد ہی کرنے کی کوشش کی تھی۔

''گھوتراجی! مجھے خوشی ہوئی ہے کہ آپ ایک کھلے دل و دماغ کے وسیع النظر انسان ہیں۔'' میں نے صدقِ نیت سے اس کی توصیف کی۔ ''تاہم مجھے افسوس بھی ہے کہ میں آپ کی بیٹی پرتیا کی جان نہیں بچا سکا، حالانکہ وہ میرے ساتھ ہی تھی اور میں نے ہر ممکن ان کی مدد کرنے کی کوشش کی تھی، سوشیت کا بیان میری سچائی کا ثبوت ہے۔''

''آئی نو آل ریڈی...... مائی ڈیئر شہزی!'' گھوتراجی بولے۔

''اوکے گھوتراجی! میرے یہاں آنے کا مقصد پورا ہوا...... میں صرف آپ کی بیٹی پرتیا کے سلسلے میں آپ کو حقائق سے آگاہ کرنا چاہتا تھا، تاکہ آپ کسی ابہام کا شکار نہ رہیں، کیونکہ سوشیت آپ کو میری حقیقت بتا ہی چکا تھا، اس لیے بھی میرا یہاں آنا از بس ضروری تھا۔'' میں صوفے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''ارے...... رے...... تم کہاں چل دیے؟'' گھوتراجی بھی ایک پریشان کن حیرت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''ممبئی کا ایک بڑا ڈان بھولا ناتھ اس وقت تمہاری جان کا دشمن بنا ہوا ہے۔ تم نے میری سورگ باشی بیٹی پرتیا کے قاتلوں کو ان کے بھیانک اور عبرت ناک انجام تک پہنچایا ہے، تم نے ایک بڑا بوجھ میرے سر سے اُتار دیا، اب میں تمہیں بھلا تنہا کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟ بیٹھو ذرا...... اور میری بات بھی ذرا دھیان سے سنو!'' اس نے میرے قریب آکر میرا شانہ ہولے سے تھپتھپایا، میں ایک گہری سانس لے کر بیٹھ گیا۔

''بے شک تم نے بھارت کی سرزمین پر اپنے ایک بڑے دشمن کو ہی نہیں بلکہ یہاں کی خفیہ ایجنسی کے ایک بڑے سربراہ کو اس کے ہیڈکوارٹر سمیت ختم کر دیا ہے، لیکن شاید تمہیں اپنی اس بڑی فتح کے بعد پیدا ہونے والے کچھ ''آفٹر شاکس'' کا اندازہ نہیں ہے۔ اگر ہے بھی تو تم اسے کوئی اہمیت دینے کو تیار نہیں ہو۔ یہ پورا گینگ ہے، جسے تمہاری کمزوریوں کا علم ہے، سب سے بڑی کمزوری کو بھوانی بھی بھولا ناتھ سے ڈسکس کر چکا ہوگا، وہ ہے تمہارے ساتھی......

''مجھے ان ساری باتوں کا پورا اندازہ ہے گھوتراجی!'' میں نے گہری متانت سے کہا۔ ''اور میں اپنے ساتھیوں کی طرف سے بھی سخت فکر و تشویش میں مبتلا ہوں...... لیکن میں نہیں چاہوں گا کہ میرے یہاں دیگر خیرخواہوں کی طرح آپ پر بھی ''غدار'' یا ''دیش دروہی'' کا لیبل چسپاں ہو جائے۔''

''ڈیم اٹ......! مجھے اس کی چنداں پروا نہیں...... میں سب جانتا ہوں......'' گھوتراجی نے اپنا ہاتھ جھٹک کر بے پروایانہ انداز میں کہا۔ ''لیکن مائی ڈیئر شہزی خان! میں تمہیں جو بات سمجھانا چاہ رہا ہوں وہ اس سے زیادہ اہم ہے۔ بلیو تلسی اور اس کے سربراہ سمیت اہلکاروں کا کچا چٹھا تو میں عنقریب پرنٹ اینڈ الیکٹرانک میڈیا میں کھولنے ہی والا ہوں، مگر تم ان کے خاتمے کے باوجود محفوظ نہیں ہو یہاں...... بھولا ناتھ کسی ایک فرد کا نام نہیں ہے، یہ پورا ایک مافیا ہے۔ جس کی جڑیں بھارت کے کونے کونے تک پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ اس وقت تمہارے پیچھے پڑ چکا ہے۔ تمہارے تینوں ساتھیوں کی صورت میں ایک بڑی کمزوری بھوانی، بھولا ناتھ سے ڈسکس کر چکا ہے۔ بھوانی کی ایک اہم ساتھی کورنیلا بھی زندہ ہے۔ بھولا ناتھ تمہیں قابو کرنے کے لیے تمہارے تینوں ساتھیوں کو بھی یرغمال بنا سکتا ہے یا ان کی جانوں سے بھی کھیل سکتا ہے۔'' گھوتراجی نے جس طرح میرے ''پیش آمدہ'' حالات کا باریک بینی سے تجزیہ کیا تھا، وہ غلط نہ تھا۔

میں نے کہا۔ ''لیکن میرے ساتھی اس وقت انڈمان کے ایک وحشی قبیلے ''کل منجارو'' کی قید میں جا چکے ہیں اور نجانے وہ بے چارے کس حال میں ہوں گے، کچھ پتا نہیں۔'' میرے لہجے اور چہرے سے ازحد فکر و تشویش مترشح تھی، جسے محسوس کر کے گھوتراجی مجھ سے ازراہِ تسلی بولا۔

''میں اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ تم خود اس وقت ایک بڑے خطرے سے دوچار ہو، بھوانی اور بلیو تلسی کا چیپٹر تو ایک حد تک کلوز ہو چکا، تاہم یہ ممکن ہے کہ اب بھی ''را'' سمیت بھارتی خفیہ ایجنسی کے ایجنٹ تمہاری تلاش میں ہوں، لیکن تم اس کی فکر مت کرو، تم شاید نہیں جانتے کہ میرے بھی ممبئی کے ایک بڑے ''گینگسٹر'' سے تعلقات ہیں جو بھولا ناتھ کی ٹکر کا ہی گینگ ہے۔''

''ناناشکور نام ہے اس کا......'' میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔ میرا خیال تھا کہ اُسے حیرت

ہوگی، مگر وہ اس کا ذرا بھی اظہار کیے بغیر بولا۔

”ہاں! تمہیں شاید، سوشیلا نے بتایا ہوگا..... خیر! میں تمہاری ملاقات نانا شکور سے بھی کروا دوں گا۔ وہ اس سلسلے میں تمہاری زیادہ بہتر طور پر مدد کر سکتا ہے۔“

”آپ کی بڑی مہربانی گھوترا جی! لیکن میرے پاس اسٹے کرنے کا زیادہ وقت نہیں ہے، ارادہ تو میرا یہی ہے کہ کسی طرح انڈیمان کی طرف نکل جاؤں اور خود ہی اپنے تینوں ساتھیوں کی تلاش کے سلسلے میں کچھ کروں.....“

”امپوسیبل۔“ گھوترا جی سگار کا ایک کش لگاتے ہوئے بولا۔ ”اول تو دشمن سمیت بھارتی خفیہ اہلکار اس وقت بھارت کے چپے چپے پر تمہاری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ پھر جزائر انڈیمان کے بیشتر علاقوں میں بھولا ناتھ گینگ کا قبضہ ہے، میں تمہیں یہ بے وقوفی ہرگز نہیں کرنے دوں گا۔ تم آج رات یہاں آرام کرو...... اور مجھے صرف کل تک کی مہلت دو، میں نانا شکور سے مل کر کچھ کرتا ہوں۔“

اس کی بات پر سوشیلا نے جو میرے کافی قریب سرک آئی تھی، ہولے سے مجھے ٹہوکا دیا، اس کا مطلب یہی تھا کہ مجھے گھوترا جی کی بات مان لینی چاہیے، یوں بھی مجھے اس کی باتوں میں کافی وزن محسوس ہوا تھا۔ لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے۔ بھولا ناتھ کی ٹکر کا ایک اور بڑا ڈان...... نانا شکور میری مدد کر سکتا تھا تو کیا برائی تھی۔

میں نے گھوترا جی کا شکریہ ادا کیا۔

وہ رات ہم نے اسی کی پرتعیش رہائش گاہ میں گزاری...... اگلے دن صبح جاگے۔ گھوترا جی کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ اس کا پی اے جو وہیں موجود تھا، اسے ہمارے سلسلے میں گھوترا جو ہدایات دے گیا تھا، ان میں ایک ہدایت تو یہی تھی کہ میں اور سوشیلا باہر نہیں نکلیں گے، دوسرے یہ کہ لینڈ لائن فون استعمال... نہیں کریں گے۔

میرے پاس اب گھوترا جی کے انتظار کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

☆☆☆

سہ پہر کے قریب اس کی واپسی ہوئی تھی۔ اس کے ہمراہ دو افراد بھی تھے۔ ان کے چہرے ہر قسم کے جذبات سے عاری اور سپاٹ تھے۔ گھوترا جی نے مجھے بتایا کہ یہ دونوں نانا شکور کے خاص آدمی ہیں اور ہمیں ان کے ساتھ جانا ہوگا۔ میں تیار ہوگیا مگر سوشیلا سے میں نے یہی کہا کہ وہ ادھر ہی گھوترا جی کے پاس رہے، اس پر گھوترا جی نے بھی سوشیلا کو بیٹی کہہ کر یہی مشورہ دیا کہ وہ میری اس تازہ مہم سے دور ہی رہے، تو اس نے صاف انکار کر دیا اور ایک ذرا تنہائی کا موقع پاتے ہی وہ بولی۔

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا؟ میں تم سے ہرگز الگ نہیں ہونا چاہتی ہوں، بس!“

”لیکن......“ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ دوستانہ انداز کی دھمکیوں پر اُتر آئی۔ مثلاً یہ کہ اگر میں نے اسے خود سے دور کرنے کی کوشش کی تو وہ یہاں سے بھی کہیں اور چلی جائے گی اور ایڈوانی کی مہم پر بھی لعنت بھیج دے گی۔

میں جانتا تھا اگر وہ ایسا کرتی بھی تو زندہ نہیں بچ سکتی تھی، کیونکہ بلراج، سوشیلا کی جان کا دشمن بنا ہوا تھا، کیونکہ اسے اس کے گرو گھنٹال ایڈوانی نے ختم کرنے کا ٹاسک دے رکھا تھا۔ (مجھ سمیت) بالکل اسی طرح جس طرح اس جلاد صفت ایڈوانی نے اس کی بہن کی پوری فیملی کو بلراج سنگھ کے ہاتھوں بڑی بیدردی سے مروایا تھا۔

مجھے ہار ماننا پڑی اور اسے ساتھ لے جانے ہی بنی، نانا شکور کے یہ دونوں آدمی اپنی گاڑی میں آئے تھے، میں اور سوشیلا اس میں سوار ہو کر انجانی منزل کی طرف روانہ ہوگئے۔ ہم دونوں عقبی نشستوں پر سوار تھے۔

کار ذرا ہی دیر میں فراٹے بھرنے لگی۔ ممبئی کی گلیوں، بازاروں اور فٹ پاتھ کو دیکھ کر مجھے ان میں اور پاکستان میں کوئی خاص فرق دکھائی نہ دیا تھا۔

یہ سفر کوئی پون گھنٹے تک جاری رہا، اس کے بعد کار ایک ایسے علاقے میں داخل ہوئی جسے متوسط ہی کہا جا سکتا تھا۔ کار اس کی تنگ سی گلیوں سے گزرنے لگی۔ یہ سارا سفر گویا ایک دھڑکتی ہوئی خاموشی میں گزرا تھا اور اس دوران میں نے ان کی محتاط روی کو بڑی گہری نظروں سے جانچا تھا۔ کار چلانے والا اور اس کے برابر میں بیٹھا اس کا ساتھی، دونوں ہی دوران سفر سارے رستے گرد و پیش پر کڑی نگاہ ڈالتے رہے تھے۔

ایک نسبتاً تنگ سی گلی سے گزرنے کے بعد کار ایک ایسی بڑی سی عمارت کے سامنے رک گئی، جس پر مجھے کسی مکان یا رہائش گاہ سے زیادہ ایک بڑے سے گودام کا گمان ہوا تھا۔ باہر کچھ لوگ اِدھر اُدھر متر گشت کرتے دکھائی دیے۔ ایک اُچٹتی سی نگاہ انہوں نے ہم پر ڈالی تھی۔

کار ایک جھٹکے سے رکی تو وہ دونوں دروازہ کھول کر نیچے اُتر آئے، ایک کے اشارے پر میں اور سوشیلا بھی اُتر گئے تھے۔

عمارت بوسیدہ سی اور قدیم نظر آتی تھی، میں عمارت کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے ہمراہ سوشیلا کو لیے ایک دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔

ایک طویل سی نیم تاریک راہداری سے ہوتے ہوئے ہمیں ایک کمرے میں لایا گیا۔ کمرا مختصر فرنیچر کے ساتھ خالی پڑا تھا۔ ایک صوفہ اور دو کرسیاں رکھی تھیں۔ ایک لکڑی کی دیوار گیر کیبنٹ تھی، اسی دیوار کے اُوپر چھت کے قریب چوکور روشندان تھا۔ کمرے کی حالت بہتر تھی۔

''یہاں بیٹھ جاؤ......'' ان دونوں میں سے ایک نے سپاٹ لہجے میں کہا اور پھر وہ چلے گئے، دروازہ بند نہیں کیا گیا تھا، وہ بھڑا ہوا تھا۔ میں اور سوشیلا الگ الگ کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔

تھوڑی دیر گزری تھی، ایک ٹھگنا سا شخص اندر داخل ہوا، اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی، اس میں چائے اور کچھ بسکٹ اور پیسٹریاں رکھی تھیں، وہ ٹرے اس نے میز پر رکھ دی، پانی کی بوتل ایک کانچ کا گلاس بھی ٹرے پر موجود تھا۔

''ہمیں کتنی دیر یہاں انتظار میں بیٹھنا پڑے گا؟'' وہ ٹھگنا سا آدمی جب ٹرے رکھ کر اسی طرح خاموشی سے واپس لوٹنے لگا تو بالآخر میں نے پوچھ ہی لیا۔

''مجھے نہیں معلوم......'' اس نے رکے بغیر جواب دیا۔ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

ہمیں پانی کی طلب نہیں تھی، میں نے سوشیلا کو اشارہ کیا اور اُسے صرف چائے کا کپ بنانے کا کہا۔ اس نے بھی اپنے لیے چائے کا ہی انتخاب کیا۔

''ہم دونوں چائے کی چسکیاں لینے لگے اور یہاں کے ماحول پر دھیمے دھیمے لہجے میں گفتگو کرنے لگے۔

چائے ختم کی تھی کہ ایک سانولی رنگت کا شخص اندر داخل ہوا۔ قد اس کا دراز تھا اور جبڑے چوڑے، آنکھیں بڑی تھیں اور بھویں کھنچی ہوئیں، ناک لمبی تھی، بال سیجر کٹ تھے، یعنی بہت چھوٹے اور کانٹوں کی طرح کھڑے ہوئے۔ اس نے عام سا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ اس کے ہمراہ وہی دونوں آدمی تھے، جو ہمیں یہاں لائے تھے۔

میں اور سوشیلا اسے دیکھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے، کیونکہ اس شخص نے اندر داخل ہوتے ہی خیر مقدمی انداز میں ہماری طرف دیکھا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بھی بڑھایا تھا۔

''مجھے عبدالشکور کہتے ہیں...... بیٹھو!'' اس نے کہا، لہجہ اور آواز عام سا تھا، لیکن اس کی شخصیت میں مجھے ایک دبدبہ سا ضرور محسوس ہوتا تھا۔

اپنا مختصر سا تعارف کرواتے ہوئے وہ ہمارے سامنے والے صوفے پر براجمان ہو گیا، اس کے دونوں ساتھی اس کے پیچھے کھڑے ہو گئے تھے۔

''تم لوگوں نے کچھ کھایا پیا نہیں؟'' اس نے ایک نگاہ میز پر دھری ٹرے کی طرف دیکھ کر کہا۔

''چائے کی طلب ہو رہی تھی، وہ پی لی۔ آپ کا شکریہ!'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر جواب دیا اور منتظر رہا کہ وہ مقصد کی بات کی طرف آئے۔ مگر وہ بڑے غور غور سے میرا جائزہ لیے جا رہا تھا۔ ایک نگاہ اس نے سوشیلا پر بھی ڈالی تھی، مگر زیادہ تر اس کی نظریں میرے ہی چہرے اور وجود کا ایکسرے کرتی محسوس ہو رہی تھیں۔

''یقین نہیں آتا کہ تم نے تنِ تنہا، ایک غیر ملک، بلکہ ایک سخت حریف ملک میں اتنا بڑا معرکہ مارا ہے۔ ''را'' کے ایک پورے ونگ کو اس کے سربراہ سمیت نابود کر کے رکھ دیا...... اور سربراہ بھی کون...... جو بھارتی آرمی اور انٹیلی جنس کا ایک سابقہ سینئر آفیسر بھی رہ چکا تھا۔''

خیر اتنی کڑوی ہوگی میری ''متعلقہ'' معلومات کے مطابق اُس نے میرے بارے میں اپنی جس رائے کا اظہار کیا تھا، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ یہ ''ڈان'' قسم کے لوگ اپنی ذات میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے، ان کی جملہ طاقت اور ہیبت صرف اور صرف افرادی قوت پر منتج ہوتی تھی۔ اس سے باہر یہ کچھ بھی نہیں تھے۔ یہی سبب تھا کہ وہ میرے تنہا اس مشن کو سر کرنے پر اگر حیرت کا مظاہرہ کر رہا تھا تو وہ کچھ غلط بھی نہ تھا، لیکن میں اسے کیسے سمجھاتا کہ وہ ایک ڈان تھا اور میں ایک کمانڈو...... ایک ڈان کے پیشِ نظر صرف اور صرف اپنا ذاتی مفاد ہوتا ہے، جس کے حصول کے لیے وہ ہر غلط راستہ اختیار کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا...... جبکہ ایک کمانڈو کے پیشِ نگاہ اس کا عظیم مقصد اس کے وطن سے منسلک ہوتا ہے، جس میں عام لوگوں کی بقا و فلاح کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ پھر اس میں اللہ کی مدد اور اس کے نیک بندوں کی دعائیں شامل رہتی ہیں، بس! یہی ایک تنِ تنہا کمانڈو کی ''طاقت'' ہوتی ہے۔ اگر یہ ''فلسفہ'' میں اپنے سامنے بیٹھے ''ڈان'' کو بتاتا تو وہ شاید اس کے سر سے گزر جاتا۔ ہاں! یہ سوال ضرور اٹھتا ہے کہ اگر ایسا تھا تو پھر میں یہاں کیوں تھا؟ جواب یہی ہو سکتا ہے کہ اللہ نے کسی کو بے مقصد پیدا نہیں کیا، زمین پر رینگنے والے ایک حقیر کیڑے کا بھی ایک مقصد رکھا ہوگا، اسی طرح نا شکور جیسے ڈان کو......

انھی جیسے جرائم پیشہ افراد کی منہ زوری روکنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ جیسے لوہے کو لوہا اور زہر کو زہر کاٹتا ہے...... ایسی میں اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ اللہ ایسے لوگوں سے بھی کوئی نہ کوئی ایسا اچھا کام لیتا ہے، جو ان کی آخرت میں بخشش کا سامان بن جاتا ہے۔

نانا شکور کے اس تبصرے پر میں خاموش رہا تھا تو وہ پھر بولا۔ ''بھولا ناتھ سے تمہارا اب تک کوئی ٹکراؤ نہیں ہوا ہے؟ میرا مطلب ہے براہِ راست؟''

''نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلا کر مختصر جواب دیا۔

''جبکہ اس کے کچھ ساتھی تمہارے ہاتھوں ہلاک ہوئے ہیں۔''

''ہاں۔''

''تمہارا ٹکراؤ بھولا ناتھ سے ہو چکا ہے۔'' نانا شکور نے اپنی بات مکمل کی۔

''مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہے، لیکن مجھے اپنے تینوں ساتھیوں کی فکر ہو رہی ہے اور میں فوری طور پر جزائر انڈیمان جانے کا ارادہ رکھتا تھا، لیکن گھوترا جی کے مشورے سے مجھے تم سے رابطہ کرنا پڑا۔'' میں نے صاف گوئی سے جواب دیا، وہ اس کا برا منائے بغیر فراخ دلی سے مسکرا کر بولا۔

''آدمی کھرے ہو...... اور...... جی دار بھی...... اچھا لگا مجھے تمہارا یہ انداز......'' نانا شکور اسرار بھرے انداز میں مسکرایا۔

''آج رات تیار رہنا...... ہم انڈیمان کی طرف کوچ کرنے والے ہیں اور میں بھی ساتھ ہوں، لیکن......'' کہتے ہوئے اس نے سوشیلا کی طرف دیکھا اور جملہ مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''یہ خاتون ہمارے ساتھ نہیں جا سکتی، اسے ادھر ہی رہنا ہوگا۔ یہاں اسے کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہوگی۔''

اس کی بات پر میری نگاہ غیر ارادی طور پر قریب بیٹھی سوشیلا پر پڑی۔ وہ نانا شکور کی بات پر اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے بے چینی سے کسمسائی اور میری طرف تکنے لگی۔ میں نے نانا شکور کی طرف دیکھ کر کہا۔

''نانا صاحب! یہ میرے سوا اکیلی نہیں رہ سکتی، میں اسے اپنے ساتھ ہی رکھنا چاہوں گا، یہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے، اس نے اب تک میرے ساتھ شاملِ حال رہتے ہوئے، میری بہت مدد کی ہے۔''

میری بات پر نانا شکور نے شاید پہلی بار سوشیلا کو ایک لمحے کے لیے ذرا گہری نظروں سے دیکھا، اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی......''

''اگر آپ برا نہ منائیں تو اس مشن کے لیے میں اور میری ساتھی سوشیلا ہی مناسب رہیں گے، کیونکہ میں سمجھتا ہوں آپ کے کسی ساتھی کے ساتھ ہونے سے ایک طویل ''کلیش'' ہونے کا خطرہ موجود رہے گا اور اس سے کافی سارا وقت برباد ہونے کا امکان ہے۔ لہٰذا میرا خیال ہے کہ آپ ہمیں صرف جزیرہ انڈیمان تک بہ حفاظت پہنچا دیں اور اگر ممکن ہو سکے تو وہاں واقع بھولا ناتھ کے ایک اہم ٹھکانے کی بھی نشاندہی کر دیں تو یہ بھی میرے لیے کافی سے زیادہ ہوگا۔''

وہ میری بات پر ایک بار پھر اپنے مخصوص اسرار بھرے انداز میں مسکرایا، پھر بولا۔ ''میرا اصول ہے کہ دشمن کا مزاج سمجھ کر ہی اس کے خلاف کوئی قدم اٹھانا چاہیے۔ بھولا ناتھ سے ابھی تک تمہارا بلاواسطہ یا بالواسطہ ٹکراؤ نہیں ہوا ہے، اسی لیے تم ابھی اُسے نہیں جانتے ہو، مار کھا جاؤ گے۔ وہ اس وقت تمہاری کمزوری کو چھیننے کی کوشش میں ہوگا اور کوئی بعید نہیں کہ وہ اب تک اس کوشش میں جت بھی گیا ہو۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''سی جی بھوانی جیسے اہم اور طاقت ور آدمی سمیت اپنے تین ساتھیوں کا تمہارے ہاتھوں حشر دیکھ لینے کے بعد وہ تمہاری خطرناکی سے واقف ہو چکا ہوگا اور اب تمہاری اسی کمزوری سے کھیلنے کی کوشش کرے گا، جس کے لیے تم فکر و تشویش کے مارے اوندھے ہوئے جا رہے ہو...... اس لیے اس کی اب بھرپور توجہ تمہارے انھی تینوں ساتھیوں کو چھیننے کی کوشش ہوگی، جنھیں وہ اپنی گرفت میں کرنے کے بعد تمہیں جھکانے کی کوشش کرے گا۔ میرے ورلیے فقط اتنا فائدہ ضرور ہوگا کہ یہ کام جلد ہو سکتا ہے اور یہ آسانی بھی۔''

اس کی بات میں وزن تھا، جس کا میں نے کھلے دل سے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی بات میں رد نہیں کر سکتا، نہ ہی اس کی حقیقت سے انکاری ہوں، مگر کیا وہ وحشی قبیلہ کل منجارو اتنی آسانی سے میرے ساتھیوں کو ان کے حوالے کر دے گا؟ پتا نہیں میرے ساتھیوں کے ساتھ ان وحشیوں نے کیسا سلوک کیا ہو؟'' مجھے ایک بار پھر اپنے تینوں اہم اور قریبی جاں نثار ساتھیوں کی طرف سے تشویش کھانے لگی۔

وہ بولا۔ ”کچھ نہیں کہا جا سکتا...... خدا کرے وہ ان کی قید میں ہی ہوں اور زندہ ہوں، رہی بات بھولا ناتھ کے ان کو اپنے مطلب کے لیے چھڑانے کی تو وہ بھی اتنے طرم خان نہیں ہیں، لیکن بہر حال وہ بھی ایک ماسٹر آف گینگ ہے۔ اپنی سی کوشش تو ضرور کرے گا، ہم بھی تو یہی کرنے والے ہیں۔“

میں خاموش رہا۔ نانا شکور کی باتیں حقیقت پر بنی تھیں۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ بلیو تلسی کی ایک اہم ایجنٹ اور جنجم واصل سی جی بھجوانی کی قریبی ساتھی کوریلا ابھی تک نہ صرف زندہ تھی بلکہ وہ جزیرہ انڈیمان میں ہی اپنے کچھ ساتھی ایجنٹوں کے ساتھ موجود تھی۔

اس پر نانا شکور نے یہی کہا تھا کہ...... ”بلیو تلسی اور کرنل بھجوانی کا خاتمہ ہونے کے بعد ان تلوں میں اب تیل نہیں رہا ہوگا۔ اس لیے اس کی فکر مت کرو، وہ بیک ٹو پویلین ہو چکی ہوگی...... یوں بھی اگر وہ ہمارے رستے میں آئی بھی تو اس سے بھی نمٹ لیں گے......“

کچھ گھنٹے اور بیت گئے۔ شام جھکنے لگی تو ہم ایک نئی اہم اور عجیب سنسنی خیز اور خطرناک مہم کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔

نانا شکور کے ہمراہ وہی دونوں آدمی تھے جو اب تک مسلسل اس کے ساتھ تھے اور ہمیں وہ یہاں تک لائے تھے۔ جس کا صاف مطلب تھا کہ یہ دونوں نانا شکور کے خاص آدمی تھے۔

میں نہیں جانتا تھا کہ بھولا ناتھ کے مقابلے میں نانا شکور کتنا طاقت ور تھا، مگر یہاں اس کا وہ رعب اور دبدبہ مجھے نظر نہیں آرہا تھا جو ایک ڈان کا ہونا چاہیے تھا۔ یا پھر میری اس سلسلے میں آبزرویشن نامکمل تھی۔ یہاں مجھے اس کی افرادی قوت بھی کچھ خاص نظر نہیں آرہی تھی، اس کا ٹھکانا بھی بس واجبی سا ہی دکھائی پڑتا تھا۔ اسلحہ نام کی تو میں نے ابھی تک کوئی شے ان میں سے کسی کے پاس نہیں دیکھی تھی۔ البتہ یہ لوگ چہرے مہرے سے خاصے گھاگ اور ٹاپ پروفیشنل دکھائی دیتے تھے۔

طے یہی پایا تھا کہ بائی روڈ کرناٹک اور بنگلور کا روٹ اپنایا جائے اور ترچناپلی پہنچا جائے، وہاں چند گھنٹوں کا اسٹے کرنا تھا، وہاں ان کا ٹھکانا تھا، وہاں سے مدراس۔ (موجودہ نام چنائی) یہ بھارتی ریاست تامل ناڈو میں واقع تھا جو اس کا دارالخلافہ بھی تھا)

ترچناپلی کے ٹھکانے سے چنائی کی بندرگاہ میں ایک لانچ کا بندوبست کرنا تھا اور پھر وہاں سے جزائر انڈیمان کی طرف کوچ کرنا تھا۔

یوں ہم پانچوں ایک تیز رفتار اور طاقت ور پارس پاور انجن والی کار میں بیٹھ کر ممبئی سے ترچناپلی روانہ ہو گئے۔

ممبئی سے چنائی تقریباً ساڑھے تیرہ سو کلومیٹر کا فاصلہ، بائی روڈ تھا، جبکہ ترچناپلی تک لگ بھگ نو سو کلومیٹر تھا۔ ہم پانچوں روانہ ہو گئے۔ کار نانا شکور کا ایک ساتھی چلا رہا تھا، اس کے برابر میں نانا شکور براجمان تھا۔ باقی ہم تینوں عقبی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔

چنائی (مدراس) سے ہمیں ایک لانچ کے ذریعے جزائر انڈیمان کے لیے روانہ ہونا تھا۔ رات بھر سفر بخیریت جاری رہا تھا، صبح ہم ترچناپلی پہنچ گئے، وہاں ایک کلب میں زیر زمین واقع نانا شکور کا ٹھکانا تھا جہاں ہم نے دن بھر آرام کیا اور سہ پہر میں جاگے تو چنائی جانے کے لیے تیار تھے۔ بلکہ نانا شکور نے بتایا کہ چنائی سی پورٹ میں جزائر انڈیمان کی طرف روانگی کا بھی بندوبست کیا جا چکا تھا۔

چنائی بندرگاہ پہنچے تو رات گہری ہو چکی تھی۔ بندرگاہ پر عجیب سی خاموشی طاری تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور چاند ٹھاٹھیں مارتے بحر ہند کے ہیبت ناک اُفق کے عین اُوپر بڑے سے سنہرے اژدھے کی طرح رکھا معلوم ہو رہا تھا۔ مرطوب سمندری ہوائیں چہروں سے ٹکراتیں تو جانے کیوں پورے جسم میں ہلکی سی تھرتھری دوڑ جاتی، کہیں لانچیں اور باربردار جہاز لنگر انداز نظر آرہے تھے۔ ان کے مستول سربلند تھے۔ کہیں قریب ہی کسی جہاز کا بگل سوگوار سے انداز میں بجا تو فضا میں ہوک نما گونج سی اُٹھی۔ ہم ایک درمیانے درجے کی لانچ میں سوار ہو گئے۔ لانچ میں دو افراد اور بھی پہلے سے موجود تھے۔ وہی لانچ ”ہینڈل“ کر رہے تھے۔ لانچ زیادہ بڑی نہیں تھی، ایک ہی کیبن تھا، اسی میں ہم پانچوں بیٹھ گئے۔ جبکہ ذرا دیر بعد نانا شکور کے دونوں ساتھی اُٹھ کر چلے گئے۔ ہم آپس میں باتیں کرتے رہے۔ لانچ روانہ ہو چکی تھی۔ ایک خلاصی ٹرے میں چائے لے آیا تھا۔ وہ ہم پینے لگے۔

نانا شکور کے مطابق جزائر انڈیمان یہاں سے دو دنوں کی مسافت پر تھا۔ بحیرہ ہند کی مسافت کے دوسرے دن ہم نے بے آف بنگال میں داخل ہو جانا تھا۔ پورٹ بلیئر انڈیمان کا کیپٹل تھا۔

بے آف بنگال کے ذکر پر میرا دھیان لولوش کے

مقرب خاص کا رپرواز سے جی کوہارا کی طرف چلا گیا۔

انڈیمان سے متعلق مجھے نانا شکور نے مختصراً وہی بتایا تھا جو میں بھی جانتا تھا، جس کے مطابق جزائر انڈیمان، نکوبار بحرِ ہند (بے آف بنگال) میں واقع ہے۔ ہندوستان سے جزائر انڈیمان، نکوبار کی غیر معمولی دوری کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انڈیمان کی جنوبی سرحد ملیشیا صرف ایک سو کلومیٹر دور ہے۔ اسی طرح اس کی سرحد کی لمبائی کا اندازہ صرف اس سے ہوتا ہے کہ اس کی شمالی سرحد سے برما صرف ایک سو بیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔

برما یہاں سے قریب تھا اور لولوڈش اڈیسہ کمپنی کے سلسلے میں وہیں مقیم تھا۔ (تازہ صورت حال کا مجھے علم نہ تھا) لولوڈش سے دو دو ہاتھ کرنے کا مجھے بڑی بے چینی سے انتظار تھا۔ عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں مجھے ہاسکل ہولارڈ جیسے خبیث یہودی کو جھکانا تھا، کیونکہ وہ اس کی چہیتی اور اکلوتی لاڈلی بیٹی انجیلا کا شوہر تھا۔ لیکن بھارت میں مجھے ابھی ایک اور اہم مشن بھی نمٹانا تھا اور وہ تھا طلسم نور ہیرے کا حصول، جس کے لیے بشام منگلری نے اپنی جان کی قربانی دی تھی، جبکہ اس کے سفاک قاتل نے جی کوہارا سے بھی اس کی موت کا بدلہ لینا تھا۔ جانے اب وہ رذیل کہاں تھا؟

لولوڈش کو یقیناً اب تک اپنے دیرینہ حلیف کرنل سی جی بھگوانی کی ہلاکت اور اس کے ونگ "بلیو لکسی" کے خاتمے کی خبر مل ہی چکی ہوگی، اور میں نہیں جانتا تھا کہ اب اس خبیث لولوڈش نے مجھے زیر کرنے کے لیے کون سا نیا حربہ استعمال کیا ہوگا۔ تاہم یہ بات یقینی تھی کہ مجھے قابو کرنے کے سلسلے میں اس نے ہنوز جی کوہارا...... کو ہی ٹاسک دے رکھا ہوگا۔ مگر وہ میری تلاش میں کہاں کہاں کی خاک چھانتا پھر رہا ہوگا، یہ میں نہیں جانتا تھا۔

کوہارا، طلسم نور ہیرے کے ٹاسک پر بھی عمل پیرا تھا۔ لیکن مجھے بالکل بھی اس کی امید نہ تھی کہ وہ ایڈوانی جیسے ایک جناور جرنیل کے قبضے سے اس بیش قیمت ہیرے کو حاصل کرنے کی سکت رکھتا ہوگا۔

مجھے اپنی سی کوشش کے مطابق، جزائر انڈیمان کی مہم کو بہت مختصر اور صرف اپنے تینوں ساتھیوں کی رہائی کے سلسلے تک محدود رکھنا تھا۔ بھولا ناتھ سے میں ٹکرانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ خود میرے گلے پڑنے لگتا تو الگ بات تھی۔ بہ قول نانا شکور کے اگر میرے ہاتھوں بھولا ناتھ کے آدمی نہ مرے ہوتے تو بھگوانی کے جہنم واصل ہونے کے بعد بھولا ناتھ خود ہی میرے راستے سے ہٹ جاتا۔ کیونکہ میری براہ راست

اس سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔

دو دنوں تک ہمارا سفر جاری رہا تھا، دوسرے دن کی ایک سرمئی شام میں ہم پورٹ بلیئر کی ایک جیٹی سے جا لگے۔ وہاں پہلے سے نانا شکور کے آدمی ہمیں لینے کے لیے موجود تھے۔ جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے، انڈیمان کے کچھ علاقوں میں دو بڑے ڈان کا قبضہ تھا، ایک بھولا ناتھ اور دوسرے نانا شکور کا۔

نانا شکور کے ان .... آدمیوں کو دیکھ کر میں چونکا تھا۔ وہ سب جدید اسلحے کی نمائش کے ساتھ وہاں ہمارے "سواگت" کے لیے موجود تھے۔ یہ پہلا ہی موقع تھا کہ میں نے نانا شکور کے آدمیوں کے ہاتھوں میں ایسا جدید اور خطرناک اسلحہ دیکھا تھا۔

لانچ سے ہم نے جیٹی کے ایک چوبی پلیٹ فارم پر قدم رکھا تو جانے کیوں میرے دل کو کچھ بے چینی سی ہونے لگی۔ معلوم نہیں یہ انڈیمان جیسی قاتل سرزمین کی ہیبت کا اثر تھا یا کچھ اور بات تھی۔ آسمان پر اس وقت کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ فضا خاموش تھی اور اردگرد کا ماحول لاتعلق سا محسوس ہو رہا تھا۔

لانچ کے وہ دونوں آدمی لوٹ گئے تھے۔ اب ہم تینوں ان لوگوں کی رہنمائی میں تھے۔

جیٹی سے باہر آئے تو احاطے میں دو لمبی چوڑی گاڑیاں کھڑی دکھائی دیں۔ ہم ان میں سوار ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد دونوں گاڑیاں اس عجیب اور پُراسرار جزیرے کے ایک نیم پختہ اور بل کھاتے راستے پر ہولی تھیں۔

سوشیلا بھی مجھے خاصی متحیر سی دکھائی دے رہی تھی۔ غالباً اس نے بھی میری طرح اس جزیرے کی "کالا پانی" کی حیثیت سے بہت ناکیوں اور خوف ناک تاریخی واقعات کی لرزہ خیز داستانیں سن اور پڑھ رکھی ہوں گی۔ کیا معلوم تھا کہ تقدیر ایک دن مجھے بھی یہاں لے آئے گی۔ شکر تھا کہ میں قیدی کی حیثیت سے یہاں نہیں لایا گیا تھا۔

انڈیمان کی فضا ہی مجھے عجیب سی محسوس ہونے لگی تھی، یوں لگتا تھا جیسے میں کئی سال پیچھے چلا گیا ہوں۔ جب آزادیٔ وطن کے متوالے مجاہدوں کو یہاں قید کر کے انھیں انسانیت سوز سزائیں دی جاتی تھیں۔ اُس وقت کیسا منظر ہوتا ہوگا یہاں کا؟ مگر اب جیسے یہاں کچھ بھی نہیں تھا، مگر اس کی خاموش اور اسرار بھری فضا میں مجھے ان قیدیوں کی دبی دبی سسکیاں سنائی دیتی محسوس ہو رہی تھیں۔ مگر اب یہاں اول خیر، کھیل

داوا اور شکیلہ کہیں قید تھے اور مجھے ان کی طرف سے فکر کھائے جا رہی تھی۔ نجانے ان بے چاروں کی کیا دلی کیفیات ہو رہی ہوں گی؟

سفر خاموشی سے جاری تھا۔ ان کا ٹھکانا یہاں کس مقام پر اور کتنی دور تھا، یہ میں نہیں جانتا تھا۔ نہ ہی میں نے اس بارے میں ناناشکور سے کوئی سوال کیا تھا۔

میں کار کی کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھنے میں محو تھا۔ یہاں مجھے خاصی تعداد میں رہائشی مکانات، ہوٹلز اور بازار وغیرہ دکھائی دے رہے تھے۔ زندگی یہاں کافی سرگرم معلوم ہوتی تھی۔

دونوں گاڑیاں اب نسبتاً مضافاتی علاقے میں داخل ہوگئی تھیں۔ اب ہمارے اردگرد بنجر ٹیلے اور نیم صحرائی میدان پھیلا ہوا تھا۔ رات اُتر آئی تھی جبکہ گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس پہلے ہی سے روشن تھیں۔

جس کار میں ہم پانچوں سوار تھے، وہ پیچھے تھی، جبکہ آگے والی کار ایک نسبتاً تنگ سے موڑ کو کاٹنے سے پہلے ہی اچانک رک گئی۔ اسے رکتے دیکھ کر ہماری کار کے ڈرائیور نے بھی بریک لگا دیے۔

ہم سے آگے والی کار کے رکنے کی وجہ نامعلوم تھی۔ وجہ جاننے کے لیے ناناشکور نے اپنی جیب سے سیل نکالا، وہ آگے والی کار سواروں سے شاید کچھ دریافت کرنے والا تھا کہ اچانک تھمی ہوئی خاموش فضا میں ایک دل دہلا دینے والا دھماکا ہوا۔ میرے قریب بیٹھی سوشیلا کے حلق سے تو چیخ بھی خارج ہوگئی تھی۔ دھماکے کی شدت انگیز آواز اس لیے بھی زوردار تھی کہ وہ ہماری کار سے محض چند قدموں کے فاصلے پر ہوا تھا۔ جیسے کوئی دس کلو وزنی بارود بھرا بم پھٹا ہو اور غالباً ایسا ہوا بھی تھا۔

پہلے سے کسی گھات لگائے ہوئے دشمن نے بم سے اگلی کار کو نشانہ بنایا تھا اور بدنصیب کار سواروں کو شاید کسی "گڑبڑ" کا احساس بھی ہوا تھا مگر انہیں بچنے کا موقع نہ مل سکا تھا۔ ہماری کار کی ونڈ اسکرین شعلوں اور آگ کے بگولوں سے سرخ ہوگئی تھی۔

"بیک...... بیک...... ہری اَپ......" ناناشکور چلّایا۔ میرا دل سنسناتی کنپٹیوں پہ دھڑکنے لگا۔ ڈرائیور نے گیئر بدلا اور ایکسیلیٹر دبا دیا۔ ہماری کار کا انجن غرایا۔ ابھی اس کے پہیے اسکڈ ہی کر رہے تھے کہ اچانک گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ ابھری۔ زوردار چھناکے سے پہلے تو ہماری کار کی ونڈ اسکرین کے ٹوٹنے کی آواز ابھری تھی۔ ساتھ ہی ڈرائیور اور ایک اور ساتھی کی دلخراش چیخیں گونجیں۔ میں ڈرائیور کے عقب میں تھا اور اسے لگنے والی گولیوں سے اُچھلنے والا خون میرا چہرہ تر کر گیا تھا اور میں سوشیلا کی گدی دبوچے خود بھی بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ جھک گیا تھا۔ میرے برابر والا آدمی بھی ہلاک ہو چکا تھا، جبکہ ناناشکور نے میری پالیسی اپنائی تھی اور فوراً سے پہلے جھک کر خود کو گولیوں کی بوچھاڑ سے بچا گیا تھا۔

میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور مرے ہوئے ساتھی کی گود میں پڑی گن اور سوشیلا کا ہاتھ دبوچے کار سے نیچے رینگ گیا۔

تاریکی اور گرد و بارود کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے، میں سوشیلا کو لیے اس طرف کو لپکا جدھر یکے بعد دیگرے بنجر ٹیلے پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نسبتاً محفوظ جگہ پر سوشیلا کو چھوڑ کر میں طوفانی بگولے کی طرح واپس پلٹا اور دیکھا ہوں کہ چار یا پانچ مسلح افراد کار کو گھیرے ہوئے تھے اور اندر مجھے ناناشکور محبوس سا دکھائی دیا، اپنی یقینی موت کو سامنے دیکھ کر اس کا چہرہ ایک دم سپاٹ ہو گیا تھا، دوسرے ہی لمحے فضا میں ایک بار پھر گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ ابھری۔

میں نے ناناشکور کو موت کے یقینی قریب دیکھ کر ان مسلح افراد پر اپنی گن سے گولیوں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ یہ حملہ ان کے لیے غیر متوقع نہیں تو اچانک ضرور تھا۔ تین تو چیخیں مار کے وہیں گر پڑے، چوتھے نے میری گن کے گرجنے کی آواز کا محتاط اندازہ کرتے ہی کمال پھرتی سے مجھ پر اپنی گن کا آتشیں دہانہ کھول دیا۔ میں نے اس لمحاتی دورانیے میں ناناشکور کو کار کا دروازہ کھولتے اور اُترتے دیکھا اور بہ سرعت جھکائی دے ڈالی۔ دشمن کی فائر کردہ گولیاں میرے اُوپر اور سر کے اتنے قریب سے گزری تھیں کہ مجھے اس کی آتشیں جھپک صاف محسوس ہوئی تھی۔

وہ مسلسل مجھ پر گولیاں داغے جا رہا تھا اور فائر کرنے کے موقعے سے مجھے سربہ سر قاصر رکھے ہوئے تھا۔ تاہم مجھے تسلی تھی کہ میں نے اس مختصر سے وقت میں جو کام کرنا چاہا تھا وہ کامیابی سے کر چکا تھا۔ یعنی ناناشکور، جو کار کے اندر محبوس ہو کر بے بسی کے ساتھ اپنی موت کا منتظر تھا، اسے کار کے اندر سے بچ نکلنے کا موقع مل چکا تھا۔ مگر دشمن نے مجھے ٹارگٹ کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔ اس کی چالاکی دیکھ کر میرے ہونٹوں پہ زہریلی مسکراہٹ آگئی۔ میں نے پینترا بدلا اور ایک دوسری سمت سے سنگل شاٹ کھیلا۔ اُسے بلف کرتے ہی میں نے تیزی کے ساتھ اپنی جگہ بدلی، وہ اس

سنگل شاٹ فائر کی طرف متوجہ ہو کر اندھا دھند گولیاں برسانے میں مصروف ہو گیا اور میں اس کی نظر میں ہمت سے طلوع ہوا، جب تک اس کی نگاہ مجھ پر پڑتی میں ایک اور سنگل شاٹ مکمل کر چکا تھا۔ گولی اس کے گن والے ہاتھ پر لگی اور وہ چھوٹ گئی، اس نے زخمی ہو کر چیخ ماری، دوبارہ سنبھلا اور اپنی جیب سے شاید پستول نکالنا چاہا تو میں نے اسی ہاتھ کے بازو پر گولی چلا دی۔ وہ کربہ انگیز چیخ مار کر گرا۔

میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ فوراً اس کے سر پہ جا پہنچا، اسی وقت سوشیلا اور نانا شکور وہاں آ گئے۔ سوشیلا شاید میری کارروائی دیکھتے ہوئے ٹیلے سے نکل آئی تھی جبکہ نانا شکور میری فائرنگ کی آواز کے آہنگ پر میری موجودگی کا درست اندازہ لگاتے ہوئے یہاں آ پہنچا تھا۔

"یہ تم نے اچھا کیا کہ اسے زندہ رکھا...... ابھی میں اس سے نمٹتا ہوں......" نانا شکور دانت پیس کر زمین پر پڑے کراہتے ہوئے دشمن کی طرف گھورتے ہوئے بولا۔

"پہلے تسلی کر لو نانا کہ اس کے اور ساتھی تو ادھر کہیں گھات لگائے نہ بیٹھے ہوں......؟" میں نے احتیاط کے پیش نظر اس سے کہا اور گردشی نظروں سے اطراف میں دیکھا تھا۔

"ہوتے تو اب تک کود چکے ہوتے میدان میں۔" نانا شکور نے جواب دیا۔ "ہماری گاڑیاں تو کہیں کام سے، وہاں ان کی کوئی گاڑی کھڑی ہوگی۔ تم اسے لے کر آؤ۔" اس نے آخر میں زخمی کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے سب سے پہلے اس کی جامہ تلاشی لی اور پستول اور گن اپنے قبضے میں کر لی، پھر اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے اٹھایا اور آگے چلا۔ سوشیلا ساتھ تھی۔

ہم اسی موڑ کے دوسری طرف پہنچے تو نانا شکور کا اندازہ صحیح نکلا۔ یہاں ایک ٹیلے کے پیچھے جیپ کھڑی تھی۔ ہم تینوں اس میں سوار ہو گئے اور زخمی دشمن کو بھی اس میں سوار کروا لیا۔

اسٹیئرنگ نانا شکور نے سنبھالا تھا، سوشیلا میرے اشارے پر اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی، جبکہ میں عقبی سیٹ پر زخمی دشمن کو لیے بیٹھ گیا۔

"بھولا ناتھ کو ہمارے یہاں آنے کی خبر بھی ہو گئی......! کیا کہتے ہو؟ ادھر ہی سوالوں کے جواب دو گے یا پھر اڈے پر جا کے؟" جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے نانا شکور نے اس زخمی دشمن سے پوچھا۔

"تم کس بھولا ناتھ کی بات کر رہے ہو؟ ہم تو تمہیں لوٹنا چاہتے تھے۔" اس نے جواب دیا۔ خود مجھے اس کے لہجے سے سفید جھوٹ کی بو آتی محسوس ہوئی تھی۔

"اچھا!" نانا شکور طنزیہ استہزا سے بولا۔ "یہ کیسے ڈکیت تھے جو ہمیں روک کے اور گن پوائنٹ پر لیے بغیر بموں اور گولیوں سے چھلنی کر کے لوٹنا چاہتے تھے؟"

"تم کچھ بھی سمجھو، حقیقت وہی ہے جو میں بیان کر چکا ہوں۔" زخمی بڑی ڈھٹائی سے بولا جس پر مجھے غصہ آیا تھا۔

"میرے ساتھیوں کو ہلاک کرنے کا جرم تو تمہارے سر پر ہے ہی...... لیکن اگر تم نے سچ نہیں بولا تو ایسی اذیت ناک سزا دوں گا کہ تم مجھ سے زندگی کے بجائے موت کی بھیک مانگو گے......" نانا شکور نے دانت پیس کر کہا اور اپنی جیب سے سیل فون نکالا۔ ایک ہاتھ سے اس نے اسٹیئرنگ سنبھالا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ سے فون کان سے لگا ہوا تھا، اسی دوران اس نے ایک موڑ کاٹا تھا کہ اچانک میرے ساتھ بیٹھا زخمی بدکا اور اس نے چلتی جیپ سے نیچے چھلانگ لگا دی۔

"گاڑی روکو...... روکو گاڑی نانا......!" میں چلایا۔ مگر نانا بڑے اطمینان سے بولا۔

"بیٹھے رہو سکون سے...... یہ کہیں نہیں جا سکتا......"

میں چپ ہو رہا۔ نانا شکور نے سیل جیپ کے ڈیش بورڈ پر پھینکا اور بڑی تیزی کے ساتھ اسٹیئرنگ کاٹا تو اس طرف جہاں وہ زخمی گرا تھا اور گرتے ہی اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ وہ جیپ کے سامنے آ گیا۔ جیپ کی تیز ہیڈ لائٹس اس کے چہرے پر پڑی تو مجھے وہاں خوف کے بے پایاں آثار دکھائی دیے، نانا شکور نے جیپ کی ایک ٹکر اسے رسید کر دی، وہ چیخ مار کر گرا۔ نانا شکور نے بریک لگائے، جیپ ریورس کی، اور تیزی سے کرتا چلا گیا۔

نجانے وہ اس کے ساتھ کیا گیم کھیلنا چاہتا تھا، مگر دوسرے ہی لمحے میں نے دیکھا کہ نانا نے بڑی بیدردی کے ساتھ جیپ اس زخمی دشمن پر چڑھا دی۔ اس کے حلق سے بڑی دردانگیز چیخیں خارج ہو گئیں۔ نانا شکور نے جیپ اس کی دونوں ٹانگوں پر چڑھا کر کچل دی تھیں۔ وہ بری طرح چیخنے لگا۔ جیپ روک کر نانا شکور نیچے اترا اور اس پر جھک کر غراتے ہوئے بولا۔

"اب بھی وقت ہے، بتاؤ تمہیں بھولا ناتھ نے بھیجا تھا نا؟ اور وہ خود اس وقت کہاں ہے؟ ورنہ تمہارے دونوں بازوؤں کا بھی یہی حال کروں گا۔"

"رر...... رحم کرو نانا......!" وہ کراہا۔

”تم نے ہم پر رحم کیا تھا؟ اب فضول بکواس نہیں سنوں گا۔“ نانا شکور سفاکی سے بولا۔ ”میرے پاس وقت کم ہے، ڈھونڈ تو میں لوں گا اسے، لیکن میرا وعدہ ہے، اگر تم مجھے سچ بتا دو تو میں تمہیں اسی حال میں زندہ چھوڑ دوں گا، مگر یاد رکھنا جھوٹ مت بولنا۔ میں ادھر ہی اپنے ساتھیوں سے فون پر رابطہ کر کے معلوم کروا لوں گا۔“

”وہ...... وہ ادھر ہی ہے۔ اسی جزیرے میں......“

”اس کا مجھے بھی اندازہ ہے۔ ٹھکانا بتاؤ؟“

”اے جے ساؤتھ کالونی کے کلب میں...... ڈوراڈاری اسٹریٹ میں......“

”اب آخری سوال کا جواب دے کر اپنی مکتی کروا لو......“ نانا بولا۔ ”کلی منجارو قبیلے کے وحشی جن تین آدمیوں کو اٹھا کر لے گئے تھے، اس سلسلے میں تمہاری معلومات کیا ہیں؟“

اس سوال پر وہ خوف زدہ سا ہو گیا اور اپنے خشک پڑتے ہونٹوں پہ زبان پھیرنے لگا۔

”جواب دو......؟“ نانا غرایا۔

”وہ...... وہ مجھے مار ڈالے گا...... بھولا ناتھ!“ وہ ہکلایا۔

”چھوڑوں گا تو میں بھی نہیں تمہیں...... جواب دو......“

نانا کے اس سوال پر میں بھی دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے ستے ہوئے چہرے پر اپنی نظریں جمائے ہوئے قریب ہی کھڑا ہو گیا تھا۔

”بھولا ناتھ نے اپنے آدمیوں کا ٹولا ان تینوں کو ان وحشیوں کے چنگل سے چھڑانے کے لیے بھیج رکھا ہے۔“

”بھولا ناتھ اتنا بے وقوف کب سے ہو گیا کہ کلی منجارو سے ٹکر لینے کی کوشش کرنے لگا؟“ نانا شکور زہریلے طنز سے بولا۔ زخمی دشمن کو مفر کی راہ نہیں مل رہی تھی، بولا۔

”ان وحشیوں سے جنگ کرنے کے لیے وہ ٹولا نہیں بھیجا گیا ہے۔“

”تو پھر؟“

”ان قیدیوں کی رہائی کے لیے ان کے سردار گوبارو سے بات چیت کرنے کے لیے وہ ٹولا تیار کیا گیا ہے اور اس میں دادا بھولا ناتھ کا ایک قریبی تامل ساتھی شاکا بھی شامل ہے، اسے اس وحشی قبیلے کلی منجارو کی زبان آتی ہے۔“

اس کی بات سن کر میں نے پرسوچ انداز میں اپنی بھویں سکیڑ لیں۔ اگر یہ سچ کہہ رہا تھا تو اس کا مطلب تھا، بھولا ناتھ کے ساتھیوں کا مذکورہ ٹولا کلی منجارو سے کامیاب مذاکرات کر سکتا تھا، جس کا مطلب تھا میرے تینوں ساتھیوں کی بھولا ناتھ کے ہاتھ ”حوالگی“ کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا، جو میں ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ بھولا ناتھ جانتا تھا کہ میرے لیے اول خیر، کبیل دادا اور شکیلہ کس قدر اہم تھے۔ وہ خبیث اپنے ”محسن“ اور دیرینہ حلیف، کرنل سی جی بھجوانی سمیت اپنے ساتھیوں کی میرے ہاتھوں ہلاکت کا انتقام میرے ان ساتھیوں سے لینے کے لیے پر تولے ہوئے تھا۔ یہی وہ بات تھی جس نے مجھے اپنے محبوب ساتھیوں کی طرف سے ایکا ایکی سخت تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔

”بہت ہے یہ معلومات...... بس اب تم ہمیشہ کے لیے چھٹی کرو......“

بڑی سفاکی سے کہتے ہوئے نانا شکور نے اپنے پستول کی نال کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے لبلبی پر انگلی رکھی تھی کہ میں نے اسے روک دیا۔

”نہیں نانا......! اسے مت مارو۔“

نانا میری طرف گردن موڑ کر دیکھنے لگا۔ جبکہ زخمی دشمن بھی مجھے رحم طلب نظروں سے تکے جا رہا تھا۔

”بس آخری سوال کا جواب دے دو......“ اس بار میں نے اسے مخاطب ہو کر کہا۔

”وہ ٹولا کب اس وحشی قبیلے کی طرف روانہ کیا گیا تھا؟“

”آج صبح......“ اس نے میرے سوال کا جلدی سے جواب دیا۔

”کلی منجارو، کا ٹھکانا کس طرف اور یہاں سے کتنی دور ہے؟“

اس نے ایک بار پھر اپنے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ ”جزیرے کے جنوب مشرقی سمت، نارتھ بے کی طرف، جہاں خشک کالی چٹانوں کا بنجر اور سنگلاخ ویرانہ ہے، وہیں ان کے دامن میں چناروں کا گھنا جنگل واقع ہے۔“

”اس ٹھکانے سے تو میں بھی واقف ہوں، مگر......“ اس بار نانا نے مداخلت کرتے ہوئے کہا اور کچھ سوچتا سا بن گیا۔

”واپس پلٹو نانا......! ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔“ میں نے اسے سوچتا پا کر سنجیدگی سے کہا۔

ہم تینوں دوبارہ جیپ میں سوار ہو گئے۔ ذرا ہی دیر بعد جیپ فراٹے بھر رہی تھی۔ اسٹیئرنگ نانا شکور نے ہی

سنبھالے ہوئے تھا اور میں اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔ جیپ اب نیم جنگلاتی علاقے میں داخل ہو گئی تھی، سیاہ اور بنجر ٹیلوں نما ٹیموں کا سلسلہ اب بھی جاری تھا، مگر وہ اب خال خال ہی نظر آرہے تھے۔ پھر جلد ہی آبادی کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے۔ مکانوں کے علاوہ بازار اور ہوٹلز، سرائے نما سب نظر آنے لگے۔ یہاں روشنیاں بھی تھیں اور چمک دمک بھی۔ گویا یہاں بھی شہر کی طرح زندگی اپنی پوری ہماہمی کے ساتھ سرگرم تھی۔ اس جزیرے کا جو ہیبت ناک اور خوفناک تصور میرے ذہن میں تھا وہ ماند سا پڑنے لگا تھا۔ تاہم وہ تصور پہلے کے ادوار سے تعلق رکھتا تھا۔ جب یہاں بنجر زمین اور ہولناک ویرانوں کے سوا کچھ نہ ہوگا، سوائے بدنصیب قیدیوں کے اور ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنے والے سپاہیوں کے..... کبھی یہاں ظلم و انسانیت سوزی کا سورج آگ بھی برساتا ہوگا، کبھی بے بس اور مجبور و لاچار قیدیوں نے اپنے ناکردہ گناہوں کے عذاب تلے سسکتے بلکتے اور اپاہج لمحوں میں بڑے کڑے ایام بتائے ہوں گے، مگر اب تو جیسے یہاں کچھ بھی نہ ہوتا ہوا نظر آتا تھا۔ انڈیا کا اب بھی یہاں مکمل تصرف تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ اس جزیرے پر بمبئی کے انڈر ورلڈ ڈان بھی قابض ہو چکے تھے اور انہوں نے یہاں اپنا اچھا خاصا اثر و رسوخ قائم کر رکھا تھا۔ کئی جرائم پیشہ عناصر تو اپنی یہاں "پُرامن" بادشاہت کو ہمیشہ قائم رکھنے کے لیے، بھارتی حکومت کو نذرانے کے طور پر بھتا بھی دیا کرتے تھے۔ یہ سب باتیں نانا شکور سے میرے علم میں آئی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد جیپ ایک قدرے بڑی سی تکونی شیپ کی عمارت کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔

عمارت میں عمومی طرز کی لائٹس روشن تھیں، البتہ گیٹ کی پیشانی پر ایک مخصوص نیون سائن جل بجھ رہا تھا، اور اس پر ایک کالے اسکارپیئن کی تصویر ابھر رہی تھی۔ اسی کے نیچے انگریزی حروف میں "بلیک اسکارپیئن کلب" لکھا ہوا تھا۔

گیٹ پر بھانت بھانت کے لوگوں کی آوک جاوک نظر آتی تھی۔ ان میں ینگ کپلز، مرد و خواتین حتیٰ کہ عمر رسیدہ لوگ بھی تھے۔ گیٹ کیا تھا، بس ایک سنگل ڈور کا دروازہ تھا۔ جہاں دائیں بائیں دو موٹے تازے آدمی بنیان ٹائپ شرٹ اور چست پینٹ پہنے کھڑے، آنے جانے والوں کی چیکنگ وغیرہ کے بعد اندر جانے کی اجازت دے رہے تھے۔ ان کی بیلٹوں سے سیاہ رنگ کے اڑسے ہوئے پستولوں کی جھلک صاف نظر آتی تھی۔ نانا شکور کو دیکھتے ہی وہ بڑھے اور نجانے کون سی زبان میں لوگوں کو ہاتھوں کے اشارے سے اِدھر اُدھر ہونے کا کہنے لگے، راستہ بنتے ہی نانا شکور اور میں اور سوشیلا اس کے عقب میں چلتے ہوئے دروازے پر پہنچے تو نانا شکور نے ذرا رک کر ان سے کچھ کہا اور آگے بڑھ گیا۔

معلوم ہوا کہ یہ دروازہ داخلے کا تو تھا ہی مگر کسی زینے کے آغاز سے بھی تعلق رکھتا تھا۔ وہاں بھی اندر کی طرف دو تنومند افراد چوکس کھڑے تھے، نانا کو دیکھتے ہی انہوں نے مودبانہ انداز میں اپنے سر کو جنبش دی تھی اور پھر نانا کی تقلید میں سوشیلا اور میں اس کے پیچھے زینے طے کرتے ہوئے اُوپر ایک فلور پر پہنچے، وہاں ایک اور دروازہ نظر آیا، جو کھلا ہوا تھا اور باہر سے ہی مجھے اندر ہونے والے طوفانِ بدتمیزی قسم کے شور شرابے اور رنگین فلش لائٹوں کی جھلک دکھائی دی تھی، دائیں جانب ایک اور دروازہ تھا جو بند تھا، نانا شکور نے اودھر ہی کھڑے ہو کے دستک دی۔

دروازے پر نصب ایک چار بائی چار کی چوکور کھڑکی ایک دم سلائیڈ ہوئی، ایک وحشت برساتی آنکھ نے ہمیں گھورا اور فوراً ہی دروازہ کھلتا چلا گیا۔

اندر داخل ہونے پر ایک مختصر سی راہداری دکھائی دی، ہم اسی پر چلتے ہوئے ایک کمرے میں پہنچے۔ کمرا قدرے کشادہ اور عام سا ہی تھا، فرنیچر کے نام پر وسط میں ایک گول میز، اس کے گرد چار پانچ کرسیاں اور ایک فیملی سائز صوفہ جو دیوار سے لگا ہوا تھا۔

نانا شکور نے مجھے اور سوشیلا کو اسی صوفے کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا جبکہ خود وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

ہمارے وہاں فروکش ہوتے ہی ایک نیم عریاں سی سانولی مگر تیکھے نقوش والی لڑکی ایک تھالی اُٹھائے اندر داخل ہوئی۔ وہ اس نے بڑے احترام سے نانا شکور کے سامنے رکھ دی۔ تھالی پر ایک بڑی شراب کی بوتل اور تین پیگ رکھے تھے۔

"میرا خیال ہے تم دونوں بھی اِدھر ہی آجاؤ......" نانا شکور نے شراب کی بوتل کا کاگ اڑاتے ہوئے ہم دونوں کی طرف دیکھا، میں نے تو ہاتھ کھڑا کر کے انکار کر دیا تھا مگر سوشیلا فوراً اُٹھ کر اس کے سامنے والی کرسی پر جا بیٹھی، اس کی آنکھوں میں ندیدے پن کی چمک دیکھ کر مجھے کچھ حیرت ہوئی تھی۔ وہ شاید آج پہلی بار ہی میری نظروں کے سامنے پینے لگی تھی۔ جانے کیوں میرے ہونٹوں پہ آپوں آپ ہی

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L.5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

غیر تاثر سی مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔

"کمال ہے تم پیتے نہیں ہو؟ تو پھر کچھ اور منگواؤں تمہارے لیے؟" نانا شکور نے جھاگ گراتی بوتل سے ایک پیگ سوشیلا اور ایک اپنے لیے بناتے ہوئے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

"شکریہ! مجھے اس وقت کسی شے کی طلب نہیں ہو رہی ہے۔" میں نے مختصراً جواب دیا۔ مقصد یہی تھا کہ وہ جلد ہی یہ "دور" چلائے اور کام کی بات پر کچھ عملی اقدام کا بھی سوچے۔

سوشیلا نے بڑے بے تابانہ انداز میں ایک بڑا گھونٹ بھر کر اپنے معدے میں منتقل کیا تو ساتھ ہی تھکے تھکے انداز میں ایک ہنکارا بھی خارج کر ڈالا۔ یوں لگا جیسے وہ ایک جام کے لیے بڑا ترسی ہوئی تھی۔ نانا شکور نے بھی ایک گھونٹ بھر کر دوبارہ مجھ سے ہولے سے کہا۔

"ایسے کیسے ہو سکتا ہے، تم یہاں میرے ٹھکانے میں کچھ کھائے پیے بغیر رہو......" کہتے ہوئے اس نے میز کے نیچے اپنا ایک ہاتھ لے جا کر شاید کوئی بے آواز سا بٹن پش کیا تھا اور اس کے ساتھ ہی دروازہ کھلا۔ وہی لڑکی دوبارہ اندر داخل ہوئی۔

"میرے اس دوست کے لیے کوئی اچھا سا سوفٹ ڈرنک لے آؤ...... اور سینڈوچ بھی۔" نانا نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اس لڑکی سے تحکمانہ کہا تو وہ لڑکی میری طرف قدرے حیرت بھری نگاہوں سے تکتی ہوئی مؤدبانہ انداز میں واپس لوٹ گئی۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ ایک اور ٹرے اٹھا لائی جس میں ایک کولڈ ڈرنک اور ایک ٹھنڈی بیئر کی بوتل اور کچھ سینڈوچ تھے۔ وہ میز پر رکھنے لگی تو میں نے اپنی کرسی پہ بیٹھے بیٹھے اسے اشارہ کیا، وہ جھجکی اور ٹرے لیے مسکراتے ہوئے میرے قریب آ گئی۔

میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر ٹرے اس کے ہاتھ سے لے لی اور کولڈ ڈرنک کا ایک ٹھنڈا ٹھار گھونٹ بھرنے کے بعد ٹرے گود میں رکھ کر سینڈوچ اٹھا کر کھانے لگا۔

بیئر کو میں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا، کیا معلوم اس میں الکوحل شامل ہو؟

یہ سارا "دور" کچھ منٹوں تک محیط رہا۔ میں اپنی کرسی پر بیٹھا بار بار بے چینی سے پہلو بدلے جا رہا تھا۔ نانا شکور میری بے قراری بھانپ گیا اور پھر دوبارہ کسی کو بلایا۔

ایک شخص اندر داخل ہوا اور نہایت مؤدبانہ انداز میں اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"ویر کو بلاؤ......"

"یس باس!" آنے والے نے مؤدبانہ انداز میں اپنا سر جھکا کر کہا اور اسی طرح واپس لوٹ گیا۔ اس کے ذرا ہی دیر بعد ایک گینڈے جیسی جسامت کا شخص وہاں پہنچا اور باادب نانا شکور کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"ویر! بھولا ناتھ سے ہمارے ٹکراؤ کی ابتدا ہو چکی ہے۔ ہم اُسے جواب تو دے ہی چکے ہیں، لہٰذا تم یہاں ساتھیوں کو ہائی الرٹ کر دو......"

"بہتر جناب! آپ اس کی فکر نہ کریں، ہمارے ساتھی یوں بھی یہاں ہر دم الرٹ ہی رہتے ہیں۔" ویر نے مؤدبانہ کہا۔

"گڈ......! اب یہ بتاؤ کہ ڈوراڈاری اسٹریٹ میں واقع بھولا ناتھ کے ایک اہم اڈے اے بی جے ساؤتھ کالونی کے کلب میں ہمارا کوئی مخبر موجود ہے؟"

"بالکل ہے جناب! ہماری ایک ساتھی مس ڈولی وہاں پر ٹیزنگ ڈانسر ہے اور ویٹریس کے بھی وہاں فرائض انجام دیتی ہے۔" ویر نے جواب دیا اور نانا شکور کی آنکھوں میں یک بیک چمک سی ابھری۔ بولا۔

"کیا اس وقت ڈولی سے بات ہو سکتی ہے؟"

"بالکل جناب! کچھ پوچھنا ہے؟"

"ابھی، اسی وقت اُس سے رابطہ کرو اور پوچھو کہ بھولا ناتھ نے اپنے ایک اہم آدمی شاکا کو کلی منجارو کی جس مہم کے لیے روانہ کیا تھا، اس میں اب تک کیا پیش رفت ہو سکی ہے؟" یہ کہتے ہوئے اس نے ویر کو اس سلسلے میں تھوڑا بہت بریف بھی کر دیا۔ ویر تھوڑا وقت مانگ کر لوٹ گیا۔ اس کے بعد نانا شکور مجھ سے مخاطب ہو کر پُرغور لہجے میں بولا۔

"درحقیقت اس خطرناک مہم پر جانے سے پہلے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ بھولا ناتھ کا یہ ٹولا اب تک کتنی کامیابی حاصل کر سکا ہے؟ ممکن ہے وہ اپنی مہم سے کامیاب لوٹا ہو یعنی تمہارے ساتھیوں کو وہ اس وحشی قبیلے سے چھڑا ہی لایا ہو۔"

"آپ نے یہ ٹھیک کیا نانا صاحب!" میں نے جیسے اس کی بات پر صاد کرتے ہوئے کہا۔ "ورنہ ہمارا وقت برباد ہو سکتا تھا۔"

کافی دیر اسی طرح اس موضوع پر تبادلہ خیال کرتے ہوئے گزری۔ پھر ویر لوٹا۔ میں نے بے چینی سے اس کی طرف دیکھا کہ نجانے وہ مس ڈولی سے کیا خبر لایا ہوگا۔ وہ خاصا پُرجوش سا نظر آ رہا تھا۔ اس نے نانا سے کہا۔

"جناب! میری ڈولی سے بات ہو چکی ہے۔ اس

نے بتایا ہے کہ شاکا کو اپنے ساتھی ٹولے سمیت اس مہم پر گئے ہوئے آج تیسرا دن ہے اور وہ ابھی تک وہاں سے نہیں لوٹے ہیں۔“

”وہاں پہنچنے کے بعد ان کی کوئی اطلاع وغیرہ، یا کوئی خبر؟“ نانا نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ میں پورے دھیان سے اور دھڑکتے دل کے ساتھ ان کی گفتگو سن رہا تھا۔

”جناب! اُس کے پاس زیادہ بات کرنے کا وقت نہیں تھا، شاید وہ اور بھی بہت سی اہم باتوں سے ہمیں آگاہ کرنا چاہتی ہے، اسی لیے ڈولی خود یہاں تھوڑی دیر میں پہنچ رہی ہے۔“

”اچھا!“ نانا نے پُرسوچ انداز میں اپنی بھووں کو سکیڑا تھا، خود میں بھی چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ لیکن میں نے سوچا کہ ان کی ساتھی مخبر ڈولی نے میرے مطلب کی جو بات بتانا تھی وہ بتا چکی تھی، اب یہاں آکر وہ کون سے چونکا دینے والے انکشافات کرنے والی تھی، اس کے بارے میں مجھے یہی اندازہ ہو پایا تھا کہ وہ ان کے آپس کے ہی معاملات سے متعلق ہوں گے۔ نانا کو اس کی آمد کا بے چینی سے انتظار تھا۔ مگر مجھے اس انتظار سے کوفت سی ہونے لگی۔ تاہم اس کے بعد نانا نے وہیر کو ایک اور حکم دیا۔

”اسی وقت ہماری روانگی کی تیاری کرو۔ ہمیں ایک تیز رفتار جیپ اور دو ساتھی چاہئیں...... اسلحہ بھی رکھوا دو جلدی......“ نانا شکور نے اسے ہدایت دی۔

وہیر نے مؤدبانہ انداز میں اپنے سر کو جنبش دی اور لوٹ گیا۔

”کیا ہم اس قبیلے کا رخ کرنے والے ہیں؟“ میں نے نانا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”ہاں!“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اب اس کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔“

”یہ قبیلہ ممبی منجارو...... جزیرے کی کون سی سمت پر واقع ہے؟ میرا مطلب ہے آپ کو ان کے ٹھکانے کا تو علم ہوگا ہی؟“ میں نے تسلی چاہی۔

”اس وحشی قبیلے کے ٹھکانے سے کون واقف نہیں......“ وہ بولا۔ ”آدھے جزیرے پر ان کی حکمرانی قائم ہے اور وہاں تک جانے کا راستہ انتہائی دشوار گزار اور گھنے خطرناک ولدلی جنگلوں پر مشتمل ہے۔“

”حیرت ہے، اب تک بھارتی حکومت اس وحشی قبیلے کی بیخ کنی کے لیے کچھ نہیں کر پائی۔“ میں نے کہا تو نانا استہزائیہ ہنسی کے ساتھ بولا۔

”یوں تو انڈیا اس جزیرے پر اپنے مکمل کنٹرول کا دعویٰ کرتا ہے مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے، ہماری مثال تمہارے سامنے ہی ہے کہ یہاں کن لوگوں کا قبضہ ہے، مگر تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ہم سمیت یہاں جتنے بھی جرائم پیشہ عناصر ہیں، وہ سب بھارت کی چند مخصوص اور مقتدر شخصیات کی سرپرستی حاصل کیے ہوئے ہیں۔ وہ ہم سے ٹیکس کی صورت میں ہر ماہ بھتّا لیتے ہیں اور در پردہ ہماری سپورٹ بھی کرتے ہیں۔ یوں ہم جیسوں کی اجارہ داری ایک عرصے سے یہاں قائم ہے، اگرچہ ماضی میں ہماری بھی بیخ کنی کرنے کی کوشش کی گئی تھی، اور انہی ”شخصیات“ نے ہی ہماری درونِ خانہ پشت پناہی کی تھی۔ لیکن اس میں بھارتی حکومت کے بجٹ کو بڑا زبردست دھچکا پہنچا تھا۔ سارے گینگسٹر عارضی طور پر انڈر گراؤنڈ ہو گئے تھے اور انہوں نے جزیروں کے دور افتادہ اور دشوار گزار علاقوں کا رخ کر لیا تھا۔ یہ وہ علاقے تھے جہاں ایک لمحے کے لیے بھی کوئی رکنا پسند نہیں کرتا تھا، کیونکہ وہاں وحشی قبائل کے علاوہ قدرتی آفات کی بھرمار تھی۔ جنگلی مچھر، زہریلے کیڑے اور خطرناک سانپوں، بچھوؤں اور ان دیکھی دلدلوں کا ایک کٹھن چکر تھا۔ ہم تو ان آفات اور حالات و ماحول کے عادی تھے، مگر سرکاری اہلکار جو آرام طلب اور سہل مزاج تھے، ایک ہی دن میں گھبرا کر بھاگ اُٹھے تھے۔“

میں پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچے نانا کی باتیں غور سے سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ آج سے کئی برس پہلے جس منحوس جزیرے کو معصوم اور بے گناہ قیدیوں کے لیے جہنم زار بنایا گیا تھا، وہ آج خود بھارت کے گلے کا پھندا بنا ہوا تھا۔ اس حقیقت سے بہت کم دنیا واقف ہوگی کہ یہاں آج بھی ”کالا پانی“ اپنی تمام تر خطرناکیوں کے ساتھ بھارت کے گلے کا طوق بنا بحرِ ہند میں ہلکورے لے رہا تھا اور خود ان کے لیے ہی مصیبت بنا ہوا تھا۔ انگریز یہاں تباہی و بربادی کا جو بیج بو کر گئے تھے، اس کے مضمرات سب کے سامنے تھے۔

جانے کتنی دیر گزری تھی کہ وہیر نامی وہی شخص ایک چھنال سی چلتا پرزہ نظر آنے والی دبلی پتلی لڑکی کے ساتھ نمودار ہوا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہی ڈولی تھی۔ اس کی عمر مشکل بیس بائیس کے پیٹے میں ہوگی، نقوش تیکھے تھے اور رنگت سانولی، وہ خالص بھارتی حسینہ ہی معلوم ہوتی تھی۔

اندر داخل ہوتے ہی اس نے ایک چونکتی نگاہ سوشیلا اور مجھ پر بھی ڈالی تھی۔ اس کے بعد وہ نانا سے مؤدبانہ پرنام

کرنے لگی!

''بیٹھو کیا خبریں ہیں......؟'' نانا شکور نے اس کے چہرے پہ اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے کہا تو وہ اس کے سامنے والی کرسی پر براجمان ہوگئی، پھر جب کچھ بتانے سے پہلے اس نے ایک متذبذب سی نگاہ مجھ پر ڈالی تو نانا اس کی اُلجھن بھانپ کر بولا۔ ''یہ اپنے ہی ساتھی ہیں، تم بولو......''

ڈولی نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے پہلے تو اُسے مقامی اور ان کے آپس کے معاملات کی نوعیت سے متعلق خبروں سے آگاہ کیا، جس کے لیے وہ ان کے حریف بھولا ناتھ کے ٹھکانے پر مخبری کے لیے پہلے ہی سے مقرر تھی۔ اس کے بعد وہ ہمارے مقصد کی بات پر آگئی۔

''ابھی تھوڑے دنوں پہلے ہی بھولا ناتھ نے اپنے ایک قریبی تامل ساتھی شاکا کو چار پانچ ساتھیوں کے ہمراہ ایک عجیب سی مہم پر روانہ کیا تھا، ان کی منزل جزیرے کے جنوب مشرق میں واقع وحشی قبائل کا وہ علاقہ تھا، جہاں کلی منجارو جیسا سب سے زیادہ سفاک اور خطرناک قبیلہ آباد ہے، میرا اس سے کوئی تعلق تو نہیں تھا مگر یہ فرض ضرور بنتا تھا کہ میں ایک مخبر کی حیثیت سے اس کی بھی کھوج کروں، سو یہی معلوم ہوا کہ مذکورہ ٹولا کسی تین پاکستانی قیدیوں کی رہائی کے سلسلے میں اس طرف روانہ کیا گیا تھا۔'' وہ یہاں تک بتا کر ذرا رکی۔ میں نے بدستور پُرغور سی نظریں اس کے چہرے پہ جمائے رکھتے ہوئے، اس کے توقف پر بے چینی سے پہلو بدلا۔

وہ آگے کہنا شروع ہوئی۔ ''انہیں روانہ کرنے کے بعد بھولا ناتھ شاکا سے اپنے خفیہ ٹرانسمیٹر پر رابطے میں رہا تھا۔ وہ لوگ کامیابی کے ساتھ وہاں تک پہنچ بھی گئے تھے۔ چوری چھپے ان کی آپس کی گفتگو سن کر مجھے یہ بھی اندازہ ہوا تھا کہ انہیں بھولا ناتھ نے اُن وحشی قبیلے سے جنگ کے لیے نہیں بلکہ خصوصی مذاکرات کے سلسلے میں روانہ کیا تھا، کیونکہ اس کا قریبی ساتھی شاکا ایک تامل تھا اور وہ چند قبائلی زبانیں بولنے سے نابلد نہیں تھا۔ مجھے کسی گہرے چکر کی بو آئی اور میں... مسلسل اپنی جان خطرے میں رکھتے ہوئے اور بہانے بہانے سے بھولا ناتھ کے قریب رہتے ہوئے، اس کی گفتگو سنتی رہی تو کچھ مزید چیزوں کا انکشاف ہوا، مجھے نہیں معلوم باس کہ یہ آپ کے لیے سود مند ثابت ہو سکتی ہیں یا نہیں، لیکن بہرحال میں نے اس کا بھی کھوج لگا لیا۔

شاکا کا بھولا ناتھ سے صرف دو دن رابطہ رہا تھا اس کے بعد وہ اچانک ٹوٹ گیا۔ وجہ نامعلوم رہی، تاہم بھولا ناتھ کی باتوں سے جو وہ یہاں اپنے دیگر ساتھیوں سے تبادلۂ خیال کرتے ہوئے کرتا رہتا تھا، اس کے مطابق شاکا اور اس کے مختصر ساتھیوں کا ٹولا وہاں کسی مشکل کا شکار ہو چکا تھا، نیز شاکا نے بھولا ناتھ سے ٹرانسمیٹر پر کچھ انکشافات بھی کیے تھے، جس کے مطابق کلی منجارو کی سرزمین اور وہاں بسنے والے یہ باسی کسی کے زیرِ نگیں ہو چکے ہیں۔ یا یوں کہہ لیں ان لوگوں نے اپنا اثر ورسوخ قائم کر لیا ہے ان پر......''

''کون ہیں وہ لوگ......؟'' نانا شکور نے ایک دم پوچھا۔

''ابھی، کچھ پتا نہیں چل سکا ہے، لیکن سننے میں آیا تھا کہ کلی منجارو کی یہ سرزمین بہت سے لوگوں کے لیے ایک دم خاص اور پُراسرار اہمیت اختیار کر چکی ہے اور کئی ٹولوں نے وہاں کا رخ کر رکھا ہے۔ لگتا کچھ ایسا ہی ہے کہ وہاں ایک بہت بڑی مہابھارت چھڑنے والی ہے۔'' ڈولی نے بتایا اور میری تشویش فزوں تر ہونے لگی۔ نجانے وہاں کیا گڑبڑ ہونے والی تھی اور پتا نہیں کون لوگ وہاں کا رخ کیے ہوئے تھے؟ مجھے تو صرف اول خیر وغیرہ کی فکر لاحق ہو رہی تھی۔

''شاکا کو وہاں جا کر اور بھی بہت سی باتوں کا علم ہوا تھا، لیکن شاید وہ اچانک کسی بڑی مشکل کا شکار ہو گیا ہے اور مزید بتانے سے قاصر رہا ہے۔ تاہم مجھے لگتا ہے کہ اس نے بھولا ناتھ کو کوئی ایک ایسی اہم بات سے بھی ضرور آگاہ کیا ہے جسے سننے کا مجھے موقع نہ مل سکا تھا کیونکہ بھولا ناتھ بھی آج رات اس طرف روانہ ہونے کی تیاریوں میں مصروف ہے۔''

بالآخر ڈولی نے اپنی بات مکمل کی اور نانا شکور ایک گہری سانس لے کر پُرسوچ سی خاموشی میں مستغرق ہو گیا۔

میں اپنی فکر میں کھویا ہوا تھا۔ لیکن جانے کیا بات تھی، مجھے کچھ ایسا لگتا تھا کہ کلی منجارو کی سرزمین میں کوئی بڑا، گہرا اور پُراسرار ڈراما ہونے والا تھا جس کا کہیں نہ کہیں تعلق میرے موجودہ حالات سے ضرور جڑتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ جب ہم اسی رات کی اسرار بھری تاریکی میں ایک بھاری بھرکم جیپ میں جزیرے کی جنوب مشرقی سمت روانہ ہونے لگے تو میرا دل بار بار کہہ رہا تھا کہ کلی منجارو کی پُراسرار سرزمین میں کوئی بہت بڑا اودھم مست قلندر ہونے والا تھا۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

ادھوری خواہش

محمد یاسر اعوان

خواہشوں کے آگے بند باندھنے پڑتے ہیں... مگر کچھ خواہشیں اس نوعیت کی ہوتی ہیں... ان کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے انتہا تک جانا پڑتا ہے... محبوبہ کے حصول نے اسے یوں الجھا دیا کہ اس کی زندگی میں بھونچال سا آگیا... پھر جو کچھ ہوا وہ... ہمت، جرأت اور عبرت سے بھرپور ایڈونچر۔

کششِ ثقل اور کشش زن کا عملی مظاہرہ...... ایک شگفتہ آدمی کی شگفتہ کہانی

میں عام طور پر اپنے کام سے کام رکھتا ہوں جو کوئی زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ کیونکہ درحقیقت مجھے کوئی کام ہی نہیں ہوتا۔ میرا مطلب ہے کہ میں آج کل بے روزگار ہوں۔ تاہم ایک پڑھے لکھے عقل مند دوست، جانسن کا کہنا ہے کہ بیکار اور بے معاش ہونا کوئی تشویش کی بات نہیں کیونکہ دنیا میں ہر دور میں اکیلے آپ ہی نہیں، لاکھوں دوسرے لوگ بھی بے روزگار ہوتے ہیں۔

جانسن، جسے میں انتہائی مشاق اور شعبدہ باز قسم کا ڈرائیور ہونے کی وجہ سے بلائنڈ رائیڈر بھی کہتا ہوں۔ اکثر و بیشتر اس قسم کے عالمانہ خیالات کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ بعض اوقات پچیس تیس ہزار ڈالر تنخواہ لینے والے افسران بھی سال چھ مہینے کے لیے بے روزگار ہو جاتے ہیں۔

میں اس کی باتیں بڑے غور سے سنتا ہوں اور ان پر پورے خلوص سے یقین رکھتا ہوں کیونکہ اس طرح دل کو بڑا حوصلہ رہتا ہے۔ اپنے ارشادات کی زندہ تفسیر وہ خود ہے۔ اس کی عمر چالیس سال ہے اور میں نے زندگی میں ایک دن

کے لیے بھی اسے کوئی باقاعدہ کام کرتے یا ملازمت پر جاتے نہیں دیکھا۔

کہتے ہیں سوچ بچار سے بال سفید ہو جاتے ہیں اور میں فی الحال اپنے بال سفید کرنا نہیں چاہتا لیکن کبھی کبھی مجھے حیرت ضرور ہوتی ہے کہ آخر میں اب تک بے کار کیوں ہوں۔ میں خوش شکل، خوش اطوار اور شریف انسان ہوں۔ اس صورت میں مجھے زیادہ دن بے کار رہنا نہیں چاہیے لیکن شاید مجھے اب تک ملازمت میسر نہ آنے کی وجہ یہ بھی کہ مجھے فوج سے کچھ زیادہ باعزت طریقے سے نہیں نکالا گیا تھا۔ جی ہاں، کچھ عرصہ پہلے تک میں فوج میں سپاہی تھا۔ کہتے ہیں ہر شخص کی ترقی کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ میرے خیال میں ہر شخص کی تنزلی کے پیچھے بھی کسی نہ کسی عورت ہی کا ہاتھ ہوتا ہے۔ میرے معاملے میں اس بات کا کریڈٹ جینی کو جاتا ہے۔ جینی بھی فوج میں ہی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ آفیسر تھی اور میں ایک سپاہی۔ میں نے پہلی مرتبہ اسے اس وقت دیکھا تھا جب ہم فلوریڈا میں تعینات تھے اور کافی عرصے کے لیے ہمیں کسی مشن پر بھیجے جانے کا کوئی امکان نظر نہیں آرہا تھا۔

میں نے سنہرے بالوں اور بھرے ہوئے جسم والی اس دراز قد لڑکی کو دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ اپنی یونیفارم میں وہ خوب جچ رہی تھی۔ پہلی نظر میں ہی مجھے یقین ہو گیا کہ ہم ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔

اس کے محسوسات بھی غالباً یہی تھے تبھی وہ جلد ہی مجھ پر مہربان ہو گئی اور کونے کھدروں میں ہماری ملاقاتیں ہونے لگیں۔ ان ملاقاتوں سے ہماری تشنگی بڑھتی چلی گئی۔ رات کو میں نچلی منزل پر اپنی بیرک میں ہوتا تھا اور وہ اوپر کی منزل پر لیڈی آفیسرز کی بیرک میں...... اس کے فراق میں بستر پر کروٹیں بدلتے بدلتے جب میں تھک جاتا تو چوری چھپے اوپر جا پہنچتا اور پہرا دینے والے سنتری کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اس فلور کے ایک باتھ روم میں جا گھستا جہاں جینی، مجھ سے ملنے آپہنچتی۔ عام طور پر اس ملاقات کے لیے ہم نے صبح تین بجے کا وقت مقرر کیا ہوا تھا۔

چوری چھپے راتوں کو اپنی بیرک سے نکلنا اور لیڈی آفیسرز کی بیرک میں گھسنا آرمی قواعد و ضوابط کے مطابق ایک سنگین جرم تھا لیکن جینی ایسی ہی لڑکی تھی جس سے ملاقات کی خاطر انسان نہ جانے کون کون سی رکاوٹیں پھلانگ سکتا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ اس قسم کی ملاقاتیں تشنگی کا مداوا نہیں ہیں بلکہ تشنگی کو بڑھا دینے کا سبب بن رہی ہیں۔ ظاہر ہے زندگی بھر تو اس طرح گزارا نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ایک روز میں نے جینی سے التجا کر ڈالی کہ اسے مجھ سے شادی کر لینی چاہیے...... روز روز کی ان ملاقاتوں سے جینی کی جو حالت تھی، اسے دیکھتے ہوئے مجھے امید تھی کہ وہ فوراً ہاں کہہ دے گی مگر خلافِ توقع اس نے میرا انٹرویو لینا شروع کر دیا۔ ''کتنے عرصے سے تم آرمی میں ہو فرینک؟''

''تقریباً چھ سال سے......'' میں نے بلا تامل جواب دیا کیونکہ میری یادداشت بہت اچھی ہے۔

''اور ابھی تک تم سپاہی ہی ہو۔'' اس نے گویا میری حالت پر افسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''بھلا میں کسی ایسے شخص سے شادی کس طرح کر سکتی ہوں جو عہدے میں مجھ سے چھوٹا ہے؟ میں کسی ایسے شخص سے شادی کرنا چاہتی ہوں جس کی معاشی بنیادیں مضبوط ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ شادی باعزت طریقے سے ہو، اس کے بعد ہمارا ایک معقول قسم کا گھر ہو اور بچے بھی ہوں۔ چنانچہ مجھ سے شادی کے لیے تمہارے پاس معقول رقم ہونا ضروری ہے۔''

''بیس ہزار ڈالر کافی رہیں گے؟'' میں نے جوش میں آکر پوچھا۔

جواباً وہ خاموش رہی۔

''کہو تو میں یہیں کینٹ میں رہتے ہوئے یہ رقم جمع کرنے کی مہم شروع کر دوں؟ چند راتوں کی بات ہے۔ بس چند لاکرز توڑنے پڑیں گے اور شہر جا کر اندھیری گلیوں میں چند راہ گیروں کو لوٹنا پڑے گا۔''

''تم پھر غلط ہتھکنڈوں پر اتر آئے۔'' وہ بیزاری سے بولی۔ ''مجھے معلوم ہے تمہارا ریکارڈ پہلے بھی کچھ اچھا نہیں، تمہاری شرارتوں کی وجہ سے ہی تمہاری ترقی رکی ہوئی ہے۔ میں چاہتی ہوں تم باعزت اور ناقابلِ اعتراض طریقے سے رقم حاصل کرو...... اور ہاں...... بیس ہزار ڈالر کافی نہیں رہیں گے۔ کچھ عرصہ پہلے تک میرے ذہن میں یہی ہدف تھا لیکن اب مہنگائی بڑھ چکی ہے، جائداد کی قیمتیں بھی کہیں سے کہیں جا پہنچی ہیں۔ اب میرے خیال میں شادی کا ارادہ کرتے وقت انسان کے پاس کم از کم تیس ہزار ڈالر تو ہونے چاہئیں۔''

ابھی ہم شادی جیسے سماجی فریضے کے معاشی پہلوؤں پر تبادلۂ خیال کر ہی رہے تھے کہ باہر میں نے قدموں کی آواز سنی۔ باتھ روم کی کھڑکی سے جھانک کر میں نے محتاط انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ دو لیڈی پولیس آفیسر گشت پر تھیں اور باقاعدہ فہرست کی مدد سے جائزہ لے رہی تھیں کہ کون کون سی

آفیسر اپنے بیڈ پر موجود ہے۔ آرمی کے مردوں کا تو اس طرح راتوں کو شمار کیا جاتا تھا مگر عورتوں کو اس طرح شمار کرنا تو میرے خیال میں زیادتی تھی۔ اس اثنا میں ایک آفیسر جسے شمار کیا جا چکا تھا۔ بستر سے اٹھ کر باتھ روم کی طرف آتی دکھائی دی۔ میں جلدی سے چینی کی اوٹ میں باتھ روم سے نکلا اور جو قریب ترین خالی بیڈ نظر آیا، اس میں دبک کر فوراً کمبل میں پاؤں سے سر تک چھپ گیا۔

آفیسرز کی چیکنگ کے مطابق اس وقت بیرک میں پچیس لیڈی آفیسرز ہونی چاہیے تھیں لیکن وہ نکلیں چھبیس...... لیڈی آفیسرز کی بیرکس میں رات کی گنتی میں ایک آفیسر کم پائی جائے تو اتنی تشویش کی بات نہیں ہوتی، لیکن اگر ایک آفیسر بڑھ جائے تو یہ بڑا سنگین مسئلہ ہوتا ہے...... چنانچہ فوراً وسل بجنے لگی۔ یعنی خطرے کی گھنٹی۔ تمام لیڈی آفیسرز اپنے بستروں سے نکل آئیں اور مستعد ہو گئیں۔ بیرک میں ایک عجیب افراتفری مچ گئی۔ نیند سے اٹھنے والی آفیسرز شاید یہ سمجھی تھیں کہ کینٹ پر کسی دشمن نے حملہ کر دیا ہے، صرف میں کمبل میں دبکا رہا۔ میں اگر چاہتا بھی تو شاید کمبل سے نکل نہ پاتا۔ میرے ہاتھ پاؤں ہی گویا شل ہو گئے تھے۔

بالآخر ایک آفیسر نے میرے اوپر سے کمبل کھینچ لیا اور میں اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اس قدر بدحواس تھا کہ میں نے آفیسرز کو سیلوٹ تک نہیں کیا اور ناک کی سیدھ میں بھاگتا چلا گیا۔ میرے عقب میں بے پناہ شور بلند ہوا اور کوئی آفیسر چلائی ''ہالٹ...... ہالٹ!'' لیکن میں دوڑتا ہی چلا گیا۔

بیرکس کے گیٹ سے نکلنے کے بعد مجھے رکنا پڑا کیونکہ سنتری رائفل سے عین میرے پیٹ کا نشانہ لیے کھڑا تھا اور پہرا دینے والا سنتری جب کسی کو دیکھ کر ہالٹ کہے تو فوراً رک جانا چاہیے۔ کم از کم مجھے اس اہم نکتے کا علم تھا۔ تاہم رکتے رکتے بھی میں اس کے کافی قریب پہنچ گیا۔

''معاف کرنا یار......'' میں نے ہانپتے ہوئے اور ہنستے ہوئے خواہ مخواہ دوستانہ انداز اختیار کرنے کی کوشش کی جیسے میری اس سے بڑی پرانی یاری چلی آرہی ہو، ابھی میں کوئی عذرِ لنگ پیش بھی نہیں کر پایا تھا کہ بہت سی لیڈی آفیسرز میرے تعاقب میں دوڑتی ہوئی دروازے تک آپہنچیں۔ ان میں سے بیشتر شب خوابی کے لبادوں میں تھیں اور ان لبادوں میں سے بیشتر تو لبادے کہلانے کے مستحق ہی نہیں تھے، خاصے قابلِ اعتراض تھے، غالباً انہی کی وجہ سے سنتری کے اعصاب پر خاصا برا اثر پڑا اور اس نے گولی داغ دی۔ شکر ہے گولی مجھے صرف چھوتی ہوئی گزر گئی۔ اس ہنگامے میں تین کے قریب آفیسرز بے ہوش ہو گئیں۔ پورے کینٹ کی سرچ لائٹس آن ہو گئیں اور سائرن بجنے لگا۔

مردوں کی بیرکس میں جب کوئی گڑبڑ ہوتی ہے تو عموماً آن ڈیوٹی آفیسر ہی اپنے معاونین کی مدد سے بڑے صبر و سکون سے حالات کو سنبھال لیتا ہے لیکن عورتوں کی بیرکس کا شاید اسٹیشن کمانڈر سے براہ راست رابطہ ہوتا ہے۔ ذرا سی دیر میں پانچ چھ جیپیں فراٹے بھرتی بیرکس کے سامنے آکر رکیں اور چاروں طرف کمانڈر کے ساتھ بہت سے آفیسرز بھی نظر آنے لگے۔

اب یہ بتانے کی تو ضرورت نہیں کہ میں کتنی مصیبت میں پھنس چکا تھا۔ میرے کورٹ مارشل کی تیاریاں ہونے لگی تھیں۔ مجھ پر الزامات کی فہرست پانچ صفحات پر مشتمل تھی۔ مجھے آرمی کے ایک وکیل کی خدمات بھی میسر تھیں۔ جس نے مجھے بتایا کہ باس مجھ سے سودے بازی کے لیے تیار ہے کہ اگر میں اس لیڈی آفیسر کا نام بتا دوں، جس کے پاس میں درحقیقت موجود تھا تو وہ الزامات میں کچھ کمی کر دے گا۔

لگتا یہی تھا کہ واقعے کی رات افراتفری میں کوئی بھی یہ نہیں دیکھ سکا تھا کہ میں باتھ روم سے کس کی اوٹ سے نکلا تھا اور کس بیڈ سے اٹھ کر بھاگا تھا۔ آپ نے اب تک میری فطرت کا کچھ کچھ اندازہ تو کر لیا ہوگا۔ میں تو کسی بھی عورت کا راز افشا نہیں کر سکتا تھا چہ جائے کہ اس عورت کو رسوا کرتا جس سے میں شادی کرنے جا رہا تھا۔ ویسے بھی مجھے شک ہو چلا تھا کہ آخر سب لوگ اسی لڑکی کا نام کیوں جاننا چاہتے تھے جس سے میں ملنے گیا تھا۔

مجھے تین ماہ نظر بندی کی سی حالت میں گزارنے پڑے۔ اس کے بعد مجھے رہا کر دیا گیا۔ جینی نے میرا شکریہ ادا کیا کہ میں نے اس کا نام ظاہر نہیں کیا تھا۔ تاہم شادی کے معاملے میں وہ اب بھی اپنی شرط پر قائم تھی بلکہ اب تو اس کے خیال میں شادی کے لیے رقم کی فراہمی اور بھی زیادہ ضروری ہو گئی تھی، کیونکہ اب میں ملازم بھی نہیں رہا تھا۔ میں فوج کا ایک سابق مجرم ہو چکا تھا۔ آرمی نے مجھے ناپسندیدگی کے تبصرے کے ساتھ میرے کاغذات دے کر رخصت کر دیا اور میں بے رحم دنیا کا سامنا کرنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ میرا خیال تھا کہ میرے تجربے اور ذہنی قابلیت سے واقف ہونے کے بعد ہر کمپنی مجھے ہاتھوں ہاتھ لینے کی بجائے کیوں ہر جگہ سے جواب ہی ملتا رہا۔ دو ایک جگہ پر تو میں نے ریسرچ انجینئر کی آسامی کے لیے بھی درخواست دے ڈالی تھی۔ ان لوگوں نے مجھ پر اعتراض کیا کہ میں تو کسی بھی اعتبار سے

ریسرچ انجینئر نہیں ہوں۔ بعض کم بخت صرف ڈگریاں اور موضوعاتی تجربہ دیکھتے ہیں۔ مجموعی طور پر انسان کی اہلیت اور ذہنی استعداد کو نہیں دیکھتے۔

اس روز میں اپنے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھا انہی حالات پر غور کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ گردوپیش کا نظارہ بھی کر رہا تھا جو کچھ ایسا زوردار نہیں تھا۔ میں دوسری منزل پر واقع ایک کمرے میں رہتا ہوں اور جس کھڑکی کے قریب اس وقت میں بیٹھا تھا، یہاں سے سامنے ہی بغیر پلستر کی ایک اونچی سی دیوار نظر آتی ہے۔ یہ نیشنل فارمر بینک کی عقبی دیوار ہے جس میں ایک دروازہ بھی موجود ہے لیکن بینک والے اس دروازے کو استعمال نہیں کرتے کیونکہ یہ عقبی گلی میں کھلتا ہے اور یہ گلی خاصی گندی ہے۔

میں اس روز خاصا اُداس تھا۔ ایک شخص جو برسرِ روزگار نہ ہو اور جسے ملازمت ملنے کے کوئی آثار بھی نظر نہ آ رہے ہوں۔ جس کے پاس تیس ہزار ڈالر نہ ہوں کہ وہ اپنی محبوبہ سے شادی کر سکے۔ وہ اداس نہیں تو کیا خوش ہوگا؟ گلی میں کاٹھ کباڑ کے نظارے نے مجھ پر اور بھی یاسیت طاری کر دی تھی۔

اچانک ہی بینک کا عقبی دروازہ کھلا اور دو آدمی جن کے ہاتھوں میں ریوالور تھے، دوڑتے ہوئے باہر آئے۔ ان میں سے ایک کینوس کی جیکٹ پہنے ہوئے تھا اور اس کا سر عجیب اور بے ہنگم سا تھا۔ ان دونوں آدمیوں کے باہر آتے ہی ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ بینک کا الارم بجنے لگا۔ دو اور آدمی دوڑتے ہوئے بینک کے دروازے سے نکلے۔ ان کے ہاتھوں میں کینوس کے تھیلے تھے۔ ان کے پیچھے پیچھے بینک کا گارڈ بھی باہر آیا۔ وہ ان پر فائرنگ کر رہا تھا۔ گلی میں دھماکے گونج رہے تھے۔ دفعتاً تھیلے اٹھا کر بھاگنے والوں میں سے ایک گر پڑا۔ گولی لگنے سے اس کی آدھی کھوپڑی اڑ چکی تھی۔ تب ریوالور بردار لٹیروں میں سے ایک نے پلٹ کر فائر کیا۔ گولی گارڈ کے سینے میں لگی اور وہ گر پڑا۔ لٹیرا وہ تھیلا اٹھانے کے لیے لپکا جو اس کے ساتھی کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا لیکن گارڈ میں ابھی سانس باقی تھا۔ مرتے مرتے بھی اس نے دو فائر کر دیے۔ لٹیرے کو گولی تو نہیں لگی لیکن اس نے تھیلا اٹھانے کا خیال ترک کر دیا اور جان بچانے کے لیے دوڑ پڑا......

میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ سب کچھ سلو موشن میں ہو رہا ہے۔ جس طرح عموماً خواب میں ہوتا ہے۔ اچانک مجھے ہوش سا آ گیا اور ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ چار ڈاکو بینک لوٹ کر بھاگے تھے۔ ان میں سے ایک گارڈ کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ باقی تین میں سے ایک نے گارڈ کو ہلاک کر دیا تھا اور وہ تینوں فرار ہو چکے تھے۔ اب رقم کا ایک تھیلا گلی میں یونہی پڑا تھا، کوئی اسے دیکھنے والا نہیں تھا۔

میرے لیے یہ ایک سنہرا موقع تھا۔ میں تیزی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچا۔ تھیلا مجھ سے تقریباً بیس پچیس فٹ کے فاصلے پر پڑا تھا۔ اس وقت تک گارڈ بھی غالباً مر چکا تھا۔ کیونکہ وہ مٹی میں چہرہ چھپائے اوندھا اور ساکت پڑا تھا۔

میں تھیلا اٹھا کر واپس دوڑا۔ اچانک دو فائر ہوئے، میں نے مڑ کر دیکھا کینوس کی جیکٹ والا ڈاکو گلی کے کونے سے جھانک رہا تھا اور فائر اسی نے کیے تھے۔ خوش قسمتی سے کوئی گولی مجھے چھوتی ہوئی بھی نہیں گزری تھی۔ میں نے دروازے سے اندر چھلانگ لگا دی۔ دروازہ بند کر کے میں نے اس چھوٹے سے شگاف سے باہر جھانکا جس میں شیشہ لگا ہوا تھا۔ بینک سے اب ایک اور شخص نکل آیا تھا۔ وہ اس طرف فائر کر رہا تھا جہاں میں نے کینوس کی جیکٹ والے لٹیرے کو دیکھا تھا۔ بہرحال اب صورت حال کا یہاں کھڑے ہو کر جائزہ لینے کا وقت نہیں تھا۔ اس لیے میں سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ اسی دوران میں نے ایک کار اسٹارٹ ہونے اور سڑک پر ٹائروں کے رگڑ کھانے کی تیز آواز سن لی تھی۔

تھیلا اپنے بیڈ پر پھینک کر میں نے کھڑکی سے جھانکا۔ گارڈ کی لاش کے گرد کچھ لوگ جمع ہو چکے تھے کوئی چلا رہا تھا۔ ”ایمبولینس کے لیے فون کرو۔“ کچھ دور ڈاکو کی لاش پڑی تھی۔

تھیلا اٹھا کر میں ایک بار پھر کمرے سے نکلا اور دوسری سیڑھیوں سے نیچے تہ خانے میں آیا، یہاں ایک اسٹور روم تھا جہاں لوگوں کے پھٹے پرانے گدے اور دوسرا کاٹھ کباڑ بھرا پڑا تھا۔ میں نے تھیلا ایک گدے کے نیچے چھپایا اور واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ اب میں نے کھڑکی سے اس طرح جھانکا کہ مجھے نہ دیکھا جا سکے۔ گلی میں بہت سے پولیس والے پہنچ چکے تھے۔ میرا مالک مکان تھامسن ایک سارجنٹ سے باتیں کر رہا تھا پھر وہ میری کھڑکی کی طرف اشارہ کر کے سارجنٹ کو جانے کیا بتا رہا تھا جس کے بعد میں نے سارجنٹ کو اپنی بلڈنگ کے اسی عقبی دروازے کی طرف بڑھتے دیکھا جس سے میں اوپر آیا تھا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا اور میں فوراً کھڑکی سے ہٹ گیا۔

میری عقل اس وقت تیزی سے کام کر رہی تھی۔ میں

نے جلدی سے دروازہ مقفل کیا، پتلون اتار کر شب خوابی کے کپڑے پہنے۔ جلدی سے ایک گلاس شراب کا حلق میں انڈیلا اور کچھ منہ پر بھی مل لی تاکہ دور ہی سے اس کی بو آجائے۔ پھر میں نے انگلیوں سے اپنے بال بکھیرے اور بستر میں گھس گیا۔

چند لمحوں بعد میرے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور کھردری سی آواز سنائی دی۔ "دروازہ کھولو...... پولیس......"

میں نے دوسری آواز پر دروازہ کھولا اور اس شخص کی سی اداکاری کرنے کی پوری پوری کوشش کی، جسے گہری نیند سے جگا دیا گیا ہو۔ "کیا مصیبت ہے؟" میں نے ناگواری سے پوچھا۔

بوڑھا نکسن بھی سارجنٹ کے ساتھ آگیا تھا۔ وہ ہیجان زدہ لہجے میں بولا۔ "نیچے بینک لٹ گیا ہے...... ڈاکو ایک لاکھ ڈالر لے گئے ہیں...... گولیاں چلتی رہی ہیں...... ایک ڈاکو اور بینک کا گارڈ مر گیا ہے اور تم یہاں پڑے سو رہے ہو۔"

"کیوں مذاق کر رہے ہو۔" میں نے بے یقینی کا مظاہرہ کیا۔ اس بار سارجنٹ بولا۔

"تمہارے کمرے کی کھڑکی گلی میں کھلتی ہے۔ کیا تم نے کچھ نہیں دیکھا، کچھ نہیں سنا؟" پھر اس نے گہری سانس لے کر شراب کی بو سونگھی۔

"نہیں...... میں تو گہری نیند سو رہا تھا۔" میں نے کہا۔

سارجنٹ نے زیادہ بحث نہیں کی اور مجھے دوبارہ سونے کا مشورہ دے کر رخصت ہو گیا۔ میں نے زور سے دروازہ بند کیا اور بیٹھ کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

کچھ دیر بعد میں نے کپڑے بدلے اور نیچے اسٹور روم میں جا کر تھیلا نکال کر رقم گنتی کی۔ تھیلے میں پچاس ہزار ڈالر تھے۔ تھیلا دوبارہ چھپا کر میں واپس کمرے میں آیا۔ اب میرا ذہن بالکل صحیح طور پر کام کر رہا تھا۔ جینی سے شادی کرنے کے لیے مجھے جتنی رقم درکار تھی، قدرت نے گھر بیٹھے مجھے اس سے زیادہ رقم دے دی تھی۔

ایک لٹیرا مجھے دیکھ چکا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ ابھی کچھ عرصہ وہ اپنی ہی جان بچانے کی فکر میں رہے گا۔ تکیے میں منہ چھپائے میں دیر تک قدرت کی اس انوکھی مہربانی پر ہنستا رہا۔

آرمی سے میرے ڈسچارج ہونے میں دو ماہ باقی تھے، گویا دو ماہ بعد ہماری زندگی کا ایک سنہرا دور شروع ہونے والا تھا۔

میں نے فون پر جینی سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ بہر حال میں نے دن کا باقی حصہ ہوا کے دوش پر پرواز کرتے ہوئے گزارا۔ شام کو میں نے اسٹور روم میں جا کر تھیلے سے سو ڈالرز کا نوٹ نکالا اور ایک ساحلی ہوٹل میں شاندار کھانا کھانے چلا گیا۔

میں واپس آیا تو اپنے خواب مجھے بکھرتے محسوس ہوئے، کیونکہ گلی میں عمارت کے سامنے سڑک کے دوسری طرف ایک کار کھڑی تھی جس میں بیٹھے ہوئے تین آدمی عمارت کے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک کو میں نے پہچان لیا تھا، یہ وہی ڈاکو تھا جس نے بینک ڈکیتی کی واردات کے دوران کینوس کی جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ جیکٹ اس کے جسم پر نہیں تھی مگر مجھے اس کی شناخت میں کوئی شبہ نہیں تھا۔

پہلے تو میں بدحواس ہو کر بھاگنے لگا تھا لیکن بمشکل میں نے اپنے آپ پر قابو رکھا اور عمارت کے سامنے سے گزرتا چلا گیا۔ چکر کاٹ کر میں پچھلی طرف سے اپنے کمرے میں پہنچا۔ دروازہ مقفل کر کے چند لمحے تک میں اندھیرے ہی میں کھڑا کانپتا رہا۔ اس وقت میری سب سے بڑی خواہش بس یہی تھی کہ رقم والا تھیلا لوں اور یہاں سے نکل بھاگوں۔ شہر سے نکلنے کے لیے میں کوئی اچھی سی گاڑی بھی خرید سکتا تھا اور طویل ہوائی سفر کے لیے ٹکٹ بھی......

میں نے ابھی کمرے سے نکلنے کے ارادے سے ناب پر ہاتھ ہی رکھا تھا کہ دستک ہونے لگی۔ میری گدی کے بال کھڑے ہو گئے۔ میں فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ پھر مالک مکان نکسن کی آواز سن کر مجھے کچھ سکون ہوا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "فرینک! میں نے سیڑھیوں پر تمہارے قدموں کی آواز سن لی تھی۔ مجھے معلوم ہے تم اندر ہو، لائٹ کیوں نہیں جلا رہے؟ دروازہ کھولو...... مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

مجبوراً میں نے لائٹ جلائی اور دروازہ کھول دیا۔ بوڑھا نکسن تیزی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ "آج شام ایک شخص تمہارے بارے میں پوچھنے آیا تھا۔ اسے تمہارا نام تو یاد نہیں رہا تھا لیکن حلیہ اچھی طرح یاد تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس کے پاس تمہارے لیے کوئی ملازمت ہے۔"

"تم نے اسے میرا نام تو نہیں بتا دیا؟" میں نے کراہ کر پوچھا۔ میں اپنے آپ کو بیمار محسوس کرنے لگا تھا۔

"ہاں، نام تو میں نے بتا دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ تمہیں ملازمت کی ضرورت ہے۔" نکسن نے داد طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"شکریہ......" میں نے مردہ لہجے میں کہا اور دروازہ

بند کرلیا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ کتنی بڑی مصیبت میں پھنس چکا ہوں۔ وہ لٹیرے مجھ سے صرف رقم ہی واپس لینے کے چکر میں نہیں تھے بلکہ یقیناً میری جان بھی لینے کے خواہاں تھے۔ کیونکہ بینک کا گارڈ مرچکا تھا اور میں اس کے قتل کا چشم دید گواہ تھا جو قاتل کو پہچان سکتا تھا۔

میں یہ تو بتا ہی چکا ہوں کہ میں خاصا ذہین ہوں۔ بہرحال یہ موقع ایسا تھا کہ مجھے کسی اپنے سے زیادہ ذہین شخص کے مشورے کی ضرورت تھی اور فوری طور پر مجھے بلائنڈ رائیڈر، کا خیال آگیا۔

میں نے دبے قدموں باہر آکر راہداری کے فون پر اس سے رابطہ کیا۔ وہ چونکہ میرا پرانا دوست اور خیرخواہ ہے اس لیے میں نے اسے بلاکم وکاست سب کچھ بتادیا۔ اس دوران وہ اس طرح خاموش رہا کہ مجھے شبہ ہوا کہ وہ فون بند کرگیا ہے مگر پوچھنے پر فوراً ہی پتا چلا کہ وہ پوری توجہ سے سن رہا تھا۔

''تھیلے میں کتنی رقم ہے......؟''

''پچاس ہزار ڈالر......ایک سو ڈالر کم سمجھو۔'' میں نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ ہنکارا بھر کر بولا۔ ''میں تمہیں اس مصیبت سے نکال لیتا ہوں مگر میری فیس بیس ہزار ڈالر ہوگی۔''

''یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔'' میں چلا اٹھا۔

''کیا تمہیں یہ رقم پوری زندگی سے زیادہ عزیز ہے؟'' بلائنڈ رائیڈر نے پُرسکون لہجے میں پوچھا پھر وہ جواب کا انتظار کیے بغیر بولا۔ ''تمہاری مرضی ہے......بیس ہزار ڈالر دے دو یا مرجاؤ۔'' جانسن جب اس طرح دوٹوک بات کرتا ہے تو بحث کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ چنانچہ میں نے بادل ناخواستہ آمادگی کا اظہار کردیا۔

''منصوبہ میں نے اسی وقت تیار کرلیا ہے اور اس میں کوئی سقم نہیں اور اس کی ناکامی کا بھی کوئی امکان نہیں۔ بشرطیکہ تم حرف بہ حرف میری ہدایات کی پابندی کرو۔'' وہ بولا۔ ''منصوبہ یہ ہے کہ تم کسی ایسی کھڑکی میں کھڑے ہوکر میرا انتظار کرو، جہاں سے تم عمارت کے سامنے کھڑی ہوئی اس گاڑی پر نظر رکھ سکو۔ جیسے ہی تم میری کار کو سڑک کے دوسری طرف رکتے دیکھو، تو تم تھیلا مضبوطی سے بغل میں دبا کر دوڑتے ہوئے میری کار میں آبیٹھو۔ باقی کام مجھ پر چھوڑ دو۔ کیسا عظیم منصوبہ ہے۔'' اس نے خود ہی اپنے آپ کو داد دی۔

''تم شاید سمجھے نہیں بلائنڈ رائیڈر۔'' میں نے بے بسی سے کہا۔ ''وہ لوگ ریوالور لیے مجھے نشانہ بنانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔''

''تمہاری بکواس سنتے سنتے میرے کان پک چکے ہیں۔'' وہ بیزاری سے بولا حالانکہ میں نے ابھی تک بکواس شروع ہی نہیں کی تھی۔

''مجھے ان لوگوں سے کوئی دلچسپی نہیں جو میری بات پر یقین نہیں کرتے۔ مجھ پر بھروسا نہیں کرتے۔''

''ٹھیک ہے۔'' بالآخر میں نے کہا۔ بلائنڈ رائیڈر اتنا عقل مند اور باصلاحیت انسان ہے کہ آنکھیں بند کرکے اس پر بھروسا کرنا ہی پڑتا ہے۔

''میں پندرہ منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔'' وہ بولا اور اس کے ساتھ ہی اس نے سلسلہ منقطع کردیا۔

اس کے انتظار میں یہ پندرہ منٹ مجھے پندرہ برس کے برابر محسوس ہوئے۔ میں ایک کھڑکی کے دونوں پٹوں کے درمیان ذرا سی درز بنائے کھڑا تھا کہ میں نے اس کی چھوٹی سی سرخ اسپورٹس کار کو عمارت کے سامنے رکتے دیکھا۔ میں ڈاکوؤں کی گاڑی کو بھی آسانی سے دیکھ رہا تھا۔

میں نیچے آیا اور تن بہ تقدیر ہوکر دروازہ کھول کر تھیلا بغل میں دبائے بلائنڈ رائیڈر کی کار کی طرف دوڑ پڑا۔ اس نے مجھے آتے دیکھ کر کار کا دروازہ کھول دیا تھا۔ میں نے چھلانگ لگائی اور سیٹ پر جاگرا۔ اس وقت تک ڈاکو بھی مجھے دیکھ چکے تھے اور انگلیوں سے میری طرف اشارے کرکے تیزی سے ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکلی پڑ رہی تھیں۔

بلائنڈ رائیڈر بولا۔ ''اب ان کی طرف دیکھ کر مسکراؤ اور یوں ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہو، جیسے وہ تمہارے دوست ہوں۔''

مجھے یوں لگا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہے لیکن فی الحال چونکہ میں اسی کے دماغ پر انحصار کرنے پر مجبور تھا خواہ وہ چلا ہوا تھا یا رُکا ہوا۔ اس لیے میں نے ڈاکوؤں کی طرف دیکھ کر دانت نکالے اور ہاتھ بھی ہلایا۔ میری اس حرکت سے غالباً وہ شش و پنج میں پڑ گئے اور آپس میں بحث کرنے لگے۔ اسی دوران میں بلائنڈ رائیڈر نے ہیلمٹ سر پر رکھا، پہلی جنگ عظیم کے زمانے کے پائلٹوں والا چشمہ چڑھایا اور ایکسلریٹر دبا دیا۔ میں نے دیکھا ڈاکو بھی ہمارے پیچھے چل پڑے تھے۔ وہ اس قدر قریب تھے کہ میں انہیں غصے سے دانت نکوستے بھی دیکھ سکتا تھا۔ آثار کافی برے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اس دوڑ بھاگ کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

دیکھتے ہی دیکھتے ہم شہر سے نکل آئے۔ اس وقت بھی

ڈاکوؤں کی گاڑی ہم سے زیادہ پیچھے نہیں تھی۔ بلائنڈ رائیڈر نے کار کا رخ اسٹیٹ ہائی وے کی جانب موڑ دیا۔ وہ قطعاً پریشان نظر نہیں آرہا تھا بلکہ وہ تو بڑے مسرور انداز میں کچھ گنگنا رہا تھا، جیسے بیس ہزار ڈالر اس کی جیب میں منتقل ہو چکے ہوں۔

اب ہم پہاڑ پر چڑھنے لگے تھے۔ ڈاکو بدستور اتنے ہی فاصلے پر تھے۔ ہمارے درمیان فاصلہ بڑھ رہا تھا نہ گھٹ رہا تھا...... ”فرینک پیارے! وہ گویا چہل قدمی کے انداز میں گپ شپ شروع کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نے ایک مرتبہ اس موضوع پر ایک مضمون پڑھا تھا کہ شریف شہری عموماً ٹریفک کے حادثات کا شکار کیوں ہو جاتے ہیں؟ خلاصہ اس سوال کے جواب کا یہ تھا کہ وہ عموماً ٹریفک قوانین کا بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ حرف بہ حرف ان میں الجھے رہتے ہیں اور ڈرائیونگ کی طرف ان کا دھیان کم رہ جاتا ہے۔ ابھی آگے ایک سائن بورڈ آئے گا۔ اس پر لکھا ہوگا کہ چڑھائی سے اترتے وقت گاڑی پہلے دوسرے گیئر میں رکھیے۔“

”بلائنڈ رائیڈر......!“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”پچھلی گاڑی میں سے ایک بدمعاش کھڑکی سے باہر لٹک رہا ہے اور پستول کا رخ ہماری کار کی طرف کر رہا ہے۔“

”بظاہر گدھے نہیں لگتے۔“ بلائنڈ رائیڈر ناگواری سے بڑبڑایا۔ ”ہمیں ان سے پیچھا چھڑانا ہی پڑے گا۔“ اس نے ایکسلریٹر کچھ اور دبا دیا۔

اس وقت مجھے صحیح معنوں میں تیز رفتاری کا احساس ہوا کیونکہ ہم پہاڑ کی چوٹی پر پہنچنے کے بعد اب دوسری طرف اترنے لگے تھے اور مجھے یوں لگ رہا تھا کہ ہماری کار پہاڑ سے نہیں اتر رہی بلکہ ہمارا جہاز لینڈ کرنے کے لیے چکر کھاتا ہوا نیچے آرہا ہے۔ بل کھاتے ہوئے راستے کے ایک طرف گہری کھائیوں اور تاریکی کے سوا کچھ نہیں تھا۔

”بلائنڈ رائیڈر!“ میں نے کانپتی آواز میں کہا۔ ”کیوں نہ ہم کہیں اور رک کر ان سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کریں...... آگے ایک خطرناک موڑ آرہا ہے۔“

”اوہ...... تو تمہیں بھی معلوم ہے چغد؟“ اس نے گویا خوشگوار سی حیرت سے کہا۔ اسی لمحے ایک سنسناتی ہوئی گولی ہمارے قریب سے گزر گئی۔ رائیڈر نے خطرناک موڑ عبور کرتے ہی گیئر کم کر دیے لیکن ایکسلریٹر دبائے رکھا۔ ایک لمحے تو مجھے لگا کہ گاڑی کا انجن پھٹ جائے گا۔ پھر اس نے بریک لگا دیے۔ کار لہرائی مگر اس نے زمین نہیں چھوڑی اور بالآخر رک گئی۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ ڈاکوؤں کی بڑی سی کار موڑ سے نمودار ہوئی۔ وہ اس وقت بھی بحث و تمحیص میں مصروف تھے۔ اسپورٹس کار کو اچانک سامنے پا کر اس کار کے ڈرائیور نے بریک لگائے اور ساتھ ہی اسٹیئرنگ وہیل دائیں طرف گھمایا۔ ان دونوں کاموں کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کار نہ تو رکی اور نہ دائیں طرف اس حد تک مڑی جس حد تک ڈرائیور چاہتا تھا۔ وہ کچھ زیادہ ہی مڑتی چلی گئی اور پھر آہنی تاروں کے جنگلے کو توڑتی ہوئی نشیب میں غائب ہوگئی۔ ڈاکو شاید اس وقت بھی آپس میں جھگڑ رہے تھے پھر ایک زوردار دھماکا سنائی دیا۔ ڈاکوؤں کی گاڑی نے بالآخر زمین کو چھو لیا تھا۔ اس میں جب آگ لگی تو روشنی اوپر تک آتی محسوس ہوئی۔ بلائنڈ رائیڈر نے اطمینان سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اب وہ دوسرے گیئر میں گاڑی چلا رہا تھا۔

”سارا مسئلہ دراصل کشش ثقل کا ہے پیارے!“ اس نے نہایت اطمینان سے مجھے سمجھایا۔ ”دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ گیئر کم کرنے کا صحیح موقع محل کیا ہے اور بریک لگانے کا مناسب وقت کون سا ہے...... اگر گاڑی تیزی سے نشیب کی طرف آرہی ہو گی اور کشش ثقل اس پر اپنا کام دکھا رہی ہو گی تو بریک لگانے کا کوئی فائدہ نہیں، بلکہ نقصان ہوگا کیونکہ سمت غلط ہو جائے گی۔“ وہ ایسے عالمانہ لہجے میں بول رہا تھا جیسے کوئی عمر رسیدہ پروفیسر کلاس میں لیکچر دے رہا ہو۔ بھلا اس کی غیر ضروری باتوں پر دھیان دینے کی کیا ضرورت تھی۔

شہر واپس آ کر میں نے وعدے کے مطابق اسے بیس ہزار ڈالر دے دیے۔ اب بھی بہرحال میرے پاس اتنی رقم تو موجود تھی جتنی جینی کا مطالبہ پورا کرنے کے لیے درکار تھی۔

میں نے پہلی فرصت میں جینی کو فون کیا۔ کینٹ ٹیلی فون ایکسچینج والوں نے معلومات حاصل کر کے مجھے بتایا کہ جینی، تو آری کو خیرباد کہہ کر جا چکی ہے، کیونکہ اس نے آری کے ایک خانساماں سے شادی کر لی تھی...... شاید انتظار کرتے کرتے میری طرف سے وہ مایوس ہو گئی تھی۔

اسے کہتے ہیں قسمت کا چکر...... اب میں سو کم تیس ہزار ڈالر لیے بیٹھا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ ان کا کیا کروں؟ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ میں بے حد ذہین ہوں لیکن بعض معاملات میں ذہانت بھی کام نہیں آتی...... اب دیکھیں نا، یہ تیس ہزار ڈالر تو میں نے جینی سے شادی کے لیے سنبھال کر رکھے تھے۔ اب میں انہیں کسی اور کام میں تو نہیں لگا سکتا۔ میرے خیال میں اب مجھے انتظار کرنا چاہیے کہ جینی جیسی کوئی اور لڑکی مجھ سے ٹکرائے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

معقول معاوضہ

تمکین رضا

ایک نوخیز دوشیزہ کی شادی کا معاملہ جو والدین کے لیے پریشانی کا باعث بن رہا تھا... وہ زمانے کی گرم ہواؤں سے ناآشنا تھی... اور ایک نازک کلی کے مانند تھی... والدین اس کے متعلق بدگمانی کا شکار تھے جو وقت گزرنے کے ساتھ جال کی طرح الجھتی اور پھیلتی جارہی تھی۔ حقیقت و سراب کے بھید میں چھپے فراڈ کا انکشاف۔

بے روزگار نوجوان کی سرگزشت جسے اپنے کام کا معقول معاوضہ مل گیا تھا......

روز ویلٹ کا کہنا تھا کہ بُرے دن ختم ہو گئے۔ شاید یہ اس نے اپنے لیے کہا ہوگا کیونکہ میری پریشانی کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ میری بے روزگاری کا تیسرا سال چل رہا تھا گو اب بھی میرے پاس دو بہترین سوٹ اور ایک ہیٹ تھا لیکن ڈھنگ کے جوتے نہ ہونے کی وجہ سے بڑی پریشانی ہورہی تھی۔ مجھے گزارہ کرنے کے لیے چھوٹے موٹے کام کرنا پڑتے اور جب بھی اخبار کے ذریعے یہ اطلاع ملتی کہ بندرگاہ پر سامان لانے والا جہاز لنگر انداز ہوا ہے تو میں اپنے کزن لیوک کے ہمراہ گودی پر پہنچ جاتا اور وہاں ہم دیہاڑی دار مزدور کی طرح کام کرنے لگ جاتے۔ لیوک نے اپنے تعلقات کی بنا پر دو عدد جعلی یونین کارڈز حاصل کر لیے تھے۔ جسے دکھا کر ہم لائن میں لگ جاتے۔ اگر قسمت یاوری کر جاتی تو فورمین انگلی سے اشارہ کر کے مجھے کام پر لگا دیتا، یہ بڑی مشقت والا کام تھا اور مجھے بارہ سے چودہ گھنٹے تک اپنے وزن سے بھاری کریٹ اٹھانا پڑتے۔ شام کو اس مشقت کا معاوضہ صرف دو ڈالر ملتا۔ میں اُمید کے سہارے دن گزار رہا تھا کہ اتنے پیسے کما سکوں جس سے بلوں کی ادائیگی کے علاوہ اپنے لیے مناسب کپڑے اور جوتے بھی خریدے جا سکیں۔ گودی پر میں ڈانگری اور بوٹ پہنتا تھا۔ اس وجہ سے میرے دونوں سوٹ محفوظ تھے۔ جنہیں میں نے اپنی نئی ملازمت کے لیے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔

مہینے کے زیادہ تر دن کام کے بغیر ہی گزر جاتے تھے۔ اگر ہماری جیب میں چند سکے ہوتے تو میں اور لیوک خودکار مشین پر جا کر ایک پیالی کافی اور ایک سویٹ رول لیتے اور اسے آدھا آدھا کر کے کھا لیتے اور اپنی قسمت کو

کوستے ہوئے آنٹی لوئی کے ٹھکانے پر جا کر سو جاتے۔ آنٹی کا دم غنیمت تھا۔ وہ ہمارے خاندان کی واحد بزرگ خاتون تھی جو ویلفیئر آئی لینڈ میں مددگار نرس کے طور پر کام کرتی تھی اور اس کا چھوٹا سا اپارٹمنٹ بھتیجوں کے لیے ہر وقت کھلا رہتا تھا جنہیں رہائش اور خوراک کی ضرورت تھی۔ ایک مرتبہ تو وہاں انتشار ہو گیا کہ ہم میں سے چند ایک کو فرش پر سونا پڑا لیکن یہ صورتِ حال زیادہ دیر نہ رہی۔ ہمارے کئی کزنز قسمت آزمانے مغرب کی جانب چلے گئے اور لیوک کی بہن کیتھرین کو سوٹن پلیس میں خادمہ کی ملازمت مل گئی۔ اسے وہیں رہنا تھا چنانچہ لوئی نے مجھے کاؤچ اور لیوک کو فولڈنگ بستر دے دیا جو وہ رات کو ہال میں بچھا لیتا تھا۔

کیتھرین کو سوٹن پلیس میں رہتا دیکھ کر میرے ذہن میں بھی ایک اچھوتا خیال آیا۔ جس جگہ ہم رہ رہے تھے، وہاں ہمارے پاس کچھ نہیں تھا اور چند بلاک کے فاصلے پر سوٹن پلیس کے مکین بے فکری کی زندگی گزار رہے تھے۔ چنانچہ جب موقع ملتا میں اپنا ایک سوٹ پہن کر سر پر ہیٹ رکھتا اور سوٹن پلیس کی سڑکوں پر گشت کرنے لگتا۔ میرا اندازہ تھا کہ اگر کچھ دن اسی طرح ان سڑکوں پر چہل قدمی کرتا رہا تو اچھی نوکری مل جائے گی اور پیسے بھی آنا شروع ہو جائیں گے۔ ایک روز صبح کے وقت میں سوٹن پلیس کے علاقے میں گھوم رہا تھا جب میں نے ایک بڑے مکان سے اپنی کزن کیتھرین کو باہر آتے دیکھا۔ وہ بہت جلدی میں لگ رہی تھی تاہم اس نے چلتے چلتے اخلاقاً آنٹی لوئی کی خیریت دریافت کی۔ میں نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ”لوئی یا لکن میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ میں اس کے لیے سردرد کی گولی لینے جا رہی ہوں۔“

”کیتھرین!“ ایک سفید بالوں والا شخص پیکارڈ کار سے باہر آتے ہوئے بولا۔ اس کا شوفر کار کا دروازہ پکڑ کھڑا ہوا تھا۔ کیتھرین اسے دیکھ کر گھبرا گئی اور وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

”مسٹر وان ہیلڈن! میں میڈم کے لیے دوا لینے جا رہی تھی۔“

اس شخص نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور بولا۔

”اچھا، اب میں سمجھا۔“

کیتھرین شرمندہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”یہ میرا کزن ہے تھامس فریڈ۔ میں دوا لینے جا رہی تھی کہ اتفاقاً اس سے ملاقات ہو گئی۔“

”ٹھیک ہے، تم جاؤ۔“ یہ کہہ کر وہ عمارت کی طرف چلا گیا۔

لوئی کا اصرار تھا کہ ہم سب کزن اتوار کی صبح ہونے والی دعا میں شرکت کریں جو پچپن ویں اسٹریٹ پر واقع چرچ میں ساڑھے گیارہ بجے ہوتی تھی۔ میں اور لیوک اس کا حکم ماننے کے پابند تھے ورنہ دوسری صورت میں وہ ہمیں اس ٹھکانے سے محروم کر سکتی تھی۔ دعا کے بعد ہم دونوں چرچ کے باہر کھڑے ہوئے تھے کہ کیتھرین سیڑھیاں اترتی ہوئی ہماری طرف آئی۔ اس نے اپنے بھائی لیوک کو قطعاً نظرانداز کر دیا اور میرا بازو پکڑتے ہوئے بولی۔

”مسٹر وان ہیلڈن نے کل صبح دس بجے تمہیں اپنے دفتر میں بلایا ہے۔ انہوں نے مجھے یہ ذمے داری سونپی تھی کہ اتوار کے دن تمہیں یہ پیغام پہنچا دوں۔ مجھ میں اتنی جرأت نہیں کہ ان سے یہ پوچھتی کہ کیا وہ تمہیں کسی ملازمت کی پیشکش کر رہے ہیں۔“

یہ کہہ کر اس نے ایک بزنس کارڈ میری طرف بڑھا دیا۔ جس پر وان ہیلڈن کے دفتر کا پتا درج تھا۔ اسی کارڈ سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ ایک مشہور زمانہ سیکیورٹی فرم کا صدر ہے جس کا دفتر پارک ایونیو اسکوائر میں تھا۔ دوسرے دن میں مقررہ وقت سے کچھ پہلے ہی پہنچ گیا۔ استقبالیہ پر بیٹھی خوب صورت لڑکی نے مجھے سامنے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ٹیلی فون اٹھا کر بولی۔ ”یہاں مسٹر فریڈ موجود ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ مسٹر وان ہیلڈن سے ان کی ملاقات کا وقت طے ہے لیکن شیڈول میں اس کا اندراج نہیں ہے۔“

دوسری طرف سے جو کچھ کہا گیا، اسے سننے کے بعد اس نے شکریہ کہا اور احتیاط سے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا پھر وہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ اس نے مجھے مکمل طور پر نظرانداز کر دیا تھا۔ اس کا رویہ دیکھ کر میں مایوس ہو گیا اور مجھے اپنی صبح کے ضائع ہونے کا افسوس ہونے لگا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ گودی چلا جاتا۔ شاید آج کی دیہاڑی لگ جاتی۔ مجھے وہاں بیٹھے ہوئے تھوڑی دیر ہی ہوئی کہ میرے بائیں جانب کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک شخص نمودار ہوا۔ اس کے جسم کی ہر چیز گرے رنگ کی تھی۔ بال، آنکھیں، سوٹ وغیرہ وغیرہ۔ اس نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”مسٹر فریڈ! کیا تم اندر آنا پسند کرو گے؟“ اتنا کہہ کر وہ واپس چلا گیا۔ میں نے مڑ کر استقبالیہ کلرک کی طرف دیکھا جس کے چہرے سے حیرانی ٹپک رہی تھی پھر اس نے اظہارِ خیرسگالی کے طور پر اپنا بایاں انگوٹھا فضا میں لہرا دیا۔

وہ جس میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا سائز تقریباً لوئی کے لیونگ روم جتنا تھا۔ میں انتظار کرتا رہا کہ وہ مجھے بیٹھنے کے لیے کہے لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ بدستور ایک کاغذ پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے کاغذ میز پر رکھ دیا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔ ''مورس ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو لکھتا رہے گا کیونکہ تحریری معاہدوں سے مجھے کاروبار پر نظر رکھنے میں مدد ملتی ہے۔''

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کا کیا جواب دوں لہٰذا اس انتظار میں رہا کہ وہ مزید کیا کہتا ہے۔ کچھ لمحے توقف کرنے کے بعد وہ بولا۔ ''میں نہیں جانتا کہ کیتھرین نے ہماری فیملی کے بارے میں تمہیں کیا بتایا ہے۔''

اب میں نے خاموش رہنا مناسب نہ سمجھا اور بولا۔ ''کیتھرین غیر ضروری باتیں نہیں کرتی۔ ہمیں صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ کہاں کام کرتی ہے اور آنٹی لوئی کے پاس اس کا ایک فون نمبر ہے تاکہ ہنگامی صورتِ حال میں اس سے رابطہ کیا جاسکے۔ بقیہ لوگوں کو اس نمبر کے بارے میں علم نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ اب میں اصل معاملے کی طرف آتا ہوں۔ میرے دو لڑکے ہیں جو اسی فرم میں کام کرتے ہیں اور ایک لڑکی جو صرف اپنا وقت ضائع کر رہی ہے۔ اس عمر میں اس کی شادی ہو جانی چاہیے تھی اور وہ اپنا گھر سنبھال کر بیٹھتی لیکن اس کے بجائے وہ مین ہٹن میں اس طرح گھومتی پھرتی ہے جیسے وہ کوئی کھیل کا میدان ہو۔ وہ چوبیس سال کی ہو گئی ہے لیکن اسے گھر بسانے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بہت جلد اس کی شادی کی عمر نکل جائے گی اور میں اسے سنبھالے بیٹھا رہوں گا۔''

'کیا مجھے اسی لیے بلایا گیا ہے؟ کیا وہ اپنی لڑکی سے میری شادی کروانا چاہتا ہے۔ یقیناً وہ اس بوڑھے کی طرح بدصورت ہوگی۔' میں نے دل ہی دل میں سوچا اور اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

''چند سال پہلے میری بہن کے دماغ میں احمقانہ خیال آیا اور اس نے ایک موسیقار سے شادی کر لی۔ مجھے ڈر ہے کہ میری بیٹی بھی اس کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے کوئی ایسی ہی فضول حرکت نہ کر بیٹھے۔'' اس کا رجحان نامناسب لوگوں کی طرف نظر آتا ہے۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اسے اپنی مرضی کے غیر موزوں شخص کے ساتھ بے ضرر تفریح کا موقع فراہم کروں۔ میں اسے پہلے ہی تنبیہ کر چکا ہوں کہ اب اگر اس نے ٹال مٹول سے کام لیا تو اس کا ماہانہ الاؤنس بند کر دیا جائے گا اور کسی مناسب شخص کے ساتھ اس کی شادی کروا دی جائے گی چاہے اس کی ماں کتنی ہی التجا کیں کرے۔''

اس نے ایک دفعہ مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور بولا۔ ''تم میری نظر میں اس قابل ہو کہ اس کام کے لیے تمہیں آگے بڑھایا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ لڑکی تمہارے اندر کشش محسوس کرے گی لہٰذا تمہیں میری بیٹی سے ملنے کا کوئی طریقہ نکالنا ہوگا اور اسے زندگی کا تاریک رخ دکھاؤ۔ اس کی حفاظت کے لیے ہر اس جگہ ساتھ جاؤ جسے وہ عجیب یا خطرناک سمجھتی ہے۔ اس کے عوض میں تمہیں پینتیس ڈالر ہفتہ اور دیگر اخراجات کی ادائیگی کروں گا۔ اس کے علاوہ کپڑوں کے لیے بھی رقم ملے گی لیکن یہ بات یاد رکھنا کہ اگر کوئی تکلیف وہ بات ہوئی تو تمہاری کزن کیتھرین ملازمت سے محروم ہو جائے گی۔''

گوکہ وہ مجھے اپنی بیٹی کے لیے بہت حقیر سمجھ رہا تھا لیکن اس آسان کام کے عوض مجھے اچھا معاوضہ اور نئے جوتے کپڑے مل رہے تھے۔ اس میں سے لوئی کو کرایہ اور لیوک کو اس کے جیب خرچ کے لیے بہ آسانی کچھ پیسے دیے جاسکتے تھے لیکن میں نے اسے یہ کہہ کر حیران کر دیا کہ۔ ''معاف کرنا میں تمہارے مطلب کا آدمی نہیں ہوں۔''

''یہ تو بہت بری بات ہے۔ تمہاری عدم دلچسپی کی وجہ سے کیتھرین کی ملازمت ہر حال میں ختم ہو جائے گی۔''

میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میری وجہ سے کیتھرین کو ملازمت سے برطرف نہ کریں۔ میں تیار ہوں۔ بتاؤ مجھے کیا کرنا ہوگا۔''

اس نے میرے عقب میں کھڑے مورس کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے تمام شرائط لکھ دی ہیں جن پر ہم نے گفتگو کی ہے؟''

مورس نے سر ہلایا تو وہ بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ اس کا مسودہ تیار کروا اور خیال رکھنا کہ اس میں کیتھرین کی ملازمت والی شق ضرور شامل ہونا چاہیے۔''

مورس اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کمرے سے باہر چلا گیا اور وان ہیلڈن ایک بار پھر اپنی کرسی پر آگے پیچھے جھولنے لگا جبکہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اسے اٹھا کر کمرے سے باہر پھینک دوں۔ تھوڑی دیر بعد مورس واپس آگیا اور اس نے ایک فائل وان ہیلڈن کے سامنے رکھ دی جس نے ایک نظر اس میں رکھے کاغذات کو دیکھا اور اس میں سے ایک صفحہ اور ایک تصویر مورس کو دی جس نے دونوں چیزیں

میرے حوالے کر دیں۔ معاہدے کے مطابق میں اس لڑکی کے ساتھ رہتا لیکن اسے ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا۔ مجھے براڈ وے پر واقع فینسی برل برادرز سے اپنے لیے کپڑے خریدنے کی اجازت تھی۔ اس کے علاوہ پینتیس ڈالر ہفتہ بمع دیگر اخراجات ملتے۔ مجھے روزانہ مورسن کو فون کرنا تھا۔ اس کی ذمے داریوں میں یہ اضافہ ہو گیا تھا کہ وہ وان ہیلڈن کی لڑکی پر نظر رکھے اور مجھے بتائے کہ وہ کہاں ملے گی۔ وہ ہم دونوں پر بھی نظر رکھے گا اور وان ہیلڈن کو اس بارے میں مطلع کرتا رہے گا۔

اگر مورسن پہلے سے ہی اس لڑکی کی سرگرمیوں پر نظر رکھے ہوئے تھا تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مجھے کس مقصد کے تحت رکھا گیا ہے لیکن کیتھرین کی ملازمت بچانے اور ایک معقول معاوضہ دیکھ کر میں یہ سودا کرنے پر تیار ہو گیا۔ غالباً وان ہیلڈن نے اشارہ کیا تبھی مورسن نے مؤدبانہ انداز میں مجھے کمرے سے باہر جانے کے لیے کہا۔ میرے دائیں ہاتھ میں معاہدے کا کاغذ اور لڑکی کی تصویر اور دوسرے ہاتھ میں نقد رقم تھی اس لیے میرے وہاں رکنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

میں نے سورج کی روشنی میں اس لڑکی کی تصویر کو غور سے دیکھا۔ اس نے اپنے بالوں کو ایک ربن سے باندھ رکھا تھا اور کسی اسکول گرل کی طرح معصوم اور خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس نے بند گلے کا لباس پہن رکھا تھا اور ایک ایسی بچی کے مانند نظر آرہی تھی جس پر اس کے باپ کا مکمل کنٹرول ہو۔

میں نے پہلے کافی اور انڈوں کا ناشتا کیا پھر لیوک کی تلاش میں نکل پڑا۔ ایک گھنٹے بعد وہ دس ڈالر فی ہفتے کے عوض میرے پے رول پر آچکا تھا۔ پھر ہم برل برادرز گئے اور اپنے لیے مناسب کپڑوں کا انتخاب کرنے لگے۔ ہم نے سیلز مین کو ہدایت کی کہ یہ کپڑے چھ بجے تک لوئی کے پتے پر پہنچ جائیں۔ اس وقت ہم اپنے آپ کو بے حد امیر اور لوئی کے گھر رہنے والوں کو حقیر سمجھ رہے تھے جو اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ ہم نے آنے والے دنوں کا جشن منانے کے لیے ایک بار کا انتخاب کیا۔

کچھ دیر بعد میں لیوک کو وہیں چھوڑ کر مورسن کو فون کرنے ایک پے فون پر گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ رات نو بجے کے بعد کسی بھی وقت میں مس آرین سے موٹلے جوز پر مل سکتا ہوں۔ گودی پر کام کرنے والا ہر شخص اس جگہ سے واقف ہے یہ جگہ جنگ عظیم سے پہلے ہی بندرگاہ پر کام کرنے والوں کی ملاقاتوں کا مرکز رہی ہے۔ وہاں دیگر ممنوعہ سرگرمیوں کے علاوہ جوا بھی ہوتا ہے۔

ساڑھے نو بجے میں بار میں تنہا بیٹھا ہوا تھا جبکہ لیوک تین اسٹول چھوڑ کر دو گودی مزدوروں سے باتیں کر رہا تھا تبھی میری نظر اس لڑکی پر گئی۔ وہ اپنی تصویر سے بالکل مختلف نظر آرہی تھی۔ اس کے بالوں سے ربن غائب ہو چکا تھا اور وہ کندھوں تک آرہے تھے۔ اسی طرح بند گلے کی فراک کی جگہ چست سیاہ گاؤن پہن رکھا تھا جس میں اس کے جسم کا انگ انگ نمایاں ہو رہا تھا۔ وہ اپنے سے بڑی عمر کے مرد کے ساتھ وہاں آئی تھی۔ اس شخص نے ایک میز تلاش کی اور مشروبات کا آرڈر دے دیا اور جیسے ہی مشروبات آئے، اس نے لڑکی کے کان میں سرگوشی کی اور اس نے کچھ بڑے نوٹ پرس سے نکال کر اس کے حوالے کر دیے۔ اس شخص نے آرین کا ہاتھ چوما اور اس دروازے کی طرف بڑھ گیا جہاں جوا ہو رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ نہیں گئی بلکہ اپنی جگہ پر بیٹھی مشروب سے دل بہلاتی رہی۔

کچھ دیر بعد ہال میں موسیقی کی آواز گونجنے لگی۔ دو جوڑے اپنی جگہ سے اٹھے اور انہوں نے اس دھن پر رقص شروع کر دیا۔ میں بھی ہمت کر کے اپنی جگہ سے اٹھا۔ آرین اس وقت سنہری کیس سے سگریٹ نکال رہی تھی۔ میں نے میز پر سے اس کا لائٹر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم چاہو تو میں تمہارا سگریٹ سلگا سکتا ہوں لیکن اس کے عوض میں تم سے رقص کے لیے کہوں گا۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ گانا تمہارے لیے ہی ہے۔“

یہ کہہ کر میں نے اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھایا تو اس نے اسے تھام لیا اور میرے ساتھ ڈانس فلور پر آ گئی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ وہ کتنی چھوٹی تھی۔ اس کا سر میرے سینے پر ٹکا ہوا تھا اور میں بہ آسانی اپنے دونوں ہاتھ اس کی کمر کے گرد ڈال سکتا تھا۔ میں نے چور نظروں سے ہال کا جائزہ لیا۔ اب لیوک ایک عمر رسیدہ جوڑے سے باتیں کر رہا تھا لیکن اس کی نظریں ہم پر تھیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ جوئے خانے کے دروازے کو بھی دیکھ رہا تھا کہ کہیں آرین کا ساتھی باہر آکر کوئی گڑبڑ نہ کرے لیکن ہم دونوں میں سے کسی کو بھی توقع نہ تھی کہ وہاں کا کوئی ملازم باہر آکر آرین سے مخاطب ہو سکتا ہے۔

”معاف کرنا مس۔“ اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ”وہ تمہیں بلا رہا ہے۔ اسے پیسوں کی مزید ضرورت

''میرے پاس نقد رقم نہیں ہے۔ تم مجھے ایک کاغذ دو۔ میں لکھ دیتی ہوں۔ پانچ سو ڈالر کافی ہوں گے؟''

میں نے آرین کی طرف دیکھا تو وہ گھورتے ہوئے بولی۔ ''یہ تمہارا معاملہ نہیں ہے۔'' اس کے بعد وہ اپنی میز پر چلی گئی۔ میں نے اس کا پیچھا کیا اور جیسے ہی اس نے سگریٹ نکالا تو میں نے اس کا لائٹر اٹھا لیا لیکن اس نے وہ میرے ہاتھ سے چھین لیا اور سرد لہجے میں بولی۔ ''شب بخیر۔''

میں واپس بار کاؤنٹر پر آگیا اور اپنے آئندہ اقدام کے بارے میں سوچنے لگا۔ لیوک مجھے دیکھ کر مسکرا رہا تھا لیکن میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ وہ ملازم دوبارہ آیا اور اس نے آرین کو ایک کاغذ اور قلم دیا۔ اسی دوران ایک شخص جوئے خانے کے دروازے سے دوڑتا ہوا باہر آیا۔ اس کے پیچھے موٹلے جوز کے دو آدمی تھے۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ کوئی چور یا بے ایمان شخص تھا۔ ہال میں اس کا ایک ساتھی پہلے سے موجود تھا۔ اس نے جوز کے آدمیوں کو روکنے کے لیے ایک کرسی ان کی جانب پھینکی جو فرش پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ لوگ گھبرا کر اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے لیکن آرین بالکل پُرسکون بیٹھی رہی۔ اس نے کاغذ پر رقم لکھی اور فرانکو کے حوالے کر دیا۔ میں اس کی میز پر گیا۔ لیوک بھی میرے پیچھے تھا۔

''ہمیں چلنا چاہیے۔'' میں نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ ''یہاں تم کسی مشکل میں پڑ سکتی ہو۔''

''تم کون ہو؟'' اس نے غصے سے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''پولیس والے تو نہیں لگتے۔''

''تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ بس یہاں سے نکل چلو۔''

''اوہ، اب سمجھی۔ شاید میرے باپ نے ایک پرائیویٹ سراغ رساں کی خدمات حاصل کی ہیں۔''

''تم غلط سمجھ رہی ہو۔ ہمیں پولیس کے آنے سے پہلے نکل جانا چاہیے۔ میں نہیں چاہتا کہ کل صبح کے اخبارات میں سب شائع ہو۔''

میرے الفاظ نے اسے قائل کیا یا وہ خود ہی سمجھ گئی کہ پارٹی ختم ہو گئی ہے۔ اس نے اپنا پرس اٹھایا اور بولی۔ ''اوہ میرے کوٹ کی رسید تورون کے پاس ہے۔''

''کوئی مسئلہ نہیں۔ وہ تم بعد میں بھی لے سکتی ہو۔''

جیسے ہی ہم باہر آئے تو اس نے تیز قدموں سے چلنا شروع کر دیا جیسے وہ ہم سے دور ہونا چاہ رہی ہو۔ میں نے

بھی اپنی رفتار بڑھائی۔ لیوک میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔

میں نے آزرین کے قریب جا کر کہا۔ ''تمہاری کار کہاں ہے؟''

''ڈیڈی پسند نہیں کرتے کہ میں رون سے ملوں اس لیے ٹیکسی پر آئی تھی۔''

''اچھا، مجھے اپنا گھر تو دکھا دو۔'' میں نے کہا۔ ''ورنہ تمہارا باپ میرا بھرتہ بنا دے گا۔''

وہ ایڑیوں کے بل گھومتے ہوئے بولی۔ ''میں تو تمہارا نام بھی نہیں جانتی مسٹر سراغ رساں۔ تم کس کی جاسوسی کر رہے ہو؟''

''میں پھر کہوں گا کہ تم غلط سمجھ رہی ہو۔'' میں نے تیزی سے سوچتے ہوئے کہا۔ ''میرا کام سراغ رسانی نہیں بلکہ معلومات حاصل کرنا اور لوگوں کی مدد کرنا ہے۔ مجھے ٹامی فرید کہتے ہیں اور یہ میرا کزن لیوک ہے۔ ہم بھی تمہاری طرح تفریح کی غرض سے نکلے تھے۔''

میرا خیال تھا کہ وہ بھی میری مسکراہٹ کا جواب اسی انداز میں دے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس نے آتی ہوئی ٹیکسی کو اشارہ کیا اور اس میں بیٹھ کر چلی گئی۔ لیوک نے اپنی تنگ پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''کیا ہمیں یہ کپڑے واپس کرنا ہوں گے۔''

''بالکل نہیں، میں یہ بازی ہر قیمت پر جیتنا چاہتا ہوں۔ چلو آٹومیٹ چلتے ہیں۔ وہاں بیٹھ کر آئندہ کی منصوبہ بندی کریں گے۔''

دوسرے دن لیوک نے میرے بزنس کارڈ چھپوائے جن پر لکھا تھا۔ ''تھامس فرید۔ تحقیقات اور معاونت۔'' اس کے نیچے ایک فون نمبر بھی درج تھا۔ موریس کی اطلاع کے مطابق وہ اس شام بیمی کے کلب جا رہی تھی۔ یہ وسط شہر میں واقع تھا اور ظاہراً اسے ایک ریستوران کی شکل دی گئی تھی لیکن اس کے عقب میں جوئے اور شراب سمیت تمام غیر اخلاقی سرگرمیاں ہوتی تھیں۔ ہم نے ٹیکسی پکڑی اور آزرین سے پہلے وہاں پہنچ گیا اور ایسی میز کا انتخاب کیا کہ جب وہ اندر داخل ہو تو اس کی نظر لازماً ہم پر جائے۔ وہ اکیلی نہیں آئی بلکہ اس کے ساتھ ایک لڑکی اور چار مرد بھی تھے۔ اس نے سادہ سا نیلا سوٹ اور سر پر پروں والی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ میں لپک کر اس کی میز پر پہنچا اور اس کے سامنے اپنا بزنس کارڈ رکھتے ہوئے بولا۔ ''تم سے دوبارہ مل کر خوشی ہوئی۔''

اس نے ترچھی نظروں سے مجھے دیکھا اور اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''میں تم لوگوں کو مین ہٹن کے مشہور سراغ رساں تھامس فرید سے ملوانا چاہوں گی۔''

انہوں نے تالیاں بجاتے ہوئے اس طرح چیخ ماری جیسے مجھے ان کی تفریح طبع کے لیے بلایا گیا ہے۔ ان میں سے ایک جوکر نما شخص بولا۔ ''بہت اچھے، آزرین۔ کیا یہ ہمیں بتا سکتا ہے کہ کیرول کی اچھائی کہاں چھپی ہوئی ہے۔''

آزرین کے ساتھ آنے والی لڑکی نے ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر اسے معلوم ہو گیا تو یہ بھی میری اچھائی دیکھنا چاہے گا۔''

یہ سن کر سب لوگ زور زور سے قہقہے اور میز بجانے لگے۔ ان میں جوکر نما شخص سب سے آگے تھا۔ میں نے اس کے سر پر زوردار ہاتھ مارا تو اس کی انگلیاں میز پر جم گئیں اور چہرہ تکلیف کی شدت سے بگڑ گیا۔

ان میں سے ایک باریک مونچھوں والا اپنی جگہ سے اٹھا اور غراتے ہوئے بولا۔ ''سنو مسٹر سراغ رساں، میں ایک وکیل ہوں اور تمہارے پاس اس حرکت کا کوئی جواز نہیں ہے۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس خاموش رہنے کا بھی کوئی جواز نہیں تھا۔''

یہ کہہ کر میں نے آزرین کی طرف دیکھا اور دروازے سے باہر چلا گیا، لیوک بھی تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا میرے پیچھے آیا، ہم ہوسٹن اسٹریٹ پر پہنچے کہ چار یا پانچ لڑکے ہمارے سامنے آ گئے۔ لگتا تھا کہ وہ کسی فیکٹری سے آ رہے ہیں۔ ہم انہیں راستہ دینے کے لیے دائیں جانب ہو گئے لیکن وہ اچانک ہی ہم پر ٹوٹ پڑے۔ ان میں سے ایک کے پاس لوہے کی سلاخ تھی جو اس نے لیوک کے پیٹ میں ماری جبکہ دوسرے نے مجھے زور سے دھکا دیا۔ میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔

''ہمارے پاس جو نقد رقم ہے وہ لے سکتے ہو۔''

اس نے میرے سر کے پچھلے حصے پر زوردار ضرب لگاتے ہوئے کہا۔ ''خاموش ہو اور ہماری بات غور سے سنو۔ تمہیں آزرین سے دور رہنا ہے۔'' پھر اس نے ایک اور دھپ لگائی اور بولا۔ ''سنا تم نے، اس سے دور رہو۔'' یہ کہہ کر وہ سب رات کی تاریکی میں گم ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد ہم ہونقوں کی طرح ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ بالآخر لیوک بولا۔

''یہ سب کیا تھا؟''

''میں نہیں جانتا لیکن بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔''

اگلے روز لیوک گودی جانا چاہ رہا تھا لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح اسے اپنے ساتھ رہنے پر آمادہ کر لیا۔ دس بجے کے قریب میں اسے لے کر ہنری کے بار میں آیا۔ ابھی ہم اخبار دیکھ رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ ہنری نے ریسیور اٹھایا اور سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہاں، ہاں کیوں نہیں۔'' پھر اس نے اشارے سے مجھے بلایا اور کہا۔ ''کوئی خاتون، تم سے بات کرنا چاہ رہی ہے۔''

دوسری طرف سے آئرین بول رہی تھی۔ ''کیا تم آج میرے ساتھ رشین ٹی روم میں لنچ کر سکتے ہو؟''

مجھے رات والا واقعہ یاد آ گیا لیکن میں بزدل نہیں تھا۔ اس لیے آئرین کی دعوت قبول کر لی اور مورسن کو بھی فون کر کے بتایا کہ وہ دوپہر میں اس کی نگرانی نہ کرے کیونکہ اس وقت وہ میرے ساتھ رشین ٹی روم میں ہو گی۔ وہ بھی میری تیز رفتاری پر حیران رہ گیا لیکن مجھے مورسن سے زیادہ وان ہیلڈن کی پروا تھی۔ اسے بھی معلوم ہونا چاہیے تھا کہ اس کے دیے ہوئے پیسے ضائع نہیں ہو رہے۔

میں نے لیوک کو ساتھ لیا اور مقررہ وقت پر ریستوران پہنچ گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''گزشتہ شام میرے دوستوں نے تمہارے ساتھ جو سلوک کیا، اس کا مجھے افسوس ہے۔ بعض اوقات وہ ایسا مذاق کرتے ہیں جو نہیں کرنا چاہیے۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ بولی۔ ''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں یبی کے کلب آؤں گی؟''

مجھے اس سوال کی توقع تھی اور میرے پاس اس کا جواب بھی موجود تھا۔ ''تم نے میرا کارڈ پڑھا ہو گا۔ اس پر لکھا ہے 'تحقیقات اور معاونت' بس میں نے بھی تمہارے بارے میں کچھ معلومات حاصل کی تھیں۔''

''تم کس کے لیے کام کر رہے ہو؟''

''بعض اوقات میں اپنے لیے بھی کام کرتا ہوں۔''

میرا اشارہ سمجھ کے وہ تھوڑا سا شرمائی۔ اس کا مطلب تھا کہ تیر نشانے پر لگا ہے۔ اس دوران ویٹر نے کھانا لگا دیا۔ چند لقمے لینے کے بعد اس نے ہاتھ روک دیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی اور یہ جاننے کے لیے انتظار کرنے لگا کہ اس نے ہمیں یہاں کیوں بلایا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھی کہ محض معافی مانگنے کے لیے ہمیں لنچ پر مدعو کرتی بلکہ وہ مجھ سے اور کچھ چاہ رہی تھی جس کا اظہار اس نے جلدی ہی کر دیا۔

''میری پرانی سہیلی بیٹی نیوٹن چند روز کے لیے پلازا میں ٹھہری ہوئی ہے۔ اس کی شادی جون میں ہو رہی ہے اور اس کی فیملی اسی لیے یہاں آئی ہے تاکہ سب دوست اور رشتے دار شادی سے پہلے اس کے ہونے والے دولہا سے مل لیں۔''

''بہت خوب۔'' میری زبان سے بے اختیار نکلا۔

اس نے مجھے گھورا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ محبت کی شادی ہے اور بیٹی کے والد بہت محتاط ہیں۔ انہیں بیٹی کے فیصلے پر بھروسا نہیں۔ میں رابرٹ لوئیس کے بارے میں تحقیق کرنے کے لیے تمہاری خدمات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ اس سے پہلے کہ اس کے باپ کو کچھ معلوم ہو، میں چاہتی ہوں کہ اگر ایسی کوئی بات ہے تو وہ بیٹی کے علم میں آنی چاہیے۔''

''یقیناً ہم دونوں کے لیے پینتیس ڈالر یومیہ کافی ہوں گے۔ تم دو دن کی پیشگی ادائیگی کر دو۔ بقیہ اخراجات تمہارے ذمے۔''

اس نے کوئی بحث نہیں کی اور ستر ڈالر میرے ہاتھ پر رکھ دیے اور بولی۔ ''میں اسے خفیہ ہی رکھنا چاہتی ہوں۔ اس لیے کسی تحریری معاہدے کی ضرورت نہیں۔ البتہ تمہیں میرا ایک کام کرنا ہو گا۔ کیا کل شام میرے ساتھ بیٹی کے استقبالیہ میں والڈورف چل سکتے ہو؟''

''مجھے تمہارے ساتھ جا کر خوشی ہو گی۔ میں کس وقت آ جاؤں؟''

وہ کچھ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''آٹھ بجے۔ تھری سوٹن پلیس۔ ہم اپنی کار میں جائیں گے۔ تم دربان کو بتا دینا۔ وہ تمہیں اندر پہنچا دے گا۔ میرے شوفر کا نام بوبی ہے۔''

اس نے بے دلی سے کھانا ختم کیا۔ لگتا تھا کہ اسے جانے کی جلدی ہے۔ اس نے نیپکن پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''آج سہ پہر میں مجھے بہت سے کام کرنے ہیں۔ اس لیے زیادہ دیر نہیں رک سکتی۔ تمہارے آنے کا شکریہ۔ اب ویٹر کو بلا لو تاکہ میں بل ادا کر سکوں۔''

میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کی ضرورت نہیں مس ہیلڈن! میں دیکھ لوں گا۔''

''تمہارا بہت بہت شکریہ۔ براہ مہربانی مجھے آئرین کہا کرو۔'' یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد لیوک نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''اس لنچ کے پیسے باپ یا بیٹی میں سے کس کے حساب میں جائیں گے۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ریستوران سے باہر آکر لیوک نے کہا۔ ''تامی، اگر رات کو وان ہیلڈن کی ڈیوٹی پر نہ جانا ہو تو کیوں نہ آج موٹلے جوز کے بار میں چلیں۔ وہاں گودی کے پرانے دوستوں سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس ہفتے کے آخر میں کرٹ کی شادی ہو رہی ہے۔ شاید یہ بار میں اس کی آخری رات ہو۔''

''کیوں نہیں۔ آج رات موٹلے جوز کل رات والڈورف۔ مزے ہی مزے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ ہم مسٹر پال سے مل کر انہیں یاد دہانی کرا دیں تاکہ ہمارے سوٹ وقت پر تیار ہو جائیں۔''

اگلے روز صبح سات بجے ہم پلازا ہوٹل کی لابی میں تھے۔ میں نے ہاؤس فون سے آپریٹر کا نمبر ملایا اور اس سے کہا کہ میں رابرٹ لوئیس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ دو مرتبہ گھنٹی بجنے کے بعد ایک نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی تو میں نے کہا۔

''مسٹر لوئیس، میرا نام تھامس فریڈ ہے اور میں ایک ضروری بات کرنے آیا ہوں۔ یہ تمہارے بہترین مفاد میں ہوگا کہ تم شام کو ہونے والے استقبالیہ سے پہلے مجھ سے مل لو۔''

''کیا؟ کون ہو تم؟'' اس وقت اس سے ایسے ہی جواب کی توقع کی جاسکتی تھی۔ میں نے کہا۔ ''میں اور میرا ساتھی ہوٹل کی لابی میں موجود ہیں اور فوراً اوپر آسکتے ہیں۔ یہ معاملہ مس نیوٹن سے متعلق ہے۔''

''بیٹی؟ وہ ٹھیک تو ہے؟ کیا کوئی واقعہ پیش آیا ہے؟'' اس کے لہجے میں بوکھلاہٹ تھی۔

''وہ بالکل ٹھیک ہے۔ یہ تو تم جانتے ہو کہ اس کا باپ اس شادی سے خوش نہیں ہے۔ میں اسی سلسلے میں تم سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔''

''مجھے اسی بات کا ڈر تھا۔ بہتر ہے کہ تم اوپر آجاؤ۔'' اس نے مجھے کمرے کا نمبر بتاتے ہوئے کہا۔

لوئیس میری توقع کے مطابق تیس سے زیادہ کا تھا۔ اس کے بال بھورے اور پلکے تھے اور وہ ننگے پیر ہی ہوٹل کی راہداری میں کھڑا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ ''مسٹر فریڈ۔''

''ہاں، میں ہی فریڈ ہوں۔'' میں نے اسے اپنا کارڈ دیتے ہوئے کہا۔ ''اندر چلتے ہیں۔''

اس نے میرا کارڈ پڑھا اور بولا۔ ''میں سمجھا نہیں۔ تحقیقات اور مدد، سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''یقیناً تمہارے لیے یہ ایک نئی بات ہوگی۔'' میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ''ہر باپ یہ چاہتا ہے کہ اس کی بیٹی کسی ایسے مناسب شخص سے شادی کرے جو دولت مند ہو اور اس کا ماضی بے عیب ہو۔ معاف کرنا مسٹر لوئیس، تمہارے کچھ راز ہیں۔ مجھے ان کا پتا لگانا اور مسٹر نیوٹن کو اس بارے میں آگاہ کرنا ہے۔ اس کے بعد ہی وہ فیصلہ کرسکیں گے کہ تم ان کی بیٹی کے لیے مناسب ہو یا نہیں۔''

اس کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں، پھر وہ سرہانے کا سہارا لیتے ہوئے آہستہ سے بستر پر بیٹھ گیا۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن الفاظ اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر میں نے اس کے قریب جا کر آہستہ سے کہا۔

''اس کا نام لینی ہے۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟''

''تم نے لینی کے بارے میں معلوم کر لیا۔ اوہ میرے خدا، یہ تو بہت برا ہوا۔ مجھے خود ہی بیٹی کو اس بارے میں بتا دینا چاہیے تھا لیکن اس کی مہلت ہی نہیں ملی۔ اب وہ مجھ سے نفرت کرنے لگے گی۔''

مجھے اس شخص پر افسوس ہونے لگا۔ وہ بیٹی نیوٹن سے شادی کرنا چاہ رہا تھا لیکن لینی براؤ کا مسئلہ اس کے راستے کی رکاوٹ بن گیا تھا۔

''تم ہمیں لینی کے بارے میں پوری بات کیوں نہیں بتا دیتے۔ یقین کرو ہم مسٹر نیوٹن سے بات کرنے سے قبل اپنے طور پر حقائق معلوم کریں گے۔''

مجھے لگا جیسے اب وہ رو دے گا لیکن ایک منٹ سے بھی کم وقت میں اس نے اپنے آپ پر قابو پالیا اور بولا۔

''میں ملواکی میں رہتا ہوں۔ میری شادی 1929ء میں ایلانا گرینگر سے ہوئی۔ اس کا باپ ایک بڑے بینک کا مالک تھا۔ شادی کے چند ماہ بعد اسٹاک مارکیٹ بیٹھ گئی اور اس نے خودکشی کرلی۔''

''اس نے اپنے آپ کو ختم کرنے کے لیے کیا طریقہ استعمال کیا؟''

''ریوالور کے ذریعے۔ سب گھر والے کھانے کی میز پر اس کا انتظار کر رہے تھے کہ اس کے بیڈروم سے گولی چلنے کی آواز آئی۔ ایلانا صدمہ برداشت نہ کرسکی۔ اس کی ماں بھی ہمارے ساتھ آگئی تھی اور سارا دن کرسی پر بیٹھی روتی رہتی۔ چند ماہ بعد میں نے ایلانا کو مجبور کیا کہ وہ کسی ڈاکٹر

سے اپنا معائنہ کروائے کیونکہ وہ روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر نے خوش خبری سنائی کہ وہ امید سے ہے۔ آنے والے موسم گرما میں اس نے ایک بچی کو جنم دیا لیکن خود جاں بر نہ ہوسکی۔ میں نے اس کا نام بھی ایلانا رکھا لیکن پیار سے اسے لینی کہتا ہوں۔"

وہ اٹھ کر میز تک گیا اور اپنے والٹ سے ایک تصویر نکال کر مجھے پکڑا دی۔ میں نے اس خوب صورت مسکراتے ہوئے چہرے کو دیکھا اور سوچنے لگا کہ وہ کیوں اس راز کو اس عورت سے چھپانا چاہتا ہے جو اس بچی کی نئی ماں بننے والی ہے۔"

"اب مجھے باقی بات بھی بتادو۔"

اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے ورثے میں بہت کچھ ملا ہے اور میں اپنے خاندانی کاروبار کو چلاتا ہوں، تم جانتے ہو کہ آج کل پیسا کمانا کتنا مشکل ہے۔ اس کے لیے کاروبار کو بہت زیادہ وقت دینا پڑتا ہے۔ مجھے بچی کی دیکھ بھال کے لیے کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ ساس کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ اسے سنبھال سکتیں چنانچہ میں لینی کو اپنی بہن کے پاس چھوڑ آیا جو (وما) میں رہتی ہے۔ مجھے جب بھی موقع ملتا ہے بچی سے ملنے چلا جاتا ہوں۔ گزشتہ سال ایک کام کے سلسلے میں شکاگو گیا تو وہاں بیٹی سے ملاقات ہوئی اور ہم قریب آتے گئے تاہم مجھے موقع نہیں ملا کہ اسے لینی کے بارے میں بتاتا پھر ہماری منگنی ہوگئی اور شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یہ خوف ستانے لگا کہ اگر بیٹی کو لینی کے بارے میں معلوم ہوگیا تو کہیں وہ شادی سے انکار نہ کردے۔"

"اس الجھن سے نکلنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہیں آج بلکہ ابھی اسے یہ حقیقت بتانا ہوگی تاکہ جب میں اس کے باپ کو اس راز کے بارے میں بتاؤں تو وہ اعتماد کے ساتھ اس کا سامنا کرسکے۔"

"لیکن فرض کرو......"

"اب فرض کرنے کی گنجائش نہیں۔ تمہیں اس صورت حال سے نمٹنا ہوگا۔ اگر تم اسے نہیں بتاؤ گے تو اس کا باپ بتا دے گا۔ کیا یہ زیادہ بری بات نہیں ہوگی؟"

"میں اسے آج ہی بتادوں گا۔" اس نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ "بروقت انتباہ کرنے کے لیے تمہارا شکریہ۔ اگر تم اجازت دو تو لباس تبدیل کرلوں۔"

"ایک آخری بات...... میں اور میرا ساتھی آج شام استقبالیہ پر موجود ہوں گے۔ براہ کرم یہ یاد رکھنا کہ تم بھی نہیں جانتے۔"

"ٹھیک ہے۔ میرا خیال ہے کہ بیٹی کے باپ نے تمہارے انتخاب میں غلطی نہیں کی۔"

☆☆☆

جب آئرین اپنے گھر سے باہر آئی تو میں کار کے پاس کھڑا اس کا انتظار کررہا تھا۔ میں نے اس کے لیے دروازہ کھولا تو اس نے مجھے اپنے برابر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کے قرب کی گرمی مجھے پگھلائے دے رہی تھی اور مجھے اپنے آپ پر قابو پانا مشکل ہورہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ "شاید تم لوئیس کو دیکھنے کے بعد اندازہ لگاسکو کہ وہ کیا چھپا رہا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ تھپتھپایا اور کہا۔ "میری تحقیقات مکمل ہوچکی ہیں اگر بیٹی نے تمہیں اپنے منگیتر کے راز کے بارے میں نہیں بتایا تو میں گھر واپس جاتے ہوئے بتادوں گا۔"

لیوک ہوٹل کی لابی میں ہمارا انتظار کررہا تھا جب میں آئرین کا بازو تھامے اندر داخل ہوا تو اس نے شرارت آمیز انداز میں مسکرا کر مجھے دیکھا لیکن میں اسے نظر انداز کرتے ہوئے مہمانوں کی قطار کی جانب بڑھ گیا۔ آئرین نے میرا تعارف بیٹی اور لوئیس سے کروایا اور اس نے روایتی انداز میں کہا کہ اسے مجھ سے مل کر خوشی ہوئی۔ میں آئرین کے ہمراہ ڈانس فلور پر گیا۔ بیٹی دوڑتی ہوئی آئی اور آئرین سے گلے لگتی ہوئی بولی۔

"میرے پاس ایک زبردست خبر ہے۔ میں ماں بننے والی ہوں۔"

آئرین اس کی بات سمجھتے ہوئے بولی۔ "یقیناً! وہ دن بھی آئے گا۔"

"نہیں، نہیں ابھی......" وہ پرجوش لہجے میں بولی۔ "لوئیس کی ایک بیٹی ہے چار سال کی۔ اس کی ماں زچگی کے دوران مرگئی تھی اور اب میں اس کی ماں بنوں گی۔"

اس نے ایک بار پھر آئرین کو گلے لگالیا اور بولی۔ "کیا یہ حیرت انگیز نہیں ہے۔ وہ مجھے بتاتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ میں نے اس سے شکایت کی کہ وہ کچھ چھپا رہا ہے لیکن جب اس نے اپنی صفائی پیش کی تو میں اس کی ہچکچاہٹ کا سبب جان گئی۔ بہرحال لینی کے بارے میں بات کرنے کا یہی مناسب وقت تھا۔"

جب بیٹی اور آئرین باتیں کررہی تھیں۔ میں نے سب کی نظریں بچا کر لوئیس کو مبارک باد دی تو وہ بولا۔ "تمہارا بہت بہت شکریہ۔"

ہم واپس فلور پر یک جا ہوئے تو آرین نے پوچھا۔ ’’مجھے حیرت ہے کہ تم نے صرف چوبیس گھنٹوں میں اس کا راز جان لیا اور اسے قائل کر دیا کہ وہ میمی کو سب کچھ بتا دے۔‘‘

میں مسکرا دیا تو وہ بولی۔ ’’تھامس فریڈ! تم واقعی اس کام کے لیے موزوں ہو۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میرے باپ نے تمہاری خدمات حاصل نہیں کیں۔‘‘

میں اس کی غلط فہمی پر مسکرا کر رہ گیا۔ اچھا ہوا کہ اس نے میری مسکراہٹ نہیں دیکھی کیونکہ رقص کے دوران اس نے اپنا سر میرے سینے پر لگا دیا تھا اور میں اس کی قربت سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔

گھر واپس آتے ہوئے اس نے راستے میں مجھ سے کہا۔ ’’سوچ رہی ہوں کہ لیتی کو کوئی تحفہ بھیجوں لیکن تم جانتے ہو کہ میرے پاس ہمیشہ پیسوں کی کمی رہتی ہے۔ مجھے مومو کو فون کرنا ہوگا کہ وہ کچھ پیسے بھیج دے۔‘‘

’’یہ مومو کون ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’اسے ایک طرح سے خاندانی ملازم سمجھ لو۔ وہ ہمیشہ سے ہی میرے باپ کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ جب ہم چھوٹے تھے تو معمول کے فرائض کے علاوہ اس کے یہ بھی کام تھے کہ وہ میرے بھائیوں کو پیسا کمانے کے گر سکھائے اور مجھے بتائے کہ سارا پیسا ایک ہی وقت میں خرچ نہیں کرنا چاہیے۔ ہم اسے مسٹر مورسن کہتے لیکن میں بہت چھوٹی تھی۔ اس لیے میری زبان پر اس کا نام نہیں آسکا جس پر میرے والد کافی ناراض ہوئے لیکن مسٹر مورسن نے کہا۔ ’’میرے دوست مجھے ’مو‘ کہتے ہیں تو مسٹر مو کہہ لیا کرو۔ میں نے اسے بگاڑ کر مومو کر دیا اور اب تک اسی نام سے بلاتی ہوں۔‘‘

’’وہ اب بھی تمہیں پیسے خرچ کرنے کے معاملات میں سکھاتا ہے؟‘‘

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ’’نہیں بے وقوف، وہ میرے ٹرسٹ فنڈ اور دوسرے مالی معاملات کی نگرانی کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں فضول خرچی کروں تو وہ ڈیڈی کو اس کی رپورٹ ضرور دیتا ہوگا کیونکہ وہ ہمیشہ یہی شکایت کرتے ہیں کہ ایک لڑکی اتنی فضول خرچ کیسے ہو سکتی ہے۔ میری ممی کو وضاحت کرنا پڑتی ہے کہ اب میں بڑی ہو گئی ہوں تو یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اب مجھے شادی کر لینا چاہیے۔‘‘

یہ کہہ کر اس نے اپنا بازو میری گردن میں ڈال دیا اور میرے کندھے پر سر رکھ دیا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میرا جوابی ردِعمل کیا ہو سکتا تھا۔

میں آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا گھر کی طرف جا رہا تھا تاکہ مجھے سوچنے کے لیے وقت مل جائے۔ دوسری صبح میں لیوک کے ساتھ ناشتا کرنے گیا اور اسے بتایا کہ میں کیا جانتا ہوں اور میں نے کیا اندازہ لگایا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ میں صحیح راستے پر چل رہا ہوں۔ ہم نے ایک اسکیم تیار کی جس میں کامیابی اور ناکامی کے برابر کے امکانات تھے۔ ہمارے پاس کافی تعداد میں نئے کپڑے جمع ہو گئے تھے ورنہ ہمارے پاس کوئی واپس جانے کا آپشن موجود تھا کیونکہ آرین میں بڑھتی ہوئی کشش محسوس کرتے ہوئے میرا اس کے ساتھ وقت گزارنا مشکل ہو رہا تھا ایسا نہ ہو کہ اس کھیل میں لینے کے دینے پڑ جائیں۔ اس لیے مجھے یہ ملازمت ختم کرنا تھی اور وہ بھی اس طرح کہ کیتھرین کی جاب محفوظ رہے۔

ہم قلبِ شہر گئے اور وان ہیلڈن کے دفتر سے قریب ایک ریستوران سے اس کا نمبر ملایا۔ مجھے یقین تھا کہ مورسن ہی فون اٹھائے گا اور ایسا ہی ہوا۔ میں نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ’’آرین خطرے میں ہے۔ تمہیں فوراً آنا ہوگا۔‘‘

مورسن نے میری بات پر کوئی توجہ نہیں دی تو میں نے چلاتے ہوئے کہا۔ ’’اس کی عزت اور غالباً زندگی بھی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔‘‘

میں نے اسے ہوسٹن اسٹریٹ پر ایک جگہ کا پتا بتایا جہاں وہ ٹیکسی کے ذریعے بیس منٹ میں پہنچ سکتا تھا لیکن وہ غیر ضروری باتیں کرنے لگا۔ تب میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ’’بہتر ہوگا کہ تم مجھے مسٹر وان ہیلڈن سے بات کرنے دو۔ وہ ان کی بیٹی ہے اور انہیں اس بارے میں معلوم ہونا چاہیے۔‘‘

یہ سن کر وہ گھبرا گیا اور بولا۔ ’’میں آ رہا ہوں۔ تم وہیں رک کر میرا انتظار کرو۔‘‘

ہم اس وقت لابی میں تھے جب ہم نے اس کی ٹیکسی کو سڑک کے کونے پر دیکھا۔ ہم لفٹ کی جانب بڑھے اور بارہویں منزل پر پہنچ کر اطمینان ہوا کہ استقبالیہ کاؤنٹر پر بروکلین گرل موجود ہے۔ اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور بولی۔ ’’مجھے افسوس ہے کہ تمہارے نام کی بکنگ نہیں ہے۔‘‘ پھر وہ شرارتی انداز میں بولی۔ ’’تم مسٹر فورڈ ہو نا؟‘‘

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ’’تم مجھے ٹوی کہہ سکتی ہو۔ یہ میرا ساتھی اور کزن لیوک فورڈ ہے۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو میں مسٹر وان ہیلڈن کے شیڈول پر نہیں ہوں بلکہ آج میری میٹنگ مسٹر مورسن کے ساتھ ہے۔ میں لیو کو اپنے ہمراہ اس لیے لایا ہوں کیونکہ اسے میری بات کا یقین نہیں تھا کہ تم کتنی پیاری ہو۔ میں نے سوچا کہ یہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔

اس نے اپنے بالوں کو ایک ادا سے جھٹکا اور زیرِ لب مسکرانے لگی۔ لیوک بولا۔ ''ڈوی، تمہارا ذوق واقعی لاجواب ہے خوب صورت خاتون، کیا میں تمہارا نام جان سکتا ہوں؟''

''ڈونی موریسن۔''

لیوک آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم ہمارے ساتھ لنچ کرنا پسند کرو گی۔ جہاں تم چاہو۔''

اس نے اپنی نظریں جھکالیں پھر آہستہ سے بولی۔ ''کیوں نہیں۔ میں دوپہر میں فارغ ہوتی ہوں۔''

میں نے دفتر کے اندرونی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''میں مسٹر مورسن سے چند باتیں کرلوں پھر چلتے ہیں۔'' اس نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر فورڈ، وہ یہاں نہیں ہیں۔''

''کیا؟ اس نے مجھے بلایا تھا۔''

''ممکن ہے۔ وہ بھول گئے ہیں۔ پانچ منٹ پہلے وہ بہت جلدی میں کہیں گئے ہیں۔ انہوں نے کچھ نہیں بتایا کہ وہ کہاں جارہے ہیں اور کب واپس آئیں گے؟''

''انہوں نے کچھ کاغذات مانگے تھے۔ میں وہی لے کر آیا تھا لیکن میں ان کی واپسی کا انتظار نہیں کرسکتا۔''

''وہ کاغذات مجھے دے دو جب وہ آئیں گے تو انہیں دے دوں گی۔''

''ڈونی مجھے تم پر بھروسا ہے لیکن ہم لنچ کرنے جارہے ہیں اور میں تمہارا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔'' پھر میں نے لیوک کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''اب یہ ہماری دوست ہے۔ ہم اسے بتاسکتے ہیں۔''

لیوک نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا کارڈ نکالا اور ڈونی کو دیتے ہوئے بولا۔ ''اسے اپنے پاس رکھ لو۔ ہم خاص مشن پر کام کرتے ہیں اور ہمارا مقصد خاندانی لوگوں کو اخبار کے صفحات سے دور رکھنا ہے ممکن ہے کہ مورسن اسے پسند نہ کرے اور میں نہیں چاہوں گا کہ تم پر کوئی بات آئے۔''

وہ خوف زدہ ہوگئی اور اس نے میری تائید میں سر ہلا دیا۔ اس کا چہرہ بتارہا تھا کہ وہ کسی افواہ کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ لیوک نے اس کی کیفیت کا اندازہ لگالیا اور بولا۔ ''تم جاؤ اندر جاکر اس کی میز پر کاغذات رکھ دو اس کے بعد ہم لنچ کے لیے جاسکتے ہیں۔ اگر اس نے کچھ پوچھا تو تم بعد میں اسے مطمئن کر دینا۔''

''یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔'' میں نے کہا لیکن ڈونی مکمل طور پر ہم سے متفق نظر نہیں آرہی تھی۔ لہٰذا میں نے کہا۔

''ڈوٹی، تم نے کبھی اس بلاک کے آخر میں واقع فرانسیسی ریستوران میں لنچ کیا ہے۔ میں نے اس کی بہت تعریف سنی ہے۔''

یہ کہہ کر میں نے لیوک کو اس کے پاس چھوڑا تاکہ وہ اسے باتوں میں لگائے رکھے اور چپکے سے برابر والے دروازے میں داخل ہوگیا۔ وان ہیلڈن کے کمرے کے برابر میں ہی مورین کا کمرا تھا جس کے دروازے پر اس کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا شاید مجھے وہ کچھ نہ ملتا جس کی تلاش تھی لیکن میرا دل کہہ رہا تھا کہ مورین جیسے لوگ ایسی چیزیں کہیں نہ کہیں چھپا کر رکھتے ہیں۔ جلد ہی مجھے آئرین کا مالی ریکارڈ مل گیا۔ میں نے جلدی جلدی کچھ صفحات پلٹے لیکن اس میں کوئی بے قاعدگی نظر نہیں آئی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ کتابوں، فائلوں اور گرد آلود رجسٹروں سے بھرے ہوئے اس دفتر میں کوئی ریکارڈ ایسا ہوگا جس سے معلوم ہو سکے کہ مورین اب تک کس طرح اور کتنی رقم چوری کر چکا ہے پھر مجھے رسالوں کے ڈھیر میں دبا ہوا ایک رجسٹر مل گیا۔ میں نے دونوں رجسٹروں کو برابر رکھا اور ان کے ایک ایک صفحے اور کالم کا موازنہ کرنے لگا۔ مورین کئی برسوں سے آئرین کے حساب کتاب میں خرد برد کر رہا تھا۔ وہ جب بھی اسے نقد رقم دیتا یا اس کے بلوں کی ادائیگی کرتا تو رجسٹر میں پانچ فیصد زائد کا اندراج کرتا اور یہ رقم اس کی جیب میں چلی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ موٹلے جوا اور دوسرے دو کلبوں میں آئرین پرچی کے عوض جو کیش لیتی، اس پر بھی وہ دس فیصد کمیشن لیتا تھا۔ اس نے ایک ایک ڈالر اور سینٹ کا حساب رکھا ہوا تھا۔ میں نے گزشتہ پانچ سال کے حسابات دیکھے اور کیلکولیٹر کی مدد کے بغیر ہی اندازہ لگالیا کہ وہ تقریباً ستر ہزار ڈالر سے زیادہ رقم خرد برد کر چکا ہے۔

میں نے دونوں رجسٹر اٹھائے اور بے دھڑک وان ہیلڈن کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کرسی سے اچھل کر کھڑا ہوگیا اور اس نے غصے میں آکر مورین کو آواز دی لیکن جب میں نے دونوں رجسٹر اس کے سامنے رکھے تو اس کے رویے میں تبدیلی آگئی اور وہ حیران نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے دوبارہ کرسی میں دھنس گیا۔ اس نے رجسٹر کے صفحات پلٹنا شروع کیے اور تمام اندراجات کا بغور جائزہ لینے کے بعد وہ ایک بار پھر کرسی سے کھڑا ہوگیا اور مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔

''میں پورے خلوص سے تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ تم نے وہ کام کیا ہے جس کا معاوضے سے کوئی تعلق نہیں۔''

''یہ میرے کام کا حصہ تھا۔ اس کے بغیر میرا مشن ادھورا رہتا۔ مورین جانتا تھا کہ تم مجھے اپنی بیٹی کی شادی کے لیے استعمال کر رہے ہو۔ اگر اس کی شادی ہوجاتی تو کیا شوہر اس کے حسابات کی دیکھ بھال نہیں کرتا؟''

وان ہیلڈن نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''بالکل۔''

''لہٰذا مورین نے کچھ غنڈوں کو میرا راستہ روکنے کے لیے بھیجا تاکہ میں خوف زدہ ہوکر آئرین کا ساتھ چھوڑ دوں اور تمہاری بیٹی لمبے عرصے تک کنواری بیٹھی رہے اور پھر وہ خود اس کا امیدوار بن کر سامنے آجائے۔''

''وہ گزشتہ چند ماہ میں کئی بار ریٹائرمنٹ کا ارادہ ظاہر کر چکا ہے۔ میں خود حیران تھا کہ وہ اس تنخواہ میں کس طرح ٹھاٹ باٹ کی زندگی بسر کر رہا ہے۔''

وان ہیلڈن نے ایک بار پھر نظریں رجسٹر پر جما دیں اور بولا۔ ''ایسا لگتا ہے کہ وہ کافی عرصے سے ریٹائر ہونے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ میری بیٹی اتنی فضول خرچ نہیں جیسا کہ میں سمجھتا رہا۔ اب شاید ہمیں آئرین کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''نہیں، مسٹر وان ہیلڈن، میں ایسا نہیں سمجھتا۔'' آخری بات جو میں کہنا چاہ رہا تھا۔ وہ یہ کہ آئرین کو کسی ''مناسب'' شخص سے شادی کے لیے مجبور کیا جائے۔

جیسے ہی میری زبان سے یہ الفاظ ادا ہوجائے۔ وان ہیلڈن کا پارا ایک بار پھر چڑھ گیا۔ اس نے مجھے دفتر سے نکلنے کا اشارہ کیا اور خدا حافظ کہنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا انتظار گاہ میں آیا۔ لیوک کو طنزیہ انداز میں دیکھا اور ڈوٹی سے کہا۔ ''ہم لنچ پر چل رہے ہیں۔''

ایک ہفتے بعد کیتھرین میرے پاس آئی اور اس نے مجھے پانچ ہزار کا چیک دیا جس پر وان ہیلڈن کے دستخط تھے۔ میں نے وہ چیک جیب میں رکھ کر سکون کا سانس لیا۔ کیا ہوا اگر آئرین سے شادی کا خواب پورا نہ کرسکا۔ کم از کم اس کے باپ نے میری خدمت کا معقول معاوضہ دینے میں کوئی کنجوسی نہیں دکھائی۔ مجھے وان ہیلڈن کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ اس نے میری اس صلاحیت کو دریافت کیا جس کا مجھے خود بھی علم نہیں تھا۔ اب میں گودی پر مزدوری کرنے کے بجائے پرائیویٹ سراغ رساں کے طور پر کام کرتا ہوں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ لیوک میرا معاون اور کیتھرین کو میں نے آئرین کے نعم البدل کے طور پر قبول کرلیا ہے۔

دولت کی سولی

سلیم فاروقی

جھوٹ... فریب کاری... دغا بازی شرمناک، قابلِ نفرت اور ناقابلِ معافی گناہ ہوتا ہے... لوگ جھوٹ بولتے ہیں اور انہیں سزا نہیں ملتی... یہ بھی حقیقت ہے کہ تاریخ میں ایسی لاتعداد مثالیں ملتی ہیں کہ جب سچ بولنے پر سزائیں ملیں اور اذیتیں جھیلنا پڑیں... کہا جاتا ہے کہ سچ سے آنکھیں نہ چرانے کے لیے تو اور بھی زیادہ جرأت درکار ہوتی ہے... اگر سچ کو رد کر دیں تو آپ کو سکون نہیں ملتا... ضمیر کی اذیت ہر پل بے چین رکھتی ہے... ایک سادہ مزاج اور نرم خو نوجوان کا قصہ... جو سچائی کو زندگی کی حقیقت گردانتا تھا... مگر اچانک ہی وہ جھوٹ... حق و صداقت سے دور رہنے والے سفاک صفتوں کے ہتھے چڑھ گیا... جو مال و زر کے غلام تھے... اس کے اطاعت گزار تھے... وقت کے بے رحم ہاتھوں میں کھلونا بن جانے والے زخم گزیدہ کی دریدہ دل کہانی...

شدید گرمی اور گوتھی اور روبی کی شاپنگ ہی ختم نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے جو کچھ خریدنا تھا، میں ایک دن پہلے ہی خرید چکا تھا۔ اس میں بھائی جان اور بھابی کے لیے کچھ گفٹ تھے۔ بھائی جان نے خاص طور پر کُرتے، شلوار اور چمڑے کے سامان کی فرمائش کی تھی۔ اس میں چمڑے کی جیکٹس، ہینڈ بیگ، بیلٹس اور والٹ وغیرہ شامل تھے۔ یہ سب چیزیں امریکا میں کئی گنا مہنگی ہوتی تھیں۔

روبی، بھابی کے لیے ساڑیاں، فینسی شلوار قمیص،

دوپٹے، شرارے وغیرہ خرید رہی تھی۔ وہاں یہ تمام چیزیں عنقا تھیں۔

''اب بس بھی کرو روبی۔ میرا بلڈ پریشر لو ہو رہا ہے اگر تم نے مزید دیر کی تو مجھے گھر کے بجائے اسپتال لے جانا پڑے گا۔''

''بھیا، آپ بھی کمال کرتے ہیں۔'' روبی منہ بنا کر بولی۔ ''ہمارے پاس آج ہی کا دن تو ہے۔ کل تو ہماری فلائٹ ہے۔''

''تم نے ایک طویل لسٹ بنائی تھی، وہ تو پوری ہو چکی ہے۔ بس اب گھر چلو، بھوک سے میرا دم نکلا جا رہا ہے۔''

ہمیں طارق روڈ، کلفٹن اور زینب مارکیٹ کی خاک چھانتے ہوئے پانچ گھنٹے گزر چکے تھے۔ روبی کی شاپنگ تھی کہ ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔

میں نے اسی سال یونیورسٹی سے ایم بی اے کیا تھا۔ روبی میڈیکل کے تھرڈ ایئر میں تھی۔ پاپا بہت پہلے امریکا چلے گئے تھے۔ وہاں انہوں نے اپنا چھوٹا سا بزنس شروع کیا تھا پھر جب انہیں نیشنلٹی مل گئی تو انہوں نے بھیا اور بھابی کو بھی بلا لیا۔ میں ان دنوں یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا اور روبی نے اسی سال ڈی ایم سی میں ایڈمیشن لیا تھا۔

بھیا تو چاہتے تھے کہ میں اور روبی امریکا آ جائیں لیکن میں نے تعلیم کو ادھورا چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔ پھر روبی بھی یہیں سے ایم بی بی ایس کر کے جانا چاہتی تھی۔ وہاں جا کر تو اسے نئے سرے سے سب کچھ کرنا پڑتا۔

گھر میں میرے اور روبی کے علاوہ خالہ نسیمہ اور افضل چاچا تھے۔

ویسے تو خالہ نسیمہ ہماری ملازمہ تھیں لیکن ہم نے انہیں کبھی ملازمہ نہیں سمجھا۔ خاص طور پر روبی تو ان سے بہت محبت کرتی تھی۔ مما کے انتقال کے وقت روبی صرف پانچ سال کی تھی اور میں دس سال کا۔ خالہ نسیمہ نے ہماری پرورش کی تھی۔ ہماری چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا خیال رکھا تھا۔

پاپا کو امریکا جانے کا موقع مل گیا تو وہ امریکا چلے گئے۔ امریکا جانے سے پہلے انہوں نے بھائی جان کی شادی کر دی تھی۔ سیما بھابی انتہائی نفیس، خوب صورت اور پڑھی لکھی تھیں۔ انہوں نے بھی ہمارا بہت خیال رکھا تھا۔

ہم لوگ شاپنگ کر کے گھر پہنچے تو میں بھوک اور تھکن سے نڈھال تھا۔

کھانے کے بعد میں ذرا تھکن اتارنے لیٹ گیا مگر میں بے وقت سونے کا عادی نہیں تھا۔

نہا دھو کر باہر نکلا تو رات کا اندھیرا تیزی سے پھیل رہا تھا۔ میں لاؤنج میں آیا تو خالہ نسیمہ میرے لیے گرم چائے لے آئیں۔

اطلاعی گھنٹی بجی تو افضل چاچا دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

تھوڑی دیر بعد افضل چاچا نے بتایا کہ روبی بیٹا کی کوئی سہیلی ہے۔ اس کے ساتھ ایک لڑکا بھی ہے۔ میں نے ان دونوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔

''نسیمہ خالہ سے کہیں کہ روبی کو اٹھا دیں۔'' میرا خیال تھا کہ روبی اب تک سو رہی ہوگی۔

''روبی بیٹا تو بہت پہلے اٹھ گئی ہیں۔ وہ اس وقت کچن میں نہ جانے کیا پکا رہی ہیں۔''

''میں ڈرائنگ روم میں جا رہا ہوں۔'' میں نے افضل سے کہا۔ ''روبی کو وہیں بھیج دینا۔'' یہ کہہ کر میں ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔

وہاں خوب صورت سی ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

''بیٹھیے پلیز، روبی ابھی آ رہی ہے۔''

اس کے ساتھ وجیہہ و شکیل اور جامہ زیب سا ایک دراز قد لڑکا بھی تھا۔ وہ چہرے سے کسی کالج کا لیکچرار یا بینکر لگ رہا تھا۔

''آپ شاید روبینہ کے بھائی ہیں؟'' لڑکی نے پوچھا۔

''شاید نہیں بلکہ واقعی میں روبی کا بھائی فراز ہوں۔''

''میں ارم ہوں اور یہ میرے بھائی جان سہیل ہیں۔'' اس نے نوجوان کا تعارف کرایا تو اس نے مسکرا کر مجھے ہیلو کہا۔

''ہیلو۔'' میں نے بھی رسمی طور پر کہا۔

''روبینہ میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔ پرسوں کئی سال بعد اس سے ملاقات ہو گئی۔''

''اچھا، آپ روبی کی کالج کی فرینڈ ہیں؟'' میں نے ہنس کر پوچھا۔ ''ایم بی بی ایس نہیں کر رہی ہیں؟''

''ارادہ تو تھا۔'' ارم مسکرائی۔ ''لیکن......''

اسی وقت روبی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ وہ روبی سے بہت اپنائیت سے گلے ملی اور بولی۔ ''روبی تم بتا رہی تھیں کہ تم امریکا جا رہی ہو؟''

''ہاں، کل رات کی ہماری فلائٹ ہے۔'' روبی نے

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ،
سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

جواب دیا۔

''ایک چھوٹی سی زحمت دوں گی تمہیں۔'' ارم نے کہا۔ ''میری ایک کزن ڈلاس میں رہتی ہے۔ اس نے مجھ سے کچھ کپڑوں کی فرمائش کی تھی۔ اگر تمہیں اور فراز بھائی کو اعتراض نہ ہو تو وہ کپڑے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ میں تمہیں ان لوگوں کا سیل نمبر دے دوں گی۔ وہ اپنا سامان خود ہی لے جائیں گے۔''

''زیادہ ویٹ تو نہیں ہے؟'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔

''روبی نے تو اتنی شاپنگ کی ہے کہ مجھے نہیں لگتا اس کے پاس مزید گنجائش ہوگی۔''

''نو پرابلم!'' سہیل نے ہنس کر کہا۔ ''ہم سامان کوریئر سے بھیج دیں گے۔''

اس دوران میں خالہ نسیمہ چائے اور بسکٹ وغیرہ ڈرائنگ روم میں پہنچا چکی تھیں۔

''ایسی کوئی بات بھی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ہم لوگ وزٹ پر جا رہے ہیں اس لیے سامان اتنا نہیں ہے کہ مزید سامان کی گنجائش نہ ہو۔ آپ سامان مجھے دے دیں۔''

''وہ تو ہم ابھی نہیں لائے۔'' سہیل نے کہا۔ ''میں کل آپ کو وہ سوٹ کیس پہنچا دوں گا۔ آپ وہاں کا سیل نمبر بتا دیں۔ میں اپنے کزن کو بھی فون کر دوں گا۔ وہ خود آپ کے گھر سے سامان لے لے گا۔''

ہم نیویارک جا رہے تھے۔ ان کا سامان وہاں سے ڈلاس پہنچانا بھی ایک مسئلہ تھا۔ یہی سوچ کر میں نے بھائی جان کا سیل نمبر اسے بتا دیا جو اس نے اپنے سیل فون میں محفوظ کر لیا۔

پھر وہ لوگ زیادہ دیر نہیں بیٹھے۔ ارم نے کہا۔ ''سوری روبینہ! میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔ تمہیں ابھی پیکنگ بھی کرنا ہوگی۔ کل تمہاری فلائٹ کس وقت ہے؟''

''کل رات کو ساڑھے بارہ بجے ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ہم ساڑھے نو بجے ائرپورٹ کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔''

''میں اس سے پہلے ہی سامان پہنچا دوں گا۔'' وہ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''زحمت کے لیے ایک مرتبہ پھر معذرت مسٹر فراز!'' سہیل نے کہا۔

میں انہیں باہر تک چھوڑنے چلا گیا۔ ان کی گاڑی جدید ماڈل کی ہنڈا اسٹی تھی۔

ان کے جانے کے بعد میں نے روبی سے پوچھا۔ ''روبی! یہ تمہاری کون سی دوست ہے؟''

''دوست کیا، بس شناسا سی ہے۔ کالج کے پرانے دوستوں سے مل کر عجیب سا احساس ہوتا ہے۔ وہ اتنے تپاک اور گرم جوشی سے ملی کہ مجھے خود پر حیرت ہوئی کہ میں نے کالج میں اسے اگنور کیوں کیا؟'' پھر وہ چونک کر بولی۔ ''بھیا! خیریت تو ہے۔ یہ آپ اس کے بارے میں کرید کرید کر کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' پھر وہ ہنس کر بولی۔ ''ویسے لڑکی ہے بہت خوب صورت۔''

''زیادہ بکواس مت کرو اور جا کر پیکنگ کرو۔ تم تو کئی گھنٹے پیکنگ میں ہی لگا دو گی۔''

☆☆☆

افضل چاچا ہم لوگوں کو ائرپورٹ چھوڑ کر واپس چلے گئے تھے۔ میں نے روانگی سے پہلے انہیں اور نسیمہ خالہ کو ہدایت کر دی تھی کہ گھر کا خیال رکھیں۔ روزانہ صفائی کریں وغیرہ وغیرہ۔

سہیل وعدے کے مطابق سامان لے کر نہیں آیا تھا۔ مجھے غصہ آ رہا تھا کہ سامان نہیں بھیجنا تھا تو کم سے کم ٹیلی فون پر اطلاع تو دے دیتا۔

ہم لوگ ابھی ڈیپارچر لاؤنج کے باہر ہی کھڑے تھے۔ ٹرالی پر روبی کے دو جمبو سائز سوٹ کیس رکھے تھے۔ تیسرا سوٹ کیس میرا تھا لیکن وہ اتنا بڑا نہیں تھا۔ ہم دونوں کے پاس ایک ایک ہینڈ کیری بیگ بھی تھا۔

میں نے اندر جانے کے لیے ٹرالی کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی۔ ''ہائے روبی!''

آواز پر روبی کے ساتھ ساتھ میں نے بھی گھوم کر دیکھا۔ وہ ارم تھی۔ شاید وہ بھاگتی ہوئی آئی تھی۔ اس کا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا۔

وہ ہانپتے ہوئے بولی۔ ''سوری فراز صاحب! مجھے کچھ دیر ہو گئی۔ سہیل بھائی تو آج دن بھر بہت بزی رہے۔ وہ ابھی تک گھر نہیں آئے۔ میں ان ہی کا انتظار کر رہی تھی۔''

''مس ارم!'' میں نے اسے سر سے پاؤں تک بہ غور دیکھا۔ ''اگر آپ مزید ایک منٹ لیٹ ہو جاتیں تو ہم آپ کو نہ ملتے۔''

ارم درمیانے سائز کا ایک سوٹ کیس کھینچتی ہوئی لائی تھی۔ اس میں پہیے لگے ہوئے تھے۔ میں نے اس کا سوٹ کیس بھی اٹھا کر ٹرالی پر رکھ لیا۔ ارم روبی سے گلے ملی۔ پھر مجھ سے ہاتھ ملایا اور ہم روانہ ہو گئے۔ ارم جب تک ہمیں نظر آتی رہی، ہاتھ ہلاتی رہی۔

ہم لوگ اپنے پاسپورٹ پر امیگریشن کی اسٹیمپ لگا

رہے تھے کہ مجھے کتے کی غراہٹ سنائی دی۔ اس کی غراہٹ سن کر میں دیکھے بغیر سمجھ گیا کہ وہ ڈوبیرمین ہے۔ میں جانتا تھا کہ چیکنگ کے لیے کسٹم والوں نے ٹرینڈ کتے بھی رکھے ہوئے ہیں۔ وہ ڈرگ آئٹمز کی موجودگی پر حرکت میں آجاتے ہیں۔

روبی گھبرا کر میرے پیچھے چھپ گئی کیونکہ کتا ہماری ٹرالی کے گرد چکر لگا رہا تھا۔

''ہے۔'' میں نے کتے کو مخاطب کیا۔ ''وہاٹ از رونگ ود یو بوائے؟'' (تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟)

''یہ سامان آپ کا ہے مسٹر......؟'' کسٹم کا ایک افسر وہاں آگیا۔

''فراز۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''میرا نام فراز ہے اور یہ سامان میرا ہی ہے۔''

''آپ ذرا اپنا سامان چیک کرائیں گے پلیز۔'' کسٹم آفیسر نے انتہائی مہذب لہجے میں کہا۔

''ضرور۔'' میں بھی مسکرایا اور ٹرالی اس کی طرف بڑھا دی۔

کتا ابھی تک ٹرالی کے اردگرد چکر لگا رہا تھا۔ اس آفیسر نے کتے کو کسٹم کے ایک سپاہی کے حوالے کیا اور میری ٹرالی لے کر کسٹم کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔

سب سے اوپر ارم کا دیا ہوا سوٹ کیس رکھا تھا۔ اب اس پر بھی میرے نام کا ٹیگ تھا۔

''اسے کھولیں پلیز۔'' کسٹم آفیسر نے کہا۔

میرا اندازہ تھا کہ ارم نے سوٹ کیس کے نمبر سیٹ نہیں کیے ہوں گے ورنہ وہ مجھے ان کا کمبی نیشن ضرور بتاتی۔ کمبی نیشن سیٹ نہ ہو تو نمبر والے لاک ٹرپل زیرو سے کھل جاتے ہیں۔ میرا اندازہ درست تھا۔ میں نے سوٹ کیس کھول دیا۔

اس میں کاٹن کے زنانہ کپڑے تھے۔ چمڑے کا ایک بیگ تھا اور ایک چمڑے کی جیکٹ تھی اس کے علاوہ دو تین جوڑے مردانہ اور زنانہ جوتوں کے تھے۔

کسٹم انسپکٹر نے پہلے وہ چمڑے کی جیکٹ اٹھائی اور الٹ پلٹ کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ پھر اس نے جیکٹ کا استر دیکھا۔ اس پر ہاتھ لگایا اور ایک کٹر سے استر اندر سے کاٹ دیا۔

میری آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں جب اس میں سے چھوٹے چھوٹے پولیتھین بیگ باہر گرے۔ ان میں سفید رنگ کا سفوف تھا۔ میں ان پیکٹس کو دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ وہ ہیروئن ہے...... میرا پورا جسم پسینے میں ڈوب گیا۔

کسٹم آفیسر نے وہ پیکٹ کاؤنٹر پر ایک طرف ڈھیر کر دیے اور طنزیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ پھر اس نے ایک زنانہ سوٹ اٹھایا۔ فیشن ایبل لمبی شرٹ میں بھی ایک استر لگا تھا۔ اسے دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا تھا کہ سوٹ کا کپڑا چونکہ بہت باریک ہے اس لیے استر کی ضرورت پڑی ہے۔

کسٹم آفیسر نے کٹر سے اس کا استر بھی کاٹ دیا۔ اسی قسم کے چند مزید پیکٹ پھسل کر کاؤنٹر پر گر گئے۔

کپڑوں کی تہوں میں جوتوں کے سول میں اور اس سوٹ کیس کی دوسری تہ میں بھی ہیروئن بھری ہوئی تھی۔ میرا دل ڈوبا جا رہا تھا اور پسینا پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ میرا ذہن ماؤف ہو کر رہ گیا۔

اس وقت روبی بھی وہاں آگئی اور بولی۔ ''بھیا! آپ ابھی تک یہاں کھڑے ہیں میں تو......''

''مسٹر فراز! یہ بھی آپ کے ساتھ ہیں؟''

حالات سنگین ہونے کے باوجود میرا ذہن اتنا تو کام کر رہا تھا کہ میں روبی کو اس معاملے سے الگ رکھوں۔ میں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''نہیں، یہ میرے ساتھ نہیں ہیں۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بھیا؟'' روبی نے حیرت سے کہا۔ ''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ میں روبینہ صدیقی ہوں، آپ کی بہن۔''

''مسٹر فراز! آپ کو ہمارے آفس میں چلنا ہوگا۔'' کسٹم آفیسر نے سرد لہجے میں کہا۔

''لیکن میری فلائٹ مس ہو جائے گی۔'' میں نے کہا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میری آواز کنویں سے آرہی ہے۔

''فلائٹ کی پروا مت کریں۔'' کسٹم آفیسر طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''فلائٹس تو جاتی ہی رہتی ہیں۔'' پھر وہ روبی سے بولا۔ ''مس صدیقی، آپ بھی آئیں۔''

''یہ سامان میرا ہے آفیسر۔'' میں نے سنبھل کر کہا۔ ''میری بہن کو اس میں انوالو مت کریں اور جانے دیں۔''

''سوری مسٹر فراز!'' آفیسر نے کہا۔ ''مس صدیقی کو بھی انوالو کرنا ہوگا۔ میرے ساتھ آئیں۔''

وہ مجھے اور روبی کو ایک کمرے میں لے گیا۔ وہ کمرا الگ تھلگ واقع تھا۔ اس میں فرنیچر کے نام پر تین کرسیاں اور پرانی سی ایک میز رکھی تھی۔ کمرے میں ایک سرے پر ٹیوب لائٹ روشن تھی لیکن باہر کی روشنیوں کے مقابلے میں مجھے وہ روشنی بہت مدھم لگ رہی تھی۔ اصل میں تو میرا دل و دماغ اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔

کسٹم آفیسر نے مجھے اور روبی کو کرسیوں پر بٹھا دیا اور خود وہاں سے چلا گیا۔ جاتے ہوئے اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے دروازہ لاک بھی کر دیا ہو گا۔

''یہ سب کیا ہے بھیا؟'' روبی متوحش لہجے میں بولی۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

''یہ سب تمہاری دوستی کا تحفہ ہے روبی! تمہاری اس خوب صورت دوست نے ہمیں تباہ کر دیا۔''

''ارم نے؟'' روبی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، اسی حرام زادی خوب صورت چڑیل نے ہماری عزت اور مستقبل دونوں داؤ پر لگا دیا۔ اس کے سوٹ کیس میں سے تقریباً سات کلو ہیروئن نکلی ہے، زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔ اب میں کسٹم افسران کو چیخ چیخ کر بتاؤں کہ وہ سوٹ کیس میرا نہیں ہے لیکن کوئی اسے مانے گا نہیں۔ سوٹ کیس پر میرا نام ہے اور میرے پاس کوئی ایسا ثبوت نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ وہ سوٹ کیس ارم کا ہے۔''

پھر میں نے غصیلے انداز میں پوچھا۔ ''تم ارم کے بارے میں کیا جانتی ہو؟''

''میں اس کے بارے میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ اس کے والد کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازم تھے اور وہ فیڈرل بی ایریا میں کہیں رہتی ہے۔''

''اس کے گھر کا پتا معلوم ہے؟''

''میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ ارم سے صرف میری شناسائی تھی۔ ہم دونوں ایک ہی کلاس میں تھیں ویسے صرف سلام دعا کی حد تک اس سے تعلقات تھے۔''

''اور وہ سہیل؟'' میں نے پوچھا۔

''اسے تو میں نے کل پہلی دفعہ دیکھا تھا۔'' روبی نے جواب دیا۔

''ہم بری طرح پھنس چکے ہیں۔'' میں نے شکستہ لہجے میں کہا۔ ''اسی لیے میں تمہیں بچانا چاہ رہا تھا لیکن تم تو مجھ سے بحث کرنے لگیں کہ تم میری بہن ہو۔''

''مجھے اس سچویشن کا بالکل اندازہ نہیں تھا۔ یوں بھی میں آپ کو اکیلا تو ہرگز نہ چھوڑتی۔''

''تمہیں اندازہ نہیں ہے بے وقوف کہ ہم کتنی بڑی مصیبت میں گھر چکے ہیں۔ تمہاری وہ دوست ضرور کسی گینگ سے تعلق رکھتی ہے۔''

''ہمیں پھنسا کر اسے کیا ملا بھیا؟''

''اگر وہ گینگ نہ ہوتا تو شاید ہم پر یہ افتاد نہ پڑتی۔''

اسی اثنا میں کمرے کا دروازہ کھلا اور کسٹم آفیسر کے ساتھ دو افراد مزید کمرے میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک سفاری سوٹ میں ملبوس تھا اور دوسرا سوٹ میں۔ کسٹم کا ایک سپاہی ان دونوں کے لیے انتہائی قیمتی ریوالونگ چیئرز لے آیا۔

''مسٹر فراز!'' سوٹ والے نے کہا۔ ''آپ اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہیں گے؟'' وہ آہستہ سے بولا۔ ''میں کسٹم کلکٹر ہوں۔''

''سر! صفائی تو اس وقت دی جاتی ہے جب کوئی غلط کام کیا جائے۔ میں تو بے خبری میں مارا گیا۔''

پھر میں نے انہیں سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ اس دوران میں دوسرا آدمی خاموشی سے میرا اور روبی کا بہت غور سے جائزہ لیتا رہا۔

''ممکن ہے آپ سچ بول رہے ہوں مسٹر فراز!'' کلکٹر صاحب نے نرم لہجے میں کہا۔ ''لیکن تمام ثبوت آپ کے خلاف ہیں۔ آپ کی تحویل میں ایک سوٹ کیس تھا جس پر آپ کے نام کا ٹیگ بھی تھا۔ پوچھنے پر بھی آپ نے اس سوٹ کیس سے لاتعلقی کا اعلان نہیں کیا۔ اس لیے مجبوراً مجھے یہ کیس رانا صاحب کے حوالے کرنا پڑے گا۔'' اس نے سفاری سوٹ والے کی طرف اشارہ کیا۔ رانا جاوید خان انسپکٹر ہیں اور ان کا تعلق کرائم برانچ سے ہے۔''

''سر! میری ایک ریکویسٹ ہے۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میری بہن کو اس کیس میں انوالو نہ کریں۔ وہ تمام اسٹف میرے سامان سے نکلا ہے اس لیے میں ہی اس کا ذمے دار ہوں۔''

''یہ ممکن نہیں ہے مسٹر فراز۔'' کلکٹر صاحب کے بجائے رانا نے جواب دیا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں لیکن ان میں عجیب طرح کی سفاکی تھی۔ ''آپ کو ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن تک چلنا ہوگا۔'' رانا نے کہا۔

''او کے، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

پھر پولیس والے ہمیں ایک موبائل وین میں بٹھا کر پولیس اسٹیشن لے آئے اور لا کر لاک اپ میں بند کر دیا۔

جب وہ مجھے بند کر رہے تھے تو میں نے کہا۔ ''انسپکٹر صاحب! آپ میری بہن کو یہاں رکھنے کے مجاز نہیں ہیں اسے فوراً جیل بھجوا دیں۔''

''اوئے، مجھے قانون مت پڑھا۔'' انسپکٹر نے درشت لہجے میں کہا۔ وہ اچانک اپنی اصلیت پر اتر آیا۔

حوالات میں دوسرے حوالاتی بھی تھے جو تھے اور

روبی کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ خاص طور پر روبی کو وہ ایسی ہوس ناک نگاہوں سے دیکھ رہے تھے کہ میرا خون کھول رہا تھا۔

ان حوالاتیوں میں ایک مقتول شخص بھی تھا۔ لباس سے وہ کھاتے پیتے گھرانے کا فرد لگتا تھا۔ وہ میری قہر آلود نظروں کی پروا کیے بغیر کھسک کر میرے نزدیک آگیا اور آہستہ سے بولا۔ ''کچھ لے دے کر معاملہ ختم کروورنہ یہ لوگ تمہارے ساتھ ساتھ اس لڑکی کا بھی حلیہ بگاڑ دیں گے۔ ایس ایچ او دل کھول کر رشوت لیتا ہے۔''

بھاری قدموں کی آوازیں گونجیں تو وہ حوالاتی پیچھے کی طرف سرک گیا۔ آنے والا ایک کانسٹیبل تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور کانسٹیبل کھڑا تھا۔ حوالات کا دروازہ کھلوا کر وہ اندر آیا اور بولا۔ ''فراز کون ہے؟'' میرے بتانے پر وہ بولا۔ ''چلو تمہیں صاحب نے بلایا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے پھرتی سے میرے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال دی اور اس کا دوسرا سرا اپنی بیلٹ میں لگا کر بولا۔ ''چل بھئی، آگے لگ۔''

''صرف مجھے ہی بلایا ہے؟'' میں نے تشویش سے کہا۔

''نہیں تو تیرے ساتھ کیا وہ تیرے محلے والوں کو بھی بلائے؟'' اس نے گدی پکڑ کر مجھے آگے کی طرف دھکا دیا۔

میں نے اس حوالاتی سے انگلش میں کہا۔ ''پلیز میری بہن کا خیال رکھیے گا۔''

''ڈونٹ وری۔'' حوالاتی نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر میں ایس ایچ او کے سامنے کھڑا تھا۔ ایس ایچ او تقریباً پینتالیس سال کا تھا۔ اس کا جسم اور چہرہ یوں پھول رہا تھا جیسے اسے شہد کی مکھیوں نے کاٹا ہو۔

اس نے اپنی بلغمی آواز میں کہا۔ ''اچھا، تو تم ہو فراز۔''

''ہاں، میرا ہی نام فراز ہے۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر ہی میرا موڈ خراب ہو گیا تھا۔

''واہ بھئی، نام تو شاعروں والا ہے۔ وہ ایک شاعر تھا نا فراز احمد فراز۔''

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

''تم کس گینگ کے لیے کام کرتے ہو؟'' اس نے اچانک پوچھا۔

''میں کسی گینگ کے لیے کام نہیں کرتا ہوں۔'' میں نے جھلا کر جواب دیا۔

ایس ایچ او اپنی جگہ سے اٹھا اور میرے سامنے آٹھہرا۔ وہ قد میں مجھ سے چھوٹا تھا اس لیے میری آنکھوں میں جھانکنے کے لیے اسے سر اٹھا کر کھڑا ہونا پڑا تھا۔ اس نے اچانک چٹاخ سے ایک تھپڑ میرے چہرے پر رسید کر دیا۔ ''بکواس کرتا ہے او ئے کوئی کلا بندہ اتنا مال لے جا سکتا ہے؟'' پھر وہ کوے جیسی آواز میں چیخا۔ ''تو جانتا ہے وہ ہیروئن کتنی ہے؟ آٹھ کلو، انٹرنیشنل مارکیٹ میں اس کی قیمت کروڑوں میں بنتی ہے۔ بتا، تیرے ساتھ اور کون کون شامل ہے؟''

''میں نے تمہیں بتایا نا کہ نہ میں منشیات فروش ہوں، نہ میرا کوئی گینگ ہے۔'' میں نے تپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس کے تھپڑ سے ابھی تک میرے بائیں کان میں سائیں سائیں ہو رہی تھی اور گال جل رہا تھا۔

''اوئے، کیوں خود پر ظلم کرتا ہے؟'' ایس ایچ او نے کہا۔ ''ہم تو بڑے بڑوں سے سچ اگلوا لیتے ہیں۔ تو تو چیز ہی کوئی نہیں ہے پھر تو اپنا نہیں تو اپنی بہن ہی کا خیال کر لے بدبخت۔''

''میری بہن کا نام مت لینا۔'' میں نے بپھر کر کہا۔ ''اس معاملے سے اس کا کوئی سروکار نہیں ہے۔''

''گڈ!'' ایس ایچ او نے کہا۔ ''چل اسے نہیں مجھے تو سروکار ہے۔'' وہ مکروہ انداز میں ہنسا۔ ''بتا دے تیرا کنکشن کن لوگوں سے ہے۔ ان کے نام بتا دے۔ میں تجھے چھوڑ دوں گا۔''

''جب میں کہہ رہا ہوں کہ میرا تعلق کسی گینگ سے نہیں ہے تو تمہیں یقین کیوں نہیں آتا؟'' میں نے بھنا کر کہا۔

اس نے ایک دم میرے چہرے پر دوسرا تھپڑ مارا۔ یہ تھپڑ اس نے خاصی قوت سے مارا تھا۔ میں بری طرح لڑکھڑایا اور سامنے والی دیوار سے ٹکرا گیا۔ فوراً ہی مجھے اپنی زبان پر خون کا نمکین ذائقہ محسوس ہوا۔ شاید اس تھپڑ سے میرے ہونٹ پھٹ گئے تھے۔ پھر وہ چیخ کر بولا۔ ''جان محمد۔''

فوراً ہی کمرے میں لمبا تڑنگا ایک حوالدار داخل ہوا۔ ''حکم چودھری صاحب۔'' اس نے پوچھا۔

''اس سے پوچھو کہ اس کا تعلق کس گینگ سے ہے اور یہ کب سے ان کے لیے کام کر رہا ہے؟''

''بہتر جناب۔'' جان محمد نے حقارت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں اس کے لیے صرف ایک گھنٹا دوں گا۔''

"ایک گھنٹا؟" جان محمد کے لہجے میں تضحیک تھی۔ "یہ آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں ریکارڈ کی طرح بجنے لگے گا۔" پھر اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے قسائی بکری کو دیکھتا ہے پھر اس نے میری ہتھکڑی کی زنجیر والا سرا اپنے ہاتھ میں پکڑا اور مجھے کسی بکری کی طرح گھسیٹتا ہوا وہاں سے لے گیا۔

وہ جس کمرے میں مجھے لے گیا، وہاں عجیب وغریب قسم کی چیزیں رکھی تھیں۔ لکڑی کی ایک بینچ، لوہے کی ایک کرسی، بالٹیاں، رسی کے لچھے اور نہ جانے کیا کیا تھا۔ کمرے کے عین وسط میں چھت پر ایک چرخی لگی تھی۔ اس میں بھی موٹی رسی پڑی تھی۔ چرخی میں سے گزرنے والی رسی کے دونوں سرے دیوار پر لگے ہوئے مضبوط سے ایک ہک سے بندھے ہوئے تھے۔

ہم سے پہلے کمرے میں دو کانسٹیبل موجود تھے۔ میری ہتھکڑی کی زنجیر ایک کانسٹیبل کے حوالے کر کے جان محمد وہاں سے چلا آیا۔ میں کھڑے کھڑے تھک گیا تھا۔ اس لیے وہاں پڑی ہوئی بینچ پر بیٹھ گیا۔

"او بیٹھ کسے نواب دی اولاد۔" مریل سے ایک سپاہی نے مجھے مخاطب کیا۔ "کھڑا ہو جا یہاں تو اپنے باپ کے ولیمے میں نہیں آیا ہے۔" ساتھ ہی اس نے میری ہتھکڑی والے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔

مریل سا وہ کانسٹیبل اگر عام حالات میں میرے ساتھ ایسا سلوک کرتا تو میں اسے بولنے کے قابل ہی نہ چھوڑتا۔ میں خون کے گھونٹ پی کر اٹھ کھڑا ہوا۔

اسی وقت جان محمد کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے وردی اتار دی تھی اور اب تہبند اور بنیان میں تھا۔ کمرے میں لوہے کی کرسی کے علاوہ ایک کرسی اور بھی تھی۔ جان محمد اطمینان سے اس کرسی پر بیٹھ گیا اور مجھ سے بولا۔ "ہاں بھئی اب شروع ہو جا۔ میں نے صاحب کو صرف آدھا گھنٹا دیا ہے۔ اس میں سے بھی سات منٹ گزر چکے ہیں۔ بتا، تیرا تعلق کس گینگ سے ہے؟"

"میں بتا چکا ہوں کہ میرا تعلق کسی بھی گینگ سے نہیں ہے۔" میں نے بیزاری سے جواب دیا۔

جان محمد کرسی سے کھڑا ہو گیا اور مجھے گھورنے لگا پھر اس نے اچانک میرے منہ پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ میں الٹ کر فرش پر گر گیا۔ "جلدی بول ورنہ......"

"میرا تعلق کسی گینگ سے نہیں ہے۔" میں چیخ کر بولا۔

"رحیم خان۔" اس نے ایک کانسٹیبل کو مخاطب کیا۔ "اس کے کپڑے اتار دو اور ہتھکڑی کھول کر ہاتھ باندھ دو۔" رحیم خان نے پہلے میری ہتھکڑی کھولی پھر میرے ہاتھ پشت کی طرف مضبوطی سے باندھ دیے۔ پھر اس نے ایک ایک کر کے میرے تمام کپڑے اتار دیے۔ میں بالکل برہنہ وہاں کھڑا ہوا تھا اور خود اپنی ہی نظروں میں گر گیا تھا۔

"اب بتا، تیرا کون سا گینگ ہے؟"

میں نے جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔

"الٹا لٹکا دو اس...... کو۔" جان محمد نے انتہائی غلیظ گالی دے کر کہا۔

ان دونوں میں سے ایک نے لپک کر چرخی میں بندھی ہوئی رسی کا ایک سرا کھولا اور میرے پاؤں باندھنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے مجھے جھٹکا سا لگا اور میں زمین پر گر گیا۔ ان دونوں نے آہستہ آہستہ رسی کا دوسرا سرا کھینچنا شروع کیا اور میں سر کے بل اٹھتا چلا گیا۔ زمین سے تقریباً پانچ فٹ کی بلندی پر انہوں نے مجھے لٹکا کر چھوڑ دیا۔ پھر جان محمد اٹھا اور اس نے میرے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کیا۔ میں پنڈولم کی طرح جھولتا ہوا دوسری طرف گیا تو وہاں سے تھپڑ مار کے مجھے پھر جان محمد کی طرف دھکیل دیا گیا۔ میرے جسم کا سارا خون سمٹ کر میرے چہرے پر آ گیا تھا۔ جان محمد کا جنون بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے تھپڑوں سے میں نڈھال ہو گیا اور آخر میرا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

مجھے ہوش آیا تو میں فرش پر پڑا تھا اور چہرہ پانی میں بھیگا ہوا تھا۔

"بتاتا ہے یا پھر لٹکا دوں الٹا؟" جان محمد غرا کر بولا۔

"جب مجھے کچھ معلوم ہی نہیں ہے تو کیا بتاؤں؟" میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اسے دوبارہ الٹا لٹکا دو۔" جان محمد چیخ کر بولا۔

دونوں سپاہی فوراً حرکت میں آ گئے۔

جان محمد کچھ سوچ کر بولا۔ "ٹھہرو، یہ ایسے زبان نہیں کھولے گا۔ اس کی بہن کو یہاں لاؤ اور اسی حالت میں اسے الٹا لٹکاؤ۔"

میں اس تصور ہی سے کانپ اٹھا کہ وہ لوگ روبی کی بھی یہی حالت کریں گے۔ وہ لمحہ انتہائی بے چارگی کا تھا۔ مجھے تو یہ سوچ کر بھی ہول آ رہا تھا کہ روبی مجھے اس حالت میں دیکھے گی۔

اچانک میں نے جھوٹ بولنے کا فیصلہ کر لیا اور چیخ کر بولا۔ "ٹھہرو، میری بہن کو یہاں مت لانا۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔"

''ہاں بچو، اب آیا نا سیدھے رستے پر۔'' جان محمد فاتحانہ انداز میں بولا۔

''پپ...... پانی...... مجھے...... پانی پلا دو۔''

''اسے نیچے اتارو۔'' جان محمد نے کہا۔

ان دونوں حکم کے غلاموں نے فوراً مجھے نیچے اتار دیا۔

میں فرش پر پڑا ہانپتا رہا۔ ایک سپاہی نے ایلومینیم کا میلا سا گلاس میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔

''اسے اٹھا کر بٹھا پاگل کے پُتر۔'' جان محمد دہاڑا۔

ان میں سے ایک نے مجھے اٹھا کر بٹھا دیا اور ایک مرتبہ پھر گلاس میرے منہ سے لگایا۔ میں نے اس حالت میں کچھ پانی پیا، کچھ فرش پر گر گیا۔

''ہاں، اب بول۔'' جان محمد نے کہا۔

''یہ گینگ کوئی بڑا گینگ نہیں ہے۔ ابھی حال ہی میں بنا ہے۔'' میں نے کہنا شروع کیا۔ ''میں نہیں جانتا کہ گروہ کا سرغنہ کون ہے۔ مجھے سہیل نے گینگ میں شامل کیا تھا۔''

''کون سہیل؟'' جان محمد نے پوچھا۔ ''وہ کیا کرتا ہے، کہاں رہتا ہے؟''

''پہلے تو وہ چھوٹی موٹی وارداتیں کرتا تھا، پھر وہ بینک لوٹنے لگا۔'' میں فراٹے سے جھوٹ بول رہا تھا۔ ''سہیل کسی زمانے میں میرے ساتھ کرکٹ کھیلتا تھا وہیں سے جان پہچان تھی۔ چھ مہینے پہلے میں بے روزگار ہو گیا تھا اور بہت زیادہ پریشان تھا۔ سہیل نے مجھے دلاور خان کا گینگ جوائن کرنے کا مشورہ دیا۔ اس نے کہا کہ کام بہت آسان ہے۔ بس تمہیں مہینے میں دو تین دفعہ کراچی سے پشاور چکر لگانا پڑے گا۔ وہ لوگ میرے ذریعے پشاور سے ہیروئن منگواتے تھے۔''

''دلاور خان کون ہے؟'' جان محمد پوری توجہ سے میری من گھڑت کہانی سن رہا تھا۔

''دلاور خان اس گینگ کا سرغنہ ہے لیکن میں نے آج تک اُسے نہیں دیکھا۔ مجھے تو سہیل کے ذریعے احکامات ملتے تھے۔''

''سہیل کہاں رہتا ہے؟'' جان محمد نے پوچھا۔

''سہیل ڈیفنس میں کہیں رہتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن اس نے کبھی اپنا پتا نہیں بتایا۔ وہ ہمیشہ مجھ سے کسی پارک یا ریسٹورنٹ میں ملاقات کرتا تھا۔ اس کی بہن نے روبی سے دوستی کر لی تھی۔ شاید روبی کے پاس اس کا سیل نمبر

''روبی کو یہاں لاؤ۔'' جان محمد نے کہا۔

''ٹھہرو۔'' میں نے کہا پھر جان محمد سے بولا۔ ''حوالدار صاحب! میں اس حلیے میں اپنی بہن کا سامنا کیسے کروں گا؟''

جان محمد نے چند لمحے سوچا، پھر سپاہیوں سے بولا۔ ''اس کے ہاتھ پاؤں کھول دو اور اسے کپڑے دے دو۔''

کپڑے پہننے کے بعد میرا کھویا ہوا اعتماد کسی حد تک بحال ہو گیا۔

ایک سپاہی باہر نکل گیا۔ وہ کچھ دیر بعد روبی کو لے آیا۔ اسے دیکھ کر میں غصے سے کانپنے لگا۔ اس کا لباس تار تار تھا، ہاتھوں اور چہرے پر نیل کے نشانات تھے۔

مجھے دیکھ کر وہ بے اختیار مجھ سے لپٹ گئی اور بلک بلک کر رونے لگی۔

''روبی...... گڑیا، کیا ہوا...... تیرا یہ حال کس نے کیا ہے؟''

''بھیا...... وہ...... وہ......'' روبی بات پوری کیے بغیر پھر رونے لگی۔

''اوئے، بند کرو یہ فلمی سین۔'' جان محمد گرج کر بولا۔

''یہ تجھے فلمی سین لگ رہا ہے؟'' میں نے بپھر کر کہا۔ ''میری بہن کی زندگی برباد ہو گئی...... تو اسے فلمی سین کہہ رہا ہے؟''

میرے بدلے ہوئے رویّے پر جان محمد حیران رہ گیا۔ اس نے سپاہیوں سے کہا۔ ''اسے ہتھکڑی لگاؤ اور لے چلو صاحب کے پاس۔''

روبی کی حالت دیکھ کر مجھے ہر طرف خون ہی خون نظر آ رہا تھا۔ ایک کانسٹیبل مجھے ہتھکڑی لگانے کو آگے بڑھا۔ میں نے ایک جھٹکے میں ہتھکڑی اس سے چھین لی اور اس کے چہرے پر اتنی زور سے گھونسا مارا کہ اس کی ناک سے بری طرح خون بہنے لگا۔ اب ہتھکڑی زنجیر سمیت میرے ہاتھوں میں تھی۔ میں نے اس کا سرا پکڑ کے ہتھکڑی کو ہنٹر کی طرح گھمایا۔ اسٹیل کی بھاری ہتھکڑی دوسرے کانسٹیبل کی کنپٹی پر پڑی۔ وہ بھی اپنے ساتھی کی طرح ڈھیر ہو گیا۔

جان محمد نے کمرے سے بھاگنے کی کوشش کی لیکن میں نے پاؤں اڑا کر اسے گرا دیا اور اس کے سر پر جا پہنچا۔ جان محمد کی آنکھوں میں خوف دیکھ کر میرے دل کو ٹھنڈک سی پہنچ گئی۔

میں نے زنجیر کو ہوا میں لہرایا اور خاصی قوت سے

اسے جان محمد کے سر پر دے مارا۔ ہتھکڑی کے کھٹاکے کے ساتھ ہی چٹاخ کی آواز آئی اور جان محمد کے حلق سے اذیت ناک چیخ ابھری۔ پھر وہ بُری طرح تڑپنے لگا اور اچانک ساکت ہوگیا۔

اس کی کھوپڑی چٹخ گئی تھی اور خون کے ساتھ ساتھ اس کا مغز بھی باہر بکھر گیا تھا۔ اسے اپنی طاقت اور فولادی جسم پر بہت ناز تھا۔ اس نے تصور بھی نہ کیا ہوگا کہ اس کمرے میں اس کی موت واقع ہوگی جہاں اس نے نہ جانے کتنے بے گناہ افراد پر تشدد کیا ہوگا؟

روبی پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے گھور رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ہوش و حواس میں نہیں ہے۔

میں نے سپاہیوں کو دیکھا۔ ان کی حالت خراب تھی لیکن وہ زندہ تھے۔

میں اب وہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ میرے ہاتھوں ایک انسان کا قتل ہوگیا تھا۔ وہ بھی ایک پولیس والے کا۔ اب موت تو یوں بھی میرا مقدر تھی پولیس والے مجھ پر اتنا تشدد کرتے کہ میں موت سے پہلے ہی مر جاتا۔ مجھے روبی کی فکر بھی تھی۔ وہ لوگ اس کے ساتھ جو سلوک کرتے، اس کا تصور کرکے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ میں نے کسی ہتھیار کی تلاش میں اردگرد دیکھا لیکن جان محمد اور دونوں سپاہیوں کے پاس اس وقت کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ ظاہر ہے، پولیس اسٹیشن کے اس ''محفوظ'' کمرے میں انہیں مسلح ہونے کی ضرورت بھی کیا تھی؟

مجھے وہاں مختلف قسم کے ڈنڈے نظر آرہے تھے۔ میں نے ایک ڈنڈا اٹھالیا۔

ٹارچر روم، حوالات اور دوسرے دفتروں سے کچھ فاصلے پر بنائے جاتے ہیں۔ ہر پولیس اسٹیشن میں ایسا ہی ہوتا ہے تاکہ ملزموں کی چیخ پکار باہر تک نہ جاسکے۔ وہ ٹارچر روم بھی الگ تھلگ تھا۔ فوری طور پر وہاں کسی کے آنے کا امکان ففٹی ففٹی تھا۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی تو میں بُری طرح اچھل پڑا۔ روبی بھی سہمے ہوئے انداز میں دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

''کون ہے؟'' میں نے حتی الامکان جان محمد جیسی کرخت آواز نکالی۔

''تمہیں صاحب بلا رہا ہے جان محمد۔'' باہر سے کسی کی آواز آئی۔

دروازے میں ہلکی سی ایک درز تھی۔ میں نے جھانک کر باہر دیکھا۔ مجھے باہر ایک سنتری نظر آیا۔ گن اس کے شانے پر لٹکی ہوئی تھی۔

''تم پہلے اس ملزم کو لے جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے اس سے سب اگلوالیا ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے دروازہ کھول دیا اور خود دروازے کے ساتھ چپک کر کھڑا ہوگیا۔

سنتری کھانستا ہوا اندر داخل ہوا۔ وہ جونہی ذرا آگے بڑھا۔ میں نے ڈنڈا خاصی قوت سے اس کے سر پر رسید کر دیا۔

کھٹاک کی آواز کے ساتھ سنتری کی کربناک چیخ بھی حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔

میں نے جھپٹ کر اس کی رائفل لے لی۔ مجھے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ اب پولیس کے پاس پرانے زمانے کی زنگ خوردہ رائفلیں نہیں ہیں۔ وہ ہلکی پھلکی جدید قسم کی رائفل تھی۔ مجھے ہتھیاروں کے بارے میں بہت سرسری سی معلومات تھیں۔ میں یونیورسٹی کے زمانے میں رائفل کلب کا ممبر رہا تھا۔ بس وہیں مجھے ہتھیاروں کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات حاصل ہوئی تھیں۔

میں نے سنتری کی رائفل ہاتھ میں پکڑی اور دروازے سے جھانک کر باہر دیکھا۔ کوریڈور سنسان پڑا تھا۔ میں نے روبی کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا اور خود بھی محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگا۔

صبح کے چار بج رہے تھے اس لیے وہاں بھی سناٹا تھا۔ وہیں درمیان میں ایس ایچ او کا آفس تھا اور آخری کمرے پر ڈیوٹی روم تھا۔ ایس ایچ او کے آفس میں سناٹا تھا۔

میں دبے پاؤں اس کے دفتر کے سامنے سے بھی گزر گیا۔ میرا یہ خیال غلط تھا کہ کمرے میں اس وقت کوئی موجود نہیں ہوگا۔ اندر سے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں لیکن دروازہ بند تھا۔

اچانک سامنے سے ایک شخص کوریڈور میں نمودار ہوا اور مجھ پر دھیان دیے بغیر ڈیوٹی روم میں چلا گیا۔ میں روبی کو لے کر دیوار سے چپک کر کھڑا ہوگیا لیکن وہ دیوار نہیں تھی بلکہ کسی کمرے کا دروازہ تھا۔ میرے جسم کا دباؤ پڑا تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔ اندر ایک میز اور چند کرسیاں رکھی تھیں لیکن کوئی موجود نہیں تھا۔

شاید وہاں سے کچھ دیر پہلے ہی کوئی اٹھ کر گیا تھا۔ فضا میں ابھی تک سگریٹ کی بو رچی ہوئی تھی۔ میز پر سگریٹ کا پیکٹ، لائٹر، رائٹنگ پیڈ اور ایک پسٹل رکھا ہوا تھا۔

میں نے وہ پسٹل اٹھالیا۔ یہاں ٹھہرنا بھی خطرناک

تھا۔ اس کمرے میں جو کوئی بھی بیٹھا تھا، کسی بھی لمحے واپس آسکتا تھا۔ اس کی پشت پر مجھے ایک اور دروازہ دکھائی دیا۔ وہ اندر سے بند تھا۔ میں نے جلدی سے وہ دروازہ کھولا تو مجھے ایک تاریک برآمدہ نظر آیا۔ اس سے کچھ فاصلے پر پولیس اسٹیشن کی باؤنڈری وال تھی۔ گیٹ پر تو سنتری موجود تھا۔ وہاں سے باؤنڈری وال پھلانگنا زیادہ آسان تھا۔

میں روبی کا ہاتھ پکڑ کر محتاط انداز میں باؤنڈری وال کی طرف بڑھا لیکن گیٹ وہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ سنتری کی نظر ہم پر پڑ سکتی تھی۔ وہاں کھڑے رہنے میں بھی خطرہ تھا۔ اس طرف سے کوئی بھی آسکتا تھا۔ بس ایک فائدہ تھا کہ اس وقت اندھیرا تھا لیکن اتنا بھی نہیں تھا کہ کچھ نظر ہی نہ آتا۔

میں نے باؤنڈری وال وہیں سے عبور کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے روبی کا ہاتھ پکڑا اور جھکا جھکا باؤنڈری وال کی طرف بڑھا۔ دیوار کے پاس پہنچ کر میں نے روبی کو سہارا دے کر دیوار پر چڑھا دیا۔

اچانک سنتری چیخ کر بولا۔ ''کون ہے؟''

میں نے روبی کو دوسری طرف کودنے کا اشارہ کیا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ باہر کی طرف سے دیوار کی بلندی کیا ہے ممکن ہے اندر کے مقابلے میں زیادہ ہو یا باہر پختہ فرش ہو۔ دوسری طرف گرنے سے روبی زخمی بھی ہوسکتی تھی۔ لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ روبی فوراً دوسری طرف کود گئی۔

اس کے بعد میں نے اچھل کر دیوار پکڑی اور اوپر پہنچ گیا۔

مجھے بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔

پھر کوئی چیخ کر بولا۔ ''رک جاؤ ورنہ میں فائر کردوں گا۔''

پھر اچانک اس نے فائر کردیا لیکن اس وقت تک میں دوسری طرف کود چکا تھا۔

فائر کے دھماکے سے پولیس اسٹیشن میں بھگدڑ مچ گئی ہوگی۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا تھا۔ میں روبی کا ہاتھ پکڑ کر پولیس اسٹیشن کی مخالف سمت بھاگا۔

اسی وقت وہاں ایک ہنڈا اکارڈ آکر رکی۔

پولیس والے مین گیٹ سے نکل کر شور مچاتے ہوئے اسی طرف آرہے تھے۔ میں نے گاڑی والے کے ہاتھ سے گاڑی کی چابی چھینی اور اسے دھکیل کر ایک طرف کردیا۔

اس وقت تک پولیس والے بہت نزدیک آگئے تھے۔ میں نے روبی سے کہا۔ ''گاڑی میں بیٹھو۔'' اسی وقت ایک فائر ہوا اور گولی میرے سر پر سے گزر گئی۔ اب پولیس والوں نے فائرنگ شروع کردی تھی۔ گاڑی کا مالک ایک طرف دبک گیا تھا۔

پولیس کی پیش قدمی روکنے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ انہیں جتا دیا جاتا کہ میں بھی مسلح ہوں۔ میں نے پسٹل سے ایک ہوائی فائر کیا اور اسٹیئرنگ پر بیٹھ کر گاڑی کا انجن اسٹارٹ کردیا۔ اسی وقت پولیس والوں کی طرف سے دو فائر ہوئے۔ ایک فائر تو نہ جانے کس طرف گیا لیکن دوسری گولی گاڑی کی چھت سے اچٹتی ہوئی نکل گئی۔

میں نے ایک دم گاڑی آگے بڑھا دی اور آناً فاناً مین روڈ پر آگیا۔ رات کا وقت تھا اس لیے ٹریفک برائے نام تھا۔

پانچ منٹ سے بھی کم وقت میں میری گاڑی شاہراہ فیصل پر دوڑ رہی تھی۔ میرے پاس ایک پسٹل تھا جس کی ایک گولی چل چکی تھی اور سنتری سے چھینی ہوئی آٹومیٹک رائفل تھی۔ اس کے میگزین میں نہ جانے کتنی گولیاں تھیں۔

میرا رخ تو بس شاہراہ کی طرف تھا۔ بس جدھر منہ اٹھا تھا ادھر نکل گیا تھا۔ فوری طور پر تو مجھے اپنی جان بچانا تھی۔

روبی ابھی تک گم صم بیٹھی تھی۔ یوں جیسے نیند میں ہو۔ مجھے اس کی طرف سے بھی فکر تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''روبی! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' میں نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔

وہ بری طرح سسکنے لگی۔ ''میں تو اسی وقت مرگئی تھی بھیا۔ جب...... اس...... ایس پی...... نے......'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر بری طرح رونے لگی۔

''روبی پلیز رونا بند کرو۔'' میں نے اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بتاؤ تم کس ایس پی کی بات کررہی ہو؟''

اس نے ایک سسکی لی اور بولی۔ ''ایک ایس پی؟...... وہاں تو کئی اور بھی تھے...... بھیا! آپ مجھے یہیں کہیں دھکا دے دیں۔ میں اب آپ لوگوں کے ساتھ رہنے کے قابل نہیں رہی۔''

خون میری کنپٹیوں پر ٹھوکریں مارنے لگا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''روبی! میں تیرے سامنے عہد کرتا ہوں کہ جس نے بھی تجھ پر میلی نظر ڈالی ہے۔ اگر میں زندہ رہا تو انہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

میں اس وقت قائد آباد کا علاقہ پیچھے چھوڑ چکا تھا۔

اچانک مجھے کچھ فاصلے پر سرخ روشنیاں دکھائی دیں۔ پھر گاڑی کے ہیڈ لیمپ میں مجھے پولیس کی ایک موبائل وین نظر آئی جو سڑک پر اس انداز میں کھڑی تھی کہ راستہ مسدود ہو گیا تھا۔ وین کے باہر کچھ پولیس والے کھڑے تھے، وہی سرخ روشنیوں سے مجھے رکنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ اگر وہ روشنیاں نہ ہوتیں تو میں پولیس کی اس موبائل وین سے ٹکرا جاتا۔ سیاہ رنگت کی وجہ سے وہ مجھے یوں بھی دور سے نظر نہیں آئی۔ اس کی چھت پر نیلے رنگ کی روشنی گردش کر رہی تھی۔

میں نے پوری قوت سے بریک لگائے۔ میری رفتار بہت زیادہ تھی۔ اس لیے بریک لگاتے لگاتے بھی گاڑی گھسٹتی ہوئی پولیس وین سے چند فٹ کے فاصلے پر رکی۔ گاڑی کے بریک چرچرانے سے جو آواز پیدا ہوئی، اسے سن کر سامنے کھڑے ہوئے پولیس والے اچھل کر ایک طرف ہو گئے۔

گاڑی رکتے ہی پولیس کے دو مسلح جوان گاڑی کے دائیں بائیں آٹھہرے۔ ان کی رائفلوں کا رخ گاڑی کی طرف تھا۔ پھر پولیس وین میں سے ایک افسر اترا اور گاڑی کے نزدیک آکر بولا۔ ”ذرا آپ نیچے آئیے۔“

”خیریت تو ہے آفیسر؟“ میں نے سنبھل کر کہا۔ ”کہیں کوئی واردات ہو گئی ہے؟“

”آپ کہاں سے آرہے ہیں؟“ پولیس آفیسر نے پوچھا۔

میں نے غیر محسوس طریقے پر پسٹل نکال لیا اور بولا۔ ”میں کراچی سے آرہا ہوں۔ آپ کو جو کچھ پوچھنا ہے جلدی پوچھیں۔ میری بہن کی حالت بہت خراب ہے۔ اسے اسپتال لے کر جانا ہے۔“ اس دوران میں مجھے نظر آگیا تھا کہ سڑک پر دائیں جانب اتنی جگہ تھی کہ وہاں سے گاڑی گزر سکتی۔ وہاں البتہ پولیس کے دو سپاہی رائفلیں لیے کھڑے تھے۔

”آپ پلیز نیچے اتریں۔“ انسپکٹر نے درشت لہجے میں کہا۔

وہ بالکل دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے آہستگی سے گاڑی گیئر میں ڈالی اور یوں ظاہر کیا جیسے میں دروازہ کھول رہا ہوں۔ پھر میں نے گاڑی کا دروازہ پوری قوت سے انسپکٹر کے جسم سے ٹکرا دیا۔ دروازے کی ضرب سے وہ لڑکھڑا کر سڑک پر گر گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ لوگ کچھ سمجھتے، میں نے دروازہ بند کیا اور گاڑی کا اسٹیئرنگ دائیں طرف موڑ کے گاڑی تیزی سے آگے بڑھا دی۔ پولیس وین اور سڑک کی درمیانی جگہ پر کھڑے ہوئے دونوں سپاہی گاڑی کو کسی خونی درندے کی طرح اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر فائر کرنا بھول گئے۔

دوسرے ہی لمحے گاڑی ان دونوں سے ٹکرائی اور وہ دونوں کئی فٹ اوپر اچھل گئے۔

اسی وقت کئی فائر ہوئے لیکن ایک دو گولیاں گاڑی سے ٹکرائیں۔ میں نے زناٹے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ میں نے عقب نما آئینے میں پولیس والوں کو اچھل اچھل کر وین میں بیٹھتے دیکھا۔ میں نے رفتار مزید بڑھا دی اور گاڑی کے ہیڈ لیمپس آف کر دیے۔

پولیس وین کا انجن اتنا طاقتور نہیں تھا اس لیے ہمارے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ان لوگوں نے ایک بے وقوفی کی تھی کہ اپنی گاڑی کے ہیڈ لیمپس آف نہیں کیے تھے۔ اسی روشنی سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ پولیس وین اب کتنی پیچھے رہ گئی ہے۔

میں کھارو پہنچا تو ایک اور مصیبت میری منتظر تھی۔ وہاں بھی پولیس کی ایک وین راستہ روکے کھڑی تھی۔ ان لوگوں نے بھی وہی غلطی دہرائی تھی جو پیچھے والوں نے کی تھی۔ انہوں نے بھی سڑک پر دائیں جانب کچھ فاصلہ چھوڑ رکھا تھا۔ سڑک کے ساتھ ہی کچی زمین تھی۔ وہاں دو پولیس والے الرٹ کھڑے تھے۔ وہ بھی مجھے سرخ لائٹ دکھا کر روک رہے تھے۔ میں نے پسٹل دائیں ہاتھ میں پکڑا اور گاڑی کو قدرے بائیں جانب لہراتے ہوئے ان کے انچارج پر فائر کر دیا جو وین سے اتر رہا تھا۔ وہ کراہ کر زمین پر گر گیا۔ گولی اسے نہ جانے کہاں لگی تھی۔ میں نے خوفناک انداز میں گاڑی دائیں طرف کاٹی اور اس طرف کھڑے ہوئے دونوں سپاہیوں کو روندتا ہوا نکل گیا۔ میری گاڑی کا عقبی حصہ پولیس وین سے بھی ٹکرایا تھا۔ ایک ساتھ کئی فائر ہوئے۔ کئی گولیاں گاڑی سے ٹکرائیں، ایک گولی گاڑی کا عقبی شیشہ توڑتی ہوئی میری سیٹ کی پشت میں پیوست ہو گئی۔

میں نے طوفانی رفتار سے گاڑی بھگائی اور پھر اچانک کچے میں اتار کے گھنے درختوں کی آڑ میں کھڑی کر دی۔

”روبی۔“ میں نے کہا۔ ”تم ڈرائیونگ سیٹ پر آجاؤ۔“

روبی نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ میں اب بہتر طریقے سے ان کا مقابلہ کر سکتا تھا۔

”گاڑی واپس موڑو روبی۔“ میں نے کہا۔ ”ہیڈ

لیسپس آن مت کرنا۔"

روبی نے وہیں سے یوٹرن لیا اور گاڑی اسی سڑک پر واپس دوڑنے لگی۔ میں جانتا تھا کہ پولیس یوں آسانی سے میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ میرے پہنچنے سے پہلے ہی اگلی چوکی والوں کو میری آمد کا علم ہوجاتا تھا۔ اب تو سیل فون اتنا عام تھا کہ پولیس والوں کو وائرلیس کی بھی ضرورت نہیں تھی۔

گاڑی کے بیک اسکرین پر چھوٹا سا ایک سوراخ تھا اس کے گرد مکڑی کا جالا سا بن گیا تھا۔

سڑک پر ایک جگہ مجھے ایک آدمی اوندھا پڑا نظر آیا۔ چاندنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی ورنہ روبی کو وہ شخص نظر نہ آتا۔ وہ پولیس کا کوئی اہلکار تھا۔ میں نے روبی سے گاڑی کے ہیڈ لیمپس آن کرنے کو کہا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا جائزہ لیا، وہ زندگی سے ناتا توڑ چکا تھا کہ اچانک سڑک کی دونوں جانب سے فائرنگ ہونے لگی۔ میرے بازو میں آگ سی بھڑک اٹھی۔ میں فوراً اوندھے منہ نیچے گر گیا اور سینے کے بل گھسٹتا ہوا گاڑی کی طرف بڑھا۔ عقبی نشست کا دروازہ کھلا ہوا تھا کیونکہ میں اسی دروازے سے نیچے اترا تھا۔

"روبی، گاڑی کو یوٹرن دو۔" میں نے وحشت زدہ لہجے میں کہا۔ میرے بازو میں گولی لگی تھی اور خون تیزی سے بہہ رہا تھا ورنہ میں خود ہی اسٹیئرنگ سنبھال لیتا۔

روبی نے انتہائی مہارت سے گاڑی کو یوٹرن دیا۔ اس دوران میں کئی گولیاں گاڑی سے ٹکرائیں لیکن روبی نے گھبرائے بغیر گاڑی کا رخ موڑ دیا۔

اچانک اندھیرے میں سے کوئی شخص اچھل کر گاڑی میں سوار ہوگیا اور اس نے روبی کی کنپٹی پر گن کی نال رکھ کے غراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "گاڑی کو روک کر نیچے اتر آؤ۔"

وہ کوئی بہت جی دار پولیس افسر تھا کہ گولیوں کی برسات کی پروا کیے بغیر گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔

وہ ابھی تک میری موجودگی سے بے خبر تھا کیونکہ میں سیٹ کے بجائے گاڑی کے پائیدان پر تھا اور پسنجر سیٹ اور عقبی سیٹ کے درمیان دبکا ہوا تھا۔

میں نے اپنا پسٹل نکال کر...... پولیس افسر کی گدی پر رکھ دیا اور سفاک لہجے میں بولا۔ "اپنی گن پھینک دو اور خاموشی سے بیٹھے رہو۔ جلدی کرو۔" پھر میں روبی سے مخاطب ہوا۔ "روبی! گاڑی کو تیز رفتاری سے چلاؤ اور یہاں سے نکلو۔"

اس پولیس افسر نے گن پھینک دی۔ روبی نے گاڑی کی رفتار ایک دم بڑھا دی۔ گولیاں اب بھی چل رہی تھیں۔

اچانک روبی کی چیخ گونجی تو میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا پھر گاڑی اِدھر اُدھر ڈولنے لگی۔ اس پولیس افسر نے اسٹیئرنگ سنبھالنے کی کوشش کی۔ پھر متوحش لہجے میں بولا۔ "اس لڑکی کی گردن میں گولی لگی ہے۔ تم کہو تو میں گاڑی روکنے کی کوشش کروں؟"

میں اس وقت کچھ بھی کہنے کی حالت میں نہیں تھا۔ وہ پولیس افسر خود ہی گاڑی روکنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی وقت ایک چھناکا ہوا، گاڑی کی عقبی اسکرین توڑتی ہوئی ایک مہلک گولی نے پولیس افسر کی کھوپڑی اڑا دی۔

گاڑی کی رفتار خاصی کم ہو چکی تھی۔ وہ پولیس افسر اگر اسٹیئرنگ نہ سنبھالتا تو گاڑی شاید اب تک سڑک کے کنارے کسی درخت یا ابھری ہوئی پتھریلی زمین سے ٹکرا چکی ہوتی۔ میں نے گاڑی کا عقبی دروازہ کھولا اور اچانک باہر چھلانگ لگا دی۔ فائرنگ مسلسل جاری تھی اور پولیس والے اب بھاری ہتھیاروں سے فائرنگ کررہے تھے۔ میں نشیب میں لڑھکتا چلا گیا۔

اسی وقت فضا میں زوردار دھماکا ہوا۔ میں نے سڑک کی طرف دیکھا۔ اس گاڑی میں آگ لگ چکی تھی جس میں روبی اور وہ پولیس افسر تھا۔ شاید اس کے پیٹرول ٹینک پر گولی لگی تھی۔

دھماکا اتنا زوردار تھا کہ میں نے گاڑی کو چند فٹ ہوا میں اچھلتے دیکھا، پھر وہ بری طرح شعلوں میں گھر گئی۔

روبی کی موت پر میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ موت تو اس کی اسی وقت واقع ہوگئی تھی جب اسے گولی لگی تھی لیکن مجھے ایک امید تھی کہ ممکن ہے روبی صرف زخمی ہوئی ہو اور وہ پولیس آفیسر مجھ سے بلف کررہا ہو لیکن اب تو کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔

میں جھاڑیوں میں چھپا چھپا آگے بڑھتا رہا۔ میرے زخمی بازو سے مسلسل خون بہہ رہا تھا اور نقاہت بڑھتی جارہی تھی۔ مجھے اور کچھ نہ سوجھا تو میں نے اپنے دونوں موزے اتار کے انہیں آپس میں باندھا، پھر اپنی آستین پھاڑ کر زخم پر رکھی اور دونوں موزے اس پر مضبوطی سے باندھ دیے۔ مجھے شدید پیاس لگ رہی تھی۔ حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے لیکن پانی وہاں کہاں سے ملتا۔

زخم کو باندھنے سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ خون بہنا بند ہو گیا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور جھاڑیوں میں اندر ہی اندر چلنے لگا۔ میرا رخ نہ جانے کس سمت میں تھا۔ بس میں چلے جارہا تھا۔

افق پر صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔
میں گرتا پڑتا بس بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ مزید کچھ دور چلنے کے بعد مجھے کھیتوں کے آثار دکھائی دیے۔ میں نے وہاں سے کترا کر گزرنا چاہا لیکن کھیتوں کے رکھوالے نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ میں اس سے بچ کر نکلتا تو وہ میری طرف سے شک میں پڑ جاتا۔ پھر بڑی بات تو یہ تھی کہ مجھ میں مزید چلنے کی سکت بھی نہیں رہی تھی۔ میں لڑکھڑایا اور وہیں ایک درخت کے پاس ڈھیر ہو گیا۔
وہ کسان دوڑتا ہوا میری طرف آیا اور بولا۔
''سائیں! سبھ خیر تو آہے؟'' (سب خیریت تو ہے)
میں سندھی کسی حد تک سمجھ لیتا تھا۔
''خیریت نہیں ہے بابا؟'' میں نے جواب دیا۔ ''مجھے ڈاکوؤں نے لوٹ لیا تھا۔ وہ میری گاڑی بھی لے گئے۔ میں نے بہت مشکل سے جان بچائی ہے۔''
''سائیں، آپ تو بہت زخمی ہو؟'' کسان نے ہمدردی سے کہا۔ ''آؤ، میرے ساتھ میری جھونپڑی تک چلو۔ اٹھو بابا، تھوڑی ہمت کرو۔'' اس نے سہارا دے کر مجھے اٹھایا اور کھیتوں میں بنی ہوئی چھوٹی سی جھونپڑی تک لے آیا۔
جھونپڑی میں ایک چارپائی تھی جس پر میلی سی بدرنگ رلی بچھی ہوئی تھی۔ میلا سا ایک تکیہ بھی تھا۔ اس نے مجھے بستر پر لٹا دیا اور خود باہر نکل گیا۔
میرے دل میں طرح طرح کے اندیشے سر اٹھانے لگے۔ ممکن ہے، وہ گاؤں والوں کو خبر دینے گیا ہو۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں گاؤں کے بہت سے لوگ اکٹھے ہو جائیں گے پھر یہ بات پولیس تک ضرور جائے گی۔ میں نے اپنی جیب پر ہاتھ مارا اس پسٹل کو محسوس کر کے مجھے خاصی تقویت محسوس ہوئی۔
چند منٹ بعد وہ کسان ہاتھ میں چھوٹی سی بالٹی اور پیتل کا کٹورا لیے ہوئے جھونپڑی میں داخل ہوا۔
''سائیں، آپ بھوکے ہو گے۔'' اس نے کہا۔ 'میں بھینس کا دودھ نکال رہا تھا۔''
اس نے اصرار کر کے مجھے تازہ تازہ دودھ پلا دیا۔
دودھ پی کر گویا مجھ میں نئی جان پڑ گئی۔ پھر وہ بولا۔
''سائیں، آپ زخمی بھی ہو۔ میں پہلے زخم صاف کر کے دوائی لگا دوں۔''
''دوائی؟'' میں نے حیرت سے کہا۔
''سائیں، اکثر ہم لوگ بھی زخمی ہو جاتے ہیں اس لیے زخموں پر لگانے والی دوائی اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ یہ دوائی ہمارے گوٹھ کا ایک آدمی بناتا ہے۔ بہت بہترین دوا ہے۔ اس سے تو کلہاڑیوں کے گہرے زخم بھر جاتے ہیں۔ آپ کا زخم بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ میں زخم صاف کرنے کے لیے گرم پانی لے کر آتا ہوں۔''
اس نے جھونپڑی سے باہر کہیں چولھا بنا رکھا تھا۔
وہ گرم پانی سے میرا زخم صاف کر رہا تھا تو میں نے اس سے پوچھا۔ ''بابا، میں بھی کیسا آدمی ہوں، اب تک آپ کا نام بھی نہیں پوچھا۔''
''سائیں، میرا نام علی بخش ہے لیکن گاؤں میں سب لوگ مجھے علن کہتے ہیں۔ آپ بھی مجھے علن کہہ سکتے ہیں۔''
اس نے جب زخم سے پٹی کھولی تو مجھے شدید تکلیف ہوئی کیونکہ کپڑا زخم پر چپک گیا تھا۔ اس نے گرم پانی سے زخم صاف کیا تو مجھے مزید تکلیف ہوئی لیکن میں برداشت کرتا رہا۔
''سائیں، آپ کے بازو کی ہڈی کو نقصان نہیں پہنچا ہے اور گولی گوشت پھاڑ کر نکل گئی ہے۔ یہ زخم تو دو تین دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔''
زخم صاف کرنے کے بعد اس نے کوئی مرہم لگایا تو مجھے اچانک سکون کا احساس ہوا۔
''سائیں، ابھی آپ آرام کرو، میں آپ کے لیے کھانے کو کچھ لاتا ہوں۔'' علن نے کہا۔
مجھے شرمندگی ہو رہی تھی کہ میری جیب میں تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی کہ میں اسے دے سکتا۔ میں نے اپنے ہاتھ پیر اور منہ کو بھی گرم پانی سے اچھی طرح صاف کر لیا تھا۔
علن باہر جا چکا تھا۔ میں نے جھونپڑی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ وہ چولھے پر بڑا سا سیدھا توا رکھے بیٹھا تھا۔ ایسے چولھے میں نے اکثر فلموں میں دیکھے تھے۔ بلاک رکھ کر مستطیل سی ایک شکل بنائی گئی تھی۔ جس کا ایک سرا خالی تھا۔ وہاں سے لکڑیاں اور اپلے ڈالے جاتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے بڑی سی ایک روٹی توے پر پھیلا دی۔ وہ چاول کی روٹی تھی۔ اس کے ساتھ مکھن اور لسی بھی تھی اور پیاز بھی۔
میں بھوک کی شدت سے بے تاب ہو رہا تھا۔ وہ کھانا مجھے اس وقت من و سلویٰ سے کم نہیں لگ رہا تھا۔
کھانا کھا کر میں ایسا سویا کہ پھر رات ہی کی خبر لایا۔
میرے کپڑے میلے اور بوسیدہ ہو گئے تھے۔ علن میرے لیے ایک دھوتی اور کرتا لے آیا تھا۔ اس کے ساتھ

ہی وہ کھیت بھی تھے جو عام طور پر سندھ میں استعمال ہوتے تھا۔ مجھے مزید شرمندگی کا احساس ہوا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''علن! اس وقت تو میرے پاس دینے کو کچھ نہیں ہے لیکن اگر میری زندگی رہی تو میں......''

''بس سائیں!'' علن نے میری بات کاٹ دی۔ ''مجھے ذلیل مت کرو۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''سائیں گاؤں میں پولیس آئی تھی۔ وہ لوگ کسی کو ڈھونڈ رہے تھے۔''

میں بری طرح چونک اٹھا۔ ''کسے ڈھونڈ رہے تھے؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''ان کا کوئی پولیس افسر کہیں گم ہو گیا ہے۔ وہ اسے ڈھونڈ رہے تھے۔''

میں نے سکون کا سانس لیا کہ پولیس میری تلاش میں نہیں آئی تھی۔

دوسرے دن میں نے علن سے کہا۔ ''علن! یہاں کہیں اخبار ملتا ہے؟''

''ہاں سائیں مل جائے گا۔'' اس نے جواب دیا۔

پھر شام تک وہ ایک اردو اور ایک انگریزی کا اخبار لے آیا۔

اخبار میں میرے ہی بارے میں چار کالمی ایک خبر لگی تھی۔ پولیس کے چار اہلکاروں کو قتل کر کے فرار ہونے والا ملزم پولیس مقابلے میں ہلاک، پولیس کی فائرنگ سے اس کی گاڑی میں آگ لگ گئی اور وہ دھماکے سے اڑ گئی۔ ملزم فراز کے ساتھ اس کی بہن اور آلۂ کار روبی بھی ہلاک۔ واضح رہے کہ پولیس نے ملزم کو کراچی ائرپورٹ سے اس کی بہن سمیت اس وقت گرفتار کیا تھا جب وہ سات کلو ہیروئن پاؤڈر امریکا لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بعدازاں ملزم ایک پولیس انسپکٹر کو قتل کرنے کے بعد اپنی بہن کو لے کر وہاں سے فرار ہو گیا۔ اس نے قتل کے ساتھ ساتھ پولیس اسٹیشن میں دو آدمیوں کو شدید زخمی بھی کر دیا تھا۔ پولیس مقابلے میں بھی ملزم فراز نے پولیس کے تین اہلکاروں کو شہید کر دیا تھا۔''

خبر پڑھ کر میں نے سکون کا سانس لیا۔ گویا پولیس نے میری موت کی تصدیق کر دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میرے کیس کی فائل بھی بند ہو گئی تھی۔ اب میں آزاد تھا بس مجھے اپنے حلیے میں تھوڑی سی تبدیلی کرنا پڑتی اور نئے نام سے قومی شناختی کارڈ بنوانا پڑتا۔

شام کو علن نے میرے لیے چائے بنائی تو میں حیران رہ گیا۔ وہ مسکرا کر بولا۔ ''سائیں، میں جانتا ہوں کہ آپ شہری لوگ چائے کے بہت شوقین ہوتے ہو۔ میں گوٹھ سے آپ کے لیے چینی اور پتی لے آیا تھا۔ دودھ تو یہاں بہت ہے۔''

میں نے کئی دنوں کے بعد چائے پی تو مجھے اس کا الگ ہی سُرور محسوس ہوا۔ اس دوران میں میرے حلیے میں بھی تبدیلی ہو رہی تھی۔ میری بڑھی ہوئی شیو آہستہ آہستہ داڑھی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ مونچھیں بھی اچھی خاصی بڑھ گئی تھیں کہ اب انہیں مونچھیں کہا جا سکتا تھا۔

''ہاں علن۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''مجھے کہیں سے شیو کا سامان مل سکتا ہے؟''

''سائیں بالکل مل سکتا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں کل ہی شیو کا سامان لے آؤں گا۔ میں خود تو شیو بناتا نہیں ہوں ورنہ میرے پاس بھی وہ سامان ہوتا۔'' پھر وہ اچانک بولا۔ ''پر سائیں میرا خیال ہے کہ آپ ابھی شیو نہ کرو۔''

''کیوں؟'' میں چونک اٹھا۔

''آپ کے چہرے پر داڑھی اچھی لگتی ہے۔''

''چلو، تم کہتے ہو تو نہیں کرتا۔'' میں نے کہا۔

میں علن سے اب بہت زیادہ بے تکلف ہو گیا تھا لیکن میرے ذہن میں ایک گرہ تھی کہ میں اس غریب آدمی پر بوجھ بنا ہوا ہوں۔

مزید ایک ہفتہ رہنے کے بعد میرا زخم بالکل ٹھیک ہو گیا۔ بس اس پر کھرنڈ جم گیا تھا۔ میں اب وہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ میں نے علن سے کہا تو وہ کچھ افسردہ ہو گیا اور بولا۔ ''سائیں، کوئی عمر بھر تو کسی کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ میں جانتا تھا کہ ایک دن آپ بھی چلے جائیں گے۔''

''جانتا تو مجھے ہے علن۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر زندگی رہی تو تم سے ملنے یہاں ضرور آؤں گا۔'' پھر میں موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ''علن! گوٹھ میں تمہارے ماں باپ، بہن بھائی اور بیوی بچے ہوں گے۔ تم ہر وقت یہیں ہوتے ہو؟''

''سائیں، اس بات کو نہ چھیڑیں۔'' علن نے کہا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد مجھے اچھی خاصی زمین ملی تھی۔ میرے بھائیوں نے پٹواری سے ساز باز کر کے تمام زمین اپنے نام کرالی۔ زمین کا یہ ٹکڑا انہوں نے مجھے دے دیا۔ اس دن کے بعد سے میں نے گوٹھ چھوڑ دیا اور یہیں رہنے لگا۔''

اس نے وہی پرانی کہانی دہرا دی جو عموماً گاؤں میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ ''شادی میں نے اب تک کی نہیں ہے۔''

علن نے کہا۔ میرے حصے کی بہت سی زمین بے آباد پڑی ہے۔ میں سوچ رہا ہوں، اسے بھی آباد کرلوں تو شادی کردوں گا۔''

ہر شخص کی کوئی نہ کوئی پریشانی تھی، کوئی نہ کوئی الجھن تھی۔

ایک دن میں وہاں سے جانے کو تیار ہوگیا۔ میری واڑھی اب خاصی بڑھ گئی تھی اور مونچھیں بھی خاصی گھنی ہوگئی تھیں۔ میں اس وقت کرتے، دھوتی اور سندھی ٹوپی میں تھا۔

علن نے مجھے کچھ نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ ''رکھ لو، سائیں، کام آئیں گے۔''

مجھے واقعی پیسوں کی ضرورت تھی۔ علن نے مجھے ایک مرتبہ پھر شرمندہ کردیا تھا۔

میں اس سے بغل گیر ہوکر باہر نکلنے لگا تو وہ بولا۔ ''سائیں، میں لاری اڈے تک تو آپ کو چھوڑ کر آؤں گا۔''

پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''سائیں ایک منٹ! آپ اپنی ایک چیز تو یہیں بھول رہے ہیں۔'' وہ دوبارہ اندر گیا اور واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں وہی گن تھی جو میں نے تھانے سے اٹھائی تھی۔ پھر وہ مسکرا کر بولا۔ ''سائیں، اب ذرا پولیس سے بچ کر رہنا۔ ہاں، میں اس کی کچھ گولیاں بھی لے آیا تھا۔''

میں نے وہ گن اپنی دھوتی میں اڑس لی اور حیرت سے بولا۔ ''علن! تم..... مجھے.....''

''میں تو آپ کو اسی وقت پہچان گیا تھا سائیں جب پولیس اپنے آفیسر کی تلاش میں آئی تھی۔ چلیں، اب دیر مت کریں۔ دو گھنٹے بعد ایک ٹرین کراچی جانے والی ہے۔''

''میں نے تو ابھی تک یہ بھی نہیں پوچھا کہ یہ کون سا گوٹھ ہے اور کس علاقے میں ہے؟''

''سائیں یہ شاہ پور ہے، یہاں سے جھمپیر کا اسٹیشن آدھے پون گھنٹے کی دوری پر ہے۔''

''جھمپیر۔'' میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ میں کراچی سے زیادہ دور نہیں تھا۔

علن نے نہ صرف مجھے اسٹیشن تک چھوڑا بلکہ کراچی کا ٹکٹ بھی خرید لایا اور بولا۔ ''سائیں، پندرہ منٹ میں ٹرین آنے والی ہے۔''

پھر وہ مجھے ٹرین میں سوار کرا کے واپس چلا گیا۔

☆☆☆

میں کراچی کے کینٹ اسٹیشن پر اترا تو سب کچھ ویسا ہی تھا۔ بس میں ویسا نہیں تھا بلکہ سرکاری طور پر تو میں تھا ہی نہیں۔

میں اپنے گھر بھی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ مکان بھی پولیس نے سیل کردیا ہوگا۔ میرے اور روبی کے پاسپورٹ پر وہی ایڈریس تھا۔ میں اسٹیشن سے باہر آیا اور یونہی بے مقصد ایک طرف چلنے لگا۔ میں کینٹ اسٹیشن سے پیدل ہی صدر تک پہنچ گیا تھا۔ چلنے سے تھکن بھی ہو رہی تھی اور بھوک بھی لگ رہی تھی۔ میرے پاس علن کے دیے ہوئے پیسے تھے۔ میں کھانے کے لیے ایک ہوٹل میں چلا گیا۔ وہاں بھانت بھانت کے لوگ موجود تھے۔ وہ اوسط درجے کا ایک ہوٹل تھا۔ لوگوں کے بولنے کا شور، بیروں کی چیخ پکار اور کرخت گھنٹی کی آواز۔ ہوٹل کے ایک کونے میں چھوٹا ٹی وی بھی لگا تھا۔

کچھ لوگ ٹی وی بھی دیکھ رہے تھے۔

میں نے کھانا کھاتے ہوئے ٹی وی پر نظر ڈالی۔ وہاں نیوز بلیٹن شروع ہوچکا تھا۔ چند سیاسی خبروں کے بعد نیوز کاسٹر نے میرا نام لیا تو میں چونک اٹھا۔

وہ کہہ رہی تھی۔ ہیروئن کی بھاری مقدار اسمگل کرنے والے ملزم فراز کے والد اور بھائی آج کراچی پہنچے تو پولیس نے ائرپورٹ پر انہیں گرفتار کرلیا۔ ملزم فراز اور اس کی بہن گرفتاری کے بعد پولیس کی حراست سے فرار ہوگئے تھے۔ بعد میں وہ دونوں پولیس مقابلے میں مارے گئے۔ ایس ایس پی کرائمز کا خیال ہے کہ ملزم کے والد اعجاز اور بھائی سلمان کا تعلق بھی اسی گینگ سے ہے جو منشیات کی اسمگلنگ میں ملوث ہے۔ اسکرین پر پہلے میری اور روبی کی تصویریں دکھائی گئیں۔ جو پولیس نے ہمارے پاسپورٹوں سے حاصل کی تھیں۔ پھر ڈیڈی اور بھائی جان کو دکھایا گیا۔

یہ خبر دیکھ کر نوالہ میرے حلق میں اٹک گیا۔ میں نے ابھی کھانا ہی شروع کیا تھا پھر مجھ سے کھانا نہیں کھایا گیا۔ میں نے کاؤنٹر پر بل کی ادائیگی کی اور باہر نکل آیا۔ پولیس اب وہی سلوک ڈیڈی اور بھائی جان کے ساتھ کرنے والی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں؟

میرے پاس پیسے بھی نہیں تھے۔ ورنہ یہاں تو ہر کام پیسے کے زور پر ہوجاتا ہے۔ ''پیسے..... پیسے۔'' میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا اور کسی کی کہی ہوئی یہ بات یاد آئی کہ یہاں مانگنے سے کچھ نہیں ملتا بلکہ چھیننا پڑتا ہے۔

''ہاں، مجھے چھیننا پڑے گا۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

پسٹل میرے پاس تھا۔ اب مجھے دھوتی اور کرتہ اتار

کے جینز اور شرٹ پہنا تھی۔ صدر کے علاقے سے مجھے لنڈے کی ایک اچھی جینز مل گئی وہیں سے میں نے ایک ٹی شرٹ اور ہلکی پھلکی جیکٹ بھی خریدی۔ پرانے جوتوں میں مجھے اچھی کنڈیشن میں ایک جوگر بھی مل گیا۔ میں نے ایک بلڈنگ کے باتھ روم میں کپڑے بدلے اور پرانے کپڑوں کو ایک شاپر میں رکھ کر باہر آ گیا۔ پھر موقع دیکھ کر میں نے وہ شاپر بھی کوڑے کے ایک ڈھیر پر پھینک دیا۔

میں وہاں سے ٹہلتا ہوا صدر کے پُر رونق علاقے میں آ گیا۔

ایک سگنل پر گاڑیاں رکیں تو میں جھپٹ کر ایک گاڑی کی پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''کون ہو تم...... یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' گاڑی والا غرایا۔ وہ چالیس، پینتالیس سال کا صحت مند آدمی تھا۔ ''نیچے اترو ورنہ میں پولیس کو بلا لوں گا۔''

میں نے اسے پسٹل کی جھلک دکھائی اور سفاک لہجے میں بولا۔ ''خاموشی سے بیٹھے رہو، ورنہ مجھے صرف انگلی کے ایک اشارے سے اس کا ٹریگر دبانا پڑے گا پھر سب کچھ ختم۔ یہ پسٹل بے آواز چلتا ہے۔''

گاڑی والے کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ ''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

اسی وقت سگنل کھل گیا۔ میں نے کہا۔ ''خاموشی سے چلتے رہو۔ فائدے میں رہو گے ورنہ......''

اس نے گاڑی گیئر میں ڈال کر آگے بڑھا دی۔

''دیکھو، میرے پاس اس وقت زیادہ کیش نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''صرف دس بارہ ہزار روپے ہوں گے۔'' اس کے علاوہ یہ سیل فون ہے، میری گھڑی اور انگوٹھی ہے اور......''

''بکومت۔'' میں دہاڑ کر بولا۔ ''میں نے کہا ہے کہ خاموشی سے چلتے رہو۔''

''دیکھو، تم یہ اچھا نہیں کر رہے ہو۔ میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔ وزارتِ داخلہ کا ایک ذمے دار افسر ہوں۔''

''تم وزارتِ داخلہ میں ہو یا وزارتِ خارجہ میں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن ذمے دار ہرگز نہیں ہو۔ جھوٹ بھی بولتے ہو کہ تمہارے پاس صرف دس ہزار روپے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تمہیں ساری معلومات ہیں۔''

وہ مرے مرے لہجے میں بولا۔ زبان میں نے جھوٹ بولا تھا۔ میرے بریف کیس میں تین لاکھ روپے ہیں۔

''وہ تو خیر تمہیں مارنے کے بعد میں لے ہی لوں گا۔'' میں نے سفاک لہجے میں کہا۔ ''یہ بتاؤ کہ فراز کیس کی تفتیش کون کر رہا ہے؟''

''فراز کیس؟'' وہ چونک کر بولا۔ ''تمہارا اس سے کیا تعلق؟''

''جتنا پوچھ رہا ہوں اتنا ہی جواب دو اور دھیان سامنے رکھو ورنہ مجھ سے پہلے ایکسیڈنٹ میں مارے جاؤ گے۔''

''فراز کیس کی تحقیقات ایس ایس پی درانی کر رہا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''فراز کے والد اور بھائی کو کہاں رکھا گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ میں نہیں جانتا۔'' اس نے کہا۔

''تو معلوم کرو۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔

''ہاں، مجھے یاد آ گیا، ان دونوں کو ابھی ملیر کے ایک پولیس اسٹیشن کے لاک اپ میں رکھا گیا ہے، پولیس......''

''کس پولیس اسٹیشن میں؟'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

''کالا بورڈ کے پولیس اسٹیشن میں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''پولیس کل انہیں کورٹ میں پیش کرے گی اور ان کا ریمانڈ لے گی۔''

''اگر میں یہ کہوں کہ ان دونوں کو وہاں سے نکال دو؟''

''یہ میرے بس میں نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''تم چاہے مجھے گولی مار دو لیکن جو بات میرے بس میں نہیں ہے، وہ میں کیسے کر سکتا ہوں؟''

اس کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔

''ہم لوگ اس وقت تک سہراب گوٹھ پہنچ چکے تھے۔ وہ بھی خوف زدہ ہو کر سیدھا چلتا آیا تھا۔

''اب کہاں جانا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''سیدھے چلتے رہو۔'' میں نے کہا۔ ''آگے جا کر بائیں طرف سروس روڈ پر لے لینا۔''

ایک ویران اور سنسان جگہ دیکھ کر میں نے گاڑی رکوا دی اور اس سے بولا۔ ''بریف کیس کے لاک کا نمبر بتاؤ۔''

''میں نے ابھی تک نمبر سیٹ نہیں کیا ہے۔''

میں نے بریف کیس کھول کر دیکھا، اس میں واقعی نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ میں نے اس کی تلاشی لی تو اس کی

جیبوں سے بھی پچیس ہزار روپے اور بائیس بور کا چھوٹا سا پستول نکلا۔

"نیچے اترو۔" میں نے درشت لہجے میں کہا۔

"کک...... کیوں؟" وہ ہکلایا۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا اور ایک مرتبہ پھر اس سے کہا۔ "نیچے اترو۔"

وہ نیچے اتر گیا۔

"اب سامنے کی طرف دوڑ لگا دو۔ اگر پیچھے مڑ کر دیکھا تو گولی مار دوں گا۔"

وہ نیچے اترا تو میں نے کہا۔ "بھاگو......"

وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ میں نے اس کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ گولی اس کی گردن میں لگی اور وہ اذیت ناک انداز میں چیخ کر وہیں گر گیا۔

میں نے فوراً گاڑی کا رخ موڑا اور اسے وہاں سے نکال کر سہراب گوٹھ پر آ گیا۔ ایک صاف جگہ دیکھ کر میں نے گاڑی پارک کی اور بریف کیس لے کر گاڑی سے اتر گیا۔ پھر میں ٹہلنے والے انداز میں آگے بڑھ گیا۔ گاڑی چھوڑنے سے پہلے میں نے ہر اس جگہ کو ممکنہ طور پر رومال سے صاف کر دیا تھا جہاں میرے فنگر پرنٹس ہو سکتے تھے۔

میں نے وہاں سے ایک ٹیکسی پکڑی اور سیدھا کینٹ اسٹیشن پہنچ گیا۔ وہاں سے دوسری ٹیکسی کے ذریعے بلوچ کالونی پہنچا۔ وہاں درمیانے درجے کا ایک صاف ستھرا ہوٹل ہے میں نے وہیں ایک کمرا بک کرایا۔ میں پرسکون ہو کر کچھ سوچنا چاہتا تھا۔

میں نے ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر اس شخص کا پرس کھول کر دیکھا۔ اس میں نقد رقم کے علاوہ اس کا ڈرائیونگ لائسنس اور دفتر کا کارڈ بھی موجود تھا۔ اس کا نام دوست محمد ابڑو تھا اور انڈر سیکریٹری تھا۔ اس کے پرس میں بہت سے وزیٹنگ کارڈز بھی تھے۔

اچانک سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں بری طرح اچھل پڑا۔ میرے پاس تو سیل فون ہی نہیں تھا۔ وہ سیل فون بھی اس دوست محمد کا تھا۔ میں نے اس کے اسکرین پر نظر ڈالی۔ کوئی اشرف اسے کال کر رہا تھا۔ میں نے بٹن دبا کر کال ریسیو کر لی لیکن کچھ بولا نہیں۔

میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی اشرف بولا۔ "سائیں، آپ کہاں ہو، میں نے اس سے پہلے کم سے کم پانچ چھ میسج بھی کیے ہیں، باس نے کہا ہے کہ کام بالکل پرفیکٹ ہونا چاہیے۔"

میں بری طرح کھانسنے لگا۔ پھر حتی الامکان دوست محمد جیسا لہجہ بنا کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "باس کو بولو، مجھے کال کرے۔"

"باس آپ کو کال کرے گا؟" اشرف کے لہجے میں حیرت تھی۔ "آپ کو؟"

"ہاں" میں نے جھنجلا کر کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

فوراً ہی سیل فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ اس مرتبہ بھی اشرف ہی تھا۔ میں نے کال ریسیو کی اور جھنجلا کر بولا۔ "اب کیا ہے؟"

"سائیں، تم وہ تیس لاکھ روپیا اکیلے ہضم نہیں کر سکتے ہو۔"

"شٹ اپ۔" میں نے دہاڑ کر کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ پھر میں نے سیل فون آف کر کے اس میں سے سم کارڈ نکال لیا۔ مجھ سے بہت بڑی بھول ہوئی تھی کہ میں دوست محمد کا سیل فون بھی لے آیا تھا۔ شاید ابھی تک کسی کو اس کی موت کا علم نہیں ہوا تھا ورنہ سیل فون پر اشرف کی نہیں بلکہ کسی پولیس آفیسر کی آواز سنائی دیتی۔

وہ جدید قسم کا انتہائی مہنگا سیل فون تھا۔ ان سیٹس میں اب لوکیشن کا کوڈ بھی ہوتا ہے۔ میں پہلی فرصت میں اس سیل فون سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا لیکن مجھے یہ تجسس بھی تھا کہ آخر یہ اشرف کون ہے اور باس کسے کہہ رہا ہے۔ کیا دوست محمد نے اس سے کسی قسم کی ڈیل کی تھی جس کے نتیجے میں اسے تیس لاکھ روپے ملے تھے اور اب وہ اشرف اپنا حصہ مانگ رہا تھا۔

میں بہت دیر تک سوچتا رہا لیکن میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ میں نے دوست محمد کا پرس نکال کر دیکھا کہ ممکن ہے مجھے اس کے ذریعے کوئی سراغ مل جائے۔ وہ مختلف لوگوں کے وزیٹنگ کارڈز تھے۔ ان میں زیادہ تعداد سرکاری افسروں کی تھی۔

اچانک ایک وزیٹنگ کارڈ پر میری نظر پڑی تو میں چونک اٹھا۔ "اشرف خان، جنرل منیجر الائنس منی چینجر۔ اس کے ساتھ ہی دفتر کا پتا اور ٹیلی فون نمبر تھا۔ ممکن ہے، وہ کوئی اور اشرف ہو؟ میں نے کارڈ کو غور سے دیکھا، پھر بے دھیانی میں اسے پلٹ دیا۔ اس پر بال پوائنٹ سے لکھا ہوا تھا۔ "صابر کو بھیج رہا ہوں، اشرف۔"

وزیٹنگ کارڈ پر اشرف کا سیل نمبر بھی تھا۔ میرے پاس سیل فون نہیں تھا ورنہ میں دوست محمد کی سم لگا کر اشرف کا نمبر ملائی کرتا۔ میں نے گھڑی دیکھی ابھی صرف شام کے

آٹھ بجے تھے۔ اس وقت تو سب دکانیں کھلی ہوں گی۔

میں ہوٹل سے نکلا اور صدر پہنچ گیا۔ وہاں سے میں نے سستا سا ایک سیل فون خریدا اور وہاں سے ٹہلتا ہوا جہانگیر پارک کی طرف آ گیا۔ میں نے سیل فون کے ساتھ ایک سم بھی خریدی تھی۔ پارک کے ایک پُرسکون گوشے میں بیٹھ کر میں نے دوست محمد کی سم نکالی اور اپنے سیل فون میں لگا دی۔

سم لگاتے ہی کال آنے لگی۔ اسکرین پر کوئی اجنبی نمبر تھا۔ میں نے لائن کاٹ کر اشرف کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے فوراً ہی کال ریسیو کر لی گئی۔ ''ہیلو۔'' مجھے اشرف کی آواز سنائی دی۔

''اشرف صاحب! میں غنی بول رہا ہوں۔ میں نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''کون غنی؟'' اشرف نے جھنجلا کر کہا۔

''میں دوست محمد صاحب کے لیے کام کرتا ہوں۔ کچھ دیر پہلے ان کا مرڈر ہو گیا ہے۔''

''وہاٹ؟'' اشرف دہاڑا۔ ''مرڈر ہو گیا ہے، کب، کہاں؟''

''سپر ہائی وے کے پاس۔'' میں نے کہا۔ ''میں اس وقت ان کے ساتھ ہی تھا۔ وہ لوگ ایک گاڑی میں سوار تھے۔ وہ اچانک آئے تھے اور دوست محمد صاحب کو گاڑی سے نیچے اترنے کو کہا۔ میں جانتا تھا کہ دوست محمد صاحب کے پاس بیس لاکھ روپے ہیں۔ دوست محمد صاحب گاڑی سے نیچے اترے تو ایک طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہ دونوں آدمی ان کے پیچھے بھاگے۔ موقع دیکھ کر میں نے بریف کیس اٹھایا اور دوسری طرف کے دروازے سے باہر چھلانگ لگا دی۔ پھر میں جھاڑیوں میں چھپتا چھپاتا ہائی وے تک پہنچا اور ٹرک میں لفٹ لے کر واپس آیا ہوں۔''

''وہ لوگ کون تھے؟'' اشرف کے لہجے میں تشویش تھی۔

''میں نہیں جانتا۔'' میں نے کہا۔

''وہ ضرور ملک کے آدمی ہوں گے۔''

''کون ملک، اشرف صاحب؟'' میں نے پوچھا۔ ''مجھے بتائیے، میں اسے اپنے ہاتھوں سے گولی ماروں گا۔''

''تم ...... تم ملک کو مارو گے؟'' اشرف ہنسا۔ ''کیا اس دھندے میں نئے آئے ہو کہ ملک کو نہیں جانتے؟''

''مجھے صرف اتنا بتا دیں کہ وہ مجھے کہاں ملے گا؟'' میں نے دانت پیس کر کہا۔

''اس سے پہلے کہ تم ملک کے کسی کتے کے ہاتھوں مارے جاؤ، وہ بیس لاکھ مجھے دے دو۔''

''وہ تو میں آپ کو نہیں دوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''اب ملک کو گولی مارنے کے بعد ہی آپ کو کال کروں گا۔''

وہ ہیلو ہیلو کرتا رہ گیا۔ میں نے لائن کاٹ دی۔ البتہ میں نے اس کا سیل نمبر ذہن نشین کر لیا تھا۔ پھر میں نے اپنے موبائل میں کاپی کر لیا۔

میں وہاں سے اٹھا ہی تھا کہ اچانک پیچھے سے کسی نے مجھ پر چھلانگ لگائی۔ میں اس کے بوجھ سے نیچے گر گیا۔ فوراً ہی ایک دوسرا آدمی بھی آ گیا۔ ان دونوں نے مجھے دبوچ لیا۔

''کون ہو تم لوگ اور کیا چاہتے ہو؟'' میں نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔

''تو اشرف صاحب کو کیسے جانتا ہے؟'' ان میں سے ایک نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''میں دوست محمد صاحب کے ساتھ کام کرتا ہوں۔ انہوں نے مجھے اشرف صاحب کے بارے میں بتایا تھا۔'' میں نے کہا۔

''بکواس کرے گا تو ابھی یہیں ذبح کر دوں گا۔'' ان میں سے ایک سفاک لہجے میں بولا۔ ''دوست محمد کے ساتھ کوئی کام نہیں کرتا۔ سچ سچ بتا تو کون ہے؟ پولیس کا مخبر یا ملک کا آدمی؟''

''نہ میں پولیس کا مخبر ہوں، نہ ملک کا آدمی۔'' میں نے کہا۔ ''میں تو......

میرا جملہ ادھورا رہ گیا۔ کیونکہ ان میں سے ایک نے میرے چہرے پر زوردار تھپڑ مار دیا تھا۔ پھر وہ اپنے دوسرے ساتھی سے بولا۔ ''ظہیر! اسے اشرف صاحب کے پاس لے چلو۔ وہی اس کا فیصلہ کریں گے۔''

''یار صفدر پہلے اس کی تلاشی تو لے لو۔''

صفدر نے میری تلاشی لی اور جیب سے پستول نکال لیا۔

رات کا وقت تھا اس لیے پارک کا وہ گوشہ بالکل سنسان تھا۔ کہیں لوگ گھاس پر پڑے مالش کروا رہے تھے۔ یا کچھ لوگ بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔

وہ لوگ مجھے گن پوائنٹ پر ایک گاڑی تک لائے اور مجھے عقبی نشست پر دھکیل دیا۔ پھر صفدر بھی میرے ساتھ آ بیٹھا۔ اس نے میری پسلیوں سے پستول لگا دیا تھا۔

گاڑی آدھے گھنٹے تک چلتی رہی۔ اس دوران میں نہ ان لوگوں نے مجھ سے کوئی بات کی، نہ میں کچھ بولا۔ بس

مجھے اتنا ضرور معلوم تھا کہ گاڑی ڈیفنس کی طرف جا رہی ہے۔

پھر گاڑی ایک بنگلے کے پورچ میں جارکی اور وہ لوگ مجھے دھکیلتے ہوئے ایک کمرے میں لے گئے۔ وہ ڈرائنگ روم تھا اور اس وقت وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ صفدر نے بلند آواز میں کہا۔ ''ولی خان!'' فوراً ہی ایک ملازم اندر آ گیا۔

''صاحب سے کہو ہم اسے لے آئے ہیں۔''

ولی خان سر ہلا کر وہاں سے چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد کمرے کے باہر قدموں کی آہٹ گونجی اور بارعب سا ایک آدمی اندر آ گیا۔ میں نے اس کا جائزہ لیا۔ وہ نکلتے ہوئے قد اور مضبوط ورزشی جسم کا مالک تھا۔

''کون ہو تم؟'' اشرف نے پوچھا۔ یقیناً وہ اشرف تھا۔

''یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا سر کہ میں کون ہوں؟'' میں نے جواب دیا۔

''بکواس کرے گا تو ابھی تجھے اپنے کتوں کے سامنے ڈال دوں گا، وہ لمحوں میں تیرے چیتھڑے اُڑا دیں گے۔ سچ سچ بتا تو کس کا آدمی ہے؟''

''میں کسی کا آدمی نہیں ہوں۔'' میں نے کہا۔

''صفدر! یہ ایسے نہیں مانے گا، اسے اوپر لے چلو۔''

صفدر نے بری طرح میرے بال پکڑے اور مجھے جھٹکا دے کر آگے کی طرف دھکا دیا۔ وہ لوگ مجھے اسی انداز میں اوپر لے گئے۔ اوپر والے کمرے میں فرنیچر برائے نام تھا، کونے میں صرف ایک بیڈ پڑا ہوا تھا۔ بیڈ کے نزدیک دو کرسیاں رکھی تھیں۔

''میں تجھ سے آخری دفعہ پوچھ رہا ہوں کہ تو کون ہے؟ تو ملک کا آدمی ہے نا؟''

میں نے اسے سب کچھ صاف صاف بتانے کا فیصلہ کر لیا۔ مرنا تو مجھے یوں بھی تھا بلکہ پولیس کے مطابق تو میں مر ہی چکا تھا۔ شاید اشرف ہی ڈیڈی اور بھائی جان کے لیے کچھ کر سکے۔

''اگر آپ کے پاس وقت ہو تو میں آپ کو تفصیل سے اپنے بارے میں بتا دوں، پھر فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہوگا۔ آپ مجھے اپنے ہاتھوں سے مارتے ہیں یا پولیس کے حوالے کرتے ہیں۔''

''جو کچھ کہنا ہے جلدی بک دے لیکن جھوٹ بولا تو میں واقعی اپنے کتوں کے سامنے ڈال دوں گا۔''

''آپ کو شاید یاد ہو کہ کچھ عرصہ پہلے ائرپورٹ پر کسٹم نے دو بہن بھائیوں کو گرفتار کیا تھا۔ ان پر سات کلو ہیروئن اسمگل کرنے کا الزام تھا۔'' میں نے خاموش ہو کر اس کا ردِعمل معلوم کرنے کی کوشش کی۔

''بولتا رہ، میں سن رہا ہوں۔'' اشرف نے کہا اور وہاں پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''وہ آدمی میں ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میرے ساتھ میری بہن بھی تھی۔''

اشرف اچھل پڑا۔ ''وہ نوجوان...... فراز تم ہو؟'' اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

''جی ہاں، میں ہی وہ بدقسمت ہوں۔'' میں نے کہا اور اسے شروع سے لے کر آخر تک سب کچھ بتا دیا۔ صرف ایک بات اسے نہیں بتائی کہ دوست محمد کو میں نے قتل کیا ہے۔

وہ چند لمحے کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس نے اضطراری کیفیت میں سگار ہونٹوں سے لگایا تو صفدر نے آگے بڑھ کر لائٹر سے اس کا سگار سلگا دیا۔ اشرف نے سگار کا ایک گہرا کش لیا اور غور سے مجھے دیکھنے لگا۔

''دوست محمد سے کہاں ملاقات ہوئی؟'' اس نے پوچھا۔

''سہراب گوٹھ پر۔'' میں نے کہا۔ ''میں کراچی تو آ گیا تھا لیکن سہراب گوٹھ پر اتر گیا تھا۔ وہاں سے دوست محمد صاحب گزرے تو میں نے ان سے لفٹ کی درخواست کی۔ انہوں نے گاڑی روک دی اور مجھے اپنے ساتھ بٹھا لیا، پھر وہ کچھ سوچ کر بولے۔ ''میں اس وقت خطرے میں ہوں۔ میں نے تمہیں اس لیے لفٹ دی ہے کہ میرے دشمن مجھے تنہا نہ سمجھیں۔ ہو سکتا ہے وہ مجھ پر حملہ کر دیں اور میرے ساتھ تم بھی مارے جاؤ۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے اب جینے اور مرنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''تمہارے پاس کوئی ہتھیار تو نہیں ہوگا۔ ڈیش بورڈ میں میرا اپسٹل پڑا ہے، وہ نکال لو۔''

''وہ آپ اپنے پاس رکھیں، میرے پاس ہتھیار ہے۔'' میں نے کہا اور اپنی گن نکال لی۔

وہ ہائی وے سے اتر کر سروس روڈ پر چلے گئے۔ نہ جانے وہ کہاں جا رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے اتنا کہا تھا کہ مجھے یہاں ایک بہت ضروری کام ہے بعد میں تم جہاں کہو گے وہاں تمہیں چھوڑ دوں گا۔''

ابھی ہم کچھ ہی دور گئے تھے کہ پیچھے سے ایک ڈبل کیبن پک اپ نمودار ہوئی۔ دوست محمد صاحب نے کہا۔

"شاید وہ لوگ آگئے ہیں۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر میرا بریف کیس رکھا ہے۔ اس میں میرے کچھ کاغذات اور پیسے ہیں۔ اسے میرے گھر تک پہنچا دینا۔ یہ میرا سیل فون رکھ لو۔ اس میں تمہیں میرے گھر کا نمبر مل جائے گا۔"

پھر میں نے اشرف کو وہی کہانی سنائی جو اس سے پہلے سیل فون پر سنا چکا تھا۔ شاید اس دوران میں اس نے میرا سیل فون ٹریک کرالیا تھا اور اپنے آدمی وہاں بھیج دیے تھے۔ وہ اس وقت جان بوجھ کر گفتگو کو طول دے رہا تھا تاکہ ٹریک کرنے والے آسانی سے مجھ تک پہنچ جائیں۔

"اب تم کیا چاہتے ہو؟" اشرف نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"میں اپنے باپ اور بھائی کو پولیس کے چنگل سے چھڑا کر واپس امریکا بھیجنا چاہتا ہوں۔ پھر وہ رقم دوست محمد کے گھر پہنچانا چاہتا ہوں۔ بس میری اور کوئی خواہش نہیں ہے۔ ہاں، اگر مجھے موقع ملا تو میں ان لوگوں کو عبرت ناک موت ضرور ماروں گا جنھوں نے میری بہن کی عزت پامال کی۔" میری آواز بھرا گئی۔ "چاہے اس کے بعد میں خود بھی مارا جاؤں، مجھے کوئی پروا نہیں۔ مرنا تو یوں بھی ہے، یوں بھی مرے ہوئے آدمی کا کوئی نام نہیں ہوتا۔"

"تم ملک کو جانتے ہو؟"

"میں نے آپ ہی سے اس کا نام سنا ہے۔ ممکن ہے وہ انڈر ورلڈ کا کوئی بہت بڑا ڈان ہو، میرا انڈر ورلڈ سے تعلق ہوتا تو شاید میں ملک سے بھی واقف ہوتا۔" میں نے کہا۔

"وہ لڑکا اظہر اسی کا آدمی ہے۔" اشرف نے کہا۔

"اظہر؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔

"ہاں، جسے تم سہیل سمجھ رہے ہو، وہ اظہر ہے اور اس کی ساتھی لڑکی نجمہ! ملک نے پہلے بھی کئی مرتبہ اس طریقے سے دوسروں کو استعمال کیا ہے۔ وہ خاصے معزز اور معروف لوگ تھے اس لیے پکڑے نہیں گئے۔ تمہاری بھی قسمت خراب تھی کہ تم پکڑے گئے۔ ملک کے آدمی کسٹم میں بھی ہیں اور پولیس میں بھی۔ اب یہ تمہاری بدقسمتی کہ تمہارا کیس ایسے کسٹم انسپکٹر کے پاس چلا گیا جو رشوت کے لفظ کو بھی گالی سمجھتا ہے۔ اس نے فوراً اس کیس کی رپورٹ تیار کرلی اور میڈیا کو انفارم کردیا ورنہ یہ نوبت نہ آتی۔ ملک کے آدمی تو امریکا اور لندن میں بھی موجود ہیں۔"

"لیکن اس ملک نے میری زندگی تو برباد کردی، میری بہن کو تو بے عزت کروادیا۔ مجھے اس کے مرنے کا اتنا افسوس نہیں ہے جتنا اس کے بے عزت ہونے کا ہے۔"

"تم خاصے جی دار آدمی ہو۔" اشرف نے کہا۔ "ورنہ پولیس اسٹیشن سے تو بڑے بڑے مجرم بغیر کسی مدد کے فرار نہیں ہوسکتے۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "میرے ساتھ کام کروگے؟"

"میرے پاس اور کوئی انتخاب اور اختیار بھی تو نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "بس میری ایک درخواست ہے، میرے ڈیڈی اور بھائی کو باعزت طریقے سے امریکا بھجوا دیں۔"

"ان کی تم فکر مت کرو۔" اشرف نے کہا۔ "میں آج ہی بلکہ ابھی باس سے بات کرتا ہوں۔ وہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر ان دونوں کو وہاں سے نکلوا دے گا۔"

باس کا نام سن کر میں چونکا۔ میں نے اس سے پہلے جب دوست محمد بن کر اس سے بات کی تھی تو اس نے باس کا نام لیا تھا جس پر میں نے یہ کہا تھا کہ باس سے کہو وہ مجھے کال کرے۔

"آپ کا بھی کوئی باس ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔" اشرف پہلی دفعہ مسکرایا۔ "ورنہ میری اتنی حیثیت نہیں کہ میں ملک جیسے آدمی کے سامنے ٹھہر سکوں۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "فراز! کیا میں تم پر اعتماد کرسکتا ہوں؟"

"میں نے تو سب کچھ آپ کو سچ سچ بتا دیا ہے اشرف صاحب۔" میں نے کہا۔ "اب اعتبار کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ تو آپ ہی کریں گے۔" پھر میں کچھ سوچ کر بولا۔ "ہاں، میں نے ایک جگہ غلط بیانی کی ہے۔ اس کی میں معافی چاہتا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ کل آپ کو حقیقت کا علم ہو تو آپ مجھ سے بدگمان ہوجائیں۔"

"کیسی غلط بیانی؟" اشرف نے چونک کر پوچھا۔

"دوست محمد کو میں نے گولی ماری تھی۔ اسے اس ویرانے میں لے کر بھی میں گیا تھا۔"

میری بات سن کر اشرف بے اختیار ہنسنے لگا۔ "تم واقعی سچے اور کھرے آدمی ہو اور جی دار بھی۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "مجھے ابھی تھوڑی دیر میں معلوم ہوجاتا کہ دوست محمد پر کسی نے حملہ نہیں کیا تھا پھر میرا شک تم پر ہی جاتا۔ تم یہ بھی سمجھتے ہو کہ دوست محمد میرا دوست تھا، اس کے

باوجود تم نے سچی بات بتادی۔" پھر وہ صفدر سے مخاطب ہوا۔ "صفدر! آج سے فراز ہمارے ساتھ کام کرے گا۔ اس کی ٹریننگ بھی تمہاری ذمّے داری ہے۔" پھر اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور نمبر ملا کر بولا۔ "باس! دوست محمد کا قتل ہوگیا ہے۔ اچھا، آپ کو معلوم ہے...... اسے کس نے قتل کیا ہوگا باس؟" اشرف نے یہ کہتے ہوئے میری طرف دیکھا...... "جی، میں تو یہی سمجھ رہا تھا...... اچھا...... چلیں خس کم جہاں پاک...... ہاں، باس...... مجھے ایک چھوٹا سا کام اور بھی ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ پولیس نے آج اس لڑکے کے باپ اور بھائی کو گرفتار کیا ہے جو اپنی بہن کو لے کر حوالات سے فرار ہوگیا تھا...... باس ان دونوں کو وہاں سے نکالنا ہے...... جی، باس آج ہی...... تھینک یو باس۔"

اشرف نے سیل فون کا رابطہ منقطع کر کے مجھ سے کہا۔ "لو یارہ تمہارا یہ کام تو ہو جائے گا، یوں بھی ان لوگوں پر کوئی الزام نہیں ہے، وہ امریکن شہری ہیں۔ پولیس کو شاید اندازہ نہیں ہے کہ ان دونوں کی گرفتاری سے الٹی آنتیں گلے پڑ سکتی ہیں۔"

"ایک اور بات سر۔" میں نے کہا۔ "میرے پاس جو پیسے ہیں وہ میں......"

"وہ تم رکھ لو۔" یہ کہہ کر اشرف اٹھ کھڑا ہوا۔

ایک گھنٹے بعد ہی مجھے اطلاع مل گئی کہ پولیس نے ڈیڈی اور بھائی جان کو چھوڑ دیا ہے۔

اس رات میں سکون سے لمبی تان کر سو گیا۔ ہاں، اس سے پہلے میں ہوٹل سے رقم والا بریف کیس لے آیا تھا۔

☆☆☆

صفدر واقعی اپنے کام میں ماہر تھا۔ اس کا نشانہ اتنا زبردست تھا کہ مجھے حیرت ہوتی تھی۔ اس نے پہلے مجھے ایک ہاتھ سے پسٹل چلانا سکھایا، پھر دوسرے ہاتھ سے بھی پسٹل چلانے میں ماہر کر دیا۔ شروع شروع میں مجھے بایاں ہاتھ استعمال کرتے ہوئے کچھ وقت ہوئی لیکن پھر آہستہ آہستہ میں دونوں ہاتھوں سے نشانے بازی میں طاق ہوگیا۔ مجھے صفدر کے ساتھ ٹریننگ کرتے ہوئے تین مہینے ہو چکے تھے۔

ایک دن اس نے نشانے بازی کی مشق کے بعد کہا۔ "فراز! اب تم مجھ سے اچھا نشانہ لگانے لگے ہو۔ ضرورت پڑنے پر خنجر کا استعمال بھی کر سکتے ہو اور خنجر کو پھینک کر اپنے ہدف کو نشانہ بنا سکتے ہو۔ میں جو کچھ جانتا تھا، تمہیں سکھا دیا۔"

"ابھی تم نے مجھے ایک ہاتھ سے رائفل چلانا نہیں سکھایا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"وہ کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔ ساری بات نشانے کی ہے۔ رائفل سے نشانہ لگانا تو اور بھی آسان ہے۔" صفدر مسکرا کر بولا۔

اسی شام اشرف نے مجھے بلایا اور بولا۔ "فراز، صفدر نے مجھے بتایا ہے کہ اب تم ہر طرح سے پرفیکٹ ہو۔ اب ذرا کچھ کام بھی کر لو۔ یہ کام زیادہ مشکل نہیں ہے لیکن میں تمہاری خوداعتمادی دیکھنا چاہتا ہوں۔ آج ہلٹن ہوٹل میں ملک کے دو اہم آدمیوں کی ملاقات ہو رہی ہے۔ تم ان دونوں کو اُڑا دو۔" اشرف نے یوں کہا جیسے مکھی اُڑانے کی بات کر رہا ہو۔ "وہ دونوں بہت دن بعد پاکستان آئے ہیں اور ملک کے بہت اہم آدمی ہیں۔ ان کی موت سے ملک مہینوں تک سنبھل نہیں سکے گا۔"

"میں انہیں پہچانوں گا کیسے؟" میں نے کہا۔

"روزی! یہ فراز ہے۔ ہمارا انتہائی بہترین آدمی۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "یہ روزی ہے۔ دیکھنے میں جتنی نرم و نازک ہے، اتنی ہی خطرناک ہے۔"

"ہائے۔" روزی نے مسکرا کر میری طرف ہاتھ بڑھایا۔

"ہیلو۔" میں نے اس کا نرم و نازک ہاتھ تھام لیا۔

صفدر نے میری شخصیت بھی بدل دی تھی۔ میرے چہرے پہ فرنچ کٹ داڑھی تھی۔ آنکھوں پر سنہری کمانی کا انتہائی نفیس چشمہ تھا۔ اس وقت میں سوٹ میں ملبوس تھا۔ اگر کوئی جان پہچان والا بھی ملتا تو وہ یہی سمجھتا کہ یہ فراز سے مشابہت رکھنے والا کوئی شخص ہے۔ فراز تو دنیا کی نظروں میں مر چکا تھا۔

"فراز! تم لوگ ہوٹل تک الگ الگ گاڑیوں میں جاؤ گے۔ وہاں بھی روزی تم سے علیحدہ رہ کر ان دونوں کی نشان دہی کرے گی اور لوٹ آئے گی۔ باقی کام تو تمہیں ہی کرنا ہے۔"

"میں سمجھ گیا۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"جاؤ، بیسٹ آف لک۔ میں یہ کام صفدر یا کسی اور سے بھی لے سکتا تھا لیکن وہ دونوں صفدر کو پہچانتے ہیں۔ اسے دیکھتے ہی چوکنا ہو جاتے، پھر وہ ہمارے ہاتھ نہیں لگتے۔"

"ڈونٹ وری سر۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "کوئی اتنا مشکل کام نہیں ہے۔"

میں اشرف سے رخصت ہو کر اپنی گاڑی میں آ بیٹھا۔ جدید ماڈل کی ہنڈا سٹی مجھے پچھلے ہفتے ہی اشرف نے دی تھی۔

روزی سلور گرے کلر کی ووٹز میں سوار تھی۔ میں نے اس سے آگے آگے چلنے کو کہا تھا۔ صفدر کی صحبت میں رہ کر میں بہت زیادہ محتاط ہو گیا تھا۔ گھر سے نکلتے ہی میں نے اردگرد کا جائزہ لیا تھا کہ کوئی گاڑی ہمارا تعاقب تو نہیں کر رہی ہے۔

ہم دونوں سست روی سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے آدھے گھنٹے میں ہلٹن ہوٹل پہنچ چکے تھے۔ وہ کراچی کا کوئی اعلیٰ ہوٹل نہیں تھا۔ ملک کے آدمیوں کی...... میٹنگ بھی شاید یہی سوچ کر وہاں رکھی گئی تھی کہ ایسی جگہ پر کسی کا دھیان نہیں جا سکتا لیکن باس اس سے بھی زیادہ ہوشیار تھا۔

☆☆☆

ہوٹل کے ہال میں اس وقت بہت رونق تھی۔ ہال میں سُریلے قہقہے گونج رہے تھے۔ ہر طرف حسن، رنگ، روشنی اور نور بکھرا ہوا تھا۔ ہال کے ایک کونے میں شاید کوئی پارٹی ہو رہی تھی۔ ایک ٹیبل پر بڑا سا کیک رکھا ہوا تھا اور ہوٹل کا ایک ویٹر اس کے گرد موم بتیاں سجا رہا تھا۔ تقریب کے شرکا بارہ بجنے کے انتظار میں تھے کہ ٹھیک بارہ بجتے ہی کیک کاٹا جانے والا تھا۔

مجھے ایک لمحے کو خیال آیا کہ ان بے چاروں کو کیا معلوم کہ ابھی ان کے رنگ میں بھنگ پڑنے والی ہے۔

میں روزی سے کچھ فاصلے پر تھا اور وہ بہت تیزی سے ہال کا جائزہ لے رہی تھی۔

اچانک اس کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی۔ وہ ٹہلنے والے انداز میں میرے نزدیک آئی اور کہا۔ ”کونے والی ٹیبل پر بلیو سوٹ میں ملبوس گنجا اور اس کے ساتھ سفاری سوٹ میں ملبوس گھنی مونچھوں والا۔“ یہ کہہ کر وہ لہراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

میں نے ان دونوں کو غور سے دیکھا۔ وہ اپنے حلیے اور چہرے مہرے سے کسی ملٹی نیشنل کمپنی کے ایگزیکٹو یا اعلیٰ بینکرز لگتے تھے۔ ان کے سامنے ٹیبل پر نفیس سا ایک بریف کیس رکھا ہوا تھا اور وہ دونوں بے تکلفی میں مصروف تھے لیکن ان کی نظریں اردگرد کا جائزہ بھی لے رہی تھیں۔

میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور کو محسوس کیا پھر آہستہ آہستہ ان کی ٹیبل کی طرف بڑھنے لگا۔

مجھے اس طرف بڑھتا دیکھ کر اردگرد کی میزوں پر بیٹھے ہوئے دو آدمیوں نے گھور کر دیکھا۔ میں ان کے انداز سے سمجھ گیا کہ وہ بھی ملک کے آدمی ہیں اور مجھے ان دونوں کی طرف بڑھتا دیکھ کر چوکنے ہو گئے ہیں۔ میں ٹہلتا ہوا مزید آگے بڑھا۔

اسی وقت مجھے ایک ویٹر نظر آیا جو مشروبات کی ٹرے اٹھائے سامنے سے آ رہا تھا۔ میں مزید آگے بڑھا اور جب وہ ویٹر اُن کی ٹیبل کے نزدیک پہنچا تو میں نے اپنا پیر اڑا دیا۔ ویٹر کا توازن بگڑا اور وہ ٹرے سمیت ان دونوں کی ٹیبل پر گرا۔ وہ دونوں اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ ویٹر ”سوری سر، سوری سر“ کی گردان کر رہا تھا۔

ان میں سے گنجا چیخ کر بولا۔ ”جاہل آدمی تم نے میرے اتنے قیمتی سوٹ کا ستیاناس کر دیا۔“

میں نے اچانک ریوالور نکالا اور برق رفتاری سے لگاتار دو فائر کر دیے۔

فائر بے آواز تھے لیکن اُن کے نزدیک کھڑے ہوئے مرد اور عورتوں نے ان کے جسم سے خون نکلتے اور پھر انہیں گرتے دیکھا تو وہاں ایک چیخ پکار مچ گئی۔

اچانک میری پشت پر فائر کی آواز گونجی اور میں نے ایک آدمی کو گرتے دیکھا۔ میں فوراً ہی فرش پر لیٹ گیا اور پلٹ کر ان دو افراد کو ایک ساتھ نشانہ بنا دیا جو مجھ پر فائرنگ کی تیاری کر رہے تھے۔ میں نے پہلی دفعہ عملی طور پر اپنے دونوں ہاتھوں سے ٹھیک نشانہ لگایا تھا۔ ماؤزر کی گولیاں ان دونوں کی کھوپڑی اُڑاتی ہوئی نکل گئی تھیں۔

پھر وہاں بھگدڑ مچ گئی اور گھپ اندھیرا ہو گیا۔ کسی نے مین سوئچ آف کر دیا تھا یا پھر فیوز اڑا دیا تھا۔ میں پھرتی سے کھڑا ہوا اور اپنی جگہ بدل لی۔ میں چاہتا تو اس اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر نکل جاتا لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ مین سوئچ آف کرنے والے دوست ہیں یا دشمن؟ اگر وہ دشمن ہوتے تو یقینی طور پر باہر گھات لگائے بیٹھے ہوتے اور میرے باہر نکلتے ہی گولیوں سے مجھے چھلنی کر دیتے۔

میں اندازے سے اس ٹیبل کی طرف بڑھا جس پر کیک رکھا تھا۔ میں نے کیک پر ہاتھ مارا اور اس کی کریم اپنے چہرے پر مل لی تا کہ لائٹ آن ہونے کے بعد مجھے پہچانا نہ جا سکے۔ پھر میں نے مزید دو تین لڑکیوں اور مردوں کے چہروں پر بھی یہی کارروائی کی اور وہاں سے ہٹ گیا۔

اسی وقت لائٹ آن ہو گئی۔ لوگ اب بھی خوف زدہ ہو کر باہر کی طرف بھاگ رہے تھے۔

اچانک کچھ لوگ وہاں چلنے لگے۔ وہ ان لوگوں کے

چہرے پر کچھ کراہس رہے تھے جن کے چہروں پر میں نے کریم ملی تھی۔ ہنسنے والوں میں، میں بھی شامل تھا۔ پھر میں ہنستا ہوا واش روم کی طرف گھوما اور منہ دھو کر اسے ٹشو پیپر سے خشک کر رہا تھا کہ پیچھے سے کوئی غرا کر بولا۔ ”اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔ اپنے دونوں ہاتھ دیوار سے لگا کر کھڑے ہو جاؤ۔“

اچانک پیچھے سے کھٹاک کی آواز سنائی دی اور ایک اذیت ناک کراہ ابھری۔ میں نے گھوم کر دیکھا روزی نے پسٹل کے دستے سے اس شخص کے سر پر وار کیا تھا جس نے مجھے دھمکی دی تھی۔

”اب نکلو یہاں سے۔“ روزی نے کہا اور واپس چلی گئی۔

میں واش روم سے نکلا اور محتاط انداز میں اردگرد دیکھتا ہوا باہر نکل گیا۔ باہر بھی میدان صاف تھا۔ میں نے اپنی گاڑی ایسے زاویے سے پارک کی تھی کہ ایمرجنسی کی صورت میں فوری طور پر نکلا جا سکے۔ میں نے دیکھا، مجھ سے کچھ فاصلے پر روزی کی گاڑی پارک تھی لیکن ایک دوسری گاڑی کی وجہ سے اس کا راستہ مسدود ہو گیا تھا۔

میں نے گاڑی ریورس کی۔ تو روزی اچانک میرے سامنے آگئی۔ میں نے پسنجر سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ وہ جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اسی وقت مجھے دور سے سائرن کی آواز سنائی دی۔ وہ یقینی طور پر کسی ایمبولینس کا سائرن تھا۔ پولیس سے تو یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی وہاں پہنچ جائے گی۔ میں نے گاڑی اطمینان سے نکالی اور مین روڈ پر آ کر اس کی رفتار یک دم بڑھا دی۔ روزی مسلسل پیچھے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ مطمئن ہو کر سیٹ پر ڈھیر ہو گئی۔

”اتنی سی بھاگ دوڑ سے نڈھال ہو گئیں؟“ میں نے اس سے کہا۔

”اتنی سی بھاگ دوڑ۔ میری نظر عین وقت پر اس شخص پر پڑ گئی۔ وہ تم پر فائر کرنے ہی والا تھا۔ اگر میں ایک لمحے کو بھی چوک جاتی تو اس وقت تم بھی ان لاشوں کے درمیان پڑے ہوتے۔“

”تھینک یو۔“ میں نے کہا۔ ”میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ......“

”فراز پلیز! اپنی آنکھیں اور کان دونوں کھلے رکھو گے تو کامیاب رہو گے۔“

”میں تمہارا احسان مند ہوں کہ......“

”فراز پلیز۔“ روزی نے جھلا کر کہا۔ ”تم اگر مجھے دوست سمجھتے ہو تو آئندہ یہ شکر گزار، احسان مندی وغیرہ جیسے الفاظ استعمال مت کرنا۔“

اشرف میری اس کامیابی پر بہت خوش تھا۔ اس نے مجھے اور روزی کو اس موقع پر خصوصی انعام دیا اور کہا کہ اگر اسی طرح کام کرتے رہے تو تم بہت آگے جاؤ گے۔

میں سوچنے لگا کہ یہ اس کی دعا ہے یا بددعا۔ بہت آگے جانے کا مطلب یہ تھا کہ میں مزید خون خرابا کروں گا۔

پھر میں نے چن چن کر ملک کے خاص آدمیوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ مجھے تو اپنی موت کی پروا تھی نہیں اور جن لوگوں کو موت کی پروا نہ ہو، وہ ہمیشہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رہتے ہیں۔

روزی البتہ مجھے سمجھاتی رہتی تھی کہ ”فضول میں اپنی جان خطرے میں ڈالنا بہادری نہیں بلکہ بے وقوفی ہے۔ تم اب اشرف صاحب اور باس کے لیے بہت اہم ہو۔ ذرا احتیاط کیا کرو۔“

”میں احتیاط ہی تو کرتا ہوں ورنہ اب تک تو میں پورے شہر کو الٹ پلٹ کر چکا ہوتا۔“

روزی میرے بہت نزدیک آگئی تھی۔ لیکن مجھے اس سے بس اتنی دلچسپی تھی کہ وہ میری دوست اور بہترین ساتھی تھی۔ کئی موقعوں پر اس نے میری جان بچائی تھی۔ میں اس کا احسان مند تھا۔ میں نے بھی کئی دفعہ اس کی جان بچا کر یہ قرض ادا کرنے کی کوشش کی تھی۔

ایک دن میں اور روزی سی سائیڈ پر ٹہل رہے تھے۔ وہاں بھی میں روزی کے مجبور کرنے پر جاتا تھا۔ مجھے اب کسی تفریح سے دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ روزی کو البتہ سمندر سے عشق تھا۔ وہ ہفتے میں ایک دفعہ سی سائیڈ پر ضرور جاتی تھی۔ وہاں بھی ہمیں چوکنا رہنا پڑتا تھا کہ نہ جانے کب کس کی گولی ہمیں چاٹ جائے۔

اچانک ایک شخص پر میری نظر پڑی تو میں اچھل پڑا۔ وہ سہیل تھا، وہی سہیل جس کی وجہ سے آج میں اس حال کو پہنچا تھا۔ جس نے ہیروئن سے بھرا ہوا سوٹ کیس عین وقت پر میرے حوالے کیا تھا۔ اس کے ساتھ وہ لڑکی بھی تھی جس کا نام مینا تھا۔

میں بپھر کر کھڑا ہو گیا۔ میرے ذہن میں دھماکے سے ہو رہے تھے اور ہر طرف خون ہی خون نظر آ رہا تھا۔

روزی نے میری بدلتی ہوئی حالت دیکھی تو وہ بھی چونک اٹھی۔ ”کیا بات ہے فراز؟“ اس نے پوچھا اور اس

سمت دیکھنے لگی جہاں سہیل اور ٹینا بیٹھے تھے۔
"کون ہیں یہ لوگ؟" روزی نے پوچھا۔
"ان ہی دونوں نے میری زندگی برباد کی تھی روزی۔" میں نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ان کی وجہ سے میں نے اپنی لاڈلی بہن کو کھویا، اس کی عزت پامال ہوئی۔ میرے فرشتہ صفت باپ اور سیدھے سادے بھائی کو لاک اَپ میں تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔"
روزی نے اپنی پنڈلی سے بندھا ہوا پسٹل نکال لیا اور بولی۔ "تو پھر انتظار کس بات کا ہے۔ انہیں یہیں ٹھنڈا کر دو۔ یہاں اس وقت اتنی بھیڑ بھاڑ بھی نہیں ہے۔ میں پسٹل پر سائیلنسر فٹ کر لیتی ہوں۔ کسی کو معلوم بھی نہ ہوگا کہ وہ دونوں بیٹھے بیٹھے اچانک کیسے گر گئے۔" روزی نے گن پر سائیلنسر فٹ کرتے ہوئے کہا۔
"نہیں روزی۔" میں نے کہا۔ "میں انہیں اتنی آسان موت نہیں ماروں گا، بلکہ تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔" میں نے سفاک لہجے میں کہا۔
"پھر اب کیا چاہتے ہو؟" روزی نے پوچھا۔
"میں ان دونوں کو زندہ پکڑ کے اپنے ٹھکانے پر لے جانا چاہتا ہوں۔"
ساحل پر اس وقت برائے نام لوگ تھے۔ وہ بھی ایسے جوڑے جو محبت کی پیاس بجھانے وہاں آئے تھے۔
"تم گاڑی کی طرف چلو، میں انہیں وہیں لاؤں گی۔"
"نہیں روزی! میں اس موقع کو گنوانا نہیں چاہتا۔ میں بھی تمہارے ساتھ رہوں گا لیکن کچھ فاصلے پر۔"
روزی نے شانے اُچکائے۔ میں روزی سے کچھ فاصلے پر ریت پر بیٹھ گیا۔ وہ لہراتی ہوئی سہیل کے سامنے پہنچی اور بہت ادا سے بال پیچھے کی طرف جھٹک کر بولی۔
"ایکسکیوزمی، آپ میری کچھ ہیلپ کر سکتے ہیں؟"
"کیسی ہیلپ؟" ٹینا نے سرد لہجے میں پوچھا۔
"میری گاڑی اسٹارٹ نہیں ہو رہی ہے، کیا آپ......"
"یہ تمہیں مکینک لگ رہے ہیں؟" ٹینا نے ناگواری سے کہا۔ "جاؤ کسی مکینک سے رابطہ کرو۔ وہ بتا سکتا ہے کہ گاڑی میں کیا خرابی ہے؟" پھر وہ ترخ کر بولی۔ "اور ہیلپ کے لیے تمہیں ہم ہی نظر آئے تھے؟"
"اس کی بھی ایک خاص وجہ ہے۔" روزی نے مسکرا کر کہا۔ "میں چاہتی ہوں کہ یہ میری ہیلپ کریں ورنہ آپ کو بھی کوئی ہیلپ کرنے والا نہیں ملے گا۔"
"کیا مطلب؟" سہیل نے کہا اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈالنا چاہا۔
"نو۔" روزی نے اسے جھڑک دیا۔ "اپنے دونوں ہاتھ باہر رکھو ورنہ......"
اس نے پلک جھپکتے میں گن نکال لی۔
"کون ہو تم؟" سہیل کے لہجے میں خوف آمیز حیرت تھی۔
"اٹھو۔" روزی نے درشت لہجے میں کہا۔ "تمہیں سب معلوم ہو جائے گا کہ میں کون ہوں اور......"
اچانک سہیل نے روزی کے گن والے ہاتھ پر بیٹھے بیٹھے لات ماری۔ اس کی گن اچھل کر دور جا گری۔ سہیل نے فوراً ہی اپنی گن نکال لی اور بولا۔ "اب بتاؤ، تم کون ہو؟"
"میں؟" روزی مسکرائی۔ "تمہیں نظر نہیں آ رہا کہ میں کون ہوں؟"
"سیدھی طرح میری بات کا جواب دو ورنہ تمہاری لاش بھی کل سے پہلے کسی کو نظر نہیں آئے گی۔"
میں اچانک اپنی جگہ سے اٹھا اور دبے پاؤں سہیل کے سر پر پہنچ گیا۔ "اپنی گن پھینک دو ورنہ میں تمہاری کھوپڑی اُڑا دوں گا۔ تم ایک لڑکی کو تنہا سمجھ کر اسے دھمکا رہے ہو۔"
سہیل اپنی جگہ پر ساکت رہ گیا۔ اس نے اپنی گن ریت پر پھینک دی۔ روزی نے لپک کر اسے اٹھا لیا اور بولی۔ "چلو، اب باتیں بہت ہو گئیں۔ مجھے واقعی تمہاری ہیلپ کی ضرورت ہے۔"
"اچھا، اپنے نخرے تم خود ہی نمٹاؤ۔" ٹینا نے کہا۔ "میں چلتی ہوں۔" وہ کپڑے جھاڑ کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔
"بکو مت۔" روزی نے آگے بڑھ کر ٹینا کے منہ پر ایک تھپڑ مارا اور بولی۔ "تم بھی ہمارے ساتھ چلو گی۔ تمہارے بغیر تو کھیل ادھورا رہے گا۔"
ہم ان دونوں کو اپنی گاڑی تک لائے۔ میں نے جیکٹ کی جیب میں سے گن سہیل کے پہلو میں اڑا رکھی تھی لیکن میرا انداز ایسا تھا جیسے دو بے تکلف دوست ہنستے بولتے جا رہے ہوں۔ ٹینا کو روزی نے کور کر رکھا تھا۔

☆☆☆

میں نے سہیل یا اظہر یا جو بھی اس کا نام تھا، اسے اس کمرے میں بند کر دیا جس میں پہلی دفعہ مجھے صفدر نے بند کیا

تھا۔

ٹینا کو ایک علیحدہ کمرے میں رکھا تھا۔

میں کمرے میں داخل ہوا تو میرے ہاتھ میں چمڑے کا ہنٹر تھا۔ میں نے کچھ کہے بغیر تابڑ توڑ اس کے جسم پر ہنٹروں کی بارش کر دی۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے اور جسم سے خون رسنے لگا۔ وہ نڈھال ہو کر بیڈ پر گر گیا اور ہانپتے ہوئے بولا۔ ''آخر تم ہو کون اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''مجھے غور سے دیکھو۔'' میں نے اس کے جسم پر ہنٹر مارتے ہوئے کہا۔ ''میں فراز ہوں۔''

''کون فراز؟'' وہ الجھ کر بولا۔

''تو مجھے اتنی جلدی بھول گیا۔ میرے سامان میں ہیروئن سے بھرا ہوا بیگ تو نے ہی رکھا تھا نا؟''

''ف...... فراز...... لیکن...... تم...... تو......''

''مر چکا ہوں۔'' یہی کہے گا نا؟ ہاں، میں مر چکا ہوں۔ اس فراز کو تو میں نے ایک عرصہ پہلے دفن کر دیا۔ میں اس کا بھوت ہوں۔''

''مجھے توقع نہیں تھی کہ تمہارے ساتھ یہ سلوک ہو گا۔'' سہیل جلدی سے بولا۔ ''مجھ سے کہا گیا تھا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ کسٹم اور پولیس میں ہر جگہ اپنے آدمی ہیں...... لیکن...... اس کسٹم آفیسر شہریار کی وجہ سے سب کچھ الٹ ہو گیا۔''

''میں تیری وضاحتیں سننے کے لیے یہاں نہیں لایا ہوں۔'' میں نے دہاڑ کر کہا۔ ''مجھے صرف یہ بتا دے کہ تو نے میرے ہی ساتھ ایسا کیوں کیا؟''

''ٹینا، روبی کو جانتی تھی۔'' سہیل نے کہا۔ ''پھر مجھ سے بھی یہی کہا گیا تھا کہ وہ سوٹ کیس تمہارے ذریعے بھیج دوں۔''

''وہاں اس سوٹ کیس کو کون ریسیو کرتا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ میں نہیں جانتا۔'' سہیل نے کہا۔

''تجھ سے کس نے کہا تھا کہ وہ سوٹ کیس میرے ذریعے امریکا بھیجنا ہے؟''

''مجھ سے ملک صاحب نے کہا تھا۔''

''ملک، ملک، ملک......'' میں ہنستا کر بولا۔ ''کون ہے یہ ملک اور کہاں رہتا ہے؟'' میں نے دہاڑ کر کہا۔

''یہ میں نہیں جانتا۔ میں کیا ملک کا کوئی آدمی بھی نہیں جانتا کہ ملک کون ہے اور کہاں رہتا ہے۔''

''تیرا رابطہ کیسے ہوتا ہے اس سے؟'' میں نے پوچھا۔

''ایس ایس پی درانی کے ذریعے۔'' اس نے کہا۔ ''یہ پلان درانی صاحب ہی کا تھا لیکن انہیں بھی حکم ملک کی طرف سے ملا تھا۔'' سہیل سانس لینے کو رکا، پھر بولا۔ ''درانی صاحب نے کہا تھا کہ اول تو وہ دونوں بہن بھائی بلا کسی روک ٹوک کے نکل جائیں گے اور اگر پکڑے بھی گئے تو محض خانہ پُری کے بعد انہیں اگلی فلائٹ سے روانہ کر دیا جائے گا۔ ہر جگہ اپنے آدمی ہیں۔''

''لیکن پھر ہوا کیا؟'' میں نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔

''اب یہ تمہاری بیڈ لک تھی کہ اس دن غیر متوقع طور پر کسٹم کے اسسٹنٹ کلکٹر شہریار کی ڈیوٹی لگ گئی۔ شہریار کے بارے میں مشہور تھا کہ اگر اس کا باپ بھی کسی غیر قانونی کام میں ملوث ہوگا تو وہ اسے کسی قیمت پر نہیں چھوڑے گا۔ شہریار کی وجہ سے تمہارا کیس ریکارڈ میں آ گیا۔ ملک صاحب نے اسے ہر قسم کی دھمکی، لالچ، مراعات بھی کچھ دینے کا فیصلہ کیا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ درانی صاحب کا خیال تھا کہ دو چار روز میں تم لوگوں کو ضمانت پر رہا کرا کے امریکا بھجوا دیا جائے گا لیکن تم نے کچھ زیادہ ہی جلد بازی کا مظاہرہ کر دیا اور......''

میں نے اس کے جسم پر پوری قوت سے ہنٹر رسید کر دیا۔ وہ تڑپ کر رہ گیا۔ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''روبی کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ بھی درانی کے پروگرام میں شامل تھا؟''

''اس بارے میں مجھے کچھ علم نہیں۔'' سہیل نے ہنٹر کے تازہ زخم کو سہلاتے ہوئے کہا جس میں سے خون رسنے لگا تھا۔ ''اس کا جواب درانی صاحب ہی دے سکتے ہیں۔''

''تو پھر اب تیرا یہاں کیا کام؟'' میں نے ایک دم پسٹل نکال لیا۔

''دیکھو پلیز، مجھے مارنا مت۔'' سہیل گڑگڑایا۔ ''میں نے تمہیں سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہے اب تو......''

''ٹھہرو فراز!'' صفدر نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

سہیل نے ممنونیت سے صفدر کو دیکھا اور بولا۔ ''آپ ہی اسے سمجھائیں۔ یہ اس وقت غصے میں پاگل ہو رہا ہے۔''

''میں اسے یہی سمجھانے آیا ہوں۔'' صفدر نے کہا۔ ''اپنے ہاتھ اس کے خون سے گندے کرنے کے بجائے اسے کتوں کے سامنے ڈال دو۔ وہ کل سے بھوکے ہیں۔''

"نہیں۔" نبیل چیخا۔ "ایسا مت کرنا ورنہ درانی صاحب......"

"بھاڑ میں گیا درانی۔" میں نے کہا۔ "کھڑا ہو جا۔"

"پلیز......فراز...... مجھ پر رحم کرو۔"

"تو نے مجھ پر رحم کھایا تھا، میری معصوم بہن پر رحم کھایا تھا؟" میں نے پشت سے اس کی گردن پکڑ کے باہر کی طرف دھکیلا۔ "ہاں، اگر تو یہ بتا دے کہ ملک کون ہے تو میں تجھے معاف کر دوں گا۔"

"جب میں ایک بات جانتا ہی نہیں تو کیسے بتا سکتا ہوں؟" وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔ "ولی خان۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔ ولی خان فوراً ہی چراغ کے جن کی طرح کوریڈور میں نمودار ہوا۔ "اسے کتوں کے سامنے پھینک دو۔"

میں وہاں سے اٹھ کر ٹینا کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ سہمی ہوئی سی کرسی پر بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ بوکھلا کر کھڑی ہو گئی۔

"تمہارا نام ٹینا ہے یا ارم؟" میں نے اکھڑے لہجے میں پوچھا۔

"میرا نام تو طاہرہ ہے، ٹینا میرا نک نیم ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"اور ارم؟......ارم کون ہے؟"

"کون ارم؟" اس نے ناگواری سے میری طرف دیکھا۔

میں نے اچانک اس کے خوب صورت بال مٹھی میں جکڑ لیے اور اس کے منہ پر زناٹے دار تھپڑ رسید کر دیا۔ "اُلّو کی پٹھی، مجھ سے پوچھ رہی ہے کہ کون ارم؟" اگر اس کے بال میری مٹھی میں نہ ہوتے تو وہ میرے تھپڑ سے پیچھے کی طرف الٹ گئی ہوتی۔ "تو ارم کو نہیں جانتی؟" میں چیخ کر بولا۔

"دیکھو مسٹر!" وہ سنبھل کر بولی۔ "میں کوئی معمولی لڑکی یا کال گرل نہیں ہوں۔ تمہیں اپنے کیے کی قیمت چکانا پڑے گی۔" وہ یوں بولی جیسے وہ پرائم منسٹر کی بیٹی ہو۔

"تو تو کال گرل سے بھی بدتر ہے گھٹیا عورت۔" میں بپھر کر بولا۔ "میں تیرا فیملی بیک گراؤنڈ بھی جانتا ہوں اور تجھے بھی بہت اچھی طرح جانتا ہوں لیکن تو شاید مجھے نہیں جانتی۔" میں نے بپھرے ہوئے انداز میں کہا۔ "تو روبی سے کس نام سے ملی تھی؟" میں نے پوچھا۔ "اب تو کہے گی کون روبی؟"

اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں لیکن اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔

"ہاں، میں روبی سے اسی نام سے ملی تھی لیکن وہ میری مجبوری تھی۔"

"ہمارے سامان میں ہیروئن سے بھرا ہوا سوٹ کیس رکھنا بھی تیری مجبوری تھی؟"

"ہیروئن، سوٹ کیس......" وہ الجھ کر بولی۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

میں نے پھر اس کے بال پکڑ کے ایک جھٹکا دیا اور اپنی کمر کے گرد بندھا ہوا ہنٹر کھول لیا۔

"اس لڑکے سے تیرا کیا رشتہ ہے جس کے ساتھ تو ساحل پر بیٹھی تھی؟"

"وہ میرا دوست ہے۔"

"تم دونوں کس کے لیے کام کرتے ہو؟"

ٹینا اپنا جسم سہلا رہی تھی۔ "جھوٹ بولا تو ہنٹر مار مار کے تیری کھال اتار دوں گا۔"

"میں ملک صاحب کے لیے کام کرتی ہوں۔"

"کیسا کام؟" میں نے پوچھا۔

"میں اکثر پشاور اور کراچی کے درمیان چکر لگاتی ہوں۔ اور پشاور سے ہیروئن اور کراچی سے رقم لے جاتی ہوں۔" ایک ہنٹر کھاتے ہی ٹینا ریکارڈر کی طرح بجنے لگی تھی۔

میں نے کہا۔ "تو جانتی ہے کہ پولیس والوں نے روبی کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟"

"مجھے اس بات کا دلی دکھ ہے۔" اس نے کہا۔ "لیکن اس میں صرف پولیس والے ہی شریک نہیں تھے بلکہ کسٹم کا ایک اعلیٰ افسر بھی تھا۔"

"شہریار؟" میں چونک کر بولا۔

"شہریار تو اس حرکت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس بے چارے کو تو ان لوگوں نے غبن اور رشوت کے الزام لگا کر جیل بھجوا دیا ہے۔"

"کسٹم کے اس افسر کا نام بتاؤ۔" میں نے سلگتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"اس کا نام احسان الحق ہے۔" ٹینا نے کہا۔

"تم جانتی ہو کہ میں نے تمہارے دوست کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟"

"کیا، کیا ہے؟" وہ چونک کر بولی۔

"میرے خونخوار کتوں نے اس کی بوٹی بوٹی کر دی

ہے۔'' میں نے سفاک لہجے میں کہا۔

''نہیں۔'' ارم خوف زدہ ہو کر بولی۔

''میرا دل تو چاہ رہا ہے کہ تمہارے ساتھ بھی وہی سلوک کروں جو تھانے میں روبی کے ساتھ ہوا تھا لیکن میں ان لوگوں کی طرح گھٹیا نہیں ہوں مگر اتنا فرشتہ بھی نہیں ہوں کہ تمہیں زندہ چھوڑ دوں۔''

''تم ایسا کچھ نہیں کر سکتے۔'' وہ کھوکھلے لہجے میں بولی۔ ''درانی تمہاری کھال اتار کر اس میں بھس بھروا دے گا۔'' وہ ہذیانی لہجے میں بولی۔ ''وہ مجھے اتنا ہی چاہتا ہے۔''

میں نے اس کے جسم پر ہنٹر کی زوردار ضرب لگائی۔ وہ تڑپ اٹھی اور اس کی سریلی چیخ گونج کر رہ گئی۔

''یہ گھر آبادی سے بہت دور ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہاں تم گلا پھاڑ کر بھی چیخو تو کوئی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا۔'' پھر میں نے اس پر پے درپے کئی ہنٹر برسا دیے۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹ گیا اور جسم سے خون رسنے لگا۔

''ذلیل آدمی۔'' وہ کراہ کر بولی۔ ''تو مجھے گولی کیوں نہیں مار دیتا؟''

میں نے پھر ہنٹر چلانا شروع کر دیا۔ وہ بری طرح تڑپتی رہی، چیختی رہی لیکن میری آنکھوں کے سامنے روبی کا تار تار لباس اور لہولہو جسم تھا، اس کی ویران آنکھیں تھیں۔ مجھ پر گویا ایک جنون طاری ہو گیا اور میں اس پر ہنٹر برساتا چلا گیا۔

اچانک کسی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ روزی تھی۔ اس نے کہا۔ ''ہوش میں آؤ فراز! اب یہ مرچکی ہے۔''

میرا ہاتھ رک گیا۔ ثمینا کا بکھرا ہوا وجود فرش پر پڑا تھا۔ اگر روزی مجھے نہ روکتی تو نہ جانے میں کب تک یونہی اس پر ہنٹر برساتا رہتا۔

اس وقت صفدر بھی کمرے میں آ گیا اور روزی سے بولا۔ ''فراز کو یہاں سے باہر لے جاؤ۔''

میں نے اتنی بے دردی سے ثمینا کو مارا تھا کہ میری سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔

میرا دوسرا شکار کسٹم کا اعلیٰ افسر احسان الحق تھا۔ وہ بہت گھاگ آدمی تھا۔ اپنے ساتھ گارڈ رکھتا تھا اور یوں آسانی سے ہاتھ آنے والا نہیں تھا۔ لیکن میں اس کے بارے میں تمام تر معلومات حاصل کر چکا تھا۔

میں ایک دن ایسے وقت میں اس کے گھر پہنچا جب وہ گھر میں موجود نہیں تھا۔ گیٹ پر گارڈ موجود تھا۔ اس نے میری گاڑی اور حلیہ دیکھ کر بہت مؤدب لہجے میں پوچھا۔ ''جی سر! کس سے ملنا ہے؟''

''مجھے حق صاحب سے ملنا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''میں لاہور سے آیا ہوں؟''

''صاحب تو اس وقت موجود نہیں ہیں۔'' گارڈ نے کہا۔ ''لیکن وہ پندرہ بیس منٹ میں آنے والے ہیں۔''

''ٹھیک ہے میں پھر آ جاؤں گا۔'' میں نے کہا اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔

''ایک منٹ سر۔'' گارڈ نے کہا۔ ''اپنا نام تو بتا دیں۔''

اسی وقت اندر سے کسی کی آواز آئی۔ ''کون ہے اللہ یار؟'' بولنے والی کی آواز مترنم تھی۔

''میڈم! کوئی صاحب لاہور سے آئے ہیں، وہ صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''ارے تو انہیں اندر بلاؤ، تم نے انہیں دروازے سے چلتا کر دیا؟'' گارڈ نے گیٹ کھول دیا اور بولا۔ ''سر! آپ اندر تشریف لے آئیں۔''

میں نے گاڑی لاک کر کے قدم اندر بڑھا دیے۔ پورچ میں جدید ماڈل کی پراڈو کھڑی تھی اور برآمدے میں خاصی حسین عورت کھڑی تھی۔ اس کا جسم فربہی مائل تھا لیکن اس سے اس کے حسن پر کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

میں نے نظریں نیچی کر کے اسے سلام کیا۔ اس نے جواب دیا اور بولی۔ ''سوری، آپ کو زحمت ہوئی۔ دراصل یہ گارڈ لکیر کے فقیر ہوتے ہیں۔ انہیں یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کسے اندر بلانا ہے اور کسے باہر سے ٹالنا ہے۔''

''آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں اس قسم کے لوگوں میں سے ہوں؟'' میں نے مسکرا کر اس کی خوب صورت آنکھوں میں جھانکا۔

''آپ کو شاید علم نہیں ہے کہ باہر سی سی ٹی وی کیمرا لگا ہے۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''میں نے اسی کیمرے میں آپ کو دیکھا تھا۔''

''اور آپ کو اندازہ ہو گیا کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جنہیں اندر بلا لینا چاہیے؟''

''ہاں، آپ کی پرسنالٹی اتنی ہی ڈیشنگ ہے۔'' اس نے توصیفی انداز میں کہا۔

''میں خود بھی بہت ڈیشنگ ہوں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

اسی وقت اس کے سیل فون کی بیل بجی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''ایکسکیوزمی!'' پھر اس نے سیل فون کان سے لگا

لیا۔ ”ہیلو...... ہاں احسان...... کب تک...... دیر ہو جائے گی...... اور وہ ڈنر کا پروگرام...... شٹ...... اچھا سنو...... وہ...... ہیلو...... ہیلو۔“ اس نے غصے میں سیل فون صوفے پر اچھال دیا اور بولی۔ ”سوری، وہ اصل میں احسان کا ٹیلی فون تھا۔“

میں چونکا اور سوچا شاید احسان آرہا ہے۔ میں اسے بہت آسانی سے ٹھکانے لگا سکتا تھا۔

”احسان صاحب کی کال تھی؟“ میں نے پوچھا۔ ”کیا کہہ رہے تھے؟“

”کہہ رہے تھے کہ میں رات کو دیر سے آؤں گا۔“ اس نے جلے کٹے انداز میں کہا۔

”آپ نے انہیں میرے بارے میں تو بتایا ہی نہیں؟“

”وہ سنتے ہی کب ہیں۔ آج کئی ہفتے بعد ہم نے باہر کھانے کا پروگرام بنایا تھا لیکن......“ پھر وہ چونک کر بولی۔ ”میں انہیں آپ کے بارے میں تو بتا دوں۔“ اس نے سیل فون اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”کیا نام ہے آپ کا؟“ وہ نمبر پش کرتے ہوئے بولی۔

”احتشام۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں لاہور سے آیا ہوں۔“

اس نے احسان کا نمبر ملا کر سیل فون کان سے لگایا پھر جھنجلا کر بولی۔ ”موصوف نے اپنا سیل آف کر دیا ہے۔ وہی منحوس ریکارڈنگ سنائی دے رہی ہے کہ آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت بند ہے۔“

میں نے مایوسی کا مظاہرہ کیا اور بولا۔ ”او کے مسز احسان! آپ کو زحمت دینے کی معذرت چاہتا ہوں۔“ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ”مجھے اب اجازت دیں۔“

”ایسے کیسے اجازت دوں۔“ وہ یوں بے تکلفی سے بولی جیسے مجھے برسوں سے جانتی ہو۔ ”آپ کھانا کھائے بغیر نہیں جائیں گے۔“

”لیکن آپ تو ڈنر باہر کرنے والی تھیں؟“ میں نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”جب وہ آ ہی نہیں رہے تو کیسا ڈنر اور کہاں کا ڈنر؟“ وہ پھر جلے کٹے انداز میں بولی۔ ”ڈنر تو اب آپ یہاں کریں گے۔“

”میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اگر آپ برا نہ مانیں تو۔“

”کیسا آئیڈیا؟“ اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

”اگر میں آپ کو ڈنر آفر کروں تو؟“

”کیا مطلب؟“ وہ سنجیدہ ہو گئی۔

”مطلب یہ کہ آپ مجھے ڈنر کے لیے روک رہی ہیں نا، یہی ڈنر اگر ہم باہر کرلیں تو...... بُرا مت مانیے گا۔ یہ صرف ایک آئیڈیا ہے۔ اگر آپ انکار کر دیں گی تب بھی میں مائنڈ نہیں کروں گا۔“

”میں بُرا تو نہیں مان رہی لیکن آپ کے ساتھ باہر نہیں جا سکتی ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”میں باہر جاؤں گی تو میرے پیچھے پیچھے دو گارڈز بھی ہوں گے۔“

”اوہ...... میں سمجھا۔“ میں نے کہا۔ ”گارڈ کیا ہر وقت یہاں موجود رہتے ہیں؟“ میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

”ظاہر ہے، دو گارڈز تو مستقل یہاں رہتے ہیں۔“

”میں احسان صاحب کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ انہیں آپ پر اعتبار نہیں ہے۔“

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ”انہیں مجھ پر اعتبار ہے۔ گارڈز تو میری حفاظت کے لیے ہیں۔ آج کل انہیں کچھ زیادہ ہی دھمکیاں مل رہی ہیں۔“

”پھر تو کوئی پرابلم ہی نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”گارڈز آپ کو کہیں جانے سے روکیں گے تو نہیں؟“

”ان کی کیا مجال کہ مجھے روک سکیں۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔

”مسز احسان...... میں......“

”میرا نام صفیہ ہے احتشام۔“ اس نے مجھے عجیب انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

میں ذہن میں ایک اور پلان ترتیب دے رہا تھا کہ صفیہ کو یہاں سے لے جاؤں اور اسے یرغمال بنا کر احسان کو شکار کروں لیکن یہ پلان کچھ زیادہ ہی طویل ہو جاتا۔ میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں تھا۔ اشرف کے بھی ایک دو کام باقی تھے۔ میں زیادہ دیر انہیں ملتوی نہیں کر سکتا تھا۔

”او کے۔“ میں نے کہا۔ ”میں یہیں آپ کے ساتھ ڈنر کر لیتا ہوں مسز...... میرا مطلب ہے صفیہ۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”ویسے کچھ اندازہ ہے کہ احسان صاحب کب تک آئیں گے؟ مجھے کل صبح کی فلائٹ سے واپس بھی جانا ہے۔“

”میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔“ صفیہ نے کہا۔ ”ممکن ہے بارہ بجے تک آئیں، ممکن ہے اس کے بھی بعد آئیں، ویسے آپ کہاں ٹھہرے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

"کہیں بھی نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں ائرپورٹ سے سیدھا یہیں آیا ہوں۔"

"اور یہ گاڑی؟" اس نے پوچھا۔

"یہ تو میرے ایک دوست کی ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ مجھے ریسیو کرنے ائرپورٹ آیا تھا۔"

"میں بھی کتنی بداخلاق ہوں۔" وہ شرمندہ ہو کر بولی۔ "میں نے آپ سے چائے کو پوچھا نہ پانی کو۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں مسکرایا۔ "میں ڈنر میں ساری کسر پوری کرلوں گا۔"

"ڈرنک کرتے ہیں آپ؟" اس نے اچانک پوچھا۔

"میں اس نعمت سے محروم ہوں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "ویسے اگر آپ ڈرنک کرتی ہیں تو ضرور کریں، ویسے آج کل تو سبھی خواتین ڈرنک کرتی ہیں۔"

"آج میرے ساتھ آپ بھی ڈرنک کریں گے۔"

"صفیہ، مجھے مجبور مت کریں پلیز۔" میں نے کہا۔

"میں......"

میرا جملہ ادھورا رہ گیا۔ باہر مین گیٹ کھلنے کی آواز آئی تھی۔ پھر دو تین گاڑیوں کے انجنوں کی آواز آئی تو صفیہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔ "شاید احسان آگئے۔"

میں خود بھی اس کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا اس لیے بوکھلا کر رہ گیا۔

"آپ بیٹھیں، میں ابھی آتی ہوں۔" وہ جلدی سے باہر نکل گئی۔

چند منٹ بعد باہر قدموں کی آہٹ گونجی۔ صفیہ نے تو ہلکی پھلکی چپل پہن رکھی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ آہٹ کی آواز احسان کی تھی۔ وہ دونوں ڈرائنگ روم ہی کی طرف آرہے تھے۔ میں جھپٹ کر کمرے کے دروازے کے پاس دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔

اچانک ایک مردانہ آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"کون ہے وہ اور کب سے بیٹھا ہے؟"

"وہ لاہور سے آیا ہے، کہہ رہا تھا کہ احسان صاحب سے بہت ضروری کام ہے۔"

"نام کیا ہے اس کا؟" یہ کہتے ہوئے احسان بالکل دروازے کے نزدیک آگیا۔

"اس کا نام...... احتشام......" صفیہ کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہو چکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی احسان بھی تھا۔

مرد سے شادی

زندگی میں پہلی بار کورٹ میں گواہی کے لیے آنا پڑا۔ بڑے میاں کچھ پریشان تھے۔ کورٹ میں آنے کے بعد گواہوں کے کٹہرے میں کھڑا ہونے کے بعد وکیلِ صفائی نے بڑے میاں پر سوالوں کی بارش کر دی۔

"کیا تم نے کبھی شادی کی؟"

"جی جناب۔" گواہ نے آہستہ سے جواب دیا۔

"تم نے کتنی بار شادی کی؟" وکیل نے پھر پوچھا۔

"جی ایک بار۔" گواہ نے جواب دیا۔

"کس سے شادی کی؟" وکیل نے پوچھا۔

"عورت سے شادی کی۔" گواہ نے کہا۔

"یقیناً تم نے عورت سے شادی کی کیا کبھی تم نے سنا کہ کسی نے مرد سے شادی کی ہو؟"

اس پر گواہ نے کہا۔ "ہاں جناب مرد سے شادی میری بیٹی نے کی ہے۔"

مانسہرہ سے احمد بیگ کی سعی

"ارے یہ احتشام صاحب کہاں گئے؟"

"کون احتشام؟" احسان جھنجلا کر بولا۔ وہ پلٹنے ہی والا تھا کہ میں نے اچانک اسے پیچھے سے دبوچ لیا۔ اور گن اس کی کنپٹی پر رکھ دی۔ پھر میں سفاک لہجے میں بولا۔ "آواز نکلی تو کھوپڑی ٹوٹے ہوئے تربوز کی طرح بکھر جائے گی۔"

صفیہ نے چیخنا چاہا لیکن میں نے ڈپٹ کر کہا۔ "آواز نکالی تو احسان کو ابھی گولی مار دوں گا۔ خاموشی سے بیڈروم کی طرف چلو۔"

وہ لرزتی کانپتی بیڈروم کی طرف چل دی۔ میں نے احتشام کی کمر پر گن کی نال رکھی اور اسے آگے چلنے کو کہا۔

ڈرائنگ روم میں آتے ہوئے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ گارڈز برآمدے سے آگے نہیں آتے۔ یہ بات الگ ہے کہ کوئی انہیں خاص طور پر اندر بلائے۔

احسان کا بیڈروم شاید اوپر کی منزل پر تھا۔ صفیہ ڈرائنگ روم سے نکل کر ایک زینے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

"نہیں احسان۔" میں نے اسے جھڑک دیا۔ "اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لو ورنہ میں فائر کرنے میں دیر نہیں کروں گا۔ میری گن پر سائیلنسر فٹ ہے اس لیے تم بے آواز مارے جاؤ گے۔"

میں احسان اور صفیہ کو دھکیلتا ہوا بیڈروم میں لے گیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے احسان کی تلاشی لی اور اس کے بغلی

ہولسٹر سے گن نکال لی۔ وہ کسٹم کا اعلیٰ افسر تھا۔ مسلح تو وہ رہتا ہی ہوگا۔

''تم نے اگر ذرا سی بھی آواز نکالی یا اپنی جگہ سے حرکت کی تو میں بلا جھجک فائر کردوں گا۔'' میں نے صفیہ سے کہا۔ ''خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھی رہو۔''

''تم ہو کون؟'' احسان بھڑک کر بولا۔ ''شاید تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تم کس کے گھر میں آگھسے ہو۔''

''مجھے خوب علم ہے جناب احسان الحق صاحب۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''تمہیں اس وقت یہاں سے زیادہ کیش نہیں ملے گا، کچھ زیور ضرور ہے جو......''

میں نے اس کے منہ پر اچانک تھپڑ مار دیا۔ احسان جیسے کسی اعلیٰ افسر کے چہرے پر تھپڑ مارنا، وہ بھی اس کی بیوی کے سامنے، اس کے لیے بہت توہین آمیز تھا۔ ''اپنی بکواس کیے جارہا ہے؟'' میں نے دوسرا تھپڑ مزید زور سے مارا۔

''تو ہے کون کمینے، میں......''

میں نے اچانک گن کی نال اس کے منہ میں گھسا دی اور بولا۔ ''اب تو نے گالی دی تو......'' میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ''تجھے روبی یاد ہے؟''

''روبی؟'' وہ چونک کر بولا۔

''ہاں، وہی روبی جسے تو نے اس کے بھائی کے ساتھ ائرپورٹ سے گرفتار کیا تھا۔''

''ہاں، مجھے یاد ہے۔'' اس نے بیوی سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''تجھے معلوم تھا کہ یہ واردات دُرانی کی سرپرستی میں ہورہی ہے اس کے باوجود......'' میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''مجھے افسوس ہے۔'' احسان نے کہا۔ ''اس وقت میں نشے میں تھا اور......''

''تو پوچھ رہا تھا نا میں کون ہوں؟ میں ملک صاحب کا آدمی ہوں۔ تو نشے میں کیا ماں بہن کی تمیز بھی بھول جاتا ہے؟'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''اس وقت میں بھی نشے میں ہوں۔ کیا میں بھی تیری بیوی کے ساتھ وہی کچھ کروں جو تو نے روبی کے ساتھ کیا تھا؟''

''مجھے افسوس ہے کہ......''

میں نے اس کے منہ پر گن کا بھاری دستہ دے مارا۔ اس کے دو تین دانت جھڑ کر باہر آگرے اور منہ سے خون بہنے لگا۔ ''تجھے افسوس ہے...... افسوس سے کام نہیں چلے گا اور

کے پیچھے۔ میں تیرے سامنے تیری بیوی کی عزت کا جنازہ نکال دوں گا، پھر بعد میں کہہ دوں گا، مجھے افسوس ہے۔''

میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر بیڈ پر پڑا ہوا صفیہ کا ایک دوپٹا اٹھایا اور احسان کو بے دردی سے کرسی پر دھکیل کر اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔ پھر میں نے صفیہ کے گلے میں پڑا ہوا دوپٹا بھی کھینچا اور اس کی ٹانگیں کرسی کے پائے سے باندھ دیں۔

''دیکھو، تم اچھا نہیں کررہے ہو؟'' اس نے کہا۔ ''میں ملک صاحب سے خود معافی مانگ لوں گا۔''

''میں بھی ابھی تم سے معافی مانگ لوں گا۔'' میں نے کہا اور صفیہ کی طرف بڑھا۔

احسان چیخا۔ ''دیکھو میری بیوی کو ہاتھ مت لگانا۔''

میں نے تکیے کا غلاف اتارا اور احسان کے منہ میں ٹھونس دیا میں پھر صفیہ کی طرف بڑھا۔

احسان بری طرح مچلنے لگا۔ میں نے اس کے منہ سے تکیے کا غلاف نکال دیا۔ اس نے گہرے گہرے سانس لیے اور بولا۔ ''میں ہر قسم کی سزا جھیلنے کو تیار ہوں۔ بس میری بیوی پر رحم کرو۔''

صفیہ اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے دبنگ شوہر کو رحم کی بھیک مانگتے دیکھ رہی تھی۔

''شہریار کو تم ہی نے پھنسایا ہے نا؟ اب تم ہی اس کے حق میں گواہی دو گے۔''

''میں تیار ہوں۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور اس کا کیمرا آن کرکے ایسے زاویے سے اسے رکھا کہ کیمرے میں اس کے بندھے ہوئے ہاتھ نظر نہیں آرہے تھے۔ صرف میں نے اس کا کلوز اپ لیا تھا۔ میں نے کیمرا بند کرکے کہا۔ ''کہو کہ میں نے شہریار پر جھوٹا الزام لگایا تھا۔ وہ بالکل بے قصور ہے، میں نے اس کے خلاف ساری پلاننگ خود ہی کی تھی۔''

میں نے کیمرا آن کرکے اسے بولنے کا اشارہ کیا۔ اس نے وہی کچھ دہرا دیا جو میں نے اس سے کہا تھا۔

پھر میں نے اچانک گھوم کر صفیہ کی کنپٹیاں پکڑ لیں اور ان پر دباؤ ڈالا تو وہ بے ہوش ہوگئی۔

میں نے احسان کی طرف دیکھا تو شاید اسے میری آنکھوں میں اترا ہوا خون نظر آگیا۔ وہ گھگیا کر بولا۔ ''دیکھو، تم نے جو کچھ کہا میں نے کہہ دیا۔ میں......''

میں نے اچانک اس کی گردن دبوچ لی اور اسے پوری قوت سے دبانے لگا۔ دو ہی منٹ میں اس کا سانس

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

اکڑ گیا۔ آنکھیں حلقوں سے باہر آگئیں اور زبان باہر نکل گئی۔ وہ بری طرح تڑپا، پھر اس کی گردن ڈھلک گئی۔ میں نے اسے زندگی کی قید سے آزاد کر دیا تھا۔

میں نے طویل سانس لی، باتھ روم میں جا کر اپنا جائزہ لیا میرے کپڑوں پر ایک سلوٹ بھی نہیں تھی۔ میں نے بال سنوارے اور باہر نکل آیا۔ میں نے احسان کی لاش اٹھا کر بیڈ پر ڈالی اور صفیہ کو بھی اس کے نزدیک لٹا کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ پھر میں ٹہلنے والے انداز میں برآمدے کی طرف بڑھا۔

اچانک ایک طرف سے ایک گارڈ نمودار ہوا اور بولا۔ ”کون ہیں آپ؟“

”یہ کیا بدتمیزی ہے؟“ میں نے ڈپٹ کر کہا پھر گیٹ پر کھڑے ہوئے گارڈ سے بولا۔ ”ان لوگوں کو بتاؤ کہ میں کون ہوں؟“

”یہ صاحب کے مہمان ہیں۔“ گارڈ نے بتایا۔ ”یہ صاحب کے آنے سے پہلے آئے تھے۔ اب ان سے ملاقات کر کے جا رہے ہیں۔ وہ گاڑی ان ہی کی ہے۔ تم پوچھ رہے تھا نا کہ باہر جو گاڑی کھڑی ہے وہ کس کی ہے۔“

”ویسے احسان صاحب سی سی ٹی وی کیمرے کے ذریعے اس وقت تمہیں بھی دیکھ رہے ہوں گے اور مجھے بھی۔“ میں نے کہا۔

گارڈ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ میں سی سی ٹی وی کیمرے پر اپنی فلم تو چھوڑے جا رہا ہوں۔ میں چلتے چلتے رکا اور گارڈ سے بولا۔ ”ایک منٹ میں اپنا سیل فون اندر بھول گیا ہوں۔“ میں دوبارہ اندر گیا۔ میرا اندازہ تھا کہ کیمرے کا مانیٹر لاؤنج میں ہوگا یا احسان کے بیڈروم میں۔ اس کے ساتھ ہی ڈی وی ڈی بھی ہوگی۔ مانیٹر بیڈروم میں تھا۔ میں ایک مرتبہ پھر بیڈروم میں گیا اور ڈی وی ڈی نکال کر اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال لی۔ میں نے اپنا سیل ہاتھ میں پکڑا اور احسان کے بنگلے سے نکل گیا۔

احسان کی موت اسے جلد ہی گھر لے آئی تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی، اس وقت بارہ بج رہے تھے۔ میں وہاں سے سیدھا اس پولیس اسٹیشن پر پہنچا جہاں مجھے اور روبی کو لے جایا گیا تھا۔ میں وہاں کے ایس ایچ او سے بھی حساب بے باق کرنا چاہتا تھا۔

میں نے گاڑی اندر لے جانا چاہی تو گیٹ پر کھڑے ہوئے سنتری نے مجھے روکا اور بولا۔ ”صاحب گاڑی باہر پارک کریں۔ اندر اتنی جگہ نہیں ہے۔“

میں نے یہ سوچ کر گاڑی باہر پارک کر دی کہ ممکن ہے مجھے ایمرجنسی میں وہاں سے بھاگنا پڑے۔

اندر داخل ہو کر میں نے تحکمانہ لہجے میں ایک سنتری سے پوچھا۔ ”صاحب بیٹھا ہے؟“

”جی سر۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”صاحب ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی آئے ہیں۔ میں نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اپنے پسٹل پر سائیلنسر فٹ کر لیا تھا۔ میں ایس ایچ او کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اس کے نزدیک ایک سب انسپکٹر کھڑا تھا جو کسی فائل سے اسے کچھ سمجھا رہا تھا۔ میں اس سب انسپکٹر کو بھی پہچان گیا۔ میری گرفتاری کے وقت وہ بھی موجود تھا۔

”جی فرمائیے؟“ ایس ایچ او نے میرے حلیے سے متاثر ہو کر پوچھا۔

”فرمانا کیا ہے جی، بس آپ سے ایک کام ہے۔“ میں نے کہا اور اچانک گن نکال لی۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میں نے اسے زیادہ حیران ہونے کی مہلت نہ دی۔ میری گن سے شعلہ نکلا اور ٹھک کی آواز کے ساتھ ایس ایچ او کی پیشانی کے عین وسط میں سوراخ ہو گیا۔ دوسرا فائر میں نے اس سب انسپکٹر پر کیا۔ ٹھک کی ہلکی سی آواز آئی اور گولی سب انسپکٹر کے جبڑے میں گھس گئی۔ میں نے احتیاطاً دوسری گولی اس کی کھوپڑی پر ماری پھر میں دروازہ بند کر کے باہر نکلا اور ٹہلتا ہوا اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی ہی تھی کہ اندر سے شور شرابے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ میں نے گاڑی گیئر میں ڈال کر تیزی سے آگے بڑھا دی۔

ایک ایک کر کے میں نے ان تمام لوگوں کو ٹھکانے لگا دیا تھا جو میری تباہی کے ذمے دار تھے۔ بس اب ایس ایس پی ورّانی اور ملک باقی رہ گیا تھا۔ اب میری زندگی کا واحد مقصد ان دونوں کو ٹھکانے لگانا تھا۔

صبح ناشتے کی میز پر اشرف بھی موجود تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”سر! میں نے ایک ایک کر کے ملک کے تقریباً تمام اہم آدمیوں کو نپٹا دیا۔ اب میں ملک کو مارنا چاہتا ہوں۔“

”ملک کو؟“ اشرف ہنسا۔ ”مجھے تو لگتا ہے کہ ایس ایس پی ورّانی ہی ملک ہے ورنہ اسے کسی نے نہ دیکھا ہوتا۔ ہر شخص کو ورّانی کے توسط سے احکامات ملتے ہیں۔ تم ایسا کرو، پہلے ایس ایس پی ورّانی کو ٹھکانے لگا دو، ملک خود بہ خود م

جائے گا۔" پھر وہ مسکرا کر بولا۔ "لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ تمہیں اس کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کرنا پڑے گی۔ دُرّانی کے مرنے سے اگر واقعی ملک کا کوئی وجود ہوا تو وہ بھی مر جائے گا۔ اس سلسلے میں روزی تمہارے کام آسکتی ہے۔" اشرف نے کہا۔

روزی اس وقت وہاں موجود نہیں تھی۔ اشرف صرف مجھے اور صفدر ہی کو اپنے ساتھ بٹھاتا تھا۔ وہ بھی دوسرے کارکنوں سے درشت لہجے میں بات کرتا تھا۔

"اگر تم چاہو تو صفدر بھی تمہارا ساتھ دے سکتا ہے۔" اشرف نے ہنس کر کہا۔

"صفدر بھائی سے تو میں کسی بھی وقت مدد لے سکتا ہوں سر۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

ناشتے کے بعد صفدر نے کہا۔ "فراز! پہلے تو میں اپنے کسی آدمی کو یہ معلوم کرنے کے لیے لگاتا ہوں کہ دُرّانی کس وقت گھر سے نکلتا ہے، وہ کس راستے سے آفس جاتا ہے اور کس قسم کی گاڑی میں جاتا ہے۔ ممکن ہے اس کے پاس گاڑی بھی بلٹ پروف ہو۔"

"یہ تو میں معلوم کر چکا ہوں۔" میں نے کہا۔ "دُرّانی کی گاڑی بلٹ پروف ہے۔" میں نے کہا۔

"پھر اس کے دیگر معمولات معلوم کراؤ، اس کے بعد کوئی پلان بناتے ہیں۔" صفدر نے کہا۔

اس وقت روزی بھی وہاں آگئی اور ہنس کر بولی۔

"کیسا پلان؟"

"دُرّانی کو ٹھکانے لگانے کا پلان۔" صفدر نے کہا۔

"پھر روزی سے بولا۔ "روزی! تم دُرّانی سے قریب ہونے کی کوشش کرو، خوب صورت لڑکیاں اس کی کمزوری ہیں۔"

"نہیں۔" میں نے سختی سے انکار کر دیا۔ "میں اپنے دشمن کو مارنے کے لیے کسی عورت کا سہارا نہیں لوں گا۔" میں نے کہا۔ "ہاں، روزی اس آپریشن میں ہمارا ساتھ دے سکتی ہے۔"

دو دن بعد صفدر نے بتایا کہ دُرّانی کس راستے سے آفس جاتا ہے اور کس وقت واپسی ہوتی ہے۔

"یہ تو ہم سوچ ہی نہیں سکتے کہ راستے میں اس پر حملہ کریں گے۔ اس کی گاڑی بلٹ پروف ہوتی ہے۔ ایک دفعہ اس پر حملہ ناکام ہو گیا تو پھر وہ پہلے سے بھی زیادہ محتاط ہو جائے گا۔" صفدر نے کہا۔

"ہاں، ہمارے پاس دو آپشن ہیں۔ ہفتے کی رات کو دس بجے تک وہ کراچی جم خانہ میں ہوتا ہے۔ اسے وہاں ٹھکانے لگایا جا سکتا ہے لیکن وہاں سے نکلنا بہت مشکل ہوگا۔ وہاں سیکیورٹی بہت سخت ہے۔ اگر کسی بھی طرح ہم اندر جانے میں کامیاب ہو گئے تو وہاں سے واپسی کی ضمانت نہیں ہے۔"

"اور دوسرا راستہ کون سا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"دوسری جگہ اس کا گھر ہے۔" صفدر نے ہنس کر کہا۔

"جب وہ باہر ہوتا ہے تو اس کے گھر پر سیکیورٹی اتنی سخت نہیں ہوتی ہے۔ وہ یہاں تنہا رہتا ہے۔ اس کی بیوی اور بچے ملک سے باہر ہیں۔"

ہم سب نے اچھی طرح سوچ بچار کرنے کے بعد بالآخر ایک منصوبہ فائنل کر لیا۔

☆☆☆

منصوبے کے مطابق ہمارا ساتھی خورشید گاڑی ڈرائیو کر کے لایا تھا اور ایک پول کے پاس اس نے سیڑھی لگائی تھی اور کچھ دیر تک اوپر رہنے کے بعد نیچے آگیا تھا۔ تاکہ دُرّانی کے گارڈز دیکھ لیں کہ الیکٹرک کمپنی والے کام کر رہے ہیں۔ عقبی سمت میں صرف دو گارڈ تھے ممکن ہے دُرّانی کی موجودگی میں زیادہ ہوتے ہوں۔ ان دونوں گارڈز کو روزی نے ٹھکانے لگا دیا اور انہیں بھی اٹھا کر الیکٹرک کمپنی کی گاڑی میں ڈال دیا۔ پھر دس منٹ بعد ہم بنگلے کے اندر تھے۔ چونکہ خورشید نے بنگلے کی بجلی کا کنکشن کاٹ دیا تھا اس لیے گھپ اندھیرا چھا گیا تھا۔

ہم اسی اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر کچن کے راستے اندر پہنچے۔ کچن میں ایک عورت کام کر رہی تھی۔ وہ دونوں کو دیکھ کر چونکی لیکن روزی نے کہا کہ میں صاحب کی مہمان ہوں۔ صاحب کا کمرا کون سا ہے خالہ؟" روزی نے پوچھا۔

"کوریڈور میں دوسرا کمرا صاحب کا ہے۔" اس عورت نے جواب دیا۔ روزی نے اس کی کنپٹی پر ہاتھ مارا اور اسے بے ہوش کر کے اس کے ہاتھ پاؤں اور منہ بند کر دیا اور اسے کچن ہی کے ایک کمرے میں ڈال دیا۔

کوریڈور میں بالکل سناٹا تھا۔ گارڈز نے جنریٹر چلا دیا تھا لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

"میں کمرے میں جا کر چھپ جاتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم دونوں یہیں رہ کر نگرانی کرنا۔ میں اگر اندر پھنس گیا تو زور سے چیخوں گا۔ تم لوگ سمجھ جانا کہ میں کسی مشکل میں ہوں۔"

پروگرام طے کر کے میں دُرّانی کے بیڈروم میں داخل ہوا اور دبیز پردے کے پیچھے چھپ گیا۔ اب مجھے صرف

انتظار کرتا تھا۔ وقت بہت سست روی سے گزر رہا تھا۔ ایک ہی حالت میں کھڑے کھڑے میری ٹانگیں شل ہوگئیں تو میں فرش پر بیٹھ گیا۔

خاصا انتظار کرنے کے بعد میں نے گھڑی دیکھی۔ اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ میں نے پھر دیوار سے ٹیک لگالی۔

اچانک مجھے قدموں کی آہٹ کے ساتھ کسی کے زور سے چھینکنے کی آواز سنائی دی۔ میں ایک دم کھڑا ہوگیا اور سانس تک روک لی۔ پردے کے پیچھے میں نے اتنی درز رکھی تھی کہ مجھے کمرے کا منظر دکھائی دے رہا تھا لیکن صرف بیڈ نظر آرہا تھا۔

اچانک کوئی کمرے میں داخل ہوا پھر آواز آئی۔ ''آپ یوں اچانک آگئے۔ مجھے اطلاع تو کردیتے ملک صاحب۔''

''مجھے ایک ضروری کام کے سلسلے میں آنا پڑا۔ کل صبح کی فلائٹ سے واپس چلا جاؤں گا۔''

وہ آواز سن کر میں سکتے میں رہ گیا۔ اس آواز کو تو میں کروڑوں میں شناخت کرسکتا تھا۔

پھر درانی کی آواز آئی۔ ''آئی ایم سوری ملک صاحب! ابھی جب آپ آئے تھے تو آپ سے بات نہیں ہو سکی۔ موقع ہی نہیں ملا۔ مجھے اس لڑکی روبی کے ساتھ زیادتی کا بہت افسوس ہے لیکن اس وقت میں مجبور تھا۔''

''کام کی بات کرو۔'' دوسری آواز آئی۔

میرا خون بری طرح کھول رہا تھا۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ جس شخص کو میں فرشتہ سمجھ کر پوجا کی حد تک اس کا احترام کرتا رہا، وہ اتنا گھناؤنا بھی ہوسکتا تھا۔ اسے روبی کی بربادی اور موت کا کوئی افسوس نہیں تھا۔ وہ کام کی بات کرنا چاہتا تھا۔

''ہاں، وہ میرا باپ تھا۔ اسے باپ کہتے ہوئے بھی مجھے کراہیت محسوس ہورہی تھی۔ ملک میرا باپ تھا۔

میں نے دونوں پسٹل نکالے اور پردے کے پیچھے سے اچانک باہر نکل آیا۔

وہ دونوں مجھے دیکھ کر یوں اچھلے جیسے بھوت دیکھ لیا ہو۔

میں نے بہ مشکل تمام اپنے لرزتے ہوئے وجود پر قابو پایا اور بولا۔ ''ڈیڈی...... آپ ملک...... آپ کی بیٹی کی عزت لٹ گئی...... بیٹے کی موت کی خبر ہے آپ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔''

میں نے اچانک درانی پر فائر کردیا۔ ٹھک کی آواز آئی اور گولی اس کے بازو میں لگی۔

''حرکت مت کرنا اپنی جگہ سے۔'' میں نے قہر آلود لہجے میں کہا۔ پھر میں ڈیڈی سے مخاطب ہوا۔ ''آپ کو تو باپ کہتے ہوئے مجھے شرم سے مرجانا چاہیے ڈیڈی...... آپ کیسے باپ ہیں کہ دولت ہی آپ کے لیے سب کچھ ہے۔ ایسے باپ سے تو میں یتیم ہونا زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔ میری گن نے بے آواز شعلہ اگلا اور ملک کی پیشانی کے عین وسط میں سوراخ ہوگیا۔ میری دوسری گولی اس کے سینے میں دل کے مقام پر لگی۔ میں نے اس کے بعد درانی کو نشانہ بنایا اور اس کی پیشانی کے وسط میں بھی سوراخ کردیا پھر میں نڈھال ہوکر وہیں بیٹھ گیا اور بری طرح رونے لگا۔ اپنے کانوں سے سننے کے بعد بھی مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میرا باپ اتنا گھٹیا ہوسکتا ہے۔

میں فرش پر بیٹھا سسک رہا تھا۔ اتفاقات اور سانحات نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ بلک رہا تھا کہ صفدر اور روزی اندر داخل ہوئے۔ صفدر نے مجھے جھنجوڑا اور بولا۔ ''اشوفراز، واپس چلو۔ ہم لوگ اس وقت شدید خطرے میں ہیں۔''

میں ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس نے زبردستی مجھے اٹھا کر کھڑا کیا، پھر باہر کی طرف دوڑ لگادی۔ عقبی سمت میں ایک دو گارڈ موجود تھے۔ روزی نے پلک جھپکتے میں ان کا کام تمام کردیا پھر صفدر نے جھپٹ کر عقبی دروازہ کھولا اور مجھے لے کر باہر نکل گیا۔ خورشید ہمیں دیکھتے ہی الیکٹرک کمپنی کی گاڑی لے کر آگیا اور ہم وہاں سے نکل آئے۔

اشرف بہت خوش تھا کہ اب وہ اس میدان کا بلاشرکت غیرے مالک تھا۔ اس نے مجھے انعام کے طور پر ڈیفنس کا ایک بنگلا، دس کروڑ روپے دیے تھے۔

میرا دل اب اس دنیا سے اچاٹ ہوگیا تھا۔ میں نے وہ ساری دولت روزی اور صفدر میں بانٹ دی اور خود پولیس اسٹیشن پہنچ کر اپنے جرم کا اعتراف کرلیا۔ اب میں جیل میں ہوں لیکن کسی کو بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے کہ میں نے اپنے باپ کو کیوں قتل کیا۔ میں اپنی بہن کی ذلت اور اندوہناک موت کو کس طرح بھول سکتا تھا۔ مجھے موت کی سزا ہوچکی ہے اور میں انتظار کررہا ہوں کہ کب مجھے سولی پر چڑھایا جاتا ہے۔

میرا باپ زندگی بھر دولت کی سولی پر چڑھا رہا۔ وہ رشتے ناتے سب کچھ بھول کر صرف دولت کی پوجا کرتا رہا۔ اس دولت کے حصول نے اسے اپنوں سے دور کرکے ہر رشتے سے بیگانہ کردیا۔

عشق زہرناک

احمد اقبال

ہر شخص کے دل میں خواہشوں کا ہجوم ہوتا ہے... اس ہجوم سے اعتدال کے راستے اختیار کرکے سفرِ حیات طے کیا جا سکتا ہے... انسان چاہتا ہے کہ اس کی سوچیں حقیقت کا روپ دھار لیں... مگر یہ ضروری تو نہیں کہ نتائج بھی اس کی مرضی کے مطابق عیاں ہوں... زندگی میں سکون... آسائش اور بلندیوں کو حاصل کرنے کا خواب دیکھنے والے نوجوان کا قصہ... الجھنیں عارضی ہوتی ہیں... اور وقتی مگر کچھ عاقبت نااندیش اس کو اپنے پر طاری کر لیتے ہیں... قانون کی سزا کے دوران سے وہ گزر رہا تھا... مگر عشق کا زہر اس کے رگ و پے میں دوڑ رہا تھا...

وصالِ یار کی تمنا اور حق و ناحق کی کشمکش...... ایک سبق آموز کہانی

وقت کی رفتار کا حساب ہر جگہ الگ تھا۔ ایک وہ تھے جن کے لیے رات پلک جھپکتے میں گزری اور ان کے لیے زندگی کی آخری صبح آ گئی۔

ایک وہ تھا جس کے لیے یہ صبح نہ جانے کہاں رک گئی تھی جب اس کی رہائی کے احکامات آنے والے تھے۔

”خان صاحب عبدالرشید خان پنڈ دادن خان والے......“ پروفیسر کاہلی سے آنکھ کھول کے گنگنایا۔ ”دو بجے ہیں۔“

”تم سے کسی نے وقت پوچھا ہے؟“ وہ خفگی سے بولا۔

”اچھا دیکھتا رہ چھت کو...... صبح تو وہی چھ بجے ہو گی۔“ وہ پھر کروٹ بدل کے سو گیا۔ چند منٹ میں اس کے خراٹے رشید کے کان خراب کرنے لگے۔ برسوں کے ساتھ نے انھیں ایک دوسرے کو شریکِ حیات کی طرح خوبیوں اور خامیوں سمیت برداشت کرنا سکھا دیا تھا اور وہ ایک دوسرے کے لیے ناگزیر بھی ہو چکے تھے۔ پروفیسر اس زنداں نگری کا باسی ہونے سے پہلے عملی زندگی میں سچ مچ کا پروفیسر تھا پھر اس نے ایک قتل کر دیا اور رشید کی طرح عمر قید کاٹنے ہنسی خوشی یہاں آ گیا۔

فرق صرف ردِعمل کا ہی نہیں سزا کے پس منظر کا بھی تھا۔ پروفیسر نے واقعی قتل کیا تھا جس کا اسے کوئی افسوس نہیں تھا۔ رشید نے کوئی قتل نہیں کیا تھا لیکن وہ دونوں قانون کی نظر میں ایک جیسے مجرم ٹھہرے۔ پروفیسر مضبوط اعصاب کا اور حقیقت میں آسانی سے سمجھوتا کرنے والا آدمی تھا اور صرف اتنا ہی کہتا تھا کہ یار زندگی اسی کا نام ہے...... رشید کو دکھ تھا کہ اس کی زندگی میں اب جینے کی آرزو کرنے کے لیے کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ دونوں کو اچھے رویے کی بنا پر جیل مینوئل کے مطابق ہر سہولت اور رعایت ملی تھی اور انھیں اکٹھے رہنے کا موقع بھی دیا گیا تھا۔

قفل میں چابی گھمانے کی آواز پر وہ چونکا۔ اس نے

کھلے دروازے میں وارڈن کا چہرہ دیکھا۔
''چل میرے شیدے پستولی ..... آجا میرے ساتھ......'' اس نے عادت کے مطابق اپنے کڑوے کریلے جیسے لہجے میں ایک گالی کا تڑکا لگا کے کہا۔
رشید کا دل ڈوبنے لگا۔ کیا پروفیسر کی پیش گوئی درست ہونے والی تھی؟ وہ مردہ دلی سے اٹھا اور وارڈن کے پیچھے چل دیا۔ فصیلِ زنداں پر سے کسی محافظ نے چلا کے کہا۔ ''کون ہے؟''
پل بھر کے لیے روشنی کی سرگرداں لہر اس پر مرکوز ہوگی۔ ''تیری ماں کا یار......'' وارڈن نے جواب کے ساتھ رشید کی تشریف پر ایک لات رسید کی۔ ''آج کیا دم نہیں رہا ٹانگوں میں؟''
جیلر کے آفس میں لگے کلاک نے تین گھنٹے بجائے۔ وہ بوجھل دل اور جھکے قدموں سے اس راستے پر چلا گیا جس پر وہ دو سال سے چل رہا تھا۔ عام طور پر یہ اس کی واپسی کا وقت تھا جس پر اسے جانا پڑ رہا تھا اور یہی خلافِ معمول بات اس کے خوف کی تصدیق کرتی تھی۔ آخری حصے میں لگی کھنی باڑھ کے درمیان بنے فٹ بھر کے خلا سے وہ بہ آسانی گزر گیا۔ خراشیں اس کے بازو پر نئی بات تھیں۔ وہ اندر بنی سرکاری بنگلے جیسی عمارت سے دائیں طرف کچن کے دروازے کی طرف مڑا تو اسے سامنے دیکھ کر چونکا۔

وہ چند سیکنڈ رشید کو دیکھتی رہی۔ اندھیرے میں ہونے کے باوجود اس کے لبوں کی مسکراہٹ دیکھی جاسکتی تھی۔ اس کے وجود سے پھوٹتی حرارت اور خوشبو کو محسوس کیا جاسکتا تھا۔ وہ چالیس سے اوپر کی عمر والی عورت ایک بھرپور بدن کی مالک تھی جو قدرے بھاری پن کی طرف مائل تھا لیکن اس کے ریشمی نرمی والے تمام اشتہا انگیز نشیب و فراز ہنوز ہوش و خرد کے دشمن تھے۔ چھبیس سال کے رشید کے لیے بھی۔
''پوچھو گے نہیں کہ اس وقت کیوں یاد کیا میں نے؟'' وہ آہستہ سے بولی۔
''مجھے معلوم ہے۔ پوچھنا کیا...... کیا میری رہائی کے احکامات منسوخ کردیے گئے ہیں؟''

''ذہین آدمی ہو، تمہاری رہائی صرف سرکاری احکامات پر کیسے ہوسکتی ہے۔'' اس نے رشید کا ہاتھ تھام کے شوخی سے کہا۔
''رانی پلیز...... مجھے جانے دو......'' اس نے منت کی۔
''رشید میں کیا کروں، یہ کم بخت دل نہیں مانتا۔ مجھے بتاؤ، کیا تم واقعی مجھے چھوڑ کے جاسکتے ہو؟'' وہ رشید کے سینے سے آلگی۔ ''اتنے سنگ دل تم کیسے ہوسکتے ہو، بتاؤ......'' اس نے چہرہ اوپر اٹھایا۔ رشید نے اس کے بدن کے گداز کی سنسنی کو محسوس کیا مگر ساکت کھڑا رہا۔
رشید نے چونک کر کہا۔ ''میں کب تمہیں چھوڑ کے جارہا تھا...... میں آتا......''
''جھوٹ مت بولو، تم کبھی لوٹ کے نہ آتے۔ کبھی نہ سوچتے کہ رانی پر کیا بیت رہی ہوگی۔ تمہارے دل میں اب بھی وہی ہے جس کو تمہارا نام بھی یاد نہ ہوگا۔ حالانکہ میں

معلوم کر کے بتا چکی ہوں تمہیں...... ان کے چار بچے ہیں...... باہر اب کوئی ہے تمہارا...... کتنے سال بیت گئے۔ تم کس سے ملتے؟ سب کے لیے تم مر چکے...... تم یقین کیوں نہیں کرتے میرا۔'' اس نے رشید کو خود سے الگ کیا۔

''یعنی اپنی سزا کاٹنے کے باوجود میں جیل سے نہیں جا سکتا؟''

''نہیں...... تم جا سکتے ہو اگر مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے، میرا مطلب ہے اب کیسے رہ سکتا ہوں میں یہاں آخر...... میں نے کہا تو ہے کہ باہر جاتے ہی میں تمہیں بلالوں گا کوئی انتظام کرنے کے بعد۔''

''اس بکواس پر یقین کرلوں میں؟ اتنا احمق سمجھتے ہو تم مجھے...... جو ناممکن ہے وہ ناممکن ہے...... تم یہاں رہو گے میرے ساتھ، کل تمہاری سزا میں اضافہ کر دیا جائے گا۔ میرا مطلب ہے صبح تمہاری رہائی سے پہلے...... تم پر آخری دن ہنگامہ، مار پیٹ سے کسی قیدی کے قتل تک کوئی بھی فردِ جرم عائد کی جا سکتی ہے۔ قیدی بہت ہیں جو مرنا چاہتے ہیں اور مارے جا سکتے ہیں۔'' اس نے پورے اعتماد سے کہا۔

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''ہاں، تم سب کچھ کر سکتی ہو اور کرا سکتی ہو کیونکہ جیلر کی بیوی ہو اور وہ نامرد تمہاری قید میں ہے۔ اسی طرح جیسے میں ہوں...... وہ تمہارے حکم کا غلام ہے۔''

''میں تو چاہتی تھی کہ تمہارا تقرر جیل کے عملے میں کرا دوں، مالی، ڈرائیور سب ایسے ہی ہیں۔ تم تو جیل کے اسکول میں ٹیچر ہوتے...... لیکن میں رسک کیسے لوں؟''

''کبھی نہ کبھی تو تمہارے عقل کے اندھے شوہر کو پتا چلے گا...... پھر کیا ہوگا؟''

''وہ مرد بن کے ہم دونوں کو قتل کر دے گا۔'' وہ اسے دیکھ کے مسکرائی۔ ''اس دن ہم دونوں کی رہائی ہو جائے گی، ایک ساتھ۔'' اور پلٹ گئی۔ اس نے کچن کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی۔ پھر وہ شکستہ قدموں سے اس راستے پر واپس چلنے لگا جو اس کے لیے اجنبی نہ تھا۔

تاریکی میں اس نے پروفیسر کی ہنسی سنی۔ ''مل گئے آرڈر...... بڑی سرکار کے...... اب سو جا آرام سے۔''

گنتی کے وقت رشید نے کسی کو اسٹریچر پر بے حس پڑا دیکھا۔ وہ ایک مخبوط الحواس بوڑھا تھا۔ وارڈ اس کے بے جان وجود کو مردہ خانے کہلانے والے کمرے میں پھینکنے لے جا رہے تھے۔ ایسے مناظر اس نے بارہا دیکھے تھے اور اس کے دل میں کوئی احساس نہیں جگاتے تھے لیکن آج اسے رہائی کی بات یاد آئی۔ نہ جانے کون کون اسے مبارک باد دیتا رہا اور خدا حافظ کہتا رہا۔ اس کو رشک اور دکھی دل سے دیکھتا رہا۔ رشید نے کچھ نہیں سنا۔

ہر روز ناشتے کے نام پر ملنے والی سوکھی ڈبل روٹی کے دو سلائس اور ٹین کے مگ میں مٹی سے پانی کے رنگ کی چائے لے کر وہ پروفیسر کے سامنے بیٹھ گیا۔ ''تم نے ٹھیک کہا تھا۔''

پروفیسر نے ہمدردی سے کہا۔ ''مجھے پتا تھا۔''

''پھر اب میں کیا کروں؟ میں تو کمبل کو چھوڑ رہا ہوں...... کمبل بھی مجھے چھوڑے......''

''کچھ نہیں...... جو کرنا ہے دوسروں کو کرنا ہے تو صبر کر...... اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور دیکھ اپنا کیس خراب نہ کرنا، جیلر ہے تو سالا نامرد کا نطفہ...... جو بیوی کہے گی وہی کرے گا۔''

ایک وارڈن نے اسے دور سے آواز دی۔ پھر دو نے قریب آ کے اسے پکڑ لیا۔ گالیوں کی بوچھاڑ کے ساتھ وہ اسے لے گئے اور ٹھوکریں مارتے جیلر کے آفس تک لے گئے۔ وہاں پہنچنے تک اس کے ہونٹوں کے کونے...... اور ناک سے خون رسنے لگا تھا۔ کمرے میں ایک طرف خبطی بڈھے کی لاش پڑی تھی۔ موت سے پہلے کی اذیت کے آثار اب بھی اس کی صورت سے عیاں تھے۔ جیلر نے باقی سب کو اشارے سے دفع ہو جانے کو کہا۔

''چھ سو گیارہ...... آج تیری سزا پوری ہو جاتی...... آرڈر تو آ گئے تھے پر یہ تو نے کیا کر دیا......؟'' جیلر بولا۔

''سر، آپ جانتے ہو...... میں پاگل نہیں ہوں اور میرا تو اس سے کوئی واسطہ نہ تعلق...... ویسے مالک ہو آپ، بغیر مقدمے کے ابھی پھانسی پر لٹکا دو۔''

جیلر نے سر ہلایا۔ ''تجھے بہت رعایت دی میں نے، اس کا نتیجہ ہے کہ تو آدھی کاٹ کے جانے والا تھا۔''

رشید نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''آپ کا احسان میں بھول سکتا ہوں......''

وہ عیاری سے مسکرایا۔ ''چل فرض کر یہ کیس نہ بناؤں میں، حالانکہ سب نے دیکھا ہے کہ تو نے اس کے پیٹ پر کتنی لاتیں ماری تھیں، پوسٹ مارٹم رپورٹ میں آ جائے گا لیکن سب کو جھوٹا کرنے سے بھی بات نہیں بنتی...... کیونکہ تیرے جو آرڈر آئے تھے ان پر کسی کے دستخط نہیں تھے۔ آج میں واپس کر دوں گا، جعلی لگتے تھے۔ اب دیکھ آگے جو ہوگا تجھے

پتا چل جائے گا۔''

اس نے پھر ہاتھ جوڑ دیے۔ ''آپ کی بڑی مہربانی سرکار...... آپ نے مجھے بے قصور مان لیا۔''

یہ پروفیسر کی بار بار کی نصیحت تھی کہ جیلر کا فرمانبردار غلام بنا رہا۔ جیلر کو غلط کہتا یا آرڈر رد کرنے کی بات کرتا تو اس پر قتل کا کیس ضرور بنتا، ایک عمر قید کے بعد دوسری عمر قید ہوتی۔ اس عمر میں جو خدا ایک ہی بار دیتا ہے، معمول کے مطابق اپنی سزا کی میعاد کے بعد کا پہلا دن گزار کے وہ رات کو لیٹا تو پھوٹ پھوٹ کر روتا رہا۔ ہے کہاں روز مکافات اے خدائے دار و گیر......

آج اگر اس پر باہر کی دنیا کے لیے درِ زنداں کھل بھی جاتا تو کون تھا جو اسے گلے لگانے کے لیے منتظر کھڑا ہوتا جس کی آنکھ میں فرطِ مسرت سے ابلنے والے آنسو ہوتے۔ خون کے رشتے رکھنے والے جیل کے دروازے پر دو ہی طرح آتے...... قیدِ حیات سے رہائی پانے والے کی میت لے جانے کے لیے چارپائی کے ساتھ یا قید کے بندِ غم سے نجات پا کے باہر آنے والے کے لیے پھولوں کے ہاروں کے ساتھ...... اس کی طرح اکثریت جانتی تھی کہ کس کے لیے کون آئے گا اور آئے گا بھی یا نہیں...... وقت نے اسے سمجھا دیا تھا کہ یہ خون کے رشتے سوت کے دھاگے تھے، ایک جھٹکے سے ٹوٹ گئے تھے۔ اس نے ان کی خاندانی شرافت کی تاکلین تحریر بے داغ چادر پر دیسا ہی بدنامی کا دھبا ڈال دیا تھا جیسا گھر سے ایک رات باہر گزارنے والی کنواری لڑکی صبح اپنے کپڑوں پر لے کر لوٹتی ہے۔

☆☆☆

''دن تھوڑے رہ گئے ہیں رشید کی ماں۔'' اس کے باپ نے گھٹنوں سے سر اٹھایا۔ ''یہی سوچ رہا ہوں۔''

''صرف سوچنے سے کیا ہوگا، لو کھانا کھاؤ۔'' رشید کی ماں نے ٹرے دکھ کے میز آگے کھسکا دی۔

''تو نے نہیں کھایا؟''

''مجھے...... بھوک نہیں ہے۔'' اس کی ماں نے کہا۔

''تو پھر لے جا یہ اٹھا کے...... مجھے بھی بھوک نہیں ہے۔'' اس کے باپ نے ٹرے دور کھسکا دی۔

''تمہیں میری قسم سارا دن دھوپ میں محنت کر کے آتے ہو۔''

''اچھا اچھا کھاتا ہوں...... کھاتا ہوں، محنت خاک کی، بس خواری اٹھائی سارا دن۔ میرے جیسے اور بہت تھے، رکشے روکے کھڑے رہے سڑک پر اور نعرے لگاتے رہے...... پولیس نے راستہ روک رکھا تھا جو آگے تھے ان کے ڈنڈے بھی پڑے...... رکشے بھی ٹوٹے، پھر پیچھے سے آنسو گیس کے گولے آ کے درمیان میں گرنے لگے تو مت پوچھ کیا حال ہوا۔'' اس نے ایک لقمہ کھا کے دوسرا بیوی کی طرف بڑھا دیا۔

اس کی ماں نے بے اختیار منہ کھول دیا اور پھر گھبرا کر رشید کی طرف دیکھا۔ رشید کو معلوم تھا یہ ہوگا چنانچہ اس کے صرف کان کھلے تھے، آنکھیں بند تھیں۔

''آخر کیا چاہتی ہے حکومت؟''

''بڑی عدالت کا حکم ہے...... چلانے ہیں تو پیٹرول والے رکشا چلاؤ...... جو گیس پر بھی چلتے ہیں۔''

ماں نے اس بات پر غور کیا۔ ''وہ کیسے ہوتے ہیں؟''

''ہوتے تو ایسے ہی ہیں، کھانا...... ہاتھ کیوں روک لیا؟''

''بس حمید ے...... پیٹ بھر گیا میرا...... تیرے کہنے پر کھا لیا۔'' وہ مسکرائی۔

''ان کا انجن دوسرا ہوتا ہے۔ اب اس رکشے کا ہم کیا کریں، کباڑی بھی دو روپے نہیں دیتا اور سی این جی رکشا تو آتا ہے ایک لاکھ کا۔''

''ایک لاکھ؟'' ماں نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔

''حکومت قرض دیتی ہے، بینک سے مل جائے گا مگر تین ہزار مہینے کی قسط ہے۔ پچاس مہینے...... چار سال سمجھ لے...... لاکھ کے ڈیڑھ لاکھ واپس کرو...... چل وہ بھی کر دے مجبور آدمی...... مگر آمدنی چار ہزار رہ گئی تو بچت کہاں سے ہو گی اور لاکھ نقد لگا لوں تو......''

''ہاں......'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ماں کی آواز آئی۔ ''پھر یاسمین کا کیا کریں گے...... مشکل سے پیٹ کاٹ کے دو لاکھ کیے تھے، وہ بھی آدھے ہو جائیں گے۔''

''ابھی تک انہوں نے جلدی کی بات تو نہیں کی، جانتے ہیں ہمارے حالات کیا ہیں لیکن کب تک چپ رہیں گے وہ بھی۔''

''رشید نے بی اے تو کر لیا۔''

''ابھی کہاں کر لیا نیک بخت...... نتیجہ آئے گا تو پتا چلے گا اور بی اے کر کے بھی کیا ہوگا، کمشنر لگ جائے گا؟ کوئی پوچھتا ہے بی اے کو آج کل...... چپراسی کی نوکری بھی نہیں ملتی۔''

''ایسی مایوسی کی باتیں مت کرو، وہ کرے گا کچھ نہ کچھ...... یاسمین بھی پڑھنا چاہتی تھی، کب سے گھر میں بیٹھی

ہے۔"
وہ بھڑک اٹھا۔ "تم عورتوں کی عقل میں آنے والی بات ہوتی تو رونا کس کا تھا۔ ارے بابا لڑکا بی اے پاس ہے، لڑکی اس کی برابری کرے گی؟ پاکستان میں یہ نہیں چلتا، چودہ نہیں سولہ پڑھ کے بھی کیا ہوتا...... کرنا تو اسے وہی ہے جو تو کرتی ہے۔"

"اچھا چلو سو جاؤ، اللہ بہتری کی صورت نکالے گا کوئی۔" ماں نے کہا۔

لیکن یہ فقط آرزو کی بات نہیں تھی، رکشا کھڑا ہو گیا۔ اس کے باپ کے لیے رکشا کو اسکریپ کے بھاؤ بیچنا منظور نہ تھا۔ یہ بھی اس نے سیکنڈ ہینڈ لیا تھا اور برسوں اس کی قسطیں ادا کی تھیں۔ رشید کا نتیجہ بھی آ گیا اور توقع کے مطابق اسے فرسٹ کلاس بھی مل گئی لیکن اس کے لیے آگے ایم اے، پی ایچ ڈی لکھنے کا خواب ایک سراب بن گیا تھا۔ وہ نوکری کی تلاش میں دنیا بھر کی خاک چھانتا پھرا، وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھا مگر جہاں "ضرورت سیلز مین" لکھا نظر آتا تو اسے بتایا جاتا کہ یہ تو کسی میٹرک فیل پاس لڑکے کے لیے ہے، تم مجبوری میں کرو گے تو دل لگا کے نہیں کرو گے اور موقع ملتے ہی بھاگ جاؤ گے۔ چپراسی، مالی، ڈرائیور وہ بی اے پاس کرنے کے جرم میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اس نے تین ہزار روپے مہینا پر ایک پرائمری اسکول میں پڑھایا تو باپ کا تبصرہ بن گیا۔ "دیکھا رشید کی ماں، جتنی رکشا کی قسط بنتی ہے یہ اس سے بھی کم ہے۔" وہ بڑی کوشش سے اپنے غصے کو قابو میں رکھتا تھا کیونکہ باپ کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے چار سال میں جو دو لاکھ بچائے تھے وہ یوں ختم ہو رہے تھے جیسے سیلابی پانی کے ریلے سے دریا کے کناروں کی مٹی لہروں میں شامل ہوتی جاتی ہے۔ اسی رفتار سے ماں کی پُرتشویش خاموشی آنکھوں کی اداسی اور چہرے کی افسردگی بڑھتی جا رہی تھی۔

سوچ بچار کے بعد بالآخر اس نے نیا رکشا خرید لیا۔ ہزار روپے روز کی کمائی شروع ہو گئی۔ اب باپ بیٹا مل کے پندرہ ہزار روپے مہینا کی بچت کو تین لاکھ تک لے جانے میں مصروف تھے۔ انہیں اس کے لیے بیس ماہ درکار تھے لیکن صرف دو ماہ بعد ہی لڑکے والے آ گئے۔ وہ مزید دو ماہ سے زیادہ انتظار کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ "تیاری" کے لیے مہلت کا عذر اب انہیں قبول نہ تھا کیونکہ وہ رشتہ طے کرنے کے بعد ڈیڑھ سال کی مہلت دے چکے تھے۔ بدلے ہوئے تیور کے ساتھ بدلا ہوا لہجہ کھلا اعلان تھا کہ یہ نہیں کر سکتے تو پھر ہم بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم کہیں اور بات کرتے ہیں...... تمہاری لڑکی ہماری ذمے داری نہیں ہے۔ اس اعلان کے بعد گھر سوگ میں ڈوب گیا۔ ناممکن کو دو ماہ میں ممکن بنانا صرف الہ دین کے چراغ کا جن ہی کر سکتا تھا۔ فیصلے کو اسی طرح قبول کیا گیا جیسے ڈاکٹر کے اس اعلان کو موت کی تصدیق کے طور پر قبول کیا جاتا ہے کہ دوا نہیں دعا کریں۔

یاسمین کا چہرہ بجھ گیا۔ اس کی خاموشی کے سوال ختم ہو گئے۔ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے گہرے ہوتے چلے گئے اور رشید کے کان سنسان راتوں کی خاموشی میں اس کی سسکیاں سننے لگے۔ وہ جاگتا رہا اور سوچتا رہا اور آہستہ آہستہ اس کی سوچ کا دائرہ سمٹتا گیا۔ اگر اس کے خواب بھی مر جاتے تو رونے کے سوا وہ کیا کر سکتا تھا؟

رشید کو یاسمین کی طرف دیکھتے ہوئے خوف آتا تھا۔ نہ جانے کہاں خلا میں وہ کیا دیکھتی تھی۔ اس نے اپنے آپ میں دلچسپی لینا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ اس کے کپڑے میلے اور بال بکھرے رہتے تھے۔ وہ بھوک پیاس کے احساس سے ماورا ہو گئی تھی۔ اصرار کیا جائے تو چلانے لگتی تھی۔ خدا کے لیے مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ تنگ مت کرو مجھے ورنہ میں گھر سے بھاگ جاؤں گی۔ آہستہ آہستہ وہ ڈپریشن کی طرف جا رہی تھی۔ کیونکہ دو ماہ کی مہلت ہی بے معنی تھی۔

ڈیڑھ ماہ کا عرصہ گزر گیا تھا۔ پندرہ دن میں کون سی لاٹری نکل آئے گی۔ اس سے زیادہ رشید کی آنکھیں ڈراؤنے خواب دیکھ رہی تھیں۔ ایک خط اور پنکھے سے لٹکتی لاش...... بیٹی کی ڈولی اٹھتی ہے یا جنازہ نکلتا ہے...... کسی کو کیا۔ وہ لڑکا جو ایفائے عہد کے چکر میں اب تک چپ بیٹھا تھا "قبول ہے" کے دو لفظ کسی کے لیے بھی بول دے گا۔ وہ یاسمین نہ سہی فاطمہ...... شہناز...... منور کچھ بھی ہو۔

ایک دن یاسمین نے چلا کے کہا۔ "ماں وہ کاکروچ مارنے کی دوا کہاں ہے؟"

رشید ایک دم اٹھ کے کچن کی طرف لپکا۔ "کیا کرنا ہے اس کا؟"

یاسمین نے اسے سر اٹھا کے دیکھا اور ہنسنے لگی۔ "ہاضمے کے لیے پیوں گی۔"

ماں نے برہمی سے کہا۔ "کاکروچ دکھائی نہیں دے رہے، چل دفع ہو یہاں سے۔"

اس شام وہ یاسمین کے پاس جا بیٹھا۔ "دیکھ میں کیا لایا ہوں تیرے لیے، تیری پسند کی چاکلیٹ۔"

یاسمین نے بے دلی سے چاکلیٹ کو دیکھا۔ پھر ایک

دم جھپٹ کے اٹھا لیا اور قیدیوں کی طرح کھانے لگی۔ ”ماں نے دیکھا تو چلانے لگی۔ “چلانے دے...... بڑی تو ہو ہی رہی ہوں...... موٹی بھی ہو جاؤں گی تو کیا فرق پڑے گا۔“

”کیسی باتیں کرتی ہے اور اتنی مایوسی کی کیا ضرورت ہے۔“ اس نے پیار سے کہا۔

”میں کیا کروں بھائی، تو باہر ہوتا ہے نا...... اس لیے تجھے احساس نہیں، کتنے سال ہو گئے مجھے انتظار کرتے...... اب گھر میں اس طرح کب تک قید رہوں، بی اے کا امتحان دینے کی اجازت نہیں۔ کچھ نہیں تو نوکری کر کے وقت گزارتی۔“

”تو اتنا کیوں سوچتی ہے اور اتنا کیوں فکر کرتی ہے۔ بس کچھ دن کی بات ہے پھر اپنا گھر ہوگا اور تو اتنی مصروف ہو جائے گی کہ ہمیں بھی بھول جائے گی۔“

”بس کر بھائی، میں کیا دودھ پیتی بچی ہوں، ابا نے بھی ہمت چھوڑ دی ہے۔ مجھے تو ترس آتا ہے ان پر۔“

”لیکن میں بھی تو ہوں۔“

”تو؟ تو کیا کرے گا؟“ اس نے تلخی سے کہا۔ ”چوری کرے گا، ڈاکا ڈالے گا۔“

”میں سب کچھ کر سکتا ہوں اور تو دیکھنا......“ وہ اٹھا اور یاسمین کے ہونٹوں پر آ جانے والی پُرتمسخر مسکراہٹ دیکھے بغیر نکل گیا۔

شام کو وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ چاچا کے ہوٹل پر بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ اندر سے تین لڑکے نکلے اور قریب کھڑی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ”یار یہ اس لنگڑے موچی کا بیٹا نہیں تھا جو گاڑی چلا رہا تھا؟“ رشید بولا۔ ”کیا نام تھا اس کا، عابد۔“

”ہاں وہی تھا اور گاڑی بھی اسی کی تھی۔“ دوست ہنسا۔

رشید نے بے یقینی سے کہا۔ ”گاڑی کہاں سے آ گئی اس کے پاس؟ یہ تو کچھ بھی نہیں کرتا تھا؟“

”ہاں، لیکن اس نے ایک کام کیا، میں نے سنا ہے کسی کے ساتھ مل کے ڈاکا ڈالا تھا کراچی میں...... لمبا ہی ہاتھ مارا ہوگا، وہ جو اس کا ساتھی تھا مارا گیا اور یہ فرار ہونے میں کامیاب رہا۔ مال اسی کے پاس تھا۔“

”مگر کیسے...... اب تو اندر باہر کیمرے ہیں، فوٹو آ جاتی ہے۔“ رشید بولا۔

”نہیں آئی ہوگی، یہ باہر ہوگا۔ یا بس قسمت تھی، مجھے نہیں معلوم۔“

”پھر یہ بات کیسے معلوم ہوئی، ڈاکے والی؟“

دوست ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ”یار چھوڑ...... منہ سے نکل گئی ایک بات غلطی سے۔“

”مجھ سے کوئی خطرہ ہے تجھے؟ کہ میں جا کے بات پھیلا دوں گا اور تیرا نام لوں گا۔“ رشید بولا۔

”وہ دراصل، عابد نے مجھ سے بھی کہا تھا۔ جب یہ کراچی جا رہا تھا کہ میرے ساتھ چل۔“

رشید بھونچکا رہ گیا۔ ”کیا کہا تھا۔“

”یہی...... کہ ایک چانس ہے، کچھ عرصہ پہلے اس کی اور میری بات ہوئی تو اس نے کہا کہ یار ایسے کچھ نہیں ہوگا۔ باپ ساری عمر سڑک کے کنارے بیٹھ کے جوتیاں گانٹھتا رہا...... یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا، میں تو کہتا ہوں تخت یا تختہ...... ایسی زندگی جینے کا بھی کیا فائدہ...... میں نے بھی کہا کہ ہاں...... لاٹری تو ہماری نکلے گی نہیں...... کوئی انعام بھی جب نکلتا ہے کہ لوٹ ہو...... اب تو یہ ہے کہ ڈاکا ہی ڈالنا پڑے گا کسی بینک میں...... آر یا پار...... یار میں نے تو ایسے ہی بک دیا تھا۔ اس کے دماغ میں کچھ تھا جو اس نے مجھے دو مہینے بعد بتایا۔ میں نے انکار کر دیا تو اس نے بڑی گالیاں دیں مجھے کہ دم نہیں تو بھونکنے کی کیا ضرورت تھی۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ اب سال ہو گیا اس بات کو تو میں نے دیکھا کہ وہ موچی غائب ہے۔ پھر ایک دکان نظر آئی جوتوں کی۔ وہ وہاں بیٹھا تھا۔ چھوٹی سی دکان تھی لیکن پھر بھی...... اور میں وہاں کھڑا تھا تو اندر سے یہ نکلا اور سڑک پر کھڑی گاڑی میں بیٹھ کے کہیں چلا گیا۔ اس کے بعد آج نظر آیا تو مجھے وہ بات یاد آئی۔ کیسے آ گیا یہ انقلاب...... کہاں سے اتنا مال آ گیا کہ ایک موچی بن گیا جوتوں کی دکان کا مالک اور بیٹا گاڑی میں پھرنے لگا، گھر بھی لے لیا ہوگا کہیں...... مگر میں اس سے تو پوچھنے سے رہا۔“

”اور کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ ٹھیک خیال ہے تیرا...... تو نے غلطی کی انکار کر کے۔“ رشید بولا۔

”پتا نہیں، کیا پتا ساتھ دیتا تو اس وقت پڑا ہوتا کراچی کے کسی قبرستان میں۔“

یہ سب حالات کی سازش تھی۔ رشید کا دماغ اسی راستے پر چل پڑا تھا۔ تقدیر اس کا ہاتھ پکڑ کے منزل تک لے گئی۔ عابد کی زندگی کا انقلاب اس کے لیے ایک مثال بن گیا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے اس کے دماغ میں ایک ہی خیال کی بازگشت چلتی رہتی تھی۔ تخت یا تختہ...... جو وہ گزار رہا ہے یہ بھی کوئی زندگی ہے جس کے لیے اتنی لاحاصل جدوجہد کی

جائے۔ اس کو داؤ پر لگا دینا ہی ٹھیک ہے۔ گر جیت گئے تو کیا کہنا ہارے بھی تو بازی مات نہیں۔ دنیا کے جھمیلوں سے جان چھوٹ جائے گی۔ آرام سے جا کے سو جائیں گے کسی گوشۂ گمنامی میں...... پھر قیامت کب آتی ہے کب نہیں آتی...... سونے والے کو نیند میں صبح تک گزرنے والے وقت کا احساس کب ہوتا ہے اور قسمت نے عابد کی طرح ساتھ دیا تو پھر زندگی واقعی جینے کے قابل ہو جائے گی۔ یاسمین اب اسے ہر روز کتنی پُرامید نظروں سے دیکھتی ہے۔

ایک دن وہ ہر بینک کی شاخ کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھتا رہا کہ حفاظتی انتظامات کہاں کیسے ہیں اور فرار کے راستے کہاں کھلے ہیں۔ اس کے خیال میں ایک بینک ایسی جگہ تھا کہ وہ کوشش کرتا تو کامیابی کا تناسب زیادہ تھا لیکن جب وہ ایک کیفے ڈی فٹ پاتھ کی بینچ پر بیٹھا آنے جانے والوں کو دیکھ رہا تھا تو اسے اپنی احمقانہ خواہش کی بے سروسامانی کا احساس زیادہ ہوا، کیا وہ اکیلا بینک لوٹ سکتا ہے؟ یہ کام کرنے والے پلان کرتے ہیں...... ایک سے زیادہ لوگ ہوتے ہیں، انہیں اندر باہر کی خبر ہوتی ہے کہ کس وقت کتنا کیش آتا ہے اور کب گارڈ یا عملہ کچھ فراغت میں ہوتا ہے کہ ان کو بے خبری میں جالیا جائے۔ زندگی چاہیے تو سب نکال کے دے دو...... یہ بینک کا مال ہے تمہارا نہیں...... اور اس کی بھی انشورنس ہے، اس کے لیے اپنی جان مت دو۔

لیکن یہ سین محض خیالی تھا کسی خواب یا فلم کا منظر...... اس کے پاس تو ایک خواہش کے سوا کچھ نہ تھا، ابھی تو اس کا ساتھ دینے والا بھی کوئی نہ تھا، اس کے پاس ریوالور تک نہ تھا۔

اچانک ایک ساٹھ سال کا مسکین صورت اور کمزور شخص اس کے پاس آ بیٹھا۔ ”کیا حال ہے پُتر رشید؟“

رشید چونکا۔ اس نے اجنبی کو غور سے دیکھا مگر اسے کچھ یاد نہ آیا۔ ”میں نے پہچانا نہیں آپ کو بابا جی۔“

وہ تلخی سے مسکرایا۔ ”میں ماسٹر فضل دین ہوں، آٹھویں تک تم کو حساب پڑھاتا رہا۔ اب ریٹائر ہوئے دو سال ہو گئے۔“

رشید کو سب یاد آ گیا۔ ”جی...... جی...... بہت پرانی بات ہے لیکن آپ کی صحت...... میرا مطلب ہے آپ تو......“

فضل دین نے ایک گہری سانس لی۔ ”ہاں میں اکھاڑے میں زور کرتا تھا پھر بیوی کو نہ جانے کہاں سے ٹی بی لگ گئی اور پتا بھی نہیں چلا...... پتا چلا تو بہت دیر ہو گئی تھی۔ وہ مر گئی اور بیماری مجھے دے گئی۔ اسکول میں پتا...... چلتا تو میری چھٹی بہت پہلے کر دی جاتی۔ میں نے علاج کرایا تو بچ گیا۔ بس صحت کا اب یہ حال ہے۔“

”اور آپ کے بچے......؟“ رشید نے ماسٹر صاحب کے لیے چائے منگوائی۔

”ایک لڑکی...... نیک بخت بیاہی گئی تھی، بیٹا رہ گیا تھا۔ بی اے کرنے کے بعد وہ یہاں نوکری تلاش کرتا رہا، پھر کسی طرح دبئی چلا گیا اور وہاں سے لندن...... شادی بھی اُدھر کر لی ہے دو بچے ہیں۔“

”اور آپ اکیلے ہو اِدھر؟“

”اکیلا تو بندہ ہو ہی جاتا ہے اس عمر میں...... لیکن اس نے میرا خیال رکھا، برابر پیسا بھیجتا رہا۔“

رشید نے کہا ”جب یہاں کوئی نہیں تھا تو آپ بھی چلے جاتے بیٹے کے پاس۔“ رشید بولا۔

ماسٹر فضل بھی نظر چرا کے دوسری طرف دیکھنے لگا۔

”وہ بلاتا تھا لیکن اب مجھے کیا کرنا ہے اس عمر میں ولایت جا کے...... شاید وہ خود ہی لوٹ کے پاس آ جائے گا، ایک اُس ہے۔“

رشید ہنسا۔ ”ارے ماسٹر صاحب، جانے والے بھی لوٹ کے آتے ہیں کبھی...... کتے بلی کے بچوں ہوں یا انسان کے۔“

”یہ بات نہیں...... دراصل اس نے کچھ کاروبار میں پیسا لگایا ہے یہاں...... مجھے پیسا بھیجا ہے کہ اس کا پارٹنر آ کے لے جائے گا۔ پھر کچھ مال لائے گا جو میں اس سے لے کر رکھ لوں۔ وہ آ کے خود لے جائے گا۔“

”اچھا۔“ رشید کی دلچسپی بڑھ گئی۔ ”کتنا پیسا بھیجا ہے آپ کو......؟“

”یہ تو پتا نہیں مجھے، اس بینک میں میری تنخواہ آتی تھی مگر اس نے پیسا اکاؤنٹ میں نہیں بھیجا۔ اس بینک کا ایک کلرک ہے وہ جانتا ہے مجھے...... اس کو بھیجا ہے، میں وہی لینے آیا تھا کہ تم پر نظر پڑ گئی۔ سوچا تمہیں ساتھ لے لوں۔“

”مجھے؟ کیوں...... پیسے کا اتنا وزن تو نہیں ہوتا۔“

ماسٹر فضل ہچکچایا اور اس کے کان کے پاس منہ لا کے سرگوشی میں بولا۔ ”بڑی رقم ہے لاکھوں میں...... بیٹے نے کہا تھا کہ کسی سے بھی بات مت کرنا...... اندر جا کے پیسا لینا اور احتیاط سے گھر لے جانا...... اس کا آدمی شام کو گھر آئے گا۔“

رشید کو یہ کہانی کچھ عجیب سی لگی۔ ”چلو میں چلتا ہوں آپ کے ساتھ...... مگر جو بندہ شام کو آئے گا اگر وہ ابھی آجاتا تو بینک میں ہی رقم وصول کر لیتا، خیر مجھے کیا۔“

”ڈر لگتا ہے مجھے پُتر رشید...... زمانہ خراب ہے، پرانے شاگرد تیرے جیسے بھروسے کے قابل ہوتے ہیں۔ چل میرے ساتھ۔“

وہ ماسٹر فضل کے ساتھ سڑک پار بینک میں چلا گیا۔ وہ ایک بڑے بینک کی چھوٹی سے برانچ تھی۔ اندر کوئی بھی نہیں تھا۔ تین کاؤنٹرز کے پیچھے تین بیزار کلرک بیٹھے تھے۔ ان کا منیجر باہر چھوٹے سے شیشے کے کیبن میں بیٹھا فون پر کسی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ کاہلی سے بندوق کے سہارے کھڑے گارڈ نے ماسٹر کو سلام کیا۔ گارڈ خود عمر رسیدہ اور خراب صحت کا مالک تھا۔ اس کی بندوق بھی گوروں کے وقت کی لگتی تھی اور اسی لیے رشید کو یہ بینک اچھا لگا جہاں بندوق اور گارڈ دونوں ناکارہ لگتے تھے یہاں خطرہ نہ ہونے کے برابر تھا۔

کاؤنٹر والے سیاہ فام اور سفید سر والے نے رشید کو نظر اٹھا کے نہیں دیکھا۔ ”کیسا ہے ماسٹر؟“ اس نے نیچے جھک کر براؤن پیپر کا پیکٹ کسی دراز میں سے نکالا۔ ”یہ تیری امانت۔“

پیکٹ ہر طرف سے بند تھا لیکن اس کی لمبائی چوڑائی ہزار روپے والے نوٹ سے بھی زیادہ تھی اور موٹائی بھی کم نہ تھی۔ ”یہ کتنی رقم ہے، میں گن لوں؟“

”بس اب گھر جا کے کرنا یہ کام...... یہاں سے نکل فوراً...... جتنی مجھے ملی وہ دے دی تجھے۔“ وہ ناگواری سے بولا۔

”پھر بھی......“ ماسٹر فضل کچھ نروس ہوا۔

وہ دانت پیس کے بولا۔ ”کیا پھر بھی.... جب مجھے نہیں پتا تو تجھے کیا بتاؤں.... یہاں بیٹھ کے گنے گا تو سب کو شک ہوگا۔“

گارڈ نے کہا۔ ”چل نکل ماسٹر...... ایک بج گیا، چھٹی کا ٹائم ہے۔ مجھے گیٹ بند کرنا ہے۔“

ماسٹر نے بے بسی سے رشید کو دیکھا اور پیکٹ کو قمیص کے بٹن کھول کے اندر ڈالا پھر بٹن بند کر کے باہر نکل آیا۔ رشید نے محسوس کیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ لیکن بحث کرنا لاحاصل تھا۔ وہاں سب یہ گفتگو سن کے بھی خاموش تھے اور سفید بالوں والے کلرک کی حمایت کرتے نظر آتے تھے۔ وہ باہر نہ آتے تو شاید نکال دیے جاتے۔ بینک بند کرنے کی بات بھی فضول تھی۔ بینک بند ہونے کا وقت ڈیڑھ بجے تھا اور ابھی ایک بجنے میں بھی دس منٹ تھے۔ بہت غور کرنے پر بھی یہ معاملہ رشید کی سمجھ میں نہ آیا۔

نروس ماسٹر فضل نے باہر آتے ہی رشید سے کہا۔ ”کوئی رکشا پکڑ لیتے ہیں تو ساتھ چل میرے۔“

”ماسٹر جی، آپ نے بینک کا کہا تھا۔“

”مجھے کچھ ڈر لگ رہا ہے گھر میں بھی کوئی نہیں ہے نا، ذرا میں رقم گن لوں کتنی ہے اور تجھے کام نہیں ہے کوئی تو شام تک رک جا میرے پاس...... جس کو رقم دینی ہے وہ آجائے، پھر چلے جانا۔“

یہی وہ وقت تھا جب شیطان نے چلا کے اس کے کان میں کہا۔ ”رشید...... پاگل کے بچے، اور موقع کیا آئے گا؟ اس سے بہتر چانس ساری زندگی نہیں ملے گا۔ تقدیر نے تیرا کام آسان کر دیا ہے۔ بینک لوٹتے ہوئے ڈاکو کتے کی موت بھی مارے جاتے ہیں۔ یہاں کوئی خطرہ نہیں اور پھر سوت نہ کپاس جولاہے سے لٹھم لٹھا...... جیخ چلی کی اولاد، پستول کیا جا تو تک تو ہے نہیں اور سوچتا ہے بینک لوٹنے کی، یہ لاکھوں ہیں لاکھوں...... ایسی لاٹری کب لگتی ہے کسی کی۔

رشید نے چلا کے کہا۔ ”رکشا۔“ اور ماسٹر فضل کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ”لنڈی کوتل چوک۔“

دھوئیں، شور اور جھٹکوں کو آدھا گھنٹا برداشت کرنا ماسٹر فضل کے لیے مشکل ثابت ہوا جب بالآخر رکشا ٹھہر گیا تو پھولی ہوئی سانس کے ساتھ انہوں نے آڑی ترچھی تنگ گلیوں میں سفر کیا جہاں ناجائز قبضے والے ہر سائز کے گھر تھے۔ زیادہ تر کے دروازے بند تھے یا ان پر پھٹے پرانے پردے جھول رہے تھے۔ گندا پانی گلی کے درمیان میں بھی بہہ رہا تھا اور چھوٹے بچے اس میں چھپ چھپ کھیل رہے تھے۔

”یہ کہاں رہتے ہو تم ماسٹر فضل...... یہ کوئی جگہ ہے، گندے نالے کے کنارے؟“

ماسٹر فضل شرمندگی سے بولا۔ ”جب میں نے گھر بنایا تھا تو ایسی نہیں تھی۔“ پھر رک کر ایک بند دروازے کا تالا کھولنے لگا۔

اندر سے گھر صاف تھا، کہیں کوڑا کرکٹ نہیں پڑا تھا لیکن اس کی دیواروں پر فرسودگی اور ویرانی تھی۔ پرانا زردی مائل سفید رنگ جگہ جگہ سے پپڑی بن کے جھڑ رہا تھا اور نیچے سے وہ نیلا رنگ دھبے کی طرح دکھائی دیتا تھا جو شاید دس سال پہلے کیا گیا ہوگا یا تعمیر کے وقت، مختصر سے صحن میں

ایک طرف دیوار میں لگا نلکا بھی پرانے وقتوں کی یادگار تھا جب اس میں پانی آتا ہوگا...... دائیں طرف کا چھوٹا سا کیبن جیسا کمرا غسل خانہ تھا اور بائیں طرف والا لیٹرین...... بیس فٹ کے برآمدے میں ایک دروازہ کچن کا تھا دوسرا بیڈ روم ہوگا جس کا دروازہ بند تھا۔ ماسٹر نے دائیں طرف والے دروازے کا تالا چابی لگا کے کھولا۔

اندر ایک بہت پرانی مسہری تھی جس نے کمرے کا آدھا حصہ گھیر لیا تھا۔ ماسٹر بیڈ پر لیٹ کے لمبی لمبی سانس لینے لگا۔ وہ غالباً دمہ کا مریض بھی تھا۔ بینک آنے جانے کی مشقت نے اسے تھکا دیا تھا۔ "پتر رشید...... پانی پلا دے مجھے...... باہر جا کچن کا دروازہ کھول، اندر کولر ہے اور گلاس ہے۔"

رشید نے کچن میں کولر سے پانی کا گلاس بھرا تو اس کی نظر برتنوں کے درمیان پڑی سبزی کاٹنے کی چھری پر گئی جو یہاں واحد نئی چیز تھی اور چمک رہی تھی۔ جب اس نے پانی کا گلاس ماسٹر کو دیا تو پہلی بار شیطان کسی سانپ کی طرح اس کے کان میں پھنکارا۔ آر یا پار...... زندگی تو جوا ہے، جو کھیلے گا ہی نہیں بس جیت کے خواب اپنے ساتھ لیے پھرے گا، بغیر کچھ کیے دعا کرتا رہے گا کہ میرے مولا...... چھپر پھاڑ کے دینا تیری قدرت کے اختیار میں ہے۔

ماسٹر نے گلاس بوسیدہ میز پر رکھا۔ "کیا سوچ رہا ہے رشید؟"

وہ چونکا یوں جیسے اس کے خیالات کی چوری پکڑی گئی ہو۔ "کچھ نہیں، کتنا ہے یہ گھر؟"

"ساٹھ گز پورے...... دس سال پہلے سستا مل گیا تھا اب قیمت دس گنا سے بھی زیادہ ہوگی۔"

رشید کا دماغ دو حصوں میں بٹ چکا تھا۔ ایک میں بڑی ڈرامائی فلم چل رہی تھی۔ ایک ماسٹر جیسا ڈھانچا تڑپ رہا تھا اور اس کی کٹی گردن دائیں بائیں لڑھک رہی تھی۔ خون اسی طرح پچکاریاں مارتا نکل رہا تھا جیسے بقر عید پر ذبح ہونے والے بکرے کی گردن سے نکلتا تھا اور وہ قصائی کی طرح ماسٹر کو دبائے بیٹھا تھا کہ اچھل کر نیچے نہ گرے اور اس کے کپڑوں کو داغ دار نہ کرے۔ دوسرے حصے میں وہ زندہ جیتے جاگتے ماسٹر سے باتیں کر کے وقت گزار رہا تھا۔

"سوچتا ہوں کسی ایجنٹ سے بات کروں، خریدار بہت...... اچھے پیسے ملیں تو حج کے لیے نکل جاؤں۔ اور موقع ملے تو اُدھر ہی بیٹھ جاؤں کہیں...... چائے پینی ہے تو بنا لے، کچن میں سب ہے۔"

وہ چونکا۔ "ہاں...... ٹھیک، میں بس پانی پی کے چلتا ہوں۔" اس نے میز پر سے اسٹین لیس کا گلاس اٹھا لیا اور اچانک اس نے خود کو کچن میں چھری اٹھاتا دیکھا۔ اس کا سینے میں دھم دھم کوٹتا دل اور کانپتے ہاتھ نہ جانے کیسے اس سازش میں شریک ہو گئے۔ اب وہ پُرسکون بھی تھا اور بے خوف بھی...... عقل اس کا ساتھ دینے لگی تھی۔ یہ چھری چھوڑو...... آسان طریقہ اختیار کرو، بڈھا ماسٹر کیا ہے تمہارے مقابلے میں...... تکیہ رکھو منہ پر اور دبا لو...... دو منٹ میں کسی خون خرابے کے بغیر کام تمام...... دمے کے مریض میں کتنا دم ہوگا اور شک کوئی کرے گا بھی کیوں...... دس...... نو...... آٹھ...... سات...... اس نے چھری رکھ دی۔

ماسٹر کو منہ کھولنے کی مہلت بھی نہ ملی۔ وہ پہلے سے لیٹا ہوا تھا۔ رشید نے ایک دم تکیہ اس کے منہ پر رکھ کے اسے گھٹنے سے دبا لیا۔ صرف ایک گزرتے لمحے میں اس نے ماسٹر کی آنکھیں ضرور دیکھیں جن میں حیرانی، پشیمانی، دکھ سب جذبات ایک چنگاری کی طرح روشن ہوئے۔ ماسٹر کا جسم اس کے وزن تلے تھرتھرایا...... سانس لینے کی، جسم کو زندگی دینے والی آکسیجن کو پھیپھڑوں میں سمونے کی بے سود کوشش...... لیکن فرشتہ اجل ماسٹر کا نام مرحومین میں لکھ کر جا چکا تھا۔ ماسٹر اب ایک مردہ تھا۔ رشید نے تکیہ اس کے منہ پر ہی چھوڑ دیا جیسے ڈر ہو کہ مردے کی آنکھیں اس کی تصویر اتار لیں گی۔

براؤن پیپر کا پیکٹ ماسٹر نے قمیص کے اندر سے نکال کے سرہانے کی طرف رکھ لیا تھا۔ اس نے کچن میں جا کے چھری سے بنڈل کو کاٹا۔ اس میں سو ڈالر کے نوٹ تھے۔ ہر نوٹ دس ہزار والا تھا۔ حساب کیے بغیر بھی مجموعی رقم لاکھوں میں تھی۔ شاید دس لاکھ یا اوپر...... اس نے ایک کپڑے سے چھری کو صاف کیا۔ گلاس سے پانی پی کے اس پر سے بھی فنگر پرنٹ مٹائے پھر سب نوٹ ایک بڑے شاپنگ بیگ میں ڈالے جس پر کسی بیکری کا نام چھپا ہوا تھا۔ کمرا بند کر کے اس نے صحن کے دروازے کو باہر سے اسی طرح مقفل کیا جیسے وہ تھا۔ جس کپڑے سے اس نے فنگر پرنٹ مٹائے تھے وہ اس نے سر پر ڈال لیا اور اس کے دو کونے دانتوں میں دبا لیے جیسے وہ چہرے کو تیز دھوپ سے بچانا چاہتا ہو۔ وہ سر جھکائے چلتا گیا۔ سامنے سے آنے والے دو مردوں، ایک عورت اور چار بچوں نے اس پر غور نہیں کیا۔ وہ انہی جیسا نظر آتا تھا۔

سڑک پر آتے ہی اس نے سکون کا سانس لیا اور ایک

رکشے میں جا بیٹھا۔ رکشے کو وہ براہ راست اپنے گھر لے جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ نمائش چوک پر اترا اور قائداعظم کے مزار کے احاطے میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ وہاں اکیلے، فیملی اور بچوں والے بھی دور دور بیٹھے تھے اور عشق لڑانے والے جوڑے بھی، دیکھتے دیکھتے لوگوں کے رویے بدل گئے تھے۔ عقیدت مند دوسرے شہروں سے آنے والے تھے جو مزار بھی دیکھتے تھے اور فاتحہ خوانی بھی کرتے تھے۔ باقی مزار کے وسیع باغ اور احاطے کو تفریح یا عیاشی کے لیے محفوظ جگہ سمجھتے تھے۔ آس پاس کا جائزہ لینے کے بعد اس نے نوٹ نکالے۔ اسی وقت دس بارہ سال کا لڑکا نمودار ہو گیا۔ ''بند کباب، بوتل جناب۔''

''نہیں چاہیے۔'' اس نے خفگی سے کہا۔

''بڑے بھائی کے پاس اچھی چیز ہے۔''

''جاتا ہے یا مار کھا کے جائے گا۔'' وہ غصے میں اٹھا تو لڑکا پلٹ گیا۔ خورشید کو یہ جگہ غیر محفوظ لگی۔ وہ صدر تک بس میں گیا پھر پیدل چلتا رہا۔ ریگل چوک پر آ کے اس نے دوسرا رکشا لیا اور کینٹ اسٹیشن پر اتر گیا۔ وہاں سے اس نے چھوٹا سا چینڈ بیگ لیا اور تیسرے درجے کے مسافر خانے میں جا پہنچا۔ مسافر خانہ بھرا پڑا تھا۔ اس نے پلیٹ فارم ٹکٹ خریدنے کا سوچا..... پھر ملتان کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لے لیا۔ اندر جا کے اس نے پل عبور کیا اور چار نمبر پلیٹ فارم پر اترا۔ وہاں بھی بے شمار مسافر اپنی فیملی اور سامان کے ساتھ بیٹھے تھے۔ اسے ایک بینچ پر جگہ مل گئی۔ ایک باریش شخص نے تصدیق کی کہ ملتان کی گاڑی یہاں لگے گی۔ دو گھنٹے بعد وہ اٹھا اور پلیٹ فارم پر سیدھا چلتا واشنگ لائن کی طرف نکل گیا۔ ایک مزار کے پاس شکستہ دیوار سے گزر کے وہ پھر سڑک پر آ گیا۔

اب اسے بھوک لگ رہی تھی۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ خطرے سے باہر نکل آیا ہے۔ اب کوئی اس کا سراغ نہیں لگا سکتا تھا۔ لاٹری میں نکلنے والی رقم کا اندازہ کرنے کے بعد اب وہ صحیح رقم کا حساب کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ایک کیبن والے ہوٹل کا انتخاب کیا۔ خالی کیبن میں بیٹھ کے اس نے پردہ برابر کیا تو ایک لڑکا آ گیا۔ ''کیبن فیملی کے لیے ہے.....''

''پتا ہے مجھے.....'' اس نے سو کا نوٹ لڑکے کو تھما دیا۔ ''نسواری برقع میں آنے والی کو ادھر لے آنا۔ شہاب نام ہے میرا..... لیکن پہلے مجھے کھانا لا دے، جو بھی اچھا ہو۔''

جب آدھے گھنٹے بعد وہ وہاں سے نکلا تو اسے معلوم ہو چکا تھا کہ ڈالر کا ریٹ بدلا نہ ہو تو اس کے پاس پورے بارہ لاکھ ستائیس ہزار روپے ہیں۔ چار پانچ سو اوپر نیچے.....

وہ اپنی گلی میں داخل ہوا تو مغرب ہو چکی تھی۔ اس نے احتیاطاً گلی کا جائزہ لیا۔ خطرے کا مبہم سا احساس اسے محتاط رہنے پر اکساتا تھا۔ گھر کے اندر بھی سب ٹھیک تھا۔ ماں سالن بھون رہی تھی۔ یاسمین ٹی وی پر کوئی ڈراما دیکھ رہی تھی اور اس کا باپ بستر پر لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔ وہ سیدھا جا کے پیروں کی طرف بیٹھ گیا۔ ''کس فکر میں ہیں ابا......؟''

ماں نے چلا کے کہا۔ ''اب پوچھ رہا ہے سارا دن باہر گزار کے..... رکشا کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ تھانے میں کھڑا ہے، تیرے ابا کی کمر میں چک پڑ گئی ہے..... کل سے تو چلائے گا رکشا؟''

وہ ہنس پڑا۔ ''ارے ماں..... تو کیوں فکر کرتی ہے..... رکشا بھی آ جائے گا ٹھیک بھی ہو جائے گا اور ابا کو ابھی کوئی ضرورت نہیں کام کرنے کی..... اللہ نے ہماری سن لی ہے۔''

یکلخت وہ سب کی سوالیہ نظروں کا مرکز بن گیا۔ ان نظروں میں بے یقینی تمسخر اور طنز سب کچھ تھا۔

اس نے بیگ میں ہاتھ ڈال کے پہلے سے الگ کیے ہوئے چار لاکھ روپے کے مساوی ڈالر نکالے اور باپ کے قریب رکھ دیے۔ اس کا اثر وہی ہوا جو متوقع تھا۔ اس کا باپ کمر کی چک کے باوجود اٹھ کے بیٹھ گیا۔ یاسمین نے ٹی وی کو خاموش کر دیا۔ ماں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے اٹھی اور قریب آ کے ان عجیب و غریب نوٹوں کو دیکھتی رہی۔

''یہ..... یہ ڈالر ہیں..... سو سو کے نوٹ۔'' اس کا باپ خوف زدہ لہجے میں بڑبڑایا۔

''ہاں ابا..... دس ہزار روپے پاکستانی ہر نوٹ کے..... یہ چار لاکھ روپے ہیں۔'' اس نے مسرت سے کہا۔

''لیکن..... تیرے پاس کہاں سے آئے......؟''

باپ کے لہجے میں شک سے زیادہ خوف تھا۔

''فکر مت کرو ابا..... کوئی ڈاکا نہیں ڈالا میں نے..... مجھے نوکری مل گئی ہے بہت اچھی..... دبئی میں۔''

کسی نے اس پر اعتبار نہیں کیا۔ ''اور..... کام شروع کرنے سے پہلے انہوں نے چار لاکھ دے دیے تجھے؟''

''یہ ایڈوانس ہے ابا..... ہر مہینے میری تنخواہ میں سے بیس ہزار کٹ جائیں گے، بیس مہینے میں اور پھر......''

''دیکھ مجھے پاگل مت سمجھ..... ایسا کون سیٹھ ساہوکار

ہے جس نے کسی کی ضمانت کے بغیر تجھے اتنی بڑی نوکری دے دی، صرف ایک بی اے پاس کو...... آخر کتنی بڑی تنخواہ دے گا وہ کہ تو ہر مہینے بیس ہزار قرض چکا دے...... پھر تیرے پاس کیا بچے گا؟"

"ابا حوصلہ رکھو، میں سب بتاتا ہوں۔ میرا ایک اسکول کا کلاس فیلو ہے دبئی میں...... بہت بڑی کمپنی ہے العظیم...... تم معلوم کر لینا۔ اس میں منیجر لگا ہوا ہے۔ نام ہے زیڈ یو صابری...... ضمیر صابری...... ساڑھے تین ہزار ملازم ہیں اُن کے...... آج وہ مل گیا تو سارا دن اس کے ساتھ رہا۔ اس کو تمام حالات بتائے تو اس نے کہا کہ تم میرے پاس آجاؤ۔ تنخواہ ہوگی پچاسی ہزار پاکستانی روپے۔ وہاں یہ زیادہ شمار نہیں ہوتی۔ ان کے الیکٹرانکس ڈویژن میں اسسٹنٹ منیجر کی جاب ہے۔ میں نے کہا کہ میرے پاس تو کرائے کے پیسے نہیں...... اور گھر کے حالات بتائے تو اس نے کہا کہ ایڈوانس لے لو...... میں منظور کر سکتا ہوں۔ وہ خود تو ساری دنیا میں پھرتا ہے۔ ڈالر، پاؤنڈ ساتھ رکھتا ہے ورنہ لے سکتا ہے کہیں سے بھی...... تو اس نے ڈالر دے دیے...... اب کل ہم کسی بھی منی چینجر سے ڈالر کے بدلے پاکستانی روپے لے لیں گے...... اور......" اس نے یاسمین کی طرف دیکھ کر قہقہہ لگایا۔ "کل ہی ہم جائیں گے اس کے سسرال...... یہ بتانے کہ بندوبست ہو گیا ہے...... ابھی تو دس دن باقی ہیں...... آئیں اور اپنی امانت لے جائیں۔"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں بے یقینی کا بوجھل پن آہستہ آہستہ یقین کی بے پایاں مسرت میں بدلتا چلا گیا۔ اس کی ماں کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کے ساتھ لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "شکر ہے تیرا میرے معبود......" اس کے باپ نے نوٹ اٹھا کے اور الٹ پلٹ کے دیکھے اور پھر رشید کو گلے لگا لیا۔ "رب نے میری سن لی......" اس نے گلوگیر لہجے میں کہا اور پھر نوٹ بیوی کو تھما دیے۔ ماں نے رشید کا ماتھا چوما۔ یاسمین بت بنی بیٹھی رہی۔ اسے معلوم ہی نہ تھا کہ آنسو خودبخود اس کے رخساروں پر لکیریں بنائے جا رہے ہیں۔

رات کو رشید کی سونے کی ہر کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ اس کا دل اَن گنت نامعلوم خدشات، امکانات اور دماغ طوفانی سمندر میں اٹھنے والی لہروں جیسے سوالات کی زد میں تھا۔ وہ خاموشی میں اپنے دل کو دھڑکتا سن سکتا تھا۔ ماسٹر کی صورت کے آخری زندہ لمحے کا عکس اس کے تصور میں ٹھہر گیا تھا۔ باقی سب خیال و امکان کے منتشر تھے۔ اس وقت ماسٹر کا بے جان جسم کہاں ہوگا؟ اپنے دائمی مدفن میں یا کسی اسپتال کی ٹیبل پر...... پوسٹ مارٹم رپورٹ کے انتظار میں...... اور اس کی بیٹی...... جو شادی شدہ تھی اور کہیں الگ رہتی تھی۔ کیا اسے اندازہ ہوگا کہ ماسٹر کا قتل ہوا ہے؟ قتل ہوا ہے تو کیوں اور کس نے کیا ہے؟ کیا ایک گندے نالے کے کنارے ناجائز بنے ہوئے مکان میں رہنے والے اسکول ٹیچر کے لیے قانون حرکت میں آئے گا؟

خطرہ تھا تو اس بیٹے کی طرف سے جس کی یہ کمائی تھی۔ ناجائز کمائی بھی کمائی تو ہوتی ہے۔ وہ اور اس بینک کا وہ بددماغ کلرک...... وہ دونوں شریکِ کار ہوں گے۔ ممکن ہے دونوں کسی زیادہ طاقتور ڈان یا مافیا گنگ کے لیے کام کرتے ہوں...... جیسا کہ فلموں میں دکھایا جاتا ہے۔ لیکن وہ رشید تک کیسے پہنچ سکتے ہیں؟ وہ خود ماسٹر سے برسوں بعد اتفاقیہ ملا تھا۔ لیکن وہ کلرک ماسٹر کے بیٹے کو بتا سکتا ہے کہ تمہارے باپ کے ساتھ کوئی نوجوان تھا۔ حلیہ بھی دیکھا تھا اس نے...... پولیس فرضی خاکے جاری کر دیتی ہے۔ ماسٹر کی بیٹی کی کوئی سنے نہ سنے...... اس کے بیٹے کی ضرور سنے گی۔ ایسا کون مائی کا لال پیدا ہو گیا جو ہمارے مال پر ڈاکا ڈالے۔

صبح سب کی صورت پر شب بیداری کے آثار عیاں تھے لیکن ان کے جذبات بدلے ہوئے تھے۔ اچانک گویا گھر کا چہرا ہو گیا تھا۔ اس کی سنی جا رہی تھی۔ مانی جا رہی تھی۔ رشید نے باپ کو آرام کرنے کا کہا اور خود ڈالرز کو پاکستانی رقم میں بدلوانے گیا۔ گھر سے نکلتے ہوئے اسے سو فیصد یقین نہ تھا کہ وہ چار لاکھ کے ساتھ واپس آئے گا یا پولیس کے ساتھ ہتھکڑی پہن کے۔ منی چینجر بھی تو بہت ہوشیار لوگ ہوتے ہیں اور ان سے ہی تمام اسمگلروں کے رابطے ہوتے ہیں۔ ڈالر سیریل نمبر میں نہیں تھے مگر وہ راتوں رات سب کو خبردار کر سکتے ہیں کہ بارہ لاکھ کے ڈالر لانے والے کو روک لو، مگر وہ تو صرف چار لاکھ لے کر جا رہا تھا۔

دوپہر سے پہلے گیارہ بج کے چالیس منٹ پر ایک چھوٹی سی دکان میں کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھے شخص نے موبائل فون پر بات کرتے ہوئے ڈالر لے کر پاکستانی چار لاکھ روپے یوں اس کے حوالے کر دیے جیسے سو کے نوٹ کی چینج دی ہو۔ یہ پانچ ہزار کے نوٹوں کی بندھی ہوئی آٹھ گڈیاں تھیں۔ نہ رسید نہ کہیں دستخط نہ سوال نہ جواب...... رشید نے انہیں شاپنگ بیگ میں ڈالا اور باہر نکل آیا۔ کاؤنٹر کے پیچھے سے رقم دینے والا اس کے بغیر فون پر کسی سے بات کرنے میں

مصروف رہا۔

پھر وہ سب کچھ ہو گیا جو رشید کے ایک فیصلے کی قوتِ خرید میں تھا۔ موقع تقدیر نے فراہم کیا تھا۔ فیصلہ اس نے بلاتاخیر کیا تھا اور زندگی کو داؤ پر لگا کے کیا تھا۔ یاسمین کی رخصتی ہوگئی۔ اسے اندازہ ہوا کہ یاسمین کا شوہر اچھا آدمی تھا اور اگر چار لاکھ کا بندوبست نہ ہوتا تب بھی وہ یاسمین کو لے جاتا۔ وہ یاسمین کو پسند کرتا تھا۔ اس نے اپنے ماں باپ کو سادگی سے رخصتی پر راضی کر لیا تھا۔ شادی کے ہنگامے میں رشید سب بھول گیا تھا۔ اب اسے نہ خطرے کا وجود محسوس ہوتا اور نہ ماسٹر کے قتل پر ندامت کا احساس تھا۔ یہ کون سی ماسٹر کی حق حلال کی کمائی تھی۔ اس کی اپنی زندگی کے دن تو یوں بھی پورے ہو گئے تھے۔ اب تو وہ بیٹے کے ہاتھوں میں کھیل رہا تھا جس نے باپ کی عزت آبرو، زندگی سب کو داؤ پر لگا رکھا تھا۔ وہ بیٹا نہ باپ کی موت پر دکھی ہوگا اور نہ اس رقم کے جانے سے برباد ہوگا۔ وہ پھر کما لے گا، باپ کی جگہ اور کسی کو آلۂ کار بنا لے گا۔

صرف ایک ہزار لے کر پولیس نے رشید کے باپ کا رکشا چھوڑ دیا تھا اور دو ہزار خرچ کر کے وہ بالکل ٹھیک ہو گیا تھا مگر شادی کے ہنگامے میں وہ کمائی کے لیے نہیں نکلا۔ پھر رشید نے ایک اور فیصلہ کیا۔ اس نے مزید تین لاکھ ملا کر رکشا کے بجائے باپ کو ٹیکسی دلوا دی۔ اب وہ زیادہ آرام سے زیادہ کما سکتا تھا۔ جو خیال اب رشید کو پریشان کرنے لگا تھا، وہ دبئی کی نوکری والے جھوٹ کا تھا۔ دبئی جانا تو ناممکن تھا۔ اس نے طے کیا کہ وہ لاہور چلا جائے اور دیکھے کہ باقی پانچ لاکھ سے کیا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے مگر اس سے پہلے کہ وہ لاہور جاتا...... اس کی ملاقات نیلوفر سے ہوگئی۔ وہ طارق روڈ کے ایک شاپنگ سینٹر میں اچانک سامنے آگئی۔ سامنا ہوتے ہی وہ دونوں رک گئے۔ ”نیلی......“ رشید نے چند سیکنڈ ساکت و جامد رہنے کے بعد کہا۔ ”کیسی ہو؟“

”جیسی بھی، جیسی نظر آرہی ہوں۔ غنیمت ہے کہ تم نے پہچان لیا۔“ وہ تلخی سے بولی۔

”میں...... بھول سکتا تھا تمہیں......؟“ وہ ہکلایا۔ وہ طنز سے بولی۔

”اچھا؟ کتنا یاد کیا مجھے۔ کتنی بار ملنے آئے۔ سامنے کھڑے ہو کے باتیں بناتے ہو۔“

”نیلی پلیز...... میرے ساتھ آؤ، ہم کہیں بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔“

”بات کرنے کو اب کیا رہا ہے؟“ وہ شیم مزاحمتی لہجے میں بولی۔

رشید نے ہمت کر کے اس کا ہاتھ پکڑا اور کھینچ لیا۔

”یہی تو بتانا ہے تمہیں...... کم آن۔“

وہ کھنچتی چلی آئی۔ ایک آئس کریم پارلر کے کیبن میں بیٹھ کے نیلوفر نے اس کے موبائل فون کو دیکھا۔ ”خاصا مہنگا والا ہے...... لیکن مجھے فون کرنے کے لیے نہیں ہے۔ میرا نمبر ملتا ہی نہیں ہوگا اس سے۔“

”طعنے مت دو۔“ رشید نے اس کا موبائل فون اٹھا لیا۔ پھر اپنا کھول کے اس کی سم نکالی اور اس میں نیلوفر کی سم لگا دی۔ ”اب ملے گا تمہارا نمبر۔“ اس نے نیلوفر کا معمولی قیمت کا فون اپنے پاس رکھ لیا اور اس کے احتجاج کی پروا نہیں کی۔ ”اب یہ تمہارا ہے۔“

”میں نہیں لوں گی یہ تحفہ......“

”آج رات اور ہر رات بارہ بجے میری کال آئے گی۔ وہ وقت بدل گیا ہے نیلی جو میرے تمہارے درمیان دیوار تھا۔“

”کیسے بدل گیا ہے، کوئی لاٹری نکل آئی ہے۔“

”یہی سمجھو، ہم نے یاسمین کو رخصت کر دیا ہے۔ میں نے باپ کو ٹیکسی دلوا دی ہے۔ اب میں تمہیں حاصل کر سکتا ہوں۔ میری راہ میں ذمے داریوں کی دیوار حائل نہیں، بتاؤ میں تمہارے گھر اپنے والدین کو لے کر کب آؤں؟“

نیلی کے چہرے پر اندر کی خوشی ایک حیا آلود مسکراہٹ بن کر نمودار ہوئی۔ ”مجھے یقین نہیں آتا۔“

”اس میں یقین نہ کرنے والی کون سی بات ہے؟“

”تم نے ناکامی سے بددل ہو کے اور مسائل سے گھبرا کے مجھے چھوڑ دیا تھا پھر یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا؟“

وہ ہنسا۔ ”چھ مہینے کو تم دو دن کہتی ہو۔“

”کہنا پڑتا ہے، ورنہ میرے لیے ہر دن ایک سال جیسا تھا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ تم ایسے اچانک میری زندگی سے نکل سکتے ہو اور مجھے یوں بھلا سکتے ہو جیسے میں تھی ہی نہیں۔“

”دیکھو اب خدا کے لیے یہاں رونا مت شروع کر دینا۔ تمہارے آنسو پونچھ نہیں سکتا میں...... اور دیکھ بھی نہیں سکتا۔“

اس نے سر ہلایا اور دوپٹے کے کونے سے آنکھوں کے گوشے خشک کیے۔ ”لیکن تم نے ایسا کیا...... یہ ظلم کیا میرے ساتھ...... مجھے خواب دے کر بھاگ گئے۔ کیا کیا خیال نہ آئے میرے دل میں...... رات میری دشمن تھی......

بڑے بھیانک مناظر دکھاتی ہے۔"

"چلو چھوڑو میں اب آ گیا ہوں نا تمہارے پاس...... تمہارے سامنے ہوں۔"

وہ سیدھی ہو کے بیٹھ گئی۔ "مسٹر رشید! میرے سامنے تو آپ ایک مہینے بعد ہی آ گئے تھے۔ میں نے دیکھ لیا تھا تمہیں، ایک ویگن کے دروازے سے لٹک کر کہیں جاتا ہوا...... میں اسٹاپ پر کھڑی تھی، میں نے رکشا لے کر پیچھا کیا مگر ویگن نکل گئی، میرا بھر جانے والا زخم پھر رسنے لگا۔ میں نے صبر کیا تھا کہ تم سے ملنا ایک خواب تھا۔ حادثہ تھا مگر تم زندہ اور اسی شہر میں تھے۔"

"اچھا معاف کر دو مجھے نیلی۔"

مگر وہ بولتی گئی۔ "اور مت پوچھو کتنا غصہ آیا مجھے خود پر...... میں نے تمہارا گھر نہیں دیکھا تھا، پتا نہیں، یہ پوچھا تھا کبھی...... تمہارے ساتھ کہاں نہیں گئی تھی، سوائے ہوٹل میں کمرے کے...... میں فون نہیں کر سکتی تھی تمہیں کیونکہ تب تمہارے پاس ایسا معمولی سا سیٹ بھی نہیں تھا اور آج یہ پندرہ بیس ہزار کا سیٹ مجھے دے رہے ہو، کیسے آیا یہ انقلاب؟"

"اچھا چلو اٹھو یہاں سے...... کہیں چل کے بیٹھتے ہیں وہاں...... میں سب بتاتا ہوں۔"

ہمیشہ کی طرح اس نے رشید کی بات مان لی، کسی بہانے کے بغیر...... اور اس کے ساتھ رکشے میں بیٹھ گئی۔ ایک بار پھر اس نے نیلی کے جسم کی نرم حرارت اور اس کی مقناطیسی کشش محسوس کی اور اسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ آخر کیسے وہ اچانک فیصلہ کر سکا کہ اسے نیلی کو چھوڑ دینا چاہیے کیونکہ وہ اسے کچھ بھی نہیں دے سکتا۔ یہ توقعات رکھنے والی محبت تھی، رفاقت مانگنے والی، تحفظ اور دائمی اپنا پن مانگنے والی...... اپنا گھر اور اپنے بچے اور سب کا محفوظ مستقبل اور ان کی خوشیاں مانگنے والی...... اب وہ کیسے بتائے کہ جدائی کا زہر اس نے کیسے پیا۔

وقت ایک بار پھر پیچھے گیا۔ سمندر وہی تھا۔ لہروں کی تڑپ وہی تھی۔ اس پر سے گزر کے آنے والی ہوا کی نمکین نمی وہی تھی۔ وہ دو فٹ کی دیوار پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھے تھے جیسے پہلے بیٹھتے تھے۔ ان کے سامنے لہروں کے جھاگ میں اس وقت بھی کچھ لوگ تھے۔ بیوی بچوں کے ساتھ لہروں کی یلغار سے کھیلتے...... ایک انہی جیسا جوڑا ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے آہستہ آہستہ ریت پر چلتا ہوا گزرا...... نوجوان نے جوتے ہاتھ میں اٹھا رکھے تھے اور پائنچے چڑھا لیے تھے۔

"اب کہنے کو کچھ نہیں تھا تو یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟" نیلی نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"یہ اتنا آسان نہیں تھا میرے لیے بھی......" وہ بولا۔ "تم کو بھول جانا...... لیکن یاد رکھ کے کیا کرتا، اس کھیل میں کب تک تم کو الجھائے رکھتا، اپنی زندگی تو خراب تھی، تمہاری بھی کرتا۔ چلو ہم بھول جاتے ہیں سب...... آنے والے کل کی بات کرتے ہیں۔"

"کل کیا ہوگا؟"

"وہ سب جو ہونا چاہیے۔ میرا تمہارا ساتھ، ایک گھر، اب مجھے لگتا ہے کہ تقدیر اک پُرپیچ راستہ ہے...... کون جان سکتا ہے کہ اگلے موڑ پر کیا ہوگا۔ اب میں امید ضرور رکھ سکتا ہوں کہ وہ گھر ایک کوٹھی ہو، سرسبز لان اور رنگین پھولوں والی...... جس کے پورچ میں ایک کار کھڑی ہو، بلکہ دو...... میری اور تمہاری، اب خواب دیکھنا جرم نہیں لگتا، دیکھو ہم پھر ساتھ ہیں۔"

"بتاؤ گے نہیں کہ ایسا کیا ہوا جس نے تمہاری سوچ بدل دی۔ میں تو ابھی اسی پرائمری اسکول میں پڑھاتی ہوں۔"

رشید نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "تم چاہو تو ابھی ملازمت چھوڑ دو، یہ بتاؤ کہ تمہارے والدین مان جائیں گے۔"

اس نے ہاتھ چھڑا لیا۔ "جواب پہلے بھی دے چکی ہوں میں، میرے کم سے کم چار رشتے انہوں نے قبول نہیں کیے، کیونکہ میں راضی نہ تھی۔ یہ اکلوتی بیٹی ہونے کا فائدہ ہے۔ مگر تم سے بھی وہ پوچھیں گے تو بھی کہ کرتے کیا ہو؟"

رشید نے محسوس کیا کہ اس سوال کے جواب سے بچا نہیں جا سکتا۔ سرِدست اس کے پاس وہی کہانی تھی جو اس نے اپنے گھر میں سنائی تھی۔ اس نے سکون اور اعتماد سے وہ دہرا دی۔

"تو تم دبئی جا رہے ہو، شادی کے لیے واپس آؤ گے؟"

"میں...... شادی کر کے بھی جا سکتا ہوں۔ اگر پندرہ بیس دن میں تمہارے والدین رخصتی پر آمادہ ہوں۔"

"تم جانتے ہو وہ فضولیات سے دور رہتے ہیں۔ ایک پیش امام بیٹی کی شادی میں کیا دھوم دھڑکا کرے گا۔ وہ تو دو گواہوں کی موجودگی میں میرا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے کر کہیں گے کہ فی امان اللہ...... میری بیٹی کو خوش رکھنا، اسے میں صرف دعائیں دے رہا ہوں اور اس کا جہیز وہ تعلیم و

تربیت ہے......"

"وہ میں جانتا ہوں، ایسی صورت میں تم کچھ دن میرے والدین کے ساتھ رہتا پھر میں دبئی بلا لوں گا تمہیں۔"

نیلی نے اس کے ہاتھ سے اپنا موبائل لے لیا، کچھ کہے بغیر اس نے اپنی سم رشید کے موبائل فون سے نکال لی۔

"یہ کیا کر رہی ہو؟"

نیلی نے اسے نظر جما کے دیکھا۔ "یہ تحفہ میں گھر کیسے لے جاسکتی ہوں رشید، خود سوچو۔"

رشید لاجواب ہوگیا۔ "اچھا، شادی کے بعد تو میں تمہیں نیا دلا دوں گا اس سے بھی قیمتی۔"

نیلوفر سمندر کو دیکھتی رہی پھر ایک دم اس کی طرف پلٹی۔ "تم نے جھوٹ کیوں بولا مجھ سے رشید؟" اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

وہ چونکا۔ "جھوٹ؟ کیا جھوٹ بولا میں نے؟"

"سب...... اول تا آخر...... تم نے مجھے ایک جھوٹی کہانی سنائی۔ مانا میں بہت بے وقوف ہوں، لیکن تم سے مجھے یہ امید نہ تھی کہ تم بھی بے وقوف بناؤ گے۔ میں تمہیں مجرم کی طرح کٹہرے میں کھڑا کر کے اپنے سوالوں سے جھوٹا ثابت کرنا نہیں چاہتی، میں ایک موقع دوں گی تمہیں...... مجھے سچ معلوم ہونا چاہیے، یہ حق ہے میرا......" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

رشید کا رنگ فق ہوگیا۔ وہ ایک بند گلی میں پھنس گیا تھا جہاں سے وہ آگے نہیں جاسکتا تھا۔ جب تک راستہ نہ ملے پیچھے لوٹ کر جانا اور بھی مشکل تھا۔ ناممکن تھا۔ ان کے ماں باپ بہت سادہ لوح تھے۔ انہوں نے کسی شک کا اظہار کیے بغیر ہی اس کی بات مان لی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ بیٹا تھا یا شاید اس لیے کہ اعتماد کرنا ان کی مجبوری تھی۔

رشید نے ایک گہری سانس لی اور نیلی کو سچ بتا دیا۔ سارا سچ...... اول تا آخر...... وہ کچھ نہیں بولی۔ اس کی آنکھوں نے کچھ نہیں کہا، پُرسکون چہرے کی طمانیت نے کچھ نہیں کہا۔

جب خاموشی کا ایک طویل بوجھل وقفہ آیا تو رشید نے پہلو بدل کر کہا۔ "کیا خیال ہے اب چلیں؟"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اپنے موبائل سے مجھے رنگ دو۔ نمبر میرے پاس آجائے گا۔"

رشید نے تعمیل کی۔ "رات کو بات کریں گے۔"

"میں وعدہ نہیں کرسکتی۔" وہ آگے آگے چلنے لگی۔

"تو کل اسکول میں...... جب فراغت ہو مجھے بس کال دے دینا۔" رشید نے ایک رکشا روک لیا۔ اب شام ڈھل رہی تھی۔ رشید خوش اور مطمئن تھا کہ جس دست غیب نے اس کی مدد کی تھی وہی اس کے مستقبل کے راستے بھی بنا رہا تھا۔ نیلی اسے پھر مل گئی تھی۔

رات وہ خوابوں اور خیالوں میں گم مختصری چھت پر ٹہلتا ہوا چاند کو دیکھ رہا تھا جو آخری تاریخوں میں اجڑا ہوا لگتا تھا۔ اس کا ذہن بہت سے مسائل میں الجھا ہوا تھا۔ اب اسے دبئی نہیں جانا تھا۔ لیکن لاہور تو وہ جاسکتا تھا اور نیلی کو بھی اپنے ساتھ لے جاسکتا تھا۔ اسے صاف بتا سکتا تھا کہ لاہور زیادہ محفوظ ہے۔ وہاں بھی وہ سب ہوسکتا تھا جو وہ یہاں کرنا چاہتا تھا۔ نیلی بڑی مختلف لڑکی تھی۔ اگر وہ کہتا کہ لاہور میں رکشا چلائے گا تو وہ کوئی اعتراض نہ کرتی۔

اس پرائمری اسکول میں رشید نے صرف چھ ماہ پڑھایا تھا جہاں نیلوفر سیکنڈ ہیڈ مسٹریس تھی۔ یہ بس نام کا عہدہ تھا جس کی اضافی تنخواہ نہیں تھی۔ جس دن ہیڈ مسٹریس نہیں آتی تھی وہ اس کی ذمے داری سنبھال لیتی تھی۔ حالات انہیں قریب لے آئے اور صرف تین مہینے بعد رشید کے کہنے پر وہ اس سے ملنے کلفٹن آگئی۔ اس نے صاف بتا دیا کہ اس کی پرورش انتہائی مذہبی گھر میں ہوئی ہے چنانچہ اعلیٰ تعلیم اور ملازمت کے باوجود وہ آزاد خیال نہیں ہے کہ اس کے ساتھ ہر جگہ چلی جائے۔ وہ کئی بار کلفٹن کے ساحل پر آئی لیکن وہ ہمیشہ برقع میں ہوتی تھی اور اپنا چہرہ سمندر کی طرف کیے بیٹھی رہتی تھی۔

ان کے درمیان شادی کے عہد و پیمان بھی ہو گئے تھے۔ رشید نے بھی صاف کہا تھا کہ اس کا باپ ایک رکشا ڈرائیور ہے اور اس کی ایک بہن ہے جس کی شادی اس لیے رکی ہوئی ہے کہ لڑکے والے جہیز کی فہرست تھما چکے ہیں اور یہ مطالبہ پورا کرنے کے لیے ان کے پاس ابھی تین چار لاکھ نہیں ہیں۔ چنانچہ وہ نیلی سے شادی کرے گا تو بہن کی رخصتی کے بعد...... نیلی کو جلدی نہیں تھی لیکن جب رشید کو ڈھنگ کی ملازمت نہ ملی اور باپ کا رکشا نہ رہا تو بددلی مایوسی اور ڈپریشن کی حالت میں اس نے اچانک یک طرفہ طور پر فیصلہ کرلیا کہ وہ نیلی کو چھوڑ دے گا۔ آخر وہ کب تک آس لگائے بیٹھی رہے گی۔ اس کے معاملات تو حل ہونے والے نہیں۔

حالات تو اس نے زندگی کی بازی لگا کے ٹھیک کر لیے تھے لیکن اب اتنی دیر ہوگئی تھی کہ لوٹ کے نیلی کے خوابوں

کی تعبیر دینے کے لیے جانا اسے بے سود لگا۔ اپنی بے حسی خود غرضی اور بے رحمی پر اب نیلی کے سامنے جاکے شرمندہ ہونا اور اس سے معافی مانگنا بھی ممکن نہ رہا تھا۔ وہ اس کے منہ پر تھوک دے گی۔ ایک تھپڑ مار کے کہے گی کہ تم نے یک طرفہ فیصلہ کیا، سزا میں نے بھگت لی اب کس منہ سے میرے سامنے آئے ہو۔ شرم اور احساس ہوتا تو ڈوب مرتے کہیں...... اور کیا پتا وہ اب کہاں ہو، کس کے گھر میں ہو، اسے بھی تو حق حاصل تھا اپنی زندگی کے فیصلے کا...... وہ کیوں اور کس امید پر انتظار کرے گی لیکن تقدیر کے راستے بنانے بگاڑنے والے زبردست نادیدہ ہاتھ نے از خود پٹری بدل کے انہیں آمنے سامنے لا کھڑا کیا تھا اور ناقابلِ یقین طور پر وہ سب جو ہو چکا تھا درمیان سے نکل گیا تھا، جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

نیلی کو اپنے ساتھ لاہور لے جانے کا معاملہ ایک چیلنج تھا، اس کے پاس اب بھی پانچ لاکھ کے قریب رقم تھی۔ جو بہت زیادہ تو نہ تھے مگر کم بھی نہ تھے۔ وہ خود نہ چلائے لیکن کرائے پر دو رکشا چلا سکتا تھا۔ انہیں بہ آسانی بیس ہزار مل جاتے۔ پانچ دس ہزار کی نوکری وہ کر سکتا تھا۔ باعزت کہلانے کے لیے یہ مزدوری تھا ورنہ اپنے باپ کی طرح رکشا چلانے سے وہ روز کے ہزار بھی کما سکتا تھا۔ نیلی کو بھی تعلیم اور تجربے سے اچھی نوکری مل جاتی تو چالیس پچاس میں وہ خوش رہ سکتے تھے۔ وہ کون سی کوٹھی اور کار مانگ رہی تھی۔ آگے تقدیر میں کیا ہے۔

اس کے خیالات کی رو کسی کے دروازہ بجانے کی آواز سے ٹوٹی۔ کوئی یوں دروازہ پیٹ رہا تھا جیسے توڑ ڈالے گا اور پھر ایسا ہی ہوا۔ معمولی چٹخنے اور کنڈی اس حملے میں مزاحمت نہ کرسکے جو پولیس چادر اور چار دیواری کی ایسی تیسی کرتے ہوئے ہر جگہ کرتی تھی۔ وہ دندناتے گالیاں بکتے اندر آئے اور ایک نے رشید کے باپ کو گردن سے دبوچ کے باہر دھکیلا۔ وہ دروازے سے ٹکرایا اور باہر جا گرا۔ اس کی ماں نے صرف ایک چیخ ماری تھی۔ پھر اسے کسی نے دیوار پر اچھال دیا اور وہ وہیں گر کے بے حرکت ہوگئی۔ رشید نے سامنے آکے برہمی کا اظہار کرنے کے لیے منہ کھولنا چاہا تھا لیکن اس پر دو پولیس مین پل پڑے۔ مکوں اور ٹھڈوں سے وہ فرش پر لڑھکتا رہا اور ان کی فحش کلامی سنتا رہا۔ ''یہی ہے وہ......'' اس نے گالیوں کے درمیان سنا۔ پھر باپ بیٹا کو پولیس نے موبائل میں پھینکا اور دم بخود سہمے ہوئے متجسس پڑوسیوں کی نظروں کے سامنے انہیں تھانے لے گئی۔

تھانے پہنچنے سے قبل ہی رشید اپنی گرفتاری کی وجہ سمجھ چکا تھا۔ اس کا چلانا بے کار گیا تھا کہ مجرم وہ ہے تو اس کے بوڑھے باپ کو کیوں پکڑتے ہو، کسی دشواری کے بغیر انہوں نے گھر میں سے باقی رقم برآمد کر لی۔ باپ بیٹا رات بھر تفتیش کے لیے ذبح کیے ہوئے بکروں کی طرح ساتھ ساتھ الٹے لٹکے رہے اور بلبلاتے پھڑکتے رہے۔ صبح ہونے سے پہلے رشید سچ بول چکا تھا۔ جب انہیں کپڑے پہنا کے حوالات کے سیلن فرش پر پھینکا گیا تو رشید کا جوڑ جوڑ درد کی شدت سے رو رہا تھا۔ مگر وہ اپنے باپ کو دیکھتا رہا۔ وہ مرنے والا تھا۔ بارہ لاکھ دینے والے ماسٹر کی موت بہت آسان تھی۔ اسے مارے جانے کی وجہ بھی معلوم تھی۔ رشید کے باپ کو مرتے دم تک پتا نہ چلا کہ اس کا جرم کیا تھا۔

اس دن چند اخبار والے آئے اور چند سینئر افسران...... انہوں نے کہا کہ باپ بیٹا ایک اسکول ماسٹر کے قتل میں ملوث تھے اور اس کے قبضے سے بیس لاکھ چھین کر لے گئے تھے جو اس کے بیٹے نے باہر سے بھیجے تھے۔ ابھی تک پولیس کو کچھ برآمد نہیں ہوا۔ انہیں تین دن پہلے کسی کی مخبری پر گرفتار کیا گیا تھا۔ گزشتہ رات بڈھے نے ازار بند سے پھندا لگا کے خودکشی کر لی۔ اول تا آخر جھوٹ پر بنی یہ کہانی اسی طرح اخبارات میں شائع ہوئی۔ اس دن رشید کے ساتھ حوالات میں بھی شرافت کا برتاؤ رہا۔

مقدمہ سیشن کورٹ میں جانے سے پہلے اسے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ اس کی نیم پاگل ماں کو اس کی بہن یاسمین اور اس کا شوہر اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ بھائی کے اعمال کی سزا سے بہن محفوظ رہی تھی، ورنہ پولیس کا کیا ہے یاسمین کا جہیز بھی اٹھا لیتی اور شوہر کو صرف بدنامی کا احساس ہوتا تو وہ یاسمین کو گھر بھیج دیتا لیکن وہ اچھا آدمی تھا۔ واقعی یاسمین کو چاہتا تھا کہ اس کی ماں کو لے گیا اور بعد میں جب خود اس کے ماں باپ یہ برداشت نہ کرسکے تو وہ بیوی کے ساتھ میکے والے گھر میں آگیا لیکن بہن یا بہنوئی ایک بار بھی رشید سے ملنے نہیں آئے۔

پہلی پیشی سے دو دن قبل اسے رات کو جگایا گیا۔ اس وقت وہ جوڈیشل ریمانڈ پر جیل میں تھا۔ پولیس کئی بار اسے قانونی تقاضے پورے کرنے کے لیے جیل لے جا چکی تھی۔ اعترافِ جرم کے باوجود رشید کو سرکاری وکیل فراہم کر دیا گیا تھا۔ وہ ایک بیزار صورت بوڑھا تھا جو صرف ایک بار اس سے ملا تھا اور اسے برا بھلا کہہ کے چلا گیا تھا۔ یہ جان کر اسے حیرانی ہوئی کہ کوئی اس سے ملنے آیا ہے۔ اسے پہلے جیلر کے

کمرے میں لے جایا گیا۔ جیلر کا وہاں موجود ہونا بھی عجیب تھا۔ رشید کے پیروں سے جان نکلنے لگی۔ کہیں انہوں نے اسے پھانسی دینے کا فیصلہ تو نہیں کرلیا ہے، قانون کو یہاں کون پوچھتا ہے۔ اس کے باپ کا قتل تو پہلی رات ہی خودکشی بنادیا گیا تھا۔

جیلر نے کہا۔ ''دیکھو، میرے محلے کی مسجد کے پیش امام مولانا قدرت اللہ تشریف لائے ہیں۔''

رشید کی سمجھ میں کچھ نہ آیا، یہ نیلی کے والد کا نام تھا۔

جیلر بولتا رہا۔ ''جمعے کے جمعے اور عید بقرعید میں بھی نماز پڑھ لیتا ہوں اُن کے پیچھے۔ میرے والد ان کی بہت عزت کرتے ہیں۔ مولانا صاحب اپنی صاحب زادی کے ساتھ آئے ہیں، وہ تم سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔''

رشید جیسے کسی راکٹ کے فائر ہونے سے اُڑ گیا۔ نیلی...... وہ اس وقت کیا کہنے آئی ہے۔

''اگر تم نے ذرا بھی بدتمیزی کی تو قسم خدا کی میں وہیں آکے تمہیں گولی ماردوں گا۔ جاؤ۔''

وہ درمیانی دروازے کی طرف بڑھا۔ کیا وہ قانونی مدد فراہم کرے گی یا اس نے باپ کو راضی کرلیا ہے؟ مولانا قدرت اللہ کے شاگرد بہت تھے اور اچھے عہدوں پر بھی تھے، جیسے یہ جیلر۔

وہ باپ کے ساتھ بیٹھی تھی۔ سپاٹ چہرہ اور بے حس آنکھوں کے ساتھ...... وہ سامنے جاکے کھڑا ہوگیا۔

نیلی کی آواز کہیں دور سے آئی۔ ''میں یہ بتانے آئی ہوں کہ تمہارے جرم کی اطلاع میں نے دی تھی۔ میں نے والد کو بتایا تھا۔ انہوں نے پولیس کو بتادیا۔''

رشید کی آنکھوں کے سامنے اندھیرے میں فرش ہلنے لگا اور دیواریں ڈولنے لگیں۔ ''تم نے؟ مگر...... کیوں؟ میں نے تمہیں سچ بتایا تھا۔ کیونکہ میں محبت کرتا تھا تم سے...... تم شادی کرنے کے لیے تیار تھیں۔''

''ہاں، مگر ایک اسکول ٹیچر سے کسی بے ضمیر قاتل سے نہیں۔ میں نے ابا کو سب بتادیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ پھر اب تم کیا کروگی؟ میں نے کہا کہ وہی جو آپ کی تربیت نے سکھایا ہے۔ میرے ایمان میں شامل ہے۔ میں استغاثہ کا سب سے اہم گواہ ہوں...... جو تم نے مجھے بتایا تھا، میں لفظ لفظ عدالت میں حلفیہ بتادوں گی۔ پہلے تم کو بتانا اس لیے ضروری تھا کہ تم میرے بیان کو کسی کے دباؤ کا نتیجہ نہ سمجھو۔ مجھ پر دباؤ ہے تو صرف اپنے ضمیر کا...... چلو ابا۔''

وہ بہت بنا کھڑا اسے جاتا دیکھتا رہا۔ سچ تو اس نے بھی بولا تھا۔ جاتے ہوئے اس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ اسے ذرا خیال نہ تھا کہ اس کے سچ کی سزا رشید کو کیا ملے گی۔ اسے پھانسی کے تختے تک پہنچا کے وہ بالکل مطمئن تھی کہ اس نے کچھ غلط نہیں کیا۔

اس پر زیرِ دفعہ تین سو دو قتلِ عمد کا کیس بھی تھا اور اس میں دیگر دفعات شامل کردی گئی تھیں۔ اسے بہت کم شک تھا کہ یہ بیگار میں پکڑا جانے والا وکیل کیا اگر اسے فوجداری مقدمات میں نام کمانے والا وکیل بھی مل جاتا تو اسے پھانسی کی سزا سے نہیں بچا سکتا تھا۔ اب اس کے پاس زندگی کی مہلت بس اتنی تھی جتنی سیشن کورٹ سے سزائے موت کا فیصلہ صادر ہونے میں لگتی۔ اپیل کا حق بھی رسمی سی کارروائی تھی۔ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں اس کے پاس کہنے کو کیا تھا جو وکیل صفائی کہتا۔ یہ سب وقت کا کھیل تھا جو صبح اجل تک جاری رہ سکتا تھا اور وہ صبح بہت دور نہیں تھی۔ پھر اسے پتا چلا کہ سزائے موت پانے والے مجرموں کو پھانسی نہیں دی جارہی کیونکہ پاکستان میں اس پر بین الاقوامی دباؤ کے تحت پانچ سال تک پابندی ہے۔

اسے فراہم کیا جانے والا عمر رسیدہ اور بظاہر کاہل اور جاہل نظر آنے والا وکیل اس سے پہلے اللہ کو پیارا ہوگیا اور وہاں سے رشید کی زندگی کی لکیر جو سست کی تھی خشک ہوجانے والے دریا کی طرح پھر متحرک ہوگئی۔ اچانک ایک نوجوان وکیل اس سے جیل میں آکے ملا اور تین دن تک اس کا اعترافِ جرم سنتا رہا۔ اس نے کہا تھا کہ ''جو ہوا اس کے بیان میں ایک لفظ کا فرق نہیں ہونا چاہیے آگے فرق نکالنا میرا کام ہے۔ تم بس وہ کرتے جاؤ جو میں بتاؤں، سزائے موت نہیں ہوگی، میری گارنٹی۔''

رشید حیران ہوا۔ ''تم...... یہ کیسے کروگے؟''

''اسے میری مجبوری سمجھو یا ایک چیلنج...... میں نے ابھی وکالت شروع کی ہے۔ پرانے وکیل ہر جگہ میری راہ میں دیوار بنے ہوئے ہیں۔ ان کا نام چلتا ہے اور وہ اسی کی کمائی کھاتے ہیں۔ جتنا بڑا نام اتنی بڑی فیسیں...... مجھے تمہارے جیسے ملزموں کے کیس لینے کو کہا گیا، جو وکیل افورڈ نہیں کرسکتے تھے۔ سرکار نام کی فیس دیتی ہے، میں نے چند کیس دیکھے، پھر تمہارا کیس ملا تو مجھے لگا کہ اس میں دم ہے۔ شاید قدرت نے مجھے اور تمہیں ایک دوسرے سے اسی لیے ملایا ہے، کیا پتا تمہیں زندگی مل جائے اور مجھے شہرت...... میرا نام ساجد حسن ہے۔''

ساجد حسن نے سیشن کورٹ میں سنسنی پھیلائی۔ اس

نے کہا۔ ”یہ سب جھوٹ ہے، پولیس تشدد سے حاصل کیا گیا اعتراف جرم بے معنی بات ہے۔“

جج نے کہا۔ ”عدالت میں دیا گیا بیان بھی مختلف نہیں۔“

”مختلف کیسے ہو گا یور آنر...... اس کے سر پر ایک تلوار جو تھی، اسے کہا گیا تھا کہ بیان بدلا تو تمہاری بہن کو معاون شریکِ جرم بنا دیا جائے گا۔ وہی بہن جس کے لیے میرے موکل نے غبن کیا...... صرف غبن...... کوئی قتل نہ وہ کر سکتا تھا نہ اس نے کیا۔“

اس نے مقدمے کی ساری کہانی بدل دی، اس نے نیلوفر کے بیان کی بنیاد پر دائر کیا جانے والا قتل کا کیس بے بنیاد کر دیا۔ ”محبت اور جنگ میں رعایت کیسی...... نیلوفر نے وہ بیان دشمنی میں دیا کیونکہ میرے موکل نے اس سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کی وجہ میں عدالت میں بیان نہیں کروں گا۔ یہ بعد میں شہادتوں سے ثابت کروں گا۔“

اس نے رشید کے احتجاج کو بھی نظر انداز کر دیا۔ ”تم کو میری مخالفت کرنی ہے تو خدا حافظ۔“

”تم نیلوفر کو کیس میں کیوں گھسیٹ رہے ہو، اس نے وہی کہا جو میں نے بتایا تھا۔“

”نہیں، تم نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا ایک وجہ یہ تھی کہ تم نے اسے ٹھکرا دیا تھا...... وجہ......“

”یہ غلط ہے۔“

”سچ وہ ہے جو میں بتا رہا ہوں۔ جو عورت تمہیں پھانسی کے تختے پر لٹکا دیکھنا چاہتی تھی، تم اس کے ساتھ اخلاق کے تقاضے پورے کرو گے؟ دشمن کو رعایت دو گے، نہیں...... تم نے نیلو کو اس لیے چھوڑا تھا کہ وہ بدکردار تھی۔“

وہ چلایا۔ ”بکواس بند کرو، دفع ہو جاؤ یہاں سے...... نہیں چاہیے مجھے کوئی وکیل۔“

”تم اسے مختلف لوگوں کے ساتھ دیکھ چکے تھے، ان میں سے دو گواہ میں لاؤں گا جو نیلوفر کے ساتھ اپنے تعلق کی کہانی سنائیں گے۔“ اس نے اگلے دن آ کے پھر بولنا شروع کیا۔

گزشتہ رات پروفیسر نے کہا تھا۔ ”مرنا چاہتے ہو تو قانون کے چکر میں عذاب لمبا کیوں کرتے ہو؟ کل مر جاؤ...... نیند کی دس گولیاں کھا لو، مجھ سے لے لو، میں آدھی روز کھاتا ہوں اور جینا ہے تو بیٹے اپنی سوچ...... دنیا کو بھاڑ میں جھونکو، نیلوفر تمہیں دوسری دنیا میں ہی مل سکتی ہے۔

شرافت کے پتلے...... تم تو دفن بھی لاوارث کیے جاؤ گے، نہ ماں لاش لینے آئے گی نہ بہن۔“

اگلے دن اس نے پھر ساجد حسن سے ملنا منظور کر لیا۔ ”کوئی ایسا راستہ نکالو کہ اس کی عزت پر حرف نہ آئے۔“

ساجد مسکرایا۔ ”وہ بھی نکل آئے گا، ذرا بات آگے چلے...... کیس یوں ہے کہ ماسٹر کا بیٹا تمہیں استعمال کرتا تھا۔ ماسٹر کی سفارش تھی تم نے بینک سے پیسے ضرور لیے مگر نہ ماسٹر تمہارے ساتھ تھا نہ تم اس کے گھر گئے۔ قتل کا کیا سوال...... ہاں گھر کے مالی مسائل تھے بہن کی شادی کے لیے تم نے وہ رقم ماسٹر کو نہیں پہنچائی...... وہ دمے کا مریض تھا مر گیا۔ اس کا اسمگلر بیٹا تمہاری جان کو آ گیا۔ قتل کا کیس اس نے بنایا...... بلکہ بنوایا، پہلے غلط پوسٹ مارٹم رپورٹ حاصل کی۔ پھر موذی کی لڑکی سے ملا اور اپنا پیغام دیا شادی ہوئی۔“

رشید چلایا۔ ”بس کرو ساجد...... تم کہہ رہے ہو نیلی نے اس سے شادی کر لی ہے۔“

ساجد پُرسکون بیٹھا رہا۔ ”لیکن یہ سچ ہے...... سو فیصد...... مولوی قدرت اللہ نے اس کا رشتہ منظور کر لیا اور نیلوفر نے بھی...... وہ شادی ہو کے دبئی جا چکی ہے۔ تمہارے اعترافِ جرم کے بعد وہ کس کا ساتھ دیتی...... تمہارا یا ہونے والے شوہر کا؟“

رشید دم بخود بیٹھا رہا۔ کیا ساجد حسن جو کہہ رہا تھا۔ واقعی سچ تھا، یہ سچ لگتا ضرور تھا۔

”اس نے ماسٹر کے بیٹے شکیل نام ہے اس کا...... شکیل کا پولیس کے ساتھ مل کر تیار کیا جانے والا بیان عدالت میں دہرا دیا۔ شکیل کا پیسا ہر جگہ تمہارے خلاف کام کرتا رہا۔“

”اگر ایسا ہے تو...... اب وہ اپنے بیان سے کیسے پھر سکتی ہے، جو وہ دے چکی ہے؟“

”ہم سودا کریں گے اس سے...... اس کے نیک نام باپ سے، شوہر سے......“ ساجد مسکرایا۔ ”قتل کا کیس غبن کا رہنے دو، نیلوفر کے خلاف میرے موکل کا کوئی بیان عدالت میں نہیں ہو گا۔ وہ عزت سے دبئی میں آباد رہے۔“

”اور شکیل مانے گا؟“

”کیسے نہیں مانے گا، بیوی منوائے گی۔ شکیل کا پیسا بولے گا۔ عدالت میں قتل کا جرم ثابت نہیں ہو گا، ورنہ شکیل بھی آئے گا جرح کے لیے...... پوسٹ مارٹم رپورٹ غلط دینے والا ڈاکٹر بھی آئے گا۔ قتل کا چشم دید گواہ تو ہے ہی نہیں۔“

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ سارے معاملات طے ہوگئے۔ رشید کو چھ سال کی سزا ہوگئی۔ لیکن اس سے پہلے بہت کچھ ہوا۔

اس کے خلاف تفتیش مکمل ہو چکی تھی۔ پولیس نے چالان عدالت میں پیش کر دیا تھا جس میں گواہوں کے نام بھی شامل تھے اور اس کا اعترافِ جرم بھی، ایک وکیل صفائی کی موت کے بعد کچھ وقت اسے ساجد حسن کی خدمات فراہم کرنے میں گزرا، پولیس اسے تاریخ پر لے جاتی تھی اور اگلی تاریخ تک کا جوڈیشل ریمانڈ لے کر واپس آجاتی تھی۔ یہ سلسلہ آٹھ ماہ سے چل رہا تھا۔ اس دوران میں پروفیسر نے اس کی سوچ بدلنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

''دیکھو بیٹے...... یہ خوش قسمتی ہے تمہاری کہ تمہیں ساجد حسن جیسا وکیل مل گیا۔''

''لیکن وہ تو حلف اٹھا کے سو فیصد جھوٹ بولنے کی بات کرتا ہے۔''

''انصاف کا نظام تو ایسے ہی چل رہا ہے اور دنیا کے ساتھ اب تمہاری اس سچی محبت کرنے والی سچائی کی علمبردار محبوبہ کو بھی اس سے غرض نہیں کہ تم مرو یا جیو، اسے اب اندازہ ہوگا کہ سچ کی قیمت اسے بھی دینی پڑے گی۔ وہ پرانا وکیل ہوتا تو استغاثہ کے اس واحد اہم گواہ سے دو چار ہی سوال کرتا اور اس کی گلوخلاصی ہو جاتی، اب پتا چلے گا کہ صرف بیان دے کر کسی کو قتل کرا دینا اتنا آسان بھی نہیں۔''

''لیکن استاد...... پھر یہ قتل کیسے ہوا۔ میرے جرم کی سزا ہے یہ۔''

پروفیسر نے اس کے ایک چھانپڑ رسید کیا۔ ''کوئی جرم نہیں کیا تو نے الو کے پٹھے...... کسی کو قتل نہیں کیا۔ پہلے خود اس بات کو سمجھ لے، وہ تو گئی، اب تجھے بھی نہیں مل سکتی۔''

وہ اپنا گال سہلاتا رہا اور سوچتا رہا۔ اتنی کم قیمت تو نہیں میری زندگی کی کہ وہ کہے یہ قاتل ہے اور میں کہوں کہ ہاں...... اور چڑھ جاؤں پھانسی کے تختے پر۔ انکار نہ کرنا تو صریح خودکشی ہے۔ وہ دبئی میں خوش و خرم زندگی گزار سکتی ہے۔ اس اطمینان کے ساتھ کہ اس نے سچ بول کے قانون کا ساتھ دیا تو غلط نہیں کیا۔ تو میں بھی ایک انکار سے زندہ رہنے کا حق کیوں استعمال نہ کروں، دو دن بعد ایک رات پھر اسے بیدار کر کے جیلر کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس کے کمرے میں برقع کا نقاب اٹھائے نیلی بیٹھی تھی اور وہ کہہ رہا تھا۔ ''مولانا صاحب بڑے فرشتہ آدمی تھے...... نیک خلقت تھی اُن کے جنازے میں......''

رشید کو دیکھتے ہی نیلی کا رنگ فق ہو گیا۔ اس کے ہم رکاب آنے والے جیلر کے اشارے پر لوٹ گئے۔

''اِدھر بیٹھو۔'' جیلر نے میز کے دائیں طرف رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا اور خود کھڑا ہو گیا۔

نیلی کے سامنے چائے کی پیالی رکھی تھی جسے اس نے چھوا بھی نہیں تھا۔ وہ بے حد نروس اور خوف زدہ تھی۔

''اب کیا کہنے آئی ہو؟'' رشید نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ ''اور اکیلی کیوں ہو، تمہارے مجازی خدا ساتھ نہیں آئے؟''

''میں...... وہ دراصل ایک ہفتے کے لیے امریکا گئے ہوئے ہیں۔''

''آئی سی، تو تم اسے بتائے بغیر آئی ہو؟''

''مجھے کسی نے فون کیا تھا۔'' اس نے موبائل فون پر ایک نمبر تلاش کیا۔ ''اس نے کہا کہ تمہارا وکیل ہے۔''

رشید نے ایک نظر ڈالی۔ ''ہاں، یہ ساجد حسن کا نمبر ہے۔''

''اس نے کہا...... کہ تم...... مجھ پر...... الزام لگا دو گے...... جھوٹے۔''

رشید کے حلق میں تلخی اتر آئی۔ ''اب کون سا لحاظ کا رشتہ رہ گیا ہے میڈم کہ میں آپ کے الزام کے جواب میں کہوں کہ حق ہے اور جان دے دوں۔''

اس کی آنکھوں میں نمی اور لہجے میں رقت آگئی۔

''میری بہت بدنامی ہوگی...... اور مولانا قدرت اللہ مرحوم کی۔''

''مجھے کسی اور کی زندگی نے کیا۔''

''میرا شوہر...... وہ چھوڑ دے گا مجھے۔''

''غیرت مند ہوگا تو قتل بھی کر دے گا لیکن وہ کاروباری آدمی ہے، فوراً تمہاری جگہ کسی اور کو لے آئے گا۔''

''رشید...... خدا کے لیے، میں نے کون سی غلطی کی...... سچ بول کے...... نہ بولتی تو میرا ضمیر میری زندگی عذاب کر دیتا، میری تربیت ہی ایسی تھی۔'' آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔

''تو اب سچ کی سزا سے کیوں ڈرتی ہو...... پاگل میں تھا کہ تم سے سچ بولا۔ اس لیے کہ مجھے محبت پر اعتماد تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنی آسانی سے مجھے جلاد کے حوالے کر دوگی۔''

''اگر میں کہوں...... اس محبت کی خاطر مجھے معاف کر

دو؟"

"محبت؟" وہ بھڑک اٹھا۔ "مرگئی وہ محبت...... تم نے اپنے ہاتھوں سے اُس کو مار دیا۔ "ذرا رحم نہیں آیا تمہارے دل میں......کوئی رعایت نہیں دی تم نے مجھے...... یہ نہیں سوچا کہ میں نے وہ جرم نہ اپنے لیے کیا تھا نہ تمہارے لیے...... مجھے حالات نے مجبور کیا تھا۔ مجھے بہن کی زندگی بچانی تھی، ورنہ وہ کنواری بیٹھی رہتی، ماں باپ کے گھر میں اور الزام مجھ پر آتا کہ نکھٹو بھائی نے کچھ نہیں کیا۔ ماں باپ کا قرض اتارا تھا میں نے...... میں عادی مجرم نہیں تھا۔ شوقیہ جرم نہیں کرتا تھا۔ اپنی عیاشی کے لیے...... میں تم کو بھی حاصل کرنا چاہتا تھا...... بیک وقت کتنے مقاصد حاصل کرسکتا تھا اگر تم اپنا منہ بند رکھتیں...... میں نے دوسرا ڈاکا ڈالنے اور دوسرا قتل کرنے کا نہیں سوچا تھا۔"

"آئی ایم سوری...... میں اس دباؤ کو برداشت نہ کر سکی جو اندر سے تھا۔ ابا کو سب بتا دیا۔ تم اسے غلطی کہہ سکتے ہو۔"

"قانون بھی مجھے رعایت دے گا، حالات دیکھے گا۔ ساجد حسن نے کہا ہے کہ سزائے موت کا سوال ہی نہیں۔ اب میں بھی جینا چاہتا ہوں نیلی...... تمہاری طرح...... یہ نہیں ہوسکتا کہ میں قبر میں پڑا گل سڑ جاؤں اور تم عیش کی زندگی جیو۔"

"میں اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کرلوں گی رشید۔"

وہ تلخی سے ہنسا۔ "مولانا صاحب نے بتایا نہیں تمہیں کہ خودکشی حرام ہے۔ حق گوئی کی سزا کا سامنا کرو۔ اپنی زندگی کے فیصلے تم خود کرتی آئی ہو۔ مجھ سے محبت بھی اپنی مرضی سے کی تھی۔ مجھے محبت کی سزا دینے کا فیصلہ بھی خود کیا تھا۔" وہ ایک دم اٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔ زاروقطار روتی نیلی کے آنسو اب اس پر کوئی اثر نہیں کرسکتے تھے۔ اس سے محبت کرنے والا رشید مرگیا تھا۔ اپنے آپ سے محبت کرنے والا رشید' سینے میں پتھر کا دل رکھنے والا رشید بہت بے رحم تھا۔

دو دن بعد ساجد حسن نے اسے مبارک باد دی۔

"اب تمہارا مستقبل محفوظ ہے اور میرا اتا پتا ک۔"

"کیا ہوا؟"

"استغاثہ کی سب سے اہم اور واحد گواہ شاید اپنے بیان سے منحرف ہوجائے...... میں نے اسے بتا دیا کہ جرح میں اس سے کس قسم کے سوال کیے جاسکیں گے۔ وہ الجھن وغیٰ

جانے سے پہلے وہ مجھ سے ملی تھی۔ میں فون پر کوئی ایسی بات نہیں کرتا جو ریکارڈ ہوجائے، جانے سے پہلے اس نے کہا کہ وہ اپنا بیان ریکارڈ نہیں کرائے گی۔"

"لیکن وہ تو پولیس ریکارڈ میں موجود ہے۔"

"اس کی قانونی اہمیت کوئی نہیں۔ اصل بیان وہ مانا جائے گا جو وہ عدالت میں دے گی۔ میں نے کہا کہ بی بی یہ اتنا آسان نہیں کہ ایک وقت میں آپ کچھ بھی بک دیں اور کسی کی زندگی کو داؤ پر لگادیں' پھر اس سے مکر جائیں، یہ جو میرے موکل نے تفتیش اور جوڈیشل ریمانڈ کا عذاب جھیلا...... رسوائی اٹھائی ہے، اس کا حساب کیا ہوگا اور حساب تو حساب ہوتا ہے۔"

وہ چونکا۔ "حساب؟ کیسا حساب؟"

"ہاں حساب...... آپ کو یوم حساب کا ڈر تھا تو آپ نے سچ بول دیا۔ اب یوم حساب سے زیادہ ازدواجی زندگی کی فکر ہوگئی تو سچ کی اہمیت ختم؟ اب ہم سودا کریں گے۔ تمہاری زندگی کے ایک ایک پُراذیت لمحے کا۔"

"تم اسے بلیک میل کرو گے؟"

"کون سا جرم زیادہ سنگین ہے؟ کسی کی جان لینا؟ یا بلیک میل کرنا؟"

رات کو اس نے پروفیسر سے کہا۔ "استاد، جان عجب عذاب میں ہے، کیا کروں؟"

"تم کچھ مت کرو، ساجد حسن کو کرنے دو۔ میں سمجھتا ہوں کہ شادی سے پہلے نیلی کے جذبات کیا تھے۔ اس کا دماغ اپنے والد کی تعلیم و تربیت کے زیر اثر تھا۔ اب باپ نہیں ہے، دولت مند شوہر اور عیش و آرام کی زندگی کے بعد سچ کی سزا میں رسوائی اور ازدواجی زندگی سے محرومی کا ڈر ہے۔"

"وہ کہیں خودکشی ہی نہ کرلے۔"

"ہاں...... اس کا امکان تو ہے لیکن ساجد حسن اس کا ہمدرد اور خیرخواہ بن جائے گا۔ اسے تسلی دے گا کہ فکر مت کرو۔ جیسا تم چاہتی ہو ویسا ہی ہوجائے گا۔ لیکن پولیس کو اس کی قیمت دینا پڑے گی۔ وہ کیس کا رخ پلٹ دیں گے۔ اگر نیلی کسی طرح منہ مانگی قیمت ادا کردے تو وکیل، جج، پولیس اور ملزم...... سب کو کچھ نہ کچھ مل جائے گا...... سب سے کم تمہیں ملے گا۔"

"مجھے کچھ نہیں چاہیے۔" وہ برہمی سے بولا۔

"آزادی بھی نہیں؟" وہ تمسخر اڑانے کے انداز میں بولا۔ "مگر آزادی جس دکان سے ملتی ہے اسے دوسرے چلا

رہے ہیں۔"

"وہ کہاں سے پورے کرے گی اُن کے مطالبات......؟"

"اچھا سوال کیا تم نے...... میری معلومات کے مطابق یہ جو شکیل ہے...... نیلی کا شوہر...... تمہارے بارے میں اسے یہ پتا چلا کہ تم نے اپنے جرم کا اعتراف نیلی کے سامنے کرلیا تھا جو مولانا قدرت اللہ کی بیٹی تھی اور تمہارے ساتھ اسکول ٹیچر تھی۔ وہ کیسے سوچ سکتا تھا کہ نیلی تم سے محبت بھی کرتی ہوگی اور تمہارے ساتھ اس کے عہد و پیمان بھی تھے۔ اس نے تو فرض کرلیا کہ یہ مولانا صاحب کی دینی تعلیم و تربیت کا اثر تھا کہ اسے معلوم ہوا تو وہ خاموش نہ رہ سکی۔ مولانا سے مل کے اس کے خیال کی تصدیق ہوئی۔ جب اس نے اتفاق سے نیلی کو دیکھا تو تعلیم و تربیت وغیرہ سب بھول گیا۔ وہ ہزار جان سے اس پر فریفتہ ہوگیا۔ کچھ سوچ کے اس نے ایک تیر سے دو شکار کرنے کا سوچا، نیلی مل جائے اسے تو وہ تمہیں جیل کی اذیت کے ساتھ ذہنی اذیت کتنی دے سکتا ہے کہ جو تمہارے خلاف گواہ بننے کے ساتھ اس کی بیوی بھی بن گئی ہے اور اب تمہارے دشمن ایک ساتھ ہیں۔"

"تم کیسے کہہ سکتے ہو اتنے یقین سے...... کہ اسے میرے اور نیلی کے مراسم کا علم نہیں تھا؟"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ کسی کے ذریعے معلوم ہوا کہ اسکول میں تھے تو اسے پسند کرتے تھے لیکن تم بھی پرائمری اسکول ٹیچر تھے۔ جب اچانک تم دولت مند ہوکے سامنے آئے تو بہت اونچے اُڑ رہے تھے۔ اس کے پوچھنے پر جو تم نے بتایا نا قابلِ یقین تھا۔ راتوں رات کوئی لاکھوں میں نہیں کھیلنے لگتا۔ اسے رشتہ منظور کرنا ہوتا تو خاموش ہو جاتی لیکن اس نے جان چھڑانے کے لیے پولیس کو بتا دیا۔"

رشید مزید بحث کے موڈ میں نہیں تھا...... اس کا سر چکرا رہا تھا۔ ذہن میں آنے والے سوالوں کے باوجود وہ خاموش ہو کے بیٹھ گیا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ عدالت کی دی ہوئی تاریخ ابھی دور تھی جب ایک رات اسے پھر طلب کیا گیا اور ایک طرح سے یہ تمام معاملات طے ہو جانے کے بعد فریقین کے درمیان رسمی سی فیصلہ کن میٹنگ تھی لیکن رشید کو کچھ پتا نہیں تھا۔ اس کے وکیل نے صرف ایک بار چکر لگا کے اطلاع دی تھی کہ سب ٹھیک جا رہا ہے۔ وہ بے حد مصروف تھا اور تفصیل بتائے بغیر چلا گیا لیکن آدھی ادھوری اطلاع سے رشید کی بے قراری بہت بڑھ گئی۔ پروفیسر اسے تسلی دیتا تھا

کہ یہ معاملات چٹکی بجاتے حل نہیں ہوتے۔ دکان پر پڑا سودا نہیں کہ اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے...... تھوڑا صبر کر۔

رشید ایک دن جھنجلا گیا تھا۔ "تم انسان نہیں پتھر ہو، دھوپ، بارش میں پڑا ہو جو کسی کی ٹھوکروں میں آئے یا سر پھاڑے کسی کا...... اسے فرق نہیں پڑتا۔" اور حسبِ عادت وہ سن کے صرف مسکراتا رہا۔ رات گیارہ بجے وارڈن نے دروازہ کھولا تو رشید کے ذہن میں صرف وہ عورت تھی جو اسے کھلونے کی طرح استعمال کر رہی تھی۔ اسے یہ کھلونا پسند تھا اور وہ نہ پہلا تھا نہ آخری...... لیکن دو طرفہ مجبوری اور اسیری کے آگے سپر ڈالے بِنا چارہ بھی نہ تھا۔ بلاشبہ وہ ایک طرح دار عورت تھی جو ہر بار کسی نئی سویٹ ڈش کی طرح خود کو پیش کرنا جانتی تھی۔ یا جان گئی تھی۔ احساسِ مجبوری یا گناہ کب کا ختم ہو چکا تھا۔ وہ رات کو نصف شب کے قریب جا کے صبح فجر کی اذان سے پہلے لوٹ آتا تھا۔ اسے کبھی معلوم نہ ہوا کہ اس کی دیگر راتیں کیسے اور کس کے ساتھ بسر ہوتی ہیں۔ شاید ایسا نہیں تھا۔ ہفتے میں ایک ہی بار اس کا شوہر اپنی ماں سے ملنے جاتا تھا اور وہ عموماً ہفتے کا دن ہوتا تھا۔ اگر وہ عام شوہر ہوتا تو ویک اینڈ اس کے لیے زیادہ اہمیت رکھتا...... مگر سیٹرڈے نائٹ وہ گھر سے باہر رہتا تھا۔ یوں جیسے اس کے اور بیوی کے درمیان ایک خاموش معاہدہ ہے کہ جب تک میری عزت محفوظ ہے، اس پر عمل ہوتا رہے گا۔

وہ اپنے خیالوں میں مگن برآمدے کے موڑ کی طرف جانے لگا تھا کہ سنتری نے اسے گالی دے کر اس کی گدی پر ایک ہاتھ مارا۔ "اُدھر کیا تیری ماں کا گھر ہے۔" یہ جیل کی قومی زبان تھی جو سب بلا ضرورت بھی بولتے تھے۔ وہ سیدھا چلنے لگا۔ اس کے حساب سے آج ہفتہ تھا۔ وہ غلط تو نہیں جا رہا تھا۔ جیلر کے آفس میں روشنی تو روز ہوتی تھی اور عموماً وہ رات کے کھانے کے بعد پھر آ کے بیٹھ جاتا تھا۔ قیدیوں کے وارثوں سے معاملات اسی وقت طے ہوتے تھے۔ کس کو کیا سہولت چاہیے۔ کس کا ماہانہ نذرانہ واجب الادا ہو گیا ہے۔ کس کے معاملات کیا رخ اختیار کر رہے ہیں۔ عموماً وکیل یا سادہ کپڑوں والے تھانے دار بھی زندگیوں کے فیصلے کرتے تھے۔

نیلی کا پھر آنا مشکل تھا۔ کمرے میں داخل ہو کے اس نے ایک اجنبی کو دیکھا۔ مضبوط اور صحت مند، قد و قامت میں کچھ زیادہ ہونے کے باوجود رشید نے اسے پہچان لیا۔ وہ صورت میں مرحوم و مقتول ماسٹر جیسا تھا۔ آج اسے جیلر نے بھی کرسی پر بیٹھنے کی اجازت نہیں دی۔ شکیل نے چائے ختم

کر کے سگریٹ کو ایش ٹرے میں بجھایا اور کھڑا ہو گیا۔

رشید کے سامنے آ کے اس نے پوری قوت سے اسے ایک تھپڑ مارا جو اس کے گال پر پڑا۔ رشید اس کے لیے تیار نہ تھا۔ اس کا گال گرم اور لال ہو گیا۔ وہ لڑکھڑا کے گرا اور اٹھ کے پھر کھڑا ہو گیا۔ ”کون ہیں آپ......؟“ رشید نے غیر ضروری سوال کیا۔

اس کے منہ پر دوسرا تھپڑ پڑا۔ ”یہ کوئی شوہر اور باپ ہی بتا سکتا ہے کہ طاقتور ہونے کے باوجود وہ کتنا کمزور ہے۔ تم نے میری بیوی کو بلیک میل کرنے کی دھمکی دے کر مجھے بے بس کر دیا۔ یہ سب تمہارے اس شیطان وکیل کا چلایا ہوا چکر تھا۔ وکیل میں بڑے سے بڑا کر لیتا لیکن عدالت میں تمہاری زبان نہیں پکڑ سکتا تھا۔“

”بس یہی بتانے آئے تھے؟“

”نہیں، میں کچھ اور بتانے آیا تھا۔ صرف میرے باپ کے قتل کی سزا میں پھانسی کافی نہ ہوتی۔ میں تم سے ایک ایک پائی وصول کرتا...... لیکن جیل کے اندر یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں اس کی کوشش کرتا تو اس کی قیمت میری بیوی کو چکانا پڑتی۔ میں نے اسے بچانے کی منہ مانگی قیمت ادا کرنا قبول کر لیا۔ جتنی رقم تم نے میرے باپ سے لی تھی، اتنی ہی بیٹے نے بھی دی۔ اس کا باپ اور میرا باپ دونوں دوسری دنیا میں ہیں ضرور ہے۔“

رشید نے کہا۔ ”میں نے تم سے کچھ نہیں لیا...... نہ مانگا۔“ جیلر نے دہاڑ کے کہا۔ ”اپنی بکواس بند کرو، تم زندہ باہر جا رہے ہو دنیا میں...... اپنے پیروں پر چل کے۔“

شکیل نے سر ہلایا۔ ”ہاں، ابھی ایسا ہی ہوگا۔ تم زندہ باہر جاؤ گے۔ باعزت طور پر رہا ہو کے اپنی زندگی جینے۔“

”اور بعد میں کیا ہوگا؟“ رشید نے تلخی سے کہا۔

”وہ جو یہاں ہونا چاہیے تھا۔ میں تم کو زندہ رہنے کا حق کیسے دے سکتا ہوں۔ جب تم باہر کتے کی موت مارے جاؤ گے تو تمہاری لاش اٹھانے والا کوئی نہیں ہوگا۔ ہو سکتا ہے یہاں تمہیں موت کی سزا نہ ہوتی، تم دو چار سال جیل میں کاٹ کے نکل آتے یا صاف رہا ہو جاتے۔ لیکن اب سزائے موت تمہیں باہر ہو گی۔ یہ جان لو اچھی طرح......“ وہ ایک دم پلٹا اور اس نے خاکی رنگ کا کاغذ کا لفافہ جیلر کی میز پر رکھ دیا۔ اس سے ہاتھ ملایا اور باہر نکل گیا۔ یہ صاف قتل کی دھمکی تھی جو جیلر کے سامنے دی گئی تھی۔

☆☆☆

پروفیسر جاگ رہا تھا۔ ”کیا صبح ہوگی؟“

”نہیں، بارہ بجے رات کو کبھی صبح نہیں ہوتی۔“ وہ تلخی سے بولا اور دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔

”خیریت تو ہے؟“ پروفیسر نے اسے غور سے دیکھا۔ ”رانی......“

”میں اس کی طرف نہیں گیا تھا۔ شکیل آیا تھا مجھ سے ملنے۔“ اس نے پروفیسر کی بات کاٹ دی۔

پروفیسر اٹھ بیٹھا۔ ”کیا کہا اس نے؟“

”یہی کہ باہر نکلتے ہی وہ مجھے قتل کرا دے گا۔“ وہ بولا۔ ”ایسی ہو گی میری رہائی۔“

پروفیسر نے فکرمندی سے داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ ”یہ بات ہے۔“

”ہاں، مقدمہ ختم...... ملزم بھی ختم۔ ساجد نے تو ایک طرف کا سوچا تھا نا، اس کو فیس مل گئی۔ سب کو اپنا اپنا حصہ مل گیا۔ بعد میں میرے ساتھ کیا ہوتا ہے، اس کی فکر کسی اور کو کیوں ہو؟“

”میں نے کہا تھا نا کہ تجھے کچھ نہیں ملے گا۔“

”مجھے بلیک وارنٹ مل گئے۔“ رشید تلخی سے بولا۔ ”سرکار کی طرف سے نہ سہی...... مدعی کی طرف سے سہی۔“

”اچھا پریشان مت ہو۔ اس کا بھی حل سوچیں گے۔ باہر نہ جانا تو کوئی مشکل نہیں مگر اندر رہنے سے کیا فرق پڑے گا۔ تجھے آتے جاتے جیل سے باہر کہیں بھی مارا جا سکتا ہے۔ صبح بات کریں گے۔“

اب اس کے لیے شب و روز کا حساب بے معنی ہو گیا تھا۔ انتظار لاحاصل ہو گیا تھا۔ پہلے اسے انتظار تھا کہ قانون اس کے جرم کی کتنی سزا دیتا ہے اور کب...... ان تمام یقین دہانیوں کے باوجود جو اسے پروفیسر کراتا تھا کہ وہ تختہ دار پر لٹکنے کے خوف سے باہر آ جائے۔ اس کے خلاف قتل عمد کا کیس بہت کمزور ہے اور اچھا وکیل ہوتا تو محض ایک عورت کے بیان پر بنائے جانے والے مقدمے سے اس کو صاف بچا لیتا۔ جب بالآخر چھ سال کی تفتیش اور اب تاریخوں پر پیشی کے بعد ایک وکیل نے یہ کر دکھایا تو اس سے کوئی فرق نہ پڑا۔ وہ اب بھی جیل میں تھا اور اسے اب بھی سزائے موت کے خوف سے نجات نہ تھی۔ جیل کے اندر نہ سہی باہر سہی۔ جیل کے اندر ہی وہ زیادہ محفوظ تھا لیکن اس وقت تک جب تک رانی کو اس کی ضرورت ہو گی جس دن اس کی جگہ لینے والا ملا، وہ اسے خود نکلوا دے گی۔ ہر سوال بے یقینی کی دھند میں کھویا ہوا راستہ تھا۔

رات کو اس کے دماغ میں الٹے سیدھے خیالوں کی

یلغار، ڈراؤنے خوابوں کا روپ دھار لیتی تھی۔ وہ دیکھتا تھا کہ رانی کی لاش بیڈ پر پڑی ہے اور وہ لہو آلودہ ہاتھ میں پستول لیے رانی کی کھلی آنکھوں کا سوال دیکھ سکتا ہے۔ اب کیا تم آزاد ہو جاؤ گے۔ میں نے کہا تھا نا کہ مجھے اپنے ساتھ لے چلو، اب میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گی دیکھنا...... کسی اور سے کیا تو تم لیکن بہن نے اسے بہت مایوس کیا تھا۔ یہ اسی کی زندگی آباد کرنے کی خواہش تھی جس نے رشید کو یہاں پہنچا دیا تھا۔ ورنہ وہ آج بھی باپ کے گھر میں بیٹھی آئینے میں اپنے سفید ہوتے بالوں کو دیکھتی رہتی اور ماں باپ اس کے غم میں گھلتے رہتے، بے شک شادی کے بعد عورت مجبور ہو جاتی ہے، کیا پتا اس کے شوہر نے ایسے بھائی کی بہن ہونے پر اسے کتنا ذلیل کیا ہو، اس پر پابندی ہوگی ورنہ وہ بھائی سے قطع تعلق کیوں کرتی۔ پھر بھی رابطے کے ہزار وسیلے ہیں، وہ کہیں سے فون کر سکتی تھی، کوئی رقعہ بھجوا سکتی تھی۔ چاہتی تو کسی کو بتائے بغیر ملنے بھی آسکتی تھی۔

پروفیسر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونکا۔ ''تیری ملاقات آئی ہے۔''

وہ پروفیسر کو دیکھتا رہا۔ ''میری ملاقات؟ کون ہے...... موت کا فرشتہ؟''

''پاگل ہو گیا ہے تو رشید...... کوئی عورت ہے، جا کے دیکھ لے۔''

اس کی نظر میں دو چہرے روشن ہوئے۔ ایک نیلوفر کا دوسرا اس کی بہن کا۔ نیلوفر دبئی سے اب کیوں آئے گی، دشمنی کا ایک رشتہ باقی ہے جو اس کے شوہر نے اپنی ذمے داری بنا لیا ہے۔ یاسمین؟ جس کے بارے میں وہ سوچ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ملاقاتیوں کے کمرے کی طرف چلنے لگا۔ اس نے جالی سے باہر دیکھا تو اسے شناسا چہرہ کوئی بھی نظر نہ آیا پھر ساجد حسن نے قریب آ کے کہا۔ ''وارڈن آفس میں جاؤ، میں نے بات کر لی ہے۔''

''لیکن کون ملنے آیا ہے مجھ سے؟''

ساجد حسن جلدی میں تھا۔ ''جا کے دیکھ لو۔'' اور پلٹ کر باہر کی آزاد دنیا میں گم ہو گیا۔

رشید پلٹا اور جانے پہچانے راستے پر چلتا وارڈن کے دفتر کی طرف چلا گیا۔ یہ آفس سے ملحق ایک اسٹور تھا جس میں بہت سے کاٹھ کباڑ کے ساتھ ایک چارپائی اور بستر بھی لگا ہوا تھا۔ ایک گینڈے جیسے اور اپنے اعمال سے مکروہ صورت ہو جانے والا وارڈن اس وقت وہاں اکیلا بیٹھا تھا۔

''ادے شیدے...... یہ کون عاشق آ گئی تیج...... یار اپنا بھی خیال کرنا۔'' اس نے فحش طریقے سے آنکھ ماری اور باہر چلا گیا۔

اسٹور میں بیڈ پر ایک اجنبی لڑکی سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی۔ اس کی نوجوانی تو گزر چکی تھی لیکن جوانی کے بعد کی منزل ابھی دور تھی۔ اس کے سانولے رنگ میں ایک بڑی پُرکشش چمک تھی اور اس کا بھرا بھرا جسم تناسب کا شاہکار تھا جس کے نمایاں کرنے میں اس کے بظاہر سادے مگر بدن کے سانچے میں کسی ماہر درزی کے ہاتھوں ڈھالے گئے لباس کا بہت دخل تھا۔ اس سانولے پن پر ہلکا زردی مائل زرد رنگ کا کپڑا روشنی کی طرح دمکتا تھا۔ رشید نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا مگر نہ جانے کیوں اسے چہرے کے نقوش مانوس لگتے تھے شاید اس میں کسی ایکٹریس کی مشابہت ہوگی۔

وہ رشید کو دیکھ کر اٹھی۔ رشید نے اسے روک دیا۔

''آپ بیٹھی رہیے۔''

لیکن وہ بیڈ کے کنارے پر سرہانے کی طرف ہو گئی۔ وہ بیریوں کی طرف اس سے چار فٹ دور تک گیا۔ ''میں نے آپ کو نہیں پہچانا...... کس نے بھیجا ہے آپ کو؟''

وہ پُرسکون لہجے میں بولی۔ ''یہ خیال کیوں آیا آپ کو...... کس نے بھیجا ہوگا؟''

''وہ نیلی...... میرا مطلب ہے نیلوفر...... اس کا شوہر...... میری بہن یاسمین...... اور کون جانتا ہے مجھے۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں مسٹر رشید...... میرا ان میں سے کسی سے بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نشاط ہوں، نشاط تسلیم...... میں ایک وکیل بھی ہوں۔''

''مجھے تو اب کسی وکیل کی ضرورت نہیں۔ ساجد نے مجھے ہر کیس سے بری کرا دیا ہے۔''

''مجھے معلوم ہے۔ اور ساجد نے ہی مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ میں ایک این جی اوز کے لیے کام کرتی ہوں۔ سپریم کورٹ کے ایک سابق جج اس کے سرپرست ہیں۔ وہی ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ اس کے ایک رکن ساجد حسن بھی ہیں۔ وہ جیل کے اندر لاوارث افراد کے کیس لیتے ہیں اور ہمارا دوسرا شعبہ ان لوگوں کو رہائی دلواتا ہے جو اپنی جیل کی سزا کاٹ چکے لیکن جرمانہ ادا کرنے کے قابل نہیں ہیں تو اضافی سزا بھگت رہے ہیں۔ ان کا جرمانہ ادا کر دیا جائے تو انہیں رہائی مل جاتی ہے۔''

''آپ کا تعلق کس شعبے سے ہے؟'' رشید نے کہا۔

''ہم جیل کے اندر ویلفیئر کا کام کرتے ہیں۔''

رشید ہنسی سے مسکرایا۔ ''جیل میں ویلفیئر...... کیا لطیفہ

ہے بس نشاط یہ بھی...... یوں کہنے کو کام کوئی نہیں ہے تو نیک نامی کی پبلسٹی کمائی ہیں۔"

اس نے برا نہیں مانا۔ "اکثر لوگ یہی سمجھتے ہیں، فکرِ معاش مجھے واقعی نہیں ہے۔"

"شوہر کی اچھی کمائی ہوگی۔ آپ نے یہ شغل بے کار میں اختیار کرلیا۔"

وہ پرسکون رہی۔ "ابھی میری شادی نہیں ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ وکالت کروں لیکن والد نے روک دیا کہ یہ جھوٹ فریب لالچ کی بنیادوں پر چلنے والا کام مت کرو۔ وہ زمیندار ہیں اور...... سیاست داں بھی...... لیکن تعلیم یافتہ اور ہمارے ملک کی جاگیردارانہ سیاست سے دور۔ ان کے مشورے پر میں جسٹس صاحب سے ملی اور ہم نے ایک گروپ بنالیا۔ بے شک ہم اس نظام کو نہیں بدل سکتے لیکن مجھے یہ سکون تو حاصل ہے کہ میں اس کو پروموٹ نہیں کر رہی ہوں۔ ہم نے جیل میں عورتوں، بچوں کے ساتھ ہونے والے مظالم، غیر قانونی اور غیر انسانی سلوک پر میڈیا میں آواز اٹھائی۔"

"اور اس سے یہ مظالم ختم ہوگئے؟" رشید تلخی سے بولا۔

"ہم نے مردوں کی جیل میں بھی کام کیا۔ عید، بقرعید پر ان کے لیے تحائف لے کر گئے۔ جن کو ان کے اپنے تک بھول چکے ہیں، ان کا خاندان سے بھی تعلق نہیں رہا۔"

اس نے نشاط کو نظر جما کر دیکھا۔ "آپ کو معلوم ہے میرا جرم کیا تھا؟"

نشاط نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ساجد نے مجھے سب بتا دیا تھا۔"

"کیا اس نے بتایا تھا کہ میں نے ڈاکا ڈالا تھا اور قتل کیا تھا لیکن نہ کوئی ثبوت تھا اور نہ چشم دید گواہ...... جس کی گواہی پر مقدمہ بنا تھا اسے بلیک میل کر کے منحرف کر دیا گیا۔"

وہ کچھ دیر ایک چھپکلی کو دیکھتی رہی جو دیوار پر آہستہ آہستہ رینگتی ایک مکھی کو شکار کرنے بڑھ رہی تھی۔ "آپ کے خلاف تمام الزامات کو عدالت نے مسترد کر دیا تھا۔ میرے لیے یہ کافی ہے، اب آپ کی رہائی کیوں نہیں ہو رہی ہے؟"

"اس کی ساجد نے کوئی وجہ نہیں بتائی، آپ کو نہیں معلوم؟"

"جیل کے اندر وجہ نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس دنیا میں قانون کی نہیں لاقانونیت کی حکمرانی ہے۔ سب جانتی ہوں میں تم سے بہتر۔" اس نے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔

"مجھ سے بہتر نہیں۔ میں نے چھ سال تک وہ سب دیکھا ہے جو آپ نے بس سنا ہی ہوگا۔ اندر کتنے ہیں جو کسی اور کے جرم کی سزا کاٹ رہے ہیں۔ کچھ اپنی مرضی سے لیکن اکثر جرم شناسی کے باعث...... اور ایسے بھی ہیں جن کو جیل کی دنیا سے باہر جانا ہے تو چھ فٹ گہری کسی قبر میں...... جب رہائی کا وقت قریب آتا ہے ان پر نئی فردِ جرم عائد ہو جاتی ہے۔ وہ صرف اپنے لیے زندہ ہیں۔ باقی سب کے لیے مر چکے...... باہر بھی ان کا کوئی نہیں رہا۔"

وہ زبردستی مسکرائی۔ "چیئر اپ رشید صاحب...... آپ کا شمار ان میں نہیں ہوگا۔"

وہ طنز سے بولا۔ "اس لیے کہ آپ کہہ رہی ہیں؟"

"یس...... اس لیے کہ میں کہہ رہی ہوں۔ ساجد نے بتایا کہ آپ کی رہائی کے جب احکامات موصول ہوئے تھے وہ ان پر کسی کے دستخط نہیں تھے۔"

"مجھے بھی یہی بتایا گیا تھا۔"

"وہ جھوٹ تھا۔ میں نے وزارت داخلہ سے تصدیق کی اور نقل ہے میرے پاس۔"

اس نے سر اٹھایا۔ "اس سے فرق نہیں پڑے گا مس نشاط۔"

"میں نے مایوسی کے ساتھ کام کرنا نہیں سیکھا رشید صاحب...... امید پر دنیا قائم ہے، ناامیدی پر نہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ کو دو چار دن اور جیل جھیلنی پڑے۔ لیکن آپ کی رہائی کو روکا نہیں جا سکتا۔ میں سمجھتی ہوں کہ...... اسی ہفتے کے دوران آپ کو رہائی مل جائے گی۔"

نشاط کے لہجے کے اعتماد نے اسے متاثر کیا۔ ابھی اس کی عمر زیادہ نہیں تھی اور وہ ایک مختلف دنیا سے تعلق رکھتی تھی۔ جہاں اس کو ہر طرف سے تحفظ اور اعتماد ملتا تھا۔ وہ قانون کے پیشے میں تھی لیکن فکرِ معاش سے آزاد تھی اور اسے باپ کے اثر و رسوخ کی ضمانت بھی حاصل تھی۔ وہ رشید کی دنیا کے مسائل کو ایک تماشائی کی طرح دیکھتی تھی۔ اس کا حصہ بھی نہیں بنی تھی۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو۔ لگتا ہے تم کو میری باتوں پر اعتبار نہیں۔" وہ رشید کی جذبات سے عاری نظروں کی تاب نہ لا سکی۔

رشید نے اثبات میں سر ہلایا۔ "یہی بات ہے مس

نشاط...... ایسا کون سا جادو ہے آپ کے پاس...... یہاں تو دعائیں بھی بے اثر ہو جاتی ہیں۔"

اس نے بیگ میں سے وہ ٹائپ کیے ہوئے کاغذ نکالے۔ "ہمت ہے تو اس پر دستخط کر دو۔"

"یہ...... یہ کیا ہے...... کوئی اپیل ہائی کورٹ کے لیے؟"

"اپیل کس بات کی۔ تم پر اب کوئی الزام نہیں۔ تم اپنی سزا کاٹ چکے بغیر جرم ثابت ہوئے۔ تمہارا بیان ہے۔ اس پر دستخط کر دو گے تو کل یہ میڈیا پر آجائے گا۔ بیان جیلر کے خلاف ہے لیکن اس کی جواب دہی وزارت داخلہ کو بھی کرنی پڑے گی۔ وہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے واقعی غیر دستخط شدہ احکامات بھیج دیے تھے۔ اصل کی نقل بھی ہے میرے پاس۔" اس نے ایک اور کاغذ رشید کو دیا۔

رشید نے وہ بھی لے لیا۔ یہ وزارت داخلہ کا حکم تھا کہ اسے رہا کر دیا جائے کیونکہ اس کو سیشن کورٹ اور سول جج نے الزام ثابت نہ ہونے کی بنا پر شک کا فائدہ دیتے ہوئے بری کر دیا ہے۔ حکومت کا اس فیصلے کے خلاف اپیل میں جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ اس میں وزارت داخلہ کے ایک افسر کے دستخط تھے اور اس کی نقل وزارت قانون اور ڈائریکٹر جنرل جیل خانہ جات کو بھی دی گئی تھی۔ یہ یقیناً جیل کے ریکارڈ میں بھی ہوگا۔

رشید نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے کی کشیدگی اور اندر کا وہ دباؤ کم ہو رہا ہے جس سے اس کا دم گھٹ رہا تھا لیکن وہ عجلت میں فیصلہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"کیا آپ مجھے مشورہ اور غور کرنے کی کچھ مہلت دیں گی مس نشاط۔"

نشاط کو یہ بات اچھی نہیں لگی۔ "میں آپ کو مجبور نہیں کر سکتی۔ یہاں کس سے مشورہ کریں گے آپ؟"

"میرے سیل میٹ ہیں۔ پروفیسر زمان خان۔"

"کیا وہ واقعی پروفیسر ہیں...... تھے...... یا کوئی پاسٹ وغیرہ؟"

رشید نے برا ماننے کے انداز میں کہا۔ "وہ کالج میں پڑھاتے تھے۔ پندرہ سال تک پڑھاتے رہے۔"

"اچھا؟ اب کس جرم کی سزا کاٹ رہے ہیں، حکومت کے خلاف سچ بولنے کی؟"

رشید نے نفی میں سر ہلایا۔ "انہوں نے ایک قتل کیا تھا۔"

"اگر یہ صرف الزام ہے تو...... ہم ان کا کیس بھی لے سکتے ہیں۔"

"نہیں، قتل انہوں نے کیا تھا۔ اس سے زیادہ میں آپ کو نہیں بتا سکتا...... لیکن وہ آپ کو اجازت نہیں دیں گے کہ ان کا معاملہ میڈیا پر اچھالا جائے۔"

وہ کچھ مایوس ہوئی۔ "اچھا وہ بعد میں دیکھیں گے۔ تم کر لو اُن سے مشورہ...... میں کل پھر آؤں گی۔"

اس لڑکی میں سادگی و پرکاری کا کچھ عجیب سا امتزاج تھا۔ مقابلہ حسن کے لیے وہ کوالیفائی بھی نہ کر پاتی اور اسے دیکھ کر معمولی شکل و صورت کی لڑکیاں بھی خود کو ملکہ حسن سمجھتی ہوں گی مگر اس کے آداب و اطوار میں ایک غیر معمولی نفاست اور پُرسکون کشش تھی جو کسی شفاف پانی کی جھیل کی ساکت سطح میں محسوس ہوتی ہے لیکن اس سے بھی بڑھ کر نشاط کی آواز میں شامل سحر آفریں نغمگی تھی جو آہستہ آہستہ اپنی گرفت میں لے لیتی تھی۔ اس اپیل پر دستخط کرنا تو خود اس کے مفاد میں تھا لیکن نشاط اسی لمحہ گر آواز کے ساتھ اعتراف کی تحریر بھی سامنے رکھتی تو شاید وہ دستخط کر دیتا۔ وہ آواز مکڑی کے جالے کی طرح اس کی قوتِ فیصلہ کے گرد لپٹ گئی تھی۔

اس کے اٹھنے سے پہلے رشید نے کہا۔ "نہیں...... میں دستخط کر دیتا ہوں۔"

جب وہ لوٹ کر گیا تو پروفیسر جیل کی دیوار کے ساتھ کھڑا قیدیوں کے کام کی نگرانی کر رہا تھا۔ "کون تھا ملاقاتی؟"

"ایک اخباری رپورٹر...... اس نے کہا کہ مجھے غیر قانونی طور پر جیل میں رکھنے کا معاملہ میڈیا پر لایا جائے گا۔ میں نے اس کی اجازت دے دی ہے۔"

پروفیسر خوش ہوا۔ "خوش قسمت ہے تو...... جیلر کو جواب دہی مشکل ہو جائے گی۔"

"میری اصل جیلر تو رانی ہے استاد۔"

"یہ ہو سکتا ہے کہ وہ چار دن تجھ پر تشدد کرائے...... مگر وہ تجھے کیسے روک سکتی ہے...... پھر بھی اچھا ہے اگر تو اسے اعتماد میں لے سکے۔"

"وہ کیسے؟"

"اسے یقین دلا کہ باہر جا کے تو اسے بھی لے جا سکتا ہے۔ اگر وہ اس شوہر سے جان چھڑا لے تو اس سے شادی بھی کر سکتا ہے۔"

رشید ہنسی سے بولا۔ "یہ کارڈ تو میں بہت پہلے کھیل چکا ہوں لیکن اس نے مجھے صاف بتا دیا کہ جس دن میں نے

طلاق کی بات کی، وہ میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ وہ میرے ساتھ نہیں جاسکتی۔"

"یہ برمودا ٹرائی اینگل سے زیادہ پُراسرار معاملہ ہے۔" پروفیسر نے بے یقینی سے سر ہلا دیا۔ "وہ تو ایک عورت ہے جو بیک وقت خوش قسمت بھی ہے اور بدقسمت بھی...... یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ اسے وہ شوہر ملتا جو اس کے فطری تقاضے پورے نہ کرتا اور اسے اجازت بھی نہ دیتا کہ وہ اپنی طلب کی تسکین کرلے۔ شرط صرف یہ کہ اس کی عزت کا بھرم رہے۔"

کھانے کی آواز پر وہ کچن کے باہر قطاریں شامل ہونے کے لیے چل پڑے۔ "جیلر ایک خطرناک نفسیاتی مریض ہے۔ اتنا ہی جتنا ایک دستی بم ہوتا ہے یا سویا ہوا آتش فشاں...... کوئی پتا نہیں کس دن اسے شک ہوجائے کہ کسی نے اس کے بارے میں بات کی ہے۔"

"بات تو اب بھی کرتے ہیں لوگ رشید پتر...... تیرے اور اس کے ناجائز مراسم کے بارے میں...... لیکن یہ کسی کو نہیں معلوم کہ شوہر کو سب معلوم ہے۔ میاں بیوی کے درمیان ایک خطرناک ہی نہیں شرمناک سمجھوتا ہے...... جیلر پر کون شک کرسکتا ہے۔ وہ تعلیم یافتہ، اعلیٰ عہدے پر فائز صحت مند مرد ہے۔ الزامات کا سارا ملبا اس بدکردار جنسی بھوک کی ماری بیوی پر گرتا ہے جو ایسے شوہر کے ہوتے غیر مردوں کو بلاتی ہے۔"

"وہ مجھ سے محبت کرتی ہے استاد۔"

پروفیسر ہنس پڑا۔ "اور جب تو رہا ہوجائے گا تو کسی اور سے کرنے لگے گی۔"

رشید نے نفی میں سر ہلایا۔ "تین سال ہوگئے مجھے...... تم بھی دیکھ رہے ہو...... ایسی کیا بات ہے آخر کہ وہ مجھے نہیں چھوڑتی......"

"چھوڑنا تو پڑے گا اُسے...... نہ وہ تجھے رکھ سکتی ہے نہ تیرے ساتھ جاسکتی ہے...... پھر بھی بات کرکے دیکھ اس سے ایک بار۔" پروفیسر نے کہا۔

اس رات رشید کی پھر طلبی ہوئی۔ یہ طلبی کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ عام قیدی اس کی قسمت پر رشک کرتے تھے اور آپس میں بات بھی کرتے تھے۔ یہ ناممکن تھا کہ ان باتوں کی خبر جیلر کو نہ ہو لیکن رشید نے یہ بھی سنا تھا کہ جیلر نے "بکواس" کرنے والوں کو درسِ عبرت بنا دیا تھا۔ اب عام خیال یہی تھا کہ وہ اندھا بہرا شوہر ہے جس پر بدکردار بیوی نے جادو کردیا ہے یا کرایا ہے کہ اسے کچھ نظر نہیں آتا اور وہ

کچھ سننے پر بھی راضی نہیں۔ اچھے بھلے آدمی کی عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں۔

رشید کو وہ باہر ہی مل گئی۔ جیلر کے بنگلے کے گرد خاردار تاریں تھیں جن میں رات کے وقت کرنٹ چھوڑ دیا جاتا تھا۔ یہ غیر قانونی تھا لیکن اندر صرف جیلر کی مرضی قانون کا درجہ رکھتی تھی۔ رشید نے سنا تھا کہ دو افراد دانستہ یا نادانستہ اس تار کو چھو کر جاں بحق ہوچکے تھے لیکن ان کی موت کو فرار کی کوشش قرار دے دیا گیا تھا۔ بنگلے کے گرد حفاظتی باڑھ آج بھی ویسی ہی تھی۔ اس کے علاوہ دو خونخوار کتے تھے جو رات کو کھلے رکھے جاتے تھے۔ وہ بھی اتنے سمجھ دار تھے کہ بنگلے کے گرد گشت کرتے تھے مگر باڑھ کے نزدیک نہیں پھٹکتے تھے۔

وہ عقبی حصے کے مختصر سے باغ میں ایک بینچ پر بیٹھی تھی۔ معمول کے مطابق ڈھیلی ڈھالی ہیجان خیز ریشمی نائٹی کی جگہ آج وہ شلوار قمیص میں تھی۔ آسمان میں زوال پذیر چاند دھندلی سی روشنی پھیلا رہا تھا اور فضا میں رات کی رانی مہک رہی تھی۔ موسم اب بدل رہا تھا اور نصف شب کے بعد باہر خنکی تھی۔ رشید کی سمجھ میں اس کی اداسی کا سبب نہ آیا۔ یہ تو ناممکن تھا کہ اسے نشاط کے آنے اور رشید سے اپیل پر دستخط لینے کی خبر مل گئی ہو۔ وہ اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

اچانک رانی نے اس کے کندھے پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

رشید نے گھبرا کے کہا۔ "کیا ہوا رانی؟"

اس نے سر اٹھائے بغیر گلوگیر لہجے میں کہا۔ "وہ جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

"کیا نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

"سب کچھ جو میرے ساتھ ہوا...... کیوں آئے تم جیل میں، کسی اور جیل میں چلے جاتے نا...... کیوں ہوئی مجھے تم سے محبت...... محبت تو مجھے شادی سے پہلے بھی ہوگئی تھی لیکن وہ حرام زادہ...... سور کا بچہ...... عین وقت پر بھاگ گیا تھا جب میں اس کے ساتھ بھاگنے پر تیار بیٹھی تھی۔" وہ سسکیاں لیتی رہی۔

رشید نے اسے پیار سے تھپکی دی۔ "وہ پرانی بات ہوگئی۔"

"اور پھر میری شادی اس سے کیوں ہوئی۔ اس بے غیرت، دھوکے باز اور بزدل آدمی سے جس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ شادی سے انکار کردیتا۔ میری زندگی کیوں تباہ کی۔ نہ جانے کتنی لڑکیاں میرے خاندان کی...... اسکول

کالج میں ساتھ پڑھی ہوگی...... آج خوش ہیں اپنے شوہروں کے ساتھ...... وہ جیسے بھی ہیں امیر غریب' عیاش وفادار...... شکیل یا بدشکل...... اور بچے بھی ہیں ان کے۔''

وہ پانی لینے اندر گیا۔ رانی ہسٹیریا سے مغلوب تھی پھر بھی اس سے محبت کی گردان کر رہی تھی۔ وہ تنگ آ گیا تھا یہ سن سن کے۔ اگر اس کا شوہر بزدل اور بے غیرت تھا تو برداشت کرے۔ اس نے بیوی پر ظلم نہیں کیا تھا' جبر اور تشدد نہیں کیا تھا اور وجہ کچھ بھی ہو' رشید سے اس کے تعلق کو برداشت کر رہا تھا۔ ایک معمولی شرط پر کہ اس کی عزت کا بھرم رہے۔ مگر یہ معمولی بات بہرحال نہیں تھی۔

اس نے پانی کا گلاس رانی کے لبوں سے لگایا۔ ''چلو، اندر چلیں...... یہاں سردی ہو رہی ہے۔''

رانی نے دو گھونٹ پی کے آستین سے منہ صاف کیا اور اس کی طرف دیکھا۔ ''رشید، میں ماں بننے والی ہوں۔''

رشید کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ کے نیچے گرا۔ ''کیوں...... میرا مطلب ہے تم نے تو......''

''اسی کو قسمت کا لکھا کہتے ہیں۔ کون سی احتیاط تھی جو ہم نے نہیں کی تھی۔'' اس نے ایک سسکی لی۔

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ رانی اٹھی اور وہ کسی روبوٹ کی طرح اس کے پیچھے اندر چلا گیا۔ وہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ رانی نے اسے یہ اطلاع دینا کیوں ضروری سمجھا۔ حادثہ تو ہو جاتا ہے لیکن پریشانی کی...... پریشانی کو ختم کرنے کے ذرائع بہت تھے اور اس کی دسترس میں بھی تھے۔

وہ بیڈ پر نیم دراز ہو گئی۔ آنسوؤں کی نمی کی جگہ اب اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی شرمیلی چمک آ گئی تھی۔ جو شاید ہر نئی نویلی دلہن کے چہرے پر اپنے شوہر کو ایسی ہی خوش خبری سناتے وقت آتی ہوگی۔ رشید کی پریشانی بڑھ گئی۔

''تمہیں کیسے...... میرا مطلب ہے کب معلوم ہوا؟''

اس کے نم آلود رخساروں پر سرخی آ گئی۔ ''آج ہی...... رپورٹ دیکھو گے۔''

''لعنت بھیجو رپورٹ پر۔'' وہ جھنجلا کے بولا۔ ''جہاں سے رپورٹ لی تھی وہیں بات کرنی تھی۔ ابھی کون سے زیادہ دن ہوئے ہوں گے۔''

اس نے رشید کو غور سے دیکھا۔ ''بات تو میں کر سکتی تھی مگر میں نے نہیں کی۔''

''کیوں نہیں کی؟''

''اس لیے کہ میں...... کچھ کرنا نہیں چاہتی تھی۔'' اس نے رشید کا ہاتھ تھام کے چوما۔

رشید نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ ''تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو؟''

وہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔ ''ہاں، پاگل ہو گئی ہوں میں...... پاگل ہو گئی ہوں میں تمہاری محبت میں۔ تم نے تو کبھی یقین نہیں کیا پہلے...... تم تو اسے صرف بدن کی بھوک کہتے تھے نا افلاطون۔''

رشید کا دل ڈوبنے لگا۔ ''رانی...... کچھ عقل سے کام لو۔''

''میری عقل نے ہی مجھ سے کہا کہ اپنی محبت کو زندہ رکھوں۔ خواہ انجام موت ہو، بس تمہارے بچے کی ماں بنوں گی، میں نے فیصلہ کیا۔''

''یا میرے خدا...... رانی وہ ہم دونوں کو مروا دے گا، تمہارا شوہر۔''

''میں نے کہا نا کہ مجھے مرنا منظور ہے...... تم سوچ لو، زندگی عزیز ہے تو مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ میرے لیے تمہیں نکال کے لے جانا کوئی مشکل کام نہیں، باہر کی ذمے داری تمہاری۔''

''بکواس بند کرو۔ کہاں جا سکتے ہیں ہم یہاں سے نکل کے...... اور کیسے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ میرا تمہارا کوئی قانونی رشتہ نہیں۔ باہر کی دنیا میں ہمارے لیے کوئی جگہ نہیں، تم کسی اور کی بیوی ہو۔''

''میں صرف تمہارے بچے کی ماں ہوں...... اور مجھے مرنا منظور ہے کر دے سنگسار یہ دنیا مجھے لیکن میرے ساتھ تم کو بھی مرنا ہوگا رشید۔'' وہ چلانے لگی۔ ''میں اس دنیا سے تم کو اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی۔''

رشید نے بہتر سمجھا کہ اس ذہنی کیفیت میں رانی سے اس مسئلے پر بحث نہ کرے۔ شاید دو چار دن میں خود اس کی عقل ٹھکانے آ جائے...... جذبات کا یہ آتش فشاں سرد پڑ جائے۔ اگرچہ رشید کا دل گواہی دیتا تھا کہ اس کی دیوانگی کا یہ دورہ عارضی نہیں لیکن یہ سب ممکن تھا جو وہ سوچتی تھی۔

اس نے رشید کو جھنجوڑا۔ ''میری بات سن رہے ہو نا تم؟''

رشید نے سر ہلایا۔ ''وہ کب واپس آئے گا...... تمہارا اور میرا جیلر؟''

''اس مرتبہ وہ زیادہ پریشان ہے ورنہ ہفتہ اتوار اپنی ماں کے ساتھ سو کر گزارتا ہے اور لوٹ آتا ہے۔ سوچو ذرا مرد کتنا انتظار کرتے ہیں ویک اینڈ کا......'' وہ تلخی سے بولی۔

''مگر وہ مرد ہوتے کہاں ہیں۔''

''رانی، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ...... وہ بچے کو بھی قبول کرلے...... برداشت نہ ہوتا تو وہ اب تک تمہیں کب کا قتل کر چکا ہوتا...... لیکن ضرور وہ محبت کرتا ہے تم سے...... نامرد بھی تو محبت کر سکتے ہیں۔''

''نہیں چاہیے مجھے ایسی بے غیرت محبت...... میں عورت ہوں، مجھے تم سے محبت ہے تو اس لیے کہ تم مرد ہو...... مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم قاتل ہو یا ڈاکو۔'' وہ دیوانوں کی طرح چلانے لگی۔

''او کے...... او کے...... کیا میں ایک فون کر لوں؟''

کچھ حیرانی کے ساتھ رانی نے کونے کی طرف اشارہ کیا۔ رشید نے اس سے پہلے کبھی باہر کی دنیا میں کسی سے بات نہیں کی تھی۔

رشید نے نشاط کا فون نمبر اپنی ہتھیلی پر اس کے بال پوائنٹ سے لکھ لیا تھا۔ یہ اس نے اپنے سیل کی دیوار پر یوں کھرچا تھا کہ صاف پڑھا جائے۔ ہتھیلی کے حروف مٹنے لگے تھے لیکن ابھی بات پرانی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے ذہن میں اعداد کی ترتیب برقرار تھی۔ اس نے نمبر ملایا تو گھنٹی کی بار بجی۔ پھر کسی لڑکی نے خوابیدہ لہجے میں کہا۔ ''ہیلو۔''

''میں رشید بول رہا ہوں۔ سینٹرل جیل سے۔''

''رشید؟...... اس وقت...... کیا ہوا، خیریت تو ہے نا؟'' وہ ہوشیار ہو گئی۔

رشید نے اطمینان کا سانس لیا کہ رابطہ ہو گیا۔ ''وہ جو آپ نے مجھ سے بیان لیا تھا...... اسے ابھی دو چار دن کے لیے روک دیں۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ ''جانتے ہو اس وقت کیا ٹائم ہے؟ اخبار سب پریس میں ہیں۔''

''یعنی...... وہ بیان چلا گیا؟''

''نہیں، اتفاق ہے کہ مجھے اسٹوری فائل کرنے میں دیر ہو گئی۔ وہ کل جاتا۔ کیا ارادہ بدل دیا ہے تم نے؟''

''نہیں مگر......'' اس نے جانتے بوجھتے لائن کاٹ کے ریسیور ایک طرف رکھ دیا۔

رانی اٹھ کر اس کے پاس آ گئی۔ ''کون سا بیان؟ کسے فون کیا تھا تم نے؟''

''اپنے وکیل ساجد کو۔''

''مجھے تو کسی عورت کی آواز لگی۔'' وہ شک بھرے لہجے میں بولی۔ ''کیا بیان تھا؟''

رشید نے کہا۔ ''تمہارے شوہر کے خلاف کہ اس نے مجھے کسی اختیار کے بغیر روک رکھا ہے۔''

''سچ بتاؤ عورت کون تھی؟ میں نے ساجد کی آواز نہیں سنی۔''

''رانی، پلیز...... ساجد حسن کسی این جی او میں بھی کام کرتا ہے۔ سپریم کورٹ کے ایک سابق جج لاوارث اور مفلس قیدیوں کی مدد کے لیے چلاتے ہیں...... اس کی بیوی بھی وہیں ہے، وہ اخبار والوں سے اور ٹی وی سے رابطہ رکھتی ہے۔ وہ میرا بیان شائع کراتی...... ابھی میں نے اسے روک دیا ہے۔ اس کی بیوی پوچھ رہی تھی کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ میں نے بحث نہیں کی اس وقت......'' رشید کے لیے جھوٹ کو سچ بنانا ضروری ہو گیا تھا۔ رانی کا شک دور کرنا ضروری تھا۔

رانی نے ریسیور اٹھا کے کان سے لگایا اور رکھ دیا۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مطمئن ہو گئی ہے۔

''رشید ایک بات اچھی طرح سمجھ لو، مجھے چھوڑ کے تم اکیلے باہر نہیں جا سکتے۔ نہ میڈیا پر تمہارا بیان اور نہ قانون...... کوئی تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ میں زہر کھا کے مر جاؤں گی لیکن اس دنیا سے بھی اکیلی نہیں جاؤں گی۔''

''کیا کرو گی تم؟ مجھے بھی زہر دے دو گی؟'' اس نے رانی کو اپنی طرف کھینچ لیا۔

کمپنی پالیسی

ایک کمپنی میں نوکری صرف شادی شدہ مرد کو دی جاتی تھی۔ غیر شادی شدہ آدمی اور عورت کو نوکری نہیں ملتی تھی۔ ایسی صورت کو دیکھتے ہوئے عورتوں کے مفاد کو بچانے کے لیے فیکٹری کے باہر عورتوں نے مظاہرہ کیا کہ وہ صرف شادی شدہ مرد کو ہی نوکری کیوں دیتے ہیں۔ کیا تم لوگ سمجھتے ہو کہ عورتیں کمزور ہیں، بے وقوف اور باتونی ہیں اس لیے ان کو نوکری نہیں دینا چاہتے۔''

کمپنی کے نمائندے نے فوراً کہا۔ ''نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اصل میں ہماری کمپنی میں کام کرنے والوں کو بہت کچھ سننا پڑتا ہے۔ مالک یا منیجر جو کہے وہ...... کرتا ہے بغیر جواب دیے ہوئے اور شادی شدہ مرد گھر میں بیوی کی باتوں کو سننے کا عادی ہوتا ہے بیوی جو کہے وہ کرتا ہے بغیر جواب دیے ہوئے یہ خوبی صرف شادی شدہ مردوں میں ہوتی ہے اس لیے ہم ایسے کام کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں جو شادی شدہ ہوں، آئی بات سمجھ میں۔''

لاہور سے انجم خان کی ناراضی

"میں بہت کچھ کر سکتی ہوں کیونکہ ایک جن میرے قبضے میں ہے۔" اس نے تشفّی نظروں سے رشید کو دیکھا۔ "وہ جن میرے اشارے پر کسی کو کہیں بھی پہنچا سکتا ہے، یہ ہو سکتا ہے کہ تم کچھ پہلے دوسری دنیا میں پہنچ جاؤ۔"

"جانِ من، ذرا سوچو یہ کیسے ممکن ہے اگر وہ تمہیں طلاق دینے پر راضی ہو تو اور بات ہے مگر وہ ایسا کبھی نہیں کرے گا۔"

"تم ایک بیوہ سے تو شادی کر کے اس کے ساتھ رہ سکتے ہو۔ صرف چار مہینے دس دن کے بعد۔" وہ رشید کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے جذبات سے عاری لہجے میں بولی۔ رشید کو اس عورت سے خوف محسوس ہوا۔ وقت کی سرنگ ہر گزرتے دن کے ساتھ تنگ ہوتی جا رہی تھی۔ آخری کنارہ ابھی دور تھا۔ باہر کی روشنی کون دیکھے گا۔ سب غیر یقینی ہو گیا تھا۔

اگلا دن بے یقینی کے خلا میں گزرا جب وہ کچھ سوچتے سمجھنے اور کسی فیصلے پر پہنچنے کی ناکام کوشش میں بھٹکتا رہا۔ دوپہر کے قریب اس کی وارڈن آفس میں طلبی ہوئی۔ جیل سپرنٹنڈنٹ کی عدم موجودگی میں وہ تمام اختیارات کا مالک تھا لیکن کسی نامعلوم وجہ کی بنا پر اس کا رویہ رشید کے ساتھ شفقت کا تھا۔ وہ سفید داڑھی والا خاموش طبع آدمی تھا جو قتل و فساد اور بدکرداری و بدعنوانی کی اس دنیا میں بالکل مس فٹ لگتا تھا۔ تیس سال کی نوکری میں وہ محض سنیارٹی کی بنا پر اس عہدے تک ضرور پہنچ گیا تھا لیکن آگے ترقی کا زینہ صرف ان کے لیے تھا جو مقابلے کے امتحان جیل سروس میں پاس ہو کے یہاں پہنچتے تھے۔ وہ بے ضرر تھا اور نئے آنے والوں کے لیے کتابی قواعد وضوابط کا انسائیکلو پیڈیا چنانچہ وہ جگت چاچا تھا اور سب اس کے وجود کو غنیمت شمار کرتے تھے۔ دو سال بعد رشید کو اندر کے ایک شخص نے بتایا کہ اس کا ایک بیٹا تمہاری عمر کا اور کچھ تمہارا ہم شکل بھی تھا جو گھر چھوڑ گیا تھا اور دوبارہ آیا تو دوہرے قتل کے مجرم کی حیثیت سے...... چاچا اس کی کوئی مدد نہ کر سکا اور ایک دن ایسا آیا جب اس نے پھانسی کے بعد بیٹے کی لاش وصول کی اور اسے دفن کر دیا۔ کسی نے اس کی آنکھ میں ایک آنسو نہیں دیکھا۔ کسی نے افسوس کیا تو اس نے یہی کہا کہ قانون تو سب کے لیے ایک ہے۔ بیٹا میرا ہو یا کسی اور کا۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل کی پوسٹ چھ ماہ سے خالی پڑی تھی۔ آخری ڈپٹی کو کسی سیاست داں کے خاص بندے سے ناجائز مراعات واپس لینے کے جرم کی سزا میں بلوچستان کی مچھ جیل بھیج دیا گیا تھا۔

چاچا کے کمرے میں نشاط بیٹھی تھی۔ چاچا نے اسے بھی بیٹھ جانے کے لیے کہا۔ "یہ لڑکی پوچھ رہی تھی کہ جب تمہاری سزا پوری ہو گئی تو تمہیں رہا کیوں نہیں کیا جاتا؟"

نشاط نے ایک فائل کھولی۔ "دیکھیے، اس پر دو الزامات تھے ڈکیتی کے جرم کی سزا سات سال ہو سکتی تھی۔ وہ جرم ثابت ہوتا تب بھی رشید نے جیل کاٹ لی۔ دوسرا جرم بھی ثابت نہیں ہوا، اور عدالت کا یہ فیصلہ۔"

"مجھے سب معلوم ہے بی بی۔"

"معلوم ہے تو ایسا کیوں ہوا رشید کو رہا کیوں نہیں کیا گیا؟"

"اس کا جواب تو جیلر صاحب ہی آ کے دیں گے۔"

"انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ رہائی کے جو احکامات موصول ہوئے تھے ان پر کسی کے دستخط نہیں تھے۔" رشید بولا۔

"یہ ناممکن نہیں، بعض اوقات نادانستہ ایسا ہو سکتا ہے مگر یہ بات بھی بہت پرانی ہو گئی...... اور......" اس نے چند صفحات پلٹ کے کہا۔ "یہ دیکھیے...... اصل احکام کی تصدیق شدہ نقل...... اس پر دستخط ہیں اور یہ بھی ایک ہفتہ پہلے ارسال کی گئی تھی۔"

"مس نشاط میں نے کہا نا کہ انتظامی معاملات میں میرا دخل نہیں، ڈپٹی صاحب ہوتے تو جواب دیتے۔"

"پھر جیلر صاحب کی جگہ آپ کیوں بیٹھے ہیں؟ وہ خود کہاں ہیں۔" نشاط کی آواز میں وکیل اور صحافی کا اعتماد اور بے خوفی تھی۔

"وہ بیمار والدہ کو دیکھنے گاؤں گئے تھے ہر جمعے کی شام جاتے تھے تو اتوار کی شام تک لوٹ آتے تھے لیکن میں نے سنا ہے ان کی بیمار ماں اب آئی سی یو میں ہیں تم رشید کی رہائی کا کیس اٹھاؤ، میں تمہیں منع نہیں کر سکتا...... جواب دہی خود ذمے دار کریں گے۔"

نشاط نے فائل بند کر دی۔ "کیا آپ مجھے اجازت دیں گے کہ میں رشید سے اکیلے میں بات کر لوں، آپ کی مہربانی ہوگی۔"

چاچا نے سر ہلایا اور اٹھ کے باہر چلا گیا۔ کینٹین کی چائے والا تین کپ رکھ کے نکل گیا تو نشاط نے کہا۔ "کیا مقصد تھا کل فون کر کے کہنے کا کہ میں بیان اخبارات کو جاری نہ کروں؟"

"میری کچھ مجبوری تھی۔"

"کیسی مجبوری...... تمہیں مجھ سے نہیں چھپانا

چاہیے...... میں بھی تمہاری وکالت کر رہی ہوں۔" وہ جھلّی سے بولی۔

"میں نے کہا تھا کہ ابھی بیان روک لیں۔"

"مگر کیوں؟ تم وہ بتاتے ہوئے ڈرتے کیوں ہو؟ کیا تمہیں خطرہ ہے کوئی یا دھمکی دی گئی ہے؟"

رشید نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں ایسی کوئی بات نہیں مس نشاط...... ہے کوئی ذاتی مجبوری۔"

"ذاتی مجبوری؟" وہ حیرانی سے بولی۔ "یعنی تم...... تم خود جانا نہیں چاہتے یہاں سے...... کیوں؟"

"ہے کچھ ایسی ہی بات...... بتا دوں گا آپ کو۔"

وہ خاموشی سے چائے پیتے رہے۔ چاچا کے کپ پر جم جانے والی جھلی میں ایک مکھی ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ نشاط نے اچانک کہا۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟"

وہ چونکا اور جھینپ کر بولا۔ "کچھ نہیں...... بس یہ بسنتی ساڑی اور یہ کانوں میں جھومتے دائرے بہت اچھے لگ رہے تھے مجھے وہی دیکھ رہا تھا۔"

رشید نے نشاط کے سانولے رنگ کا ذکر نہیں کیا جس پر یہ رنگ زیادہ کھلا تھا۔ نشاط کے رخساروں پر خفیف سی سرخی جھلکی اور اس کی نظر جھک گئی۔ "میں اب چلتی ہوں...... کب بتاؤ گے تم مجھے؟"

وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ "پتا نہیں، شاید ایک دو دن میں۔"

"او کے، تین دن...... پھر میں جسٹس صاحب کو بتا دوں گی...... قانونی اور اخلاقی طور پر اب مجھے تمہاری اجازت درکار نہیں...... تم دستخط کر چکے ہو، یہ بات پھیل گئی تو...... اور ظاہر ہے پہلے ہی تمہارے لیے خطرہ بڑھ جائے گا۔ خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو کسی کا کچھ نہیں جائے گا۔ یہ نظام ان لوگوں کو تحفظ دیتا ہے، دکھانے کی انکوائری ہو گی کسی کو معطل کر دیا جائے گا اور بس۔"

رشید اسے جاتا دیکھتا رہا۔ معاملہ طشت از بام ہو گیا تھا۔ بیان اخبار میں نہیں گیا تھا مگر نشاط نے چاچا کو بتا دیا تھا کہ وہ سب جانتی ہے اور چاچا جانتا ہو گا کہ وہ کون ہے...... اور کیا کر سکتی ہے۔

رات کو اس نے لیٹے لیٹے پروفیسر کو سب بتا دیا۔ وہ سگریٹ پیتا رہا اور سب سنتا رہا۔ "جیلر کی بیوی کو لے کر بھاگنا تو خود کو اغوا جیسے سنگین جرم میں ملوث کرنا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" وہ چڑ کے بولا۔

"معلوم ہونے سے فرق نہیں پڑے گا۔ تو نے کچھ سوچا ہے یہ مسئلہ کیسے حل ہو گا؟ نہیں سوچتے سے کچھ ہونے والا بھی نہیں۔"

"میں نے سوچا ہے۔" پروفیسر نے سگریٹ کا آخری کش لے کر نیچے رگڑ کر بجھا دیا۔ "تو اس کی بیوہ کو لے کر جا سکتا ہے۔"

"کیا مطلب؟ میں اس کے شوہر کو قتل کر دوں؟"

پروفیسر ہنسا۔ "او نہیں یار...... وہ چاہے تو خود بیوہ ہو سکتی ہے اور اسے ہو جانا چاہیے...... ایسے زندگی نہیں گزر سکتی۔"

"تم بہت آگے کی سوچ رہے ہو۔ ابھی میں کیا کروں اس بچے کا؟"

"وہی جو ایک باپ کو کرنا چاہیے۔" وہ ہنسا۔

وہ منہ پھیر کے لیٹ گیا۔ "تم مذاق ہی کر سکتے ہو استاد۔"

"اگر وہ خود بیوہ ہونے پر راضی ہو جائے تو ظاہر ہے اس کو یہاں سے جانا ہو گا۔ سرکاری رہائش گاہ دوسرے جیلر کے لیے خالی کرنی ہو گی۔ اپنا گھر ہوتا، چار مہینے دس دن عدت کے گزارتی...... پھر تم شادی کر لیتے۔"

"لاحول ولاقوۃ...... میں اس فاحشہ سے شادی کروں گا، میرے بچے کی ماں بن کے وہ مجھے بلیک میل کر رہی ہے۔"

"بچہ ہے تو تمہارا ہی برخوردار...... یہ تم بھی جانتے ہو۔ اچھا ہوتا اگر وہ کنواری بیوہ بن جاتی۔ مگر اب اس کا کیا علاج کہ وہ سچ مچ تمہارے عشق میں مبتلا ہے اور پاگل ہو گئی ہے۔"

"عشق کیا یک طرفہ ہوتا ہے؟ لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد دونوں کو محبت تھی۔"

"مگر یہ حقیقی زندگی ہے پیارے...... یہاں ایسا ہوتا ہے کل تو نیلوفر کے لیے دیوانہ تھا لیکن پھر تو نے اپنی دیوانگی پر خود ہی قابو پا لیا تھا۔ وہ اتفاق سے پھر ملی تو محبت کا دوسرا راؤنڈ شروع ہوا کیونکہ اس وقت تیرے پاس پیسا تھا اور تو اسے حاصل کر سکتا تھا لیکن دوسرے راؤنڈ میں نیلی نے اپنے جذبات کو کنٹرول کر لیا کیا ثابت ہوا اس سے۔"

"کچھ بھی ثابت نہیں ہوا استاد۔" وہ جھلا کے بولا۔

"دیکھ...... وہ خوب صورت اور جوان ہے...... ایک محبت کرنے والی بیوی قسمت سے ہی ملتی ہے۔ وہ دولت مند بھی ہے، باہر جا کے اس سے شادی کر لینا۔ ہنسی خوشی بچے کو پالنا اور زندگی گزارنا۔ گناہ تو کر چکے ہو تم...... اللہ معاف کرنے والا ہے۔ تو مجبور تھا، اس لیے مجبوری تھی تجھے...... یہ

معاملات ہیں دوسری دنیا کے...... پہلے یہاں کی سوچ۔

وہ چپ چاپ سنتا رہا۔ اس کے پاس پروفیسر کی بات کو رد کرنے کے لیے کوئی دلیل نہیں تھی۔ بفرض محال وہ اس صورتِ حال کو منظور کر لے۔ تب بھی یہ ابھی ایک خیال ہے، کیا وہ شوہر کو قتل کرنے پر راضی ہوگی؟ اور کیا ضمانت ہے کہ پکڑی نہیں جائے گی؟ اور اس کے بعد مجھے ملوث نہیں کرے گی۔

”یہ کام کر سکتا ہوں میں تیرے لیے۔“ پروفیسر کی آواز سکوت میں ابھری۔ رشید کا خیال تھا کہ وہ سو چکا۔

رشید اچھل پڑا۔ ”تم...... تم کیا کر سکتے ہو؟“

”میں اس کو بیوہ کر سکتا ہوں اگر تو اس سے شادی کا وعدہ کرے مجھ سے۔“

رشید اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”تم خود تو پاگل ہوئے ہو، مجھے بھی پاگل کر دو گے۔“

”میں تجھے سمجھا رہا ہوں کہ جذبات سے کام لیا تو تیرے ہاتھ کیا آیا...... نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم...... نہ وہ پیسا، نہ وہ محبت کا رشتہ جس کی خاطر تو نے قتل کر دیا۔ تیری بہن عیش کر رہی ہے لیکن یہ بھول چکی ہے کہ جس بھائی نے اسے یہ زندگی دی، وہ کہاں ہے۔ نیلوفر کے لیے بھی تو ایک پچھتاوا ہے۔ اب جذبات کو چھوڑ، حقیقت کی دنیا کچھ اور ہے۔ زندگی ایک ہی بار ملتی ہے اور تو نے قدرت کے دیے ہوئے اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا تو میری طرح زندگی ضائع ہوگی...... ایک سزا بن جائے گی۔“

”کوئی عقل کی بات کرو پروفیسر صاحب۔“

”تو جانتا ہے جب میں لیکچرر بنا تو میں بھی کسی سے ایسی ہی محبت کرتا تھا۔ ایک اسکول ٹیچر تھا میں بھی اور میں اپنے چھوٹے بھائی کو بھی سپورٹ کر رہا تھا۔ ماں مرتے وقت اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے گئی تھی کہ اب تو ہی اس کا باپ ہے۔ میں پہلے یہ ذمے داری نبھانا چاہتا تھا۔ اس کی شادی ہونے تک میری عمر تیس سال ہو گئی تھی۔ اس لڑکی نے میرا انتظار کیا۔ اس کی خاطر میں نے دو ایم اے کیے اور بالآخر لیکچرر بھی بن گیا۔ وہ پہلے سے کالج میں پڑھا رہی تھی۔ شادی کے بعد ہم دس سال ساتھ رہے لیکن اور کیا کہا جائے کہ اولاد قسمت میں نہیں تھی۔ اس نے بہت صبر کیا اور پھر ایک عورت کے اندر کی ماستا نے اس کو تڑپایا نہیں تھا۔ میں نامرد نہیں تھا اس جیلر کی طرح...... میں مکمل مرد تھا لیکن باپ نہیں بن سکتا تھا۔ ڈاکٹر نے بھی کہا تھا کہ یہ سو فیصد ناممکن والی بات بھی نہیں۔ عورت کی عمر بڑھنے کے ساتھ ماں بننے کی صلاحیت بھی کم ہوتی جاتی ہے۔ اس چیک اپ نے ہمارے درمیان جذبات کی وہ خلیج ڈال دی جو نامعلوم طریقے پر پھیل رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ہم بے مقصد ساتھ رہتے ہیں اور اس کی زندگی میری وجہ سے ضائع ہوئی۔“

رشید خاموشی سے سنتا رہا۔ اس نے پہلے کبھی اپنی زندگی کے اس راز سے پردہ نہیں اٹھایا تھا۔ اسے سب کی طرح بس اتنا معلوم تھا کہ اس نے کسی بڑے بزنس مین کو قتل کیا تھا اور وارثوں نے اس پر قتل کا الزام بھی لگایا لیکن وہ ثابت نہیں ہوا تاہم انہوں نے قتل کے عینی شاہد پیدا کر لیے اور اس کو عمر قید کرانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

”بس ایک بات بہانہ ہو گئی۔ اس چھوٹے بھائی نے جو مجھے بچوں کی طرح عزیز تھا، یہاں پہنچایا اور اب مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے۔ خیر وہ جہاں ہو، خوش رہے۔“

”کس کا قتل کیا تھا اس نے؟“ رشید نے کہا۔ ”اور کیوں؟“

پروفیسر نے سر اٹھا کے ایک گہری سانس لی۔ ”کیوں کی وجہ تو وہی زر، زمین، زن کا چکر...... وہ صرف میٹرک تک پڑھ پایا۔ شاید اس کی وجہ میری بے جا ذمے داری تھی۔ میری بیوی تو بہت پہلے چڑتی تھی کہ اپنے بچے ہیں نہیں، تیس سال کے شادی شدہ بیوی بچوں والے کو اپنا بچہ کوئی پاگل ہی کہہ سکتا ہے۔ اس نے میری محبت کا ناجائز فائدہ اٹھایا اور آوارہ گردی میں پڑ گیا۔ میں نے اسے اسی کے کہنے پر ایک جگہ سیلز مین رکھوا دیا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ الیکٹرانکس کی اس دکان کے مالک کی بیٹی کے چکر میں تھا۔ لڑکی کے باپ کو کب تک معلوم نہ ہوتا لیکن بھائی نے اس سے چھپ کر شادی کر لی اور لڑکی کو لے کر میرے پاس آ گیا۔ اس نے مجھے سب بتا دیا تو میں نے اسے تسلی دی کہ فکر مت کر...... کچھ نہیں ہوگا۔ میں نمٹ لوں گا لڑکی کے باپ سے۔ اس لڑکی کا باپ میرے پاس آیا تو میں بھائی اور اس کی بیوی کو پہلے ہی مری بھیج چکا تھا۔ میں نے کسی نہ کسی صورت اس لڑکی کے باپ کا غصہ ٹھنڈا کیا اور اسے قائل کر لیا کہ اب اچھا ہوا کہ بُرا...... وہ اس رشتے کو قبول کر لے...... اور بعد میں اس نے دنیاداری کے لیے سادہ سی تقریب میں لڑکی کو رخصت بھی کیا مگر پھر وہ کاروبار سمیٹ کر یہاں سے چلا گیا۔ بات چھپی نہ رہ سکی تھی کیونکہ اس...... شادی میں لڑکی کی پسند صاف نظر آتی تھی۔ اس نے زندگی بھر لڑکی سے کوئی تعلق بھی نہیں رکھا۔

دو ماہ بعد میں نے کوشش کر کے اسے ایک اچھے

بڑے کلاتھ اسٹور پر سیلز مین رکھوایا اور کچھ عرصے بعد الگ گھر میں شفٹ کر دیا کیونکہ اس کی وجہ سے میری اپنی ازدواجی زندگی تلخ ہو رہی تھی۔ اس نے محنت کی اور وہ کلاتھ اسٹور... چند سال میں دو منزلہ ہو گیا جس میں اوپر نیچے مردانہ اور زنانہ کپڑے کی ہر ورائٹی تھی۔ کم سے کم دس سیلز مین تھے لیکن سیٹھ کچھ بھائی کی محنت اور کچھ شخصیت سے متاثر ہوا۔ اس نے بھائی کو کیش کاؤنٹر پر بٹھا دیا۔ ہر روز کی سیل بھی بہت تھی اور عید یا شادی کے سیزن میں لاکھوں تک پہنچ جاتی تھی۔ رمضان کے آخری ہفتے میں دکان نصف شب کے بعد تک کھلی رہتی تھی۔ ہر روز لاکھوں کیش وصول کرتے کرتے بھائی کا ایمان متزلزل ہو گیا۔ اس نے بڑی ذہانت سے منصوبہ بندی کی۔ ہر روز کا کیش دو بار بینک جاتا تھا۔ دن کی کمائی شام کو اور رات دکان بند ہونے تک کی آمدنی صبح صبح بینک چلی جاتی تھی۔ سب ایک روٹین پر چل رہا تھا۔ عید کے آخری دنوں کی کمائی اس نے اپنے پاس رکھی اور سیٹھ کو رپورٹ دیتا رہا کہ بینک میں جمع ہو گئی۔ سیٹھ کو اعتبار تھا چنانچہ روز بینک سے معلوم بھی نہیں کرتا تھا۔ اندازہ ہے کہ عید کی چھٹیاں ہونے تک اس نے تیس لاکھ کے قریب جمع کر لیے تھے۔ تین دن بینک بند تھے۔ اس کو یقین ہو گیا کہ اب سیٹھ کو معلوم ہو گا تو عید کی چھٹیوں کے بعد...... اس کا پروگرام فائنل تھا لیکن نہ جانے کیا ہوا کہ سیٹھ نے آن لائن بیلنس چیک کیا تو اسے غبن کا اندازہ ہو گیا۔ مجھے شک ہے کہ کسی سیلز مین نے تاڑ لیا تھا کہ بھائی گڑبڑ کر رہا ہے۔ شاید اسی نے رازداری کی قیمت مانگی ہو اور ناکامی پر سیٹھ کو مطلع کر دیا۔ عین عید کے دن سیٹھ اس کے گھر پہنچ گیا۔

"بھائی نے بیوی بچوں کو بھیج دیا تھا اور خود نکلنے والا تھا۔ سارا پلان فیل ہوتا نظر آیا اور جیل کی ہوا کھانا یقینی محسوس ہوا تو بھائی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ...... سیٹھ کو گرا کے گلا گھونٹا اور خاموش کر دیا۔ وہ عمر رسیدہ اور کمزور آدمی تھا۔ لاش کو وہیں چھوڑ کے وہ میرے پاس آیا اور چابی مجھے دے کر بولا کہ وہ فیملی کے ساتھ مری جا رہا ہے۔ شک کی بات بھی نہ تھی۔ میں نے چابی لے لی۔ اس شام پولیس میرے پاس پہنچ گئی۔ میں نے بتا دیا کہ بھائی تو مری گیا ہے۔ وہ مطمئن نہ ہوئے اور مجھے اپنے ساتھ اس کے گھر لے گئے وہاں سیٹھ کی لاش پڑی تھی۔ اس کے ایک بیٹے نے سب معلوم کر لیا تھا کہ بینک اکاؤنٹ میں کب سے کچھ جمع نہیں کرایا گیا اور اندازاً کیشیئر تیس چالیس لاکھ لے کر بھاگ گیا ہے۔ پولیس نے اس کا سراغ لگانے کے لیے مجھے مسلسل تشدد کا نشانہ بنایا۔ وہ مجھ سے بولتے رہے کہ جب بھائی کے بینک اکاؤنٹ میں غبن کا پیسا نہیں گیا تو ضرور اس نے میرے پاس رکھوایا ہو گا۔ پولیس مجھے ساتھ لے کر مری کے تمام ہوٹلوں میں گئی۔ عید کی چھٹیوں میں بھی وہاں ملک بھر سے ہزاروں لوگ آتے ہیں۔ اسے ملنا تھا اور نہ ملا۔ آج تک نہیں ملا۔ میں قبول کرتا نہ کرتا وہ منوا لیتے...... ان کو یعنی وارثوں کو پیسا واپس مل جاتا تو شاید وہ مرحوم ابا کا خون معاف کر دیتے لیکن کچھ بھی نہیں ملا تو ان پر انتقام کا بھوت سوار ہو گیا۔ سب کو معلوم تھا کہ میں نے اسے بچوں کی طرح پالا تھا۔ میں ہی نشانہ بنا اور دیکھ لے...... میں یہاں عمر قید کاٹ رہا ہوں تیرے سامنے۔ ممکن ہے بھائی کراچی چلا گیا ہو جہاں سے جعلی شناختی کارڈ پر پاسپورٹ بنوانا آسان ہے۔ یا کراچی میں ہی روپوش ہو جو دو کروڑ انسانوں کا سمندر ہے۔ اس میں ایک آدمی صرف پانی کی ایک بوند ہے۔"

ان دونوں کے درمیان خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا پھر رشید بولا۔ "اور وہ جو بیوی تھی تمہاری؟"

پروفیسر کا چہرہ اندرونی کرب کی تصویر بن گیا۔ "اس نے تو اسی وقت طلاق لے لی تھی جب مجھ پر مقدمہ قائم ہوا تھا اور مجھے سزا ہونے سے پہلے وہ کسی اور سے شادی کر چکی تھی۔ سنا ہے تین بچے ہیں اس کے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آیا استاد...... اب تم کو یہ کیسے سوجھ گئی...... قتل کرنے کی؟"

رشید "یہ ٹھیک ہے کہ میں زندہ ہوں لیکن جب

شجرہ نسب

"ڈیڈی! امی کہتی ہیں کہ انسان پہلے بندر تھا اور رفتہ رفتہ تبدیل ہو کر انسان کے روپ میں آ گیا......"

"ہاں، اور کیا کہتی ہیں تمہاری امی؟" باپ نے بات کاٹ کر پوچھا۔

"وہ تو نہیں، آپ کہتے ہیں کہ انسان شروع سے انسان تھا اور ہم سب حضرت آدم کی اولاد ہیں...... میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ دونوں میں سے کس کی بات مانوں؟"

"دونوں درست ہیں بیٹا...... تمہاری امی کا خاندان بندروں کی اولاد ہے اور میرا انسانوں کی اولاد۔ ضد کرو گے تو شاید وہ اپنا پورا شجرہ بھی بتا دیں گی۔ تم نے دیکھا نہیں کہ وہ کبھی کبھی ہم دونوں پر کیسے غراتے لگتی ہیں۔"

مالیر سٹی سے خرم علیم کا شگوفہ

میری سزا کی میعاد پوری ہوگی اور میں باہر جاؤں گا تو میری کیا زندگی ہوگی۔ کون ہے باہر کی دنیا میں میرا جو میرا انتظار کر رہا ہو۔ کیا کروں گا میں اس دنیا میں جا کے جہاں اب کوئی شناسا بھی ملے گا تو اجنبی ہو جائے گا۔ پروفیسر تو کیا مجھے ٹیچر کی نوکری بھی نہیں ملے گی۔ لیکن اس کے علاوہ بھی ایک بات ہے جو کسی کو معلوم نہیں لیکن میں جانتا ہوں۔ سال بھر پہلے جیل کے ڈاکٹر نے کہا تھا کہ سگریٹ چھوڑ دو...... پھیپھڑے متاثر نظر آتے ہیں۔ کہیں کینسر نہ ہو۔ یہاں کس کو پروا ہے کہ چیک اپ کرائے جب خود مجھے ہی نہیں۔ اب شک نہیں میرا یقین ہے کہ مجھے کینسر ہو چکا ہے۔ یہ چھوت سے لگنے والی بیماری نہیں ہے ورنہ میں تجھے بھی اپنے ساتھ نہ رکھتا۔ جیل میں خاک علاج ہوگا جب باہر کوئی علاج نہیں۔ سال تو نا ممکن ہے۔ چند مہینے شاید مل جائیں مجھے...... کیوں نہ میں اس بے غیرت آدمی کو ماردوں جس کو جینے کا کیا حق ہے۔ ایسا میں سمجھتا ہوں لیکن تجھے ایک موقع ملنا چاہیے۔"

"نہیں استاد...... مجھے رہائی مل جائے گی۔ وہ لڑکی نشاط کوشش کر رہی ہے۔ اچھا اس سے کہوں گا کہ تمہارے علاج کے لیے بھی کچھ کرے۔"

پروفیسر چپ رہا۔ خود رشید کو بھی اپنے الفاظ کے کھوکھلے پن کا احساس تھا۔ اگر اسے واقعی کینسر ہو چکا تھا تو اس کے اندر باہر ہونے سے کیا فرق پڑتا تھا۔ موت کا ایک دن متعین ہے اور وہ کون جانتا ہے کہ کس کو کب اور کیسے آئے گی۔

نصف شب سے پہلے اس کی طلبی ہوگئی۔ وہ سونا چاہتا تھا۔ دن میں اسے کوئی رعایت نہیں ملتی تھی اور وہ بڑی مشکل سے کہیں چھپ کر کچھ وقت نکالتا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ انکار کر دے۔ لیکن وہ حالات کو خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ آج وہ طبیعت کی خرابی کے بہانے سو کے رات گزار دے۔ رانی نے اس کی معذرت قبول کر لی اور صبح وہ دیر تک سوتا رہا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا ورنہ صبح کے اجالے سے پہلے وہ لوٹ کر اپنے سیل میں آجاتا تھا۔ حاضری کے وقت اس کی موجودگی لازمی تھی۔

وہ گھبرا کے اٹھا۔ "تم نے جگایا نہیں مجھے...... میری غیر حاضری......"

وہ مسکرائی۔ "میں نے چاچا سے کہہ دیا تھا کہ صاحب تو لوٹ کے آئے نہیں۔ رشید کو میں نے حفاظت کے لیے روکا ہے۔ میری ساس مر گئی ہے۔"

"کیا؟" وہ چونکا اور اٹھ بیٹھا۔

"ہاں، میرے میاں کا فون آیا تھا۔ بڑھیا آئی سی یو میں کب تک رہتی۔ اب ہمیں شہر جانا ہے۔"

"ہمیں؟" وہ باتھ روم کی طرف جاتے جاتے رک گیا۔

"ہاں، مجھے اور تمہیں...... جنازہ بعد نماز ظہر ہے۔ مجھے ڈرائیونگ نہیں آتی۔ تمہیں آتی ہے؟"

"لیکن میں کیسے باہر جا سکتا ہوں؟"

"یہ مجھ پر چھوڑ دو۔"

رشید کو سخت حیرانی ہوئی جب اس نے کہیں سے خاکی رنگ کی وردی برآمد کی جس کے ساتھ پی کیپ بھی تھی۔ وردی اسے کچھ ڈھیلی تھی۔ یہ کسی پرانے ڈرائیور کی تھی جو اس کی شادی سے پہلے بھی اس کے شوہر کا ملازم رہا تھا۔ رشید کا دل خوف سے دھڑک رہا تھا جب وہ کار میں ڈرائیور کی حیثیت سے بیٹھا اور پیچھے بیٹھنے کے بجائے رانی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

"سب دیکھ لیں گے کہ صرف گاڑی جیلر صاحب کی نہیں ہے۔ میں بھی ساتھ ہوں۔" اس نے کہا۔ "کوئی روکے گا نہیں۔"

اور ایسا ہی ہوا۔ ہر دروازے پر گارڈ پہلے سامنے آئے پھر بیگم صاحبہ کو دیکھا تو سیلیوٹ مار کے پیچھے ہٹ گئے۔ اچانک رشید نے باہر کی آزاد دنیا...... سڑکوں پر چلتے پھرتے انسانوں، جو رکشا اور کاروں میں تھے اور موٹر سائیکل پر تھے اور بسوں میں تھے۔ مرد عورت اور بچے...... آزاد دنیا کے لوگ...... اور خود کو ان سب کے درمیان پا کے رشید کے دل میں یہ خواہش مچلی کہ وہ گاڑی کہیں بھی روک کے اترے اور بھاگ جائے۔

رانی کی آواز نے اس خواہش کو جیسے سن لیا۔ "میرے پاس بھرا ہوا ریوالور ہے۔" وہ بولی۔

رشید نے خود کو سنبھالا۔ "مجھے کیوں بتا رہی ہو تم سمجھتی ہو میں بھاگ جاؤں گا؟"

"نہیں، اب نہیں بھاگو گے۔"

"تم واقعی مجھے گولی مار سکتی ہو؟" اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ "یعنی تمہیں میری ضرورت نہیں۔"

"میرے بچے کو باپ کی ضرورت ہے...... مجھے ہو نہ ہو......" وہ سامنے دیکھتی رہی۔

اس کی واپسی اگلے روز ہوئی۔ جیلر کے آبائی گھر پہنچتے ہی اس کو ایک کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔ رانی کا شوہر اس کی بے وقوفی پر بہت ناراض تھا کہ اس نے انتہائی غیر ذمے

دارانہ حرکت کی۔ وہ فون کر کے ٹیکسی منگوا سکتی تھی۔ تمہیں کوئی اختیار نہیں کسی سزا یافتہ قیدی کو یوں باہر لانے کا...... رانی نے۔ اسے یہ نہیں کہا کہ قانونی طور پر تو اب وہ آزاد ہے یا یہ کہ رشید میرا ابھی قیدی ہے۔ رانی کے شوہر نے واپسی کے سفر کے لیے کوئی ڈرائیور فراہم کیا اور رشید کو باندھ کر ڈکی میں ڈال دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ قیدی جلد از جلد جیل کے اندر پہنچ جائے۔ اگر وہ اکیلی ٹیکسی میں آتی تو شاید اسے ساس کے سوم تک رکنا پڑتا۔

یہ انکشاف اس پر واپس جیل میں پہنچنے کے بعد ہوا کہ نشاط نے اس کا بیان شائع کرا دیا ہے اور اس پر متعدد رفاہی تنظیموں، این جی اوز اور وکیلوں کے بیانات میں اس لاقانونیت پر شدید ردعمل کا اظہار بھی کیا گیا ہے۔ وہ پروفیسر کو اپنے شہر کی آزاد دنیا کے سفر کی روداد سنا رہا تھا کہ ایک پرانا قیدی آگیا۔ زیادہ عمر کی وجہ سے اس کی سزائے موت عمر قید میں بدل دی گئی تھی۔ اس نے خاموشی سے رشید کو ایک چھوٹا موبائل فون دیا۔ ''اسے سنبھال کے رکھ لے۔''

''یہ کہاں سے آیا؟''

''آگیا کہیں سے۔ کوئی وکیل آیا تھا وہ دے گیا ہے۔ تو ایسے حیران ہو رہا ہے جیسے تجھے کچھ معلوم نہیں کہ پیسا خرچ کرنے والوں کو اندر سب کچھ ملتا ہے۔ گھر کا کھانا بھی...... سگریٹ چائے، گندا نشہ...... اندر بڑے لوگ محفلیں سجاتے ہیں ناچ گانے کی...... مجرے کراتے ہیں۔ شراب آتی ہے، زنانہ وارڈ سے روز سپلائی ہوتی ہے۔'' وہ گالیاں دینے لگا۔

''وہ تو معلوم ہے مجھے۔'' رشید نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ اسے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ یہ انتظام نشاط نے کیا ہو گا۔ ایک کونے میں جا کے اس نے نشاط سے بات کی۔

''ہاں، فون میں نے بھیجا تھا کل...... آج تحریک چلا دی ہے میں نے...... اب تم محفوظ ہو، اسی ہفتے میں تمہاری رہائی ہو جائے گی۔ آج کیس بھی دائر کر دیا جائے گا تمہاری رہائی کے احکامات حاصل کرنے کے لیے...... موبائل فون میں بیلنس ہے۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو تو مجھے بتا دینا۔ دن میں تین بار میں فون پر تمہاری خیریت پوچھوں گی۔ صبح، دوپہر، رات...... بلکہ ٹائم نوٹ کر لو۔ نو بجے، پھر تین بجے اور پھر نو بجے۔'' وہ بولتی گئی۔ رشید خاموشی سے سنتا رہا۔ اسے نشاط کی آواز اچھی لگ رہی تھی۔

نشاط کی مہم کے پیچھے قانون کی طاقت تھی۔ این جی اوز نے اپنی دکانداری کے لیے صحافت کے کچھ بااثر نام اپنے ساتھ ملا رکھے تھے۔ یہ ناممکن تھا کہ اس کا ردعمل نہ آتا۔ جیلر کو وزارتِ داخلہ کے حکام نے بھی فون کیا اور اخباری نمائندوں نے بھی لیکن وارڈن چاچا نے سب کو ایک ہی جواب سے دور رکھا۔ ''والدہ کے انتقال پر وہ گاؤں گئے ہوئے ہیں۔ انہیں اچانک جانا پڑا تھا۔'' اس نے جیلر کا فون نمبر دینے سے انکار کر دیا۔ ''مجھے معلوم ہوتا تب بھی میں نہ بتاتا۔ یہ موقع نہیں ایسی باتوں کا، وہ دو چار دن میں آجائیں گے۔''

گھر پہنچنے کے بعد رانی نے کوئی اخبار نہیں دیکھا تھا۔ جیل میں سرکاری خرچ پر آنے والے اخبارات صبح اس کے گھر پہنچائے جاتے تھے اور پھر اس کے آفس میں رکھ دیے جاتے تھے۔ لیکن نہ جانے کیسے کسی نیوز چینل نے بھی اس معاملے کو اٹھا لیا خبر کے ساتھ رشید کی تصویر بھی تھی۔ پھر اس نے گھر میں پڑے اخبارات اٹھائے تو اسے ہر اخبار میں رشید کی صورت دکھائی دی۔ نشاط نے اس کے بیان کی نقل بھی جاری کی تھی لیکن اس کے جرم کی تفصیل نہیں دی تھی۔ خبر میں صرف اتنا تھا کہ ایک جرم ثابت نہ ہونے اور دوسرے میں سزا کاٹ لینے کے بعد رشید کو خلافِ قانون رہا نہیں کیا جا رہا ہے۔ اس کے ذمے دار جیل کے حکام ہیں۔ اخبارات جیلر کے آبائی گاؤں میں نہیں پہنچتے تھے لیکن اب ڈش کی وجہ سے ٹی وی چینل سب جگہ تھے لیکن ٹی وی ہر گھر میں نہیں تھا۔ کچھ خوش حال گھروں کے علاوہ یہ چائے خانوں اور چھپر ہوٹلوں میں لگے ہوئے تھے مگر ان پر فلمیں چلتی رہتی تھیں۔ جیلر کو اس روز رشید کے معاملے کا علم نہیں ہوا۔ اس کی ذمے داریاں سنبھالنے والے چاچا نے جیلر کو اس سوم سے پہلے ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا اور خود رانی نے ایسا نہیں کیا۔ جب وہ رات تک نہیں لوٹا تو اسے یقین آگیا کہ شوہر صاحب کو ابھی تک اس معاملے کا علم نہیں اور اب وہ لوٹے گا بھی تو کل شام تک...... ظہر کی نماز کے بعد تو اس کی ماں کا سوم تھا۔

اس رات رشید نے رانی کو ایک عالمِ وحشت میں دیکھا۔ اس کے بال پریشان تھے اور آنکھیں دھندلائی ہوئی تھیں۔ ''یہ کیا ہے رشید؟'' اس نے اخباروں کا ایک بنڈل اس کے سامنے پھینک کے کہا۔

''کیا ہے؟'' رشید نے انجان بن کے نظر چراتے ہوئے کہا۔

''یہ تم مجھ سے پوچھ رہے ہو، کمینے آدمی...... میں تمہیں گولی مار دوں گی۔'' اس نے جھپٹ کر دراز میں سے ریوالور نکالا اور چلائی۔

رشید کو اس کی چیخیں سنائی دیں مگر وقت چلا کے خبردار کر

دیا تھا کہ اس کیفیت میں رانی کیا کر سکتی ہے۔ رانی نے دو فائر کیے جو سامنے کھڑکی کے شیشوں میں سوراخ کر گئے......

اس سے پہلے کہ وہ مزید فائر کرتی رشید نے اس سے ریوالور چھین لیا اور رانی کو بیڈ پر گرا دیا...... اسے ایک لمحے کی تاخیر بھی ہو جاتی تو اس کیفیت میں رانی اس کے سینے میں گولیاں اتار دیتی...... اور اس کے بعد شاید خود کو بھی ہلاک کر لیتی۔ بیڈ پر گرتے ہی وہ اچھل کے واپس آئی اور اس نے رشید پر حملہ کیا۔ اب اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ اس کے ہونٹوں سے گالیوں کے ساتھ کف جاری تھا۔ ''کمینے...... ذلیل...... تم سمجھتے ہو کہ آسانی سے مجھے چھوڑ دو گے اور میں تمہارے بچے کو پالتی رہوں گی۔''

رشید نے اسے ایک زناٹے کا تھپڑ رسید کیا۔ وہ گھوم کے پھر بیڈ پر جا گری اور بے ہوش ہو گئی۔ رشید نے سکون کا سانس لیا اور پستول کو بیڈ کے پیچھے پھینک دیا۔ ایک گلاس پانی پی کے وہ رانی کے پاس بیٹھ گیا۔ جو اب الٹی پڑی تھی۔ اس کا دھڑ بیڈ پر تھا اور پاؤں فرش کو چھو رہے تھے۔ اس نے رانی کو گھسیٹ کر سیدھا کیا اور اس کے سر کے نیچے تکیہ رکھ کر اس پر پانی کے چھینٹے مارے۔ وہ آہستہ سے کراہی پھر سسکیاں لینے لگی۔

''رانی...... رانی ہوش میں آؤ...... لو پانی پیو۔'' رشید نے پیار سے کہا۔

رانی کی آنکھیں آہستہ آہستہ وا ہوئیں اور اس پر جم گئیں۔ اس کا جنون ختم ہو گیا تھا۔ کسی مزاحمت کے بغیر اس نے رشید کے ہاتھ کا سہارا لے کر سر اٹھایا اور تھوڑا سا پانی پیا۔ پھر اس سے چمٹ کر زار و قطار رونے لگی۔ ''تم چلے جاؤ گے؟ رانی کو لاوارث چھوڑ کے۔ نہیں رشید تم نے ایسا کیا تو میں زندہ نہیں رہوں گی، میں زہر کھا لوں گی، گولی مار لوں گی خود کو۔''

''میں نہیں جا رہا کہیں بھی تمہیں چھوڑ کے۔'' اس نے مجروح نظروں سے رشید کو دیکھا۔

''جھوٹ مت بولو۔ تم کو سب معلوم ہے کہ اخبار کیا کہہ رہے ہیں۔ تم نے اس وکیل کو اپنا بیان لکھوایا تھا...... نشاط کو...... میں جانتی ہوں اسے...... وہ بنگالن...... تم پر اس کا کالا جادو اثر کر گیا ہے۔''

''خدا کے لیے رانی، یہ ٹھیک ہے کہ میں نے اس کے کہنے پر بیان پر دستخط کیے تھے مگر وہ جھوٹ تو نہیں تھا۔''

وہ سیدھی ہو کے بیٹھ گئی۔ اس نے انگلیوں سے بالوں کو کنگھی کر کے پیچھے کیا۔ ''کتنا اچھالا ہے اخبارات نے اور ذلیلوں نے اس معاملے کو...... میرے شوہر کو ابھی پتا نہیں۔''

''لیکن اب وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔'' رشید نے ہمت کر کے کہا۔ ''ابھی ہو سکتا ہے اسے معطل کیا جائے۔ یا ٹرانسفر...... بات کو دبانے کے لیے...... لیکن نہ وہ مجھے مار سکتا ہے نہ اب میرے خلاف نیا مقدمہ کھڑا کر سکتا ہے۔ رہی بات نشاط کی...... تو وہ شادی شدہ عورت ہے اس کے میاں کا نام نسیم ہے۔ اس کو بدنام مت کرو۔''

رانی کے ردعمل سے اندازہ ہوا کہ اس نے یہ جھوٹ تسلیم کر لیا ہے۔ ''تم کو میرا ذرا بھی خیال نہیں؟ تم چھوڑ جاؤ گے مجھے؟''

رشید کے لیے انکار آسان تھا نہ اقرار...... وہ رانی کو دیکھتا رہا۔

رانی نے کہا۔ ''تم کو ذرا بھی محبت نہیں مجھ سے...... شاید تم محبت کر ہی نہیں سکتے...... تم نے نیلی سے محبت کی تھی؟''

''ہاں...... لیکن وہ مجھے چھوڑ گئی۔ اس نے مجھے یہاں پہنچا دیا...... یہ تھی اس کی محبت۔''

''نہیں رشید...... محبت ایسی نہیں ہوتی۔ محبت سزا بنتی ہے، سزا دیتی نہیں...... جان دینا جانتی ہے۔ جان لے نہیں سکتی۔ رانی جانتی ہے محبت کیا ہوتی ہے۔ تم تو اسے ناجائز تعلق ہی کہو گے۔ دنیا بھی کہے گی۔ سب کی نظر میں ایک فاحشہ ہوں میں...... ہوس پرست عورت...... جب تم نہیں سمجھے تو دنیا کیا سمجھے گی۔'' وہ جذباتی ہو گئی۔

''رانی، پلیز صورت حال کو سمجھو۔ تم کسی اور کی بیوی ہو۔ شرع قانون معاشرہ...... سب تمہاری محبت کو کیسے جائز سمجھ سکتے ہیں؟ میں اور تم کیسے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تم اس سے طلاق لے لو۔ پھر تم عدت کا زمانہ گزار کے میری ہو جاؤ مگر وہ ایسا کبھی نہیں ہونے دے گا۔ وہ اپنی عزت کے بھرم پر مجھے، تمہیں، ان سب کو مار سکتا ہے۔''

''تو...... اگر ہم بھاگ جائیں...... کہیں روپوش ہو جائیں۔''

''پاگل ہو تم جو ایسا سوچتی ہو، اول تو ایسی جگہ کوئی نہیں جہاں ہم بھاگ کے جا سکیں۔ تم اس کی بیوی تو رہو گی نا، ایک شوہر کے ہوتے دوسرے مرد سے نہ شادی ممکن ہے نہ اس سے تعلق۔''

اس نے رشید کو کھینچ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔ ''اگر ہم فتویٰ لے لیں کہ وہ نامرد تھا۔''

''پاگل...... تمہارے کہنے سے کیا ہوگا؟ یہ میڈیکل چیک اپ کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتا۔ فیصلہ عدالت ہی کر سکتی

ہے۔ اس کی رپورٹ دیکھ کر...... تب تک تم کہاں رہو گی...... میں کہاں رہوں گا، زیادہ امکان یہی ہے کہ جیل میں...... ہر جیل میں تمہارے شوہر کی مرضی چلے گی۔ میرا وہ حشر کیا جائے گا کہ دنیا دیکھے۔‘‘

وہ کچھ دیر خاموش لیٹی چھت کو دیکھتی رہی۔ رشید کا خیال تھا کہ اس پر نیند غالب آ رہی ہے۔ مگر اس نے اچانک کہا۔ ’’میں زندہ نہیں رہ سکتی تمہارے بغیر...... اسے فلمی ڈائیلاگ مت سمجھنا، یا یہ کہ کچھ دن بعد میں تمہیں بھول جاؤں گی۔ تم سن رہے ہو نا؟ میں مر جاؤں گی...... میں نے طے کرلیا ہے اور اس کا بندوبست بھی کرلیا ہے۔‘‘

وہ اٹھ بیٹھا۔ ’’کیا بندوبست کرلیا ہے؟‘‘

وہ ہذیانی انداز میں ہنسی۔ ’’ابھی کیوں بتاؤں لیکن خواب آور گولیاں رکھی ہیں میرے پاس...... ہوں نا میں پاگل...... بتا بھی دیا تمہیں...... کھا کے سو جاؤں گی اور نیند مجھے سکون کے ساتھ خاموشی سے اڑا کے موت کی وادی میں لے جائے گی۔‘‘

رشید کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ اس نے پہلی بار محبت عشق اور جنون یا وحشت کا مجسم روپ رانی کے پیکر میں دیکھا جو انتہائی سحر آفریں تھا۔ حسن جو رانی کے وجود میں آنکھ دیکھ سکتی تھی اس سے کہیں زیادہ...... جو محسوس ہوتا تھا، ول میں روشنی جگاتا تھا اس کی حرارت اس روشنی میں تحلیل ہوتی جا رہی تھی۔ اندھیرے کی طرح جو صبح کی نمود میں اپنا وجود کھو دیتا ہے۔ وہ رانی کے پیکر میں یوں تحلیل ہو رہا تھا جیسے پورب اور پچھم کی ہوا ایک ہو جاتی ہے۔

پروفیسر نے اس کو گھٹنوں میں سر رکھے دیکھا۔ وہ نہ جانے کس وقت لوٹا تھا اور نہ جانے کیوں آتے ہی فرش پر گر کے سویا نہیں تھا۔ جیسا کہ ہر بار ہوتا تھا۔ ’’رشید...... کیا بات ہے؟‘‘

رشید نے سر اٹھا کے اس کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھا۔ جیسے سوال اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔

پروفیسر نے اسے ہلایا۔ ’’کچھ پلا تو نہیں دیا ہے اس نے تجھے؟ تو ٹھیک ہے نا؟‘‘ پھر اسے کھانسی کا دورہ پڑا اور وہ سینہ پکڑ کے سانس لینے کی کوشش کرتا رہا۔ رشید کو فرش پر سیاہی مائل سرخ دھبا سا دکھائی دیا جو خون تھا اور جم کے خشک ہونے لگا تھا۔ پروفیسر کی آنکھیں درد کی شدت سے خونی ہو رہی تھیں۔

اس سے پہلے کہ وہ پروفیسر کو سنبھالتا، رشید کا بلاوا آ گیا۔ جانے سے پہلے اس نے پروفیسر کو گلاس میں پانی ڈال کر دیا۔ پروفیسر اذیت میں مسکرایا۔ ’’میں...... اب ٹھیک ہوں......‘‘ پانی کا ایک گھونٹ لے کر اس نے گلاس رکھ دیا اور جیب میں سے سگریٹ نکالی، سگریٹ لبوں میں لگانے والے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ لبوں میں دبی سگریٹ اس نے مشکل سے جلائی۔ رشید کا دل کٹ گیا۔ وہ مر رہا تھا۔ اور کتنے شوق سے اپنی موت کی طرف جا رہا تھا۔ کیونکہ اس کی زندگی بے معرف ہو گئی تھی۔ جس کی نہ اسے ضرورت تھی نہ کسی اور کو۔

جیلر ابھی تک واپس نہیں لوٹا تھا۔ اس کے کمرے میں نشاط کے ساتھ ایک اور کالے کوٹ والا وجیہہ شخص تھا جس کے بال بالکل سفید اور چھوٹے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے سر پر برف جمی ہو۔ لیکن وہ صحت مند تھا اس کا رنگ صاف اور آنکھیں نیلی اور پُراسراریت لیے ہوئے تھیں۔ وہ جیلر کی خالی کرسی کے سامنے ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ رشید سے ہاتھ ملاتے ہوئے وہ مسکرایا تو اس کے ہموار سفید دانت چمکے لیکن وہ اس کی عمر سے میل نہیں کھاتے تھے اور غالباً مصنوعی تھے۔

رشید دائیں طرف بیٹھ گیا تو نشاط نے کہا۔ ’’ہم تمہاری رہائی کے احکامات لے آئے مگر کچھ سرکاری ضابطے بیچ میں آ گئے۔ آج جیل میں موصول ہوں گے۔ کل تم آزاد ہو جاؤ گے۔‘‘

سفید بالوں والے وکیل نے بریف کیس میں سے ایک کاغذ نکالا۔ ’’یہ اس کی نقل تم رکھ سکتے ہو۔‘‘

رشید نے سوالیہ نظروں سے نشاط کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔ ’’یہ میرے شوہر ہیں...... مسٹر نسیم صدیقی۔‘‘ کاغذ رشید کے ہاتھ سے گر گیا۔ ’’آپ...... کے شوہر۔‘‘

’’بہت حیران ہو تم۔‘‘ نسیم صدیقی مسکرایا۔ ’’نشاط میری دوسری بیوی ہے۔‘‘

’’وہ...... دراصل...... انہوں نے کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔‘‘ رشید نے نیچے گرا ہوا کاغذ اٹھایا۔

نشاط کے گہرے سانولے رنگ میں حیا کی سرخی مل گئی تھی۔ ’’ہم نے حال ہی میں شادی کی ہے۔ دو ہفتے قبل۔‘‘

’’جی...... بہت مبارک ہو...... یہ بھی اکیلے ہوں گے۔‘‘ رشید کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اور کیا کہے۔

’’اکیلا؟‘‘ نسیم صدیقی نے قہقہہ لگایا۔ ’’میری ساٹھ سال کی بیوی کو دیکھو تو ادھوری ڈکشت کو بھول جاؤ تم...... سات بچے تھے دو بیٹے اور ان کے بچے ہمارے ساتھ ہیں۔‘‘

ایک قیدی ان کے سامنے چائے کے تین کپ رکھ گیا۔

’’بالآخر میں نے ان کی بیوی کو منا لیا۔ ورنہ یہ تو نہیں

مانتے تھے۔" نشاط نے ایک شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور اپنے شوہر پر ایک وارفتگی کی نظر ڈالی۔ اس نظر نے وہ سب کہہ دیا جو محبت کی پوری کہانی تھی۔ آسانی سے سمجھ میں نہ آنے والی۔

رشید کا دماغ کسی ہنڈولے کی طرح گھوم رہا تھا۔ یہ کیا طلسم ہوشربا تھی۔ جادوئی کہانی جس میں نہ دلیل تھی نہ منطق...... رات کو اس نے سوچے سمجھے بغیر جو جھوٹ بولا تھا وہ صبح ہونے تک کیسے سچ ہو گیا۔ اس نے رانی سے کہا تھا کہ نشاط کے شوہر کا نام نسیم ہے جبکہ اس کا خیال تھا کہ یہ باپ کا نام ہوگا اور شوہر کہلانے والا اس کے باپ سے بھی زیادہ عمر کا تھا۔ نشاط نے خود اس کی پہلی بیوی کو منایا تھا۔ اس سے پہلے یقیناً اس نے نسیم صدیقی کو منایا ہوگا۔ اس لیے نشاط نے یہ سب کیا کہ اسے محبت تھی نسیم سے...... نشاط سے یہ سب اس محبت نے کرایا جو اسے کسی اپنی عمر کے نوجوان سے نہیں ہوئی۔ سانولے رنگ کے باوجود اس کے حسن میں وہ کشش تھی جو کسی کو بھی کھینچ سکتی تھی۔ جسے رانی نے بنگال کا کالا جادو کہا تھا۔

کیا ہے آخر یہ محبت...... وہ جو مجھے نیلی سے تھی کچھ اور تھی...... جو نیلوفر کو مجھ سے تھی بالکل مختلف تھی۔ وہ بھی تو محبت ہی تھی جو پروفیسر نے اپنے چھوٹے بھائی سے کی اور پھر ایک عورت سے...... یہ جانے بغیر کے ماما کی محبت میں جلا ہے اسے پورا کرنے کا وہ اہل ہی نہیں...... محبت اسے اپنی بہن سے نہ ہوتی تو وہ اس کا گھر بسانے کے لیے اپنی زندگی داؤ پر کیوں لگاتا۔ کتنے روپ محبت کے ہیں سچا اور جھوٹا کیا۔

رانی کی محبت کا خیال آیا تو وہ اٹھ بیٹھا۔

"پروفیسر...... سو رہے ہو؟"

"نہیں، سوچ رہا تھا کہ تو کب بولے گا۔ خاموشی تیری بہت کچھ کہہ رہی تھی۔"

"مجھے کل رہائی مل جائے گی۔"

وہ ہنسا۔ "معلوم ہے مجھے...... جیلر تو معطل کر دیا گیا ہے۔ لیکن تجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"معطل ہونے کے بعد وہ کیا کر سکتا ہے۔ اس کے خلاف تفتیش ہوگی۔ اس کا ٹرانسفر ہو سکتا ہے۔"

"ہاں یہ ڈراما چلے گا پندرہ بیس دن...... کیا تو نے سنا نہیں دیکھیے نے گا۔ فارسی میں ہے کہ...... بادشاہ تخت پر ہو نہ ہو...... جہاں بیٹھے گا بادشاہ ہی ہوگا...... اس کی جگہ دوسرا تیسرا مددگار فرشتہ نہیں آ جائے گا۔"

"عدالت میں درخواست دائر کر دی گئی ہے پھر بھی۔" رشید مایوسی سے بولا۔

"ہاں پھر بھی...... عدالت کون سا کل ہی فیصلہ سنا دے گی جیلر کو جواب داخل کرنے کا حق تو دے گی۔ تب تک تیرا دماغ خراب ہو جائے گا۔ تو جیلر پر حملہ کر دے گا۔ چشم دید گواہوں کے سامنے...... پھر دو چار سال یہیں......"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں وہ سوچتا رہا کہ پروفیسر کو رانی کے جنونِ عشق کی انتہا کے بارے میں بتائے یا نہ بتائے۔ وہ تو رشید کو بتا چکی ہے کہ خواب آور گولیاں کھالے گی جو اس کے پاس پہلے سے موجود ہیں۔ اس کو رانی کی وارفتگی سے ڈر لگتا تھا۔ وہ ایسا کر سکتی ہے، اور کرے گی۔

"استاد......" اس نے آہستہ سے کہا۔ "تم ٹھیک کہتے تھے، اب میری سمجھ میں آ گیا۔"

"کیا سمجھ میں آ گیا ہے؟"

"یہی کہ...... میں اس سے شادی کر لوں۔" اس نے اعترافِ جرم کے انداز میں کہا۔

"بہت سکھی رہے گا بچے...... کیا تو نے اسے بتا دیا ہے؟"

رشید نے اپنا موبائل فون نکالا۔ "بتا تو سکتا ہوں، لیکن ابھی وہ جیلر کی بیوی ہے۔ بیوہ نہیں۔"

پروفیسر نے آہستہ سے کہا۔ "فکر مت کر، صبح بیوہ بھی ہو جائے گی۔ میں نے سنا ہے یہ لوگ رسمی کارروائی کے لیے مجھے اسپتال شفٹ کرنا چاہتے ہیں۔ اب مجھے افسوس نہیں ہو گا مرنے کا...... یہ زندگی کسی کے کام تو آئی۔"

"یہ آسان تو نہیں ہوگا استاد...... تمہارے ساتھ......" وہ مجرمانہ لہجے میں بولا۔

"آسان تیرے لیے کب تھا بچے میری بات ماننا...... آسان تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔" پروفیسر بولا۔ "ایک وعدہ کر۔"

رشید نے اس کا ہاتھ تھام کے آنکھوں سے لگا لیا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں۔ عدت کا زمانہ پورا ہوتے ہی اس سے شادی کر لوں گا۔"

پروفیسر نے آنسوؤں کی نمی کو اپنے ہاتھ پر محسوس کیا اور ایک گہری ٹھنڈی سانس لی۔ اب کیا فائدہ یہ وعدہ لینے سے کہ وہ ہر سال اس کی قبر پر فاتحہ پڑھنے آئے گا۔ وعدہ نبھانا بھی تو آسان نہیں ہوتا۔

"ہم اپنے بچے کا نام تمہارے نام پر رکھیں گے۔"

رشید بولا اور فون پر رانی کا نمبر ملانے لگا۔